میر تقی میر - ۱۸۵۷ء سے پہلے کے مرقع کا عکس

اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

شمارہ ۸ — اپریل تا جون ۱۹۶۲ ء

ترقی اردو بورڈ
URDU DEVELOPMENT BOARD

نگراں

جناب ممتاز حسن

ادارۂ تحریر

جوش ملیح آبادی　　شان الحق حقی

خواجہ حمید الدین شاہد

ترقی اردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون ۳۲۱۶۳

چندہ سالانہ　چار روپے
فی پرچہ　ایک روپیہ

ادارے کا نیا پتہ
دو منزل، جمشید روڈ، کراچی - ۵

مضامین

نادرات

اردو کی ترقی کے مسائل

شعبۂ لغت

ابوالمسعود فصیحی نے ترقیٔ اردو بورڈ کی جانب سے شائع کیا۔　مطبوعہ ریلیکا، صدر، کراچی

اردو نامہ

ہر زبان اپنے معاشرے کی ترجمان ہوتی ہے ۔ ہم اس حقیقت سے گریز نہیں کر سکتے کہ ہمارا معاشرہ کئی لحاظ سے پس ماندہ ہے ۔ ہماری زبان کا ہماری سماجی پستی سے متاثر ہونا لازمی ہے ۔ بہر حال ہم اپنی اس پستی کو دور کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں ۔ ملک کے اقتصادی اور سماجی حالات کو سدھار نے کے لئے وسیع پیمانے پر سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت منظم کارروائیاں ہو رہی ہیں ۔ گونا گوں مسائل اور بڑی دشواریوں کے باوجود ترقی کا عمل کسی نہ کسی رفتار سے جاری ہے ۔ ہر قسم کے اعداد و شمار تدریجاً بہتر اور زیادہ حوصلہ افزا ہوتے جارہے ہیں ۔ مگر زبان اس ترقی میں کس حد تک حصہ دار ہے؟

ہم توقع کرسکتے ہیں کہ ہماری کانوں اور کارخانوں کی بضاعت ، اجناس کی قسم اور پیداوار ، علمی و فنی اداروں کی تعداد اور اسی نسبت سے فی کس آمدنی، تعلیم کی شرح، فنی ماہروں کی گنتی برابر بڑھتی رہیگی ۔ عام حالات میں زبان کو تعلیم کے اضافے اور ملک کی ہر جہتی ترقی سے قدرتاً متمتع ہونا چاہئے ۔ لیکن ہماری زبان عام حالات سے نہیں بلکہ بڑے مخصوص حالات سے دوچار ہے ۔ یہ اس وقت بھی وہیں کی وہیں ہے ، بلکہ کچھ پیچھے، جہاں اس وقت تھی جبکہ تعلیم کا تناسب اوربھی کم تھا ، نہ اتنے گریجویٹ تھے نہ اتنے خواندہ لوگ نہ اتنے فنی ماہرین نہ اتنے مدرسے اور کالج ۔

یہاں ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم کے صدقے میں اپنی زبان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے ۔ جولوگ فنی مہارت حاصل کرتے ہیں وہ زبان سے بیگانہ تر ہوجاتے ہیں ۔ ان کی لیاقت اور مہارت انگریزی خوانی پر انحصار رکھتی ہے اور انگریزی دانی کے ساتھ مشروط ہوتی ہے ۔ کسی شخص کا کسی علم میں سند حاصل کرنا، انگریزی دانوں کی دنیا میں ایک اور فاضل کا اضافہ ہے اور اردو کے پس ماندہ حلقے میں ایک اور اپاھج کا ۔

یہ عجیب و غریب اور غیر فطری حالات اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کہ زبان کے بندھن نہ کھلیں اور یہ زمانے کے ساتھ چلنے کے قابل نہ ہوجائے۔ زبان کی صحیح ترقی اسی وقت ممکن ہے کہ یہ تعلیم ، سرکار اور کاروبار میں اپنا صحیح مقام حاصل کرائے ۔

اس راستے میں جو دشواریاں ہیں ان میں سے ایک بہت بڑی دشواری ہمارے نزدیک خود اردو کے خیر خواہوں کی تنگ نظری اور نادان دوستوں کی دشمنی ہے ۔ ہم اس کے رنگ روپ کے دلدادہ ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ : "چودہ برس کا من ترا لاکھوں برس رہے! " ہم نے اسے اپنا آلۂ تفریح قرار دیا ہے ۔ ہم اس کے شعر و ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں (جس میں پہلے ہی کلاسکی رنگ ، حال و احوال سے بیگانہ پن غالب ہے ، جیسے

قبل از وقت بڑهاپے کی علامت کهنا چاهئے) لیکن یه نهیں چاهتے که یه اپنا لبادهٔ عروسی تهه کر کے زندگی کی مهمات میں همارے دوش بدوش چلے که مبادا اسکے رنگ روپ میں فرق آجائے اور اسکے نازک جسم پر خراشیں پڑ جائیں ۔

کچھ لوگ تو اردو کو سرے سے زندگی کا ساتھ دینے کے قابل هی نهیں سمجهتے ، اور جو زبان سے انگریزی کی جگه اردو کو رائج کرنے کا نام لیتے هیں ، ان میں بهی کم هی ایسے هیں جنهوں نے ان تمام مسائل پر خاطر خواه غور کیا هو جو اس سلسلے میں پیدا هونگے ۔ ' اردو نامه ، کے صفحات میں ان مسائل کی طرف توجه دلائی جاتی رهی هے ۔ انگریزی کی جگه اردو کا نفاذ چهو منتر کے عمل سے نهیں هو سکتا ۔ همیں غور کرنا چاهئے که اگر آج سے اردو کو انگریزی کی جگه دلائی جائے (اور یه آج هی سے دلائی جانی چاهئے ورنه‌کل کبهی نه آئیگی) تو کیا کیا تدبیریں ضروری هونگی که یه کامیابی سے اپنا کام چلا سکے ۔

هم اس کے حامی نهیں که زبان کی بالکل هی کایا پلٹ کر دی جائے ۔ اگر ایسا هو تو پهر انگریزی کا هونا هی کیا برا هے ۔ اردو کے وه مخصوص اور دلآویز خد وخال جن کی بنا پر یه همیں عزیز هے ، قائم رهنے چاهئیں ۔ اپنے جنم سے اب تک بڑی تراش خراش کے بعد اسنے جو وضع وهئیت پیدا کی هے وه باقی رهنی چاهئے ۔ اسکی فصاحت کا معیار قائم رهنا چاهئے ۔ اس کا مخصوص محاوره ، جاندار ادبی روایات مٹنے کے قابل نهیں، نه انهیں مٹانا چاهئے ۔ لیکن ان خصوصیات کو بحال رکهنے کا طریقه یه نهیں که زبان کو پردے میں بٹها دیا جائے ۔

اس زمانے میں نشر و اشاعت کی سهولتوں کے باعث معیاری اردو کو رائج کرنے اور برقرار رکهنے کے وسائل پهلے سے زیاده موجود هیں۔ لیکن یه واقعه هے که ایک وسیع معاشرے میں خصوصاً جهاں ایک سے زیاده زبانیں رائج هوں، کسی قدر لهجے اور محاورے کا اختلاف اور تنوع قدرتی بات هے ۔ هر طبقے هر علاقے اور هر گروه کی ایک مخصوص بولی اور مخصوص اصطلاحات و محاورات هوتے هیں اور جس قدر زبان کو فروغ هوگا، جتنے کام زندگی میں اس سے لئے جائینگے اور جتنے زیاده لوگ اسے برتیں گے اتنا هی لهجے اور

اردو کی ادبی محفل میں سے یکے بعد دیگرے کئی عزیز شخصیتیں دیکهتے دیکهتے اٹھ گئیں ۔ یوں تو اهل قلم (خصوصاً اهل دل) کبهی نهیں مرتے ، بلکه مر کر هی امر هوتے هیں ، لیکن پسماندگان محفل کو یه جدائی بهرحال شاق گزرتی هے ۔ آغا اشرف نے تو بهت قبل از وقت سفر آخرت اختیار کیا ۔ اُن کی صحت (جیسی که نظر میں هے)، اُن کے مزاج اور اُن کے قلم میں ایسی جوانی تهی جو شاید کبهی زائل نه هوتی، اگر موت هی اسکے در پے نه هو جاتی ۔ اب اُن کی بجائے اُن کی جواں مرگی کا داغ مدتوں جوان رهے گا۔ ان کا تبسم، تکلم؛ آواز، انداز؛ تحریر و تقریر بهولنے والی نهیں ۔

ش ح ۔ ح

معاورے اور اصطلاحات کے اس تنوع میں اضافه هوگا ۔ اسکے باوجود اهل زبان اور اهل ادب اپنے لهجے اور محاورے کو اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے رائج اور برقرار رکھ سکتے هیں، جسکی اشاعت پر کوئی رکاوٹ نهیں بلکه زیاده سے زیاده سهولیتیں حاصل رهیں گی ۔

اسی طرح هم اردو کے رسم الخط کومٹادینے کے بھی حامی نهیں جو اس کے ساتھ لازم و ملزوم هوگیا هے ۔ همارا خیال هے که اس رسم الخط کے تحفظ کی پوری ضمانت هونی چاهئے اور اس کی سب سے کافی وشافی صورت یه هے که تعلیم کا آغاز اسی رسم الخط سے هو تا که بچے جلد از جلد خوانده هوسکیں اور موجوده انگریزی اسکولوں کے بچوں کی طرح اے بی سی ڈی سیکھ کر انگریزی پرائمروں میں کئی سال سر کھپانے کے باوجود، ناخوانده نه رهیں۔ تعلیم کا مسلمه اصول یه هے که تعلیم کا آغاز مادری زبان سے هونا چاهئے اس طرح بچه حرف شناس هونے کے ساتھهی خوانده هوجاتا هے۔جس زبان کو جانتا اور بولتا هے اس کا لکھنا اور پڑھنا بھی اسے آجاتا هے ۔ اور اسی کا نام خواندگی هے ۔ برخلاف اسکے گھر میں اردو سیکھ کر اسکول میں انگریزی پرائمریں پڑھنے والے بچے برسوں خوانده نهیں بننے پاتے ۔ یه گاڑی بهر حال انهیں کھینچنی تو پڑتی هے اور کھنچ هی جاتی هے، مگر بڑے نقصان کے بعد ۔ لهذا تعلیم کا آغاز اردو زبان اور اردو رسم الخط هی سے هونا لازمی هے ۔

لیکن یه بھی درست هے که آج کی دنیا میں کوئی شخص رومن کی حرف شناسی کے بغیر گذاره نهیں کر سکتا ۔ نه صرف رومن حروف بلکه انگریزی کا جاننا ایک مدت دراز تک ضروری هو گا ، تا که هماری نئی نسل کی جدید علوم تک رسائی حاصل رهے ، [illegible] فی‌الحال هماری زبان مهیا نهیں کر سکتی ۔ در اصل یه زبان خود بھی رومن کا سهارا لئے بغیر سرکار و کاروبار میں نهیں چل سکتی ۔ ایک مزید اور لازمی سهولت هے جو اردو کو مهیا هونی چاهئے که نسخ و نستعلیق کے ساتھ رومن حروف سے بھی کام چلا سکے ۔ اسکو اشاعت اور اظهار کے ایک کی بجائے دو وسیلے حاصل هوں ۔ موجوده دنیا میں وهی زبان بر رهے گی جو ایک کی بجائے دو طرح کے رسم‌الخط سے کام لے گی ۔ ادب میں نهیں، رسائل و اخبارات میں نهیں، عام خط و کتابت اور عام تحریر و تصنیف میں بھی نهیں، البته سرکار اور کاروبار میں نه صرف بولیوں کا تنوع ، نه صرف لهجے اور محاورے کا اختلاف بلکه دو طرح کا رسم‌الخط اختیار کرنا پڑیگا ۔ تا که زبان کو بے شمار عملی کاروائیوں اور بهت سے فرائض کی انجام دهی میں رکاوٹ لاحق نه رهے ۔

اگر چه رومن رسم‌الخط اس بر عظیم میں ایک صدی سے رائج هے اور ظاهر هے که همارے لاتعداد الفاظ و اعلام اس رسم‌الخط میں لکھے جاتے رهے هیں ، اور روزانه لکھے جاتے هیں، لیکن انهیں رومن میں لکھنے کا کوئی متعین طریقه موجود نهیں، جسے در اصل حکماً اور قانوناً نافذ کرنا ضروری تھا ۔ بورڈ نے علمی مقاصد کے لئے اس ضرورت کو محسوس کر کے ایک طریقه تجویز کیا ، جو اردو نامه میں شائع کیا جا چکا هے ۔ اس پر موجوده

اشاعت میں جناب ڈاکٹر گیان چند نے اظہار خیال کیا ہے ۔ ہم ان کے اس مضمون پر مختصر تبصرہ ضروری خیال کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے کہ اس دور میں رومن سے کام لئے بغیر چارہ نہیں ، نیز یہ کہ رومن کا مبینہ نقص ہی در اصل اس کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ اپنی اسی لچک کے باعث یہ ہر زبان کی اصوات کو ادا کرنے کے لئے موزوں ہے یا ڈھالا جا سکتا ہے ۔ یہ بھی درست ہے کہ بین الاقوامی صوتیاتی علامات (جو رومن پر مبنی ہیں) ہر زبان کے تلفظ کے لئے کفایت کرتی ہیں ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلے پر خالص علمی نقطۂ نظر سے غور فرمایا ہے اور اس عملی ضرورت کو نظر انداز کیا ہے کہ ہم اسے آج ہی سے عملی ضروریات کے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔ ہم انہی ٹائپ رائٹروں سے کام لینا چاہتے ہیں جو اس وقت ملک میں موجود ہیں اور انگریزی کے تصرف میں ہیں ۔ اور انہی حروف پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں جن سے ہمارے تعلیم یافتہ لوگ واقف ہیں اور جنہیں وہ روزانہ برتتے ہیں ، اور انہیں کوئی بالکل ہی تیسرا رسم الخط نہیں سکھانا چاہتے ۔ حروف کی قیمت اور آوازیں بھی حتی الامکان وہی رکھنا چاہتے ہیں جن سے وہ واقف ہیں تاکہ کوئی ذہنی الجھن لاحق نہ رہے ۔ جو املا ڈاکٹر صاحب نے تجویز کی ہے ، اس سے انگریزی خوانی کی عادت کے باعث ، نظر کو جو الجھن ہوتی ہے اور بڑے حروف کو چھوٹے حروف کے بیچ میں لانے سے الفاظ جو انوکھی شکل اختیار کرتے ہیں ، وہ اسکی مقبولیت کے حق میں مفید نہیں ہو سکتی ۔ ہمارے گھروں ، دفتروں اور کوچہ و بازار میں رومن اب بھی افراط سے لکھی ہوئی پائی جاتی ہے ۔ ہمیں مطالعے اور تحریر کی ان عادات سے یکسر انحراف نہیں کرنا چاہئے جو گذشتہ ایک صدی میں بڑی حد تک محکم ہو چکی ہیں ۔ انہیں صرف ضابطہ میں لانے کی ضرورت ہے ۔ ہمارے مجوزہ طریقۂ املا میں یہی امور پیش نظر رکھے گئے تھے ۔

ش ۔ ح ۔ ح

سر ورق

عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد (دکن) کے مشاہیر شعرا میں سے ہیں ۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے ۔ ان کے اردو دیوان (قلمی) کے علاوہ مثنوی لعل و گوہر بہت مشہور ہوئی ، جس کے مخطوطے کتب خانۂ سالار جنگ ، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں ۔ ۱۷۶۴ع مطابق ۱۱۷۸ھ میں عاجز کا انتقال ہوا ۔ انہوں نے خود ہی وفات سے قبل اپنے نام " عارف الدین خاں عاجز " سے اپنی تاریخ وفات نکالی تھی ۔

مثنوی لعل و گوہر مدراس اور بمبئی میں ۱۸۷۳ع اور ۱۸۷۷ع میں طبع ہو چکی ہے ، لیکن یہ اب کم یاب ہے ۔ سر ورق کی تصویر لعل و گوہر کے انڈیا آفس لائبریری والے نسخے کا ایک مصور صفحہ ہے ، جس کا مائکرو فلم ترقیٔ اردو بورڈ میں موجود ہے ۔

خ ۔ ح ۔ ش

تاریخ و ادب کی بہترین کتابیں

ادب اور شعور

ممتاز حسین

ادب اور تنقید پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ممتاز حسین کا حصہ بڑا وزنی ہے۔ ممتاز حسین بڑے با شعور نقاد ہیں، یہ ان کے گرانقدر ادبیات اور تنقیدات کا مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۰ روپے

تذکرۂ جگر مراد آبادی

محمود علی خاں جامعی

جگر مرحوم ایک دوست ناقد اور مصنف کی نظر میں۔ جگر ایک عظیم شاعر کے علاوہ عظیم انسان بھی تھے۔ ان کی متعدد تصاویر اور ان کے تحریری عکسوں سے مزین۔
قیمت ۴ روپے

روح اور فلسفہ

سید محمد تقی

روح ہو یا فلسفہ، دونوں ہی دشوار گذار گھاٹیاں ہیں اور جب یہ دونوں ایک ہی جگہ جمع ہوجائیں تو بات اور زیادہ پیچیدہ ہوجاتی ہے۔ سید محمد تقی نے ان دونوں کو جس طرح کتاب میں سمویا ہے، یہ انہی کا کام تھا۔
قیمت آٹھ روپے

مقالات یوم شبلی

مرتبہ: خان عبیداللہ خاں

ڈاکٹر سید عبداللہ، وقار عظیم، خواجہ دل محمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ نے مولانا شبلی اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کا غائر مطالعہ کیا اور انہیں اپنے مضامین میں محفوظ کردیا۔ مولانا شبلی اور ان کے کام پر ایک شاندار تحقیقی کارنامہ۔
قیمت ۱۲ روپے ۵۰ پیسے

نئی اور پرانی قدریں

ڈاکٹر شوکت سبز واری

چودہ گرانقدر مقالات کا شاندار مجموعہ۔ ان کی تنقیدات میں قدیم اور جدید ادبی روایات کا بہترین امتزاج موجود ہے۔ ادب کی نئی اور پرانی اقدار پر سیر حاصل بحث اور تبصرہ۔
قیمت پانچ روپے

جام سرشار

رتن ناتھ سرشار

سرشار کا سرمایۂ ادب 'فسانۂ آزاد' ہی تک محدود نہیں، انہوں نے اردو ادب کو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ دیا ہے۔ اس میں 'جام سرشار' کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ سرشار سے متعلق چکبست کا معرکہ آرا مضمون اور ایک فرہنگ کے ساتھ۔ قیمت (۹) نو روپے

معیار ادب

ڈاکٹر شوکت سبز واری

ادب کیا ہے؟ اور ادبی معیار کسے کہتے ہیں؟ اس تنقیدی مجموعے میں اس کا جواب دیا گیا ہے، نظری اور عملی تنقید کا بلند پایہ مجموعہ
قیمت چار روپے ۵۰ پیسے

لفظِ اُردو کی تاریخ

ڈاکٹر محمد صابر

شعبۂ تاریخ کراچی یونیورسٹی

ترکی لہجوں اور ترکی ادب کی تحقیقات اور مختلف ترکی علاقوں کے سفر کے دوران لفظ ''آردو'' کے کثرت استعمال نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ اس لفظ کے عجیب و متنوع تلفظ، گوناگوں استعمال اور دنیا کی اہم زبان ہونے اور پاکستان کی قومی زبان کا نام بھی آردو ہونے کے باعث، میں نے اس کی اصلیت، تاریخ اور استعمال کا پتہ لگانا شروع کیا۔ لفظ ''آردو'' کی چھان بین کے خلاصے کو سب سے پہلے اردو زبان ہی میں پیش کرنا باعث فخر سمجھتا ہوں۔

آردو کی اصلیت

سیکڑوں سال قبل آردو زبان نے ہندوستان میں جنم لیا۔ اس زبان کی اصل آریائی ہی ہے۔ یہ زبان پہلے مختلف ناموں سے موسوم رہی، لیکن ''ترک'' فرماں روا شاہ جہاں کے دور میں اس قدیم ہندوستانی بھاشا کو آردو کے شاندار نام سے نوازا گیا۔ گو کہ آردو زبان کی پیدائش ہندوستان ہی میں ہوئی، لیکن اس کا نام یعنی لفظ ''آردو'' اصل کے اعتبار سے ہندوستانی نہیں بلکہ خالص ترکی ہے۔ اس لفظ کا عام استعمال ہند کے بارلاس ترکوں (آل تیمور، مراد ہندوستان کے آخری ترکی فرمانروا بابر کی اولاد شاہجہاں وغیرہ، جنہیں غلطی سے مغل یا منگول کہا جاتا ہے) کے دور ہی میں ہوا، جن کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے مظالم کا شکار ہوکر ملک سے جلا وطن ہوا۔

آردو زبان جس طرح پروان چڑھی، اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ ترکوں کا اس زبان کی ترویج میں جو مقام ہے، اسے بھی سب جانتے ہیں۔ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ امیر خسرو جنہیں اردو کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے، لاچین ترکی قبیلے کے سردار کے لڑکے تھے، جو ترکستان سے آکر ہندوستان میں آباد ہوگئے تھے۔ مرزا غالب نے تو نظم و نثر میں کئی جگہ اپنے ترک النسل ہونے کا اظہار کیا ہے۔

ترکمانی، آذری، تاتاری، قپچاق، قزاق، قرغز، اویغور وغیرہ ترکی لہجوں کے نام ہیں۔ اسی لئے بعض حضرات نے غلطی سے لفظ ''آردو'' کو تاتاری بھی کہہ دیا ہے۔ یہ غلطی

بعض ہندوستانی اور پاکستانی مصنفین کی کتابوں میں بھی عام طور سے نظر آتی ہے۔ یہ لفظ بڑا جاندار ہے ، جس کی زندہ مثال اس لفظ کا مختلف ترکی علاقوں میں آج بھی استعمال ہونا ہے۔ یہ لفظ منگولی زبان میں بھی داخل ہوگیا ، جہاں لشکر کے لئے منگولی لفظ قوشون (غوشون) Qoshun/Ghoshun موجود تھا۔

یہ لفظ ایسا دلچسپ اور ہردل عزیز ثابت ہوا کہ کہیں فوج ، کہیں سپاھی ، کہیں خیمہ ، کہیں حرم ، کہیں ناظر حرم ، کہیں کیمپ ، کہیں زبان کے نام اور کہیں سانپ کے بل اور کھیل کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ یہی نہیں بلکہ اسم عام سے نکل کر اسم خاص کی شکل اختیار کرگیا۔ لفظ ''اردو'' کے برابر شاید ترکی زبان کا کوئی اور لفظ نہیں جو آج بھی سائبیریا سے لے کر ملتان تک کے علاقوں میں اور دو ایک غیر ترکی علاقوں میں بھی گوناگوں معنوں میں استعمال ہوتا ہو۔ یہ شرف صرف لفظ ''اردو'' ھی کو حاصل ہے کہ تین بر اعظموں میں آج بھی اس کا بول بالا ہے اور اس نام کی جو زبان ہے ، وہ عالم اسلام ھی نہیں بلکہ دنیا میں اپنے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ترکوں کو اس لفظ پر حیرت ہے لیکن وہ خوشی بھی محسوس کرتے ھیں کہ ان کی زبان کے ایک لفظ کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔ بعض ترکی اصحاب نے اس کی بنیاد کو لفظ ''اور — Or بہ معنی قلعہ یا تخت'' بتایا ہے ، لیکن ترکی زبان کے ماہرین (Turkology) کی تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ یہ لفظ مجرد اسم ہے اور لفظ ''Or'' یا ترکی مصدر ''اورماق'' Urmaq بہ معنی مارنا سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اُردو کا تلفظ

اس لفظ کی مختلف شکلیں ھیں :

۱ - Ordu (اوردو)۔ قبل اسلام کی ترکی میں یہ لفظ Ordu تلفظ ہوا ہے اور آج ترکوں کی اکثریت Ordu ھی تلفظ کرتی ہے۔ جدید ترکی میں بھی Ordu ھی تلفظ کرتے ھیں۔

۲ - Orda (اوردا ، اوردہ)۔ یہ تلفظ عام طور سے اتراک خوارزم (موجودہ خیوہ) اور قیچاق ترکوں میں ہے۔ مختلف شکلوں کے اختلاف کے اسباب یا قانون ھیں ، جن کے تحت یہ تلفظ پیدا ہوتے ھیں۔ ترکی زبان کا قاعدہ ہے کہ الفاظ کے آخر میں u/a کی آواز ایک دوسرے سے بدل جایا کرتی ہے۔ مثلاً

۱ - Baltu بالتو (بہ معنی کلہاڑا، قدیمی تلفظ)، Balta بالتا (نیا تلفظ)۔

۲ - Ortu اورتو (بہ معنی درمیانی ، قدیمی تلفظ) ، Orta اورتا (نیا تلفظ)۔

اسی قانون کے تحت Ordu کی دوسری شکل Orda ہوگئی۔ لفظ Orda پر آئندہ تبصرہ کیا جائے گا۔ منگولی علاقوں میں Orda کا استعمال بہت نظر آتا ہے۔

۳ - Urdu (اُردو)۔ یہ لفظ Ordu کی تیسری شکل ہے ، جو زیادہ تر ترکستان اور تاتارستان میں سنا جاتا ہے۔ بابر اور اس کی

فوج کا تلفظ یہی تھا، جس کو سن کر ھندوستانی مصنفین نے بھی یہی تلفظ اختیار کرلیا۔ اگر وہ لوگ Orda تلفظ کرتے ہوتے تو کہیں نہ کہیں تحریر میں آتا اور Ordu اور Urdu کے فرق کو واضح کیا جاتا۔ یہی نہیں بلکہ بابر سے قبل ھی ترکستان کے علاقوں میں یہ تلفظ موجود تھا۔ اویغور رسم الخط میں جو کتب برآمد ہوئی ہیں، ان سے O/U کی تبدیلی کا پتہ چلتا ھے، یعنی ترکی زبان کا یہ بھی قاعدہ ھے کہ o/u آپس میں تبدیل ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً Ordu سے Urdu ھوگیا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

۴ - Orta (اورتا۔ اورتہ)۔ ترکی زبان میں دیگر زبانوں کی طرح اصوات صحیحہ کی تبدیلی بھی نظر آتی ھے۔ مثلاً

استانبولی لہجہ	دیگر لہجے
۱ - آق (سفید)	آخ - آغ
۲ - داغ (پہاڑ)	تاغ - تاق
۳ - اوچماق (اڑنا)	اوشماق

اسی قانون کے تحت Orda کا "d" (دال) "تا" ھو گیا ھے، یہ محدود ھے اور صرف چغتائی لہجے میں نظر آتا ھے۔

۵ - Ordo قرغز قزاق ترکوں میں Ordo بھی ھے، جو ترکی قواعد میں استثنیٰ ھے، کیونکہ اس لہجے کے سوا کسی بھی ترکی لہجے میں کسی لفظ کے آخرمیں "O" کی آواز (واو مجہول) نہیں ہوتی۔ بعض علاقوں میں یہی لوگ کبھی کبھی Oordu بھی کہتے ہیں۔

ترکی زبان کا قاعدہ ھے کہ کسی حرف علت کو کھینچ کر نہیں پڑھتے، یعنی Ordu کا تلفظ "اردو" کرتے ھیں اور بعض ھندوستانیوں یا پاکستانیوں کی طرح واو کو کھینچ کر آردو Urdoo نہیں کرتے۔ املا اور اس لفظ کے تلفظ میں برصغیر ھند و پاک کے لوگوں کو ایک خاص امتیاز حاصل ھے۔ ھمارا تلفظ ترکوں کو عجیب معلوم ھوتا ھے اور ان کا ھمیں۔

اردو کے معنی

دور اورخون (Orkhun)۔ اسلام سے قبل کی ترکی زبان کو اورخون ترکی یا کوک / گوک (Kok/Gok) ترکی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ سب سے قدیمی ترکی کتبے منگولیا کے قریب اورخون نامی ندی کے قرب وجوار میں پائے گئے ھیں۔ اس لئے اس دور کی ترکی کو "اورخون ترکی" کہا جانے لگا جو سب سے قدیمی آثار ھیں۔ اس کا آخری دور ساتویں آٹھویں صدی ھجری ھے۔ اس دور میں جو ترک یہاں آباد تھے ان کا نام (Kok/Turk) کوک ترک (آسمانی ترک) تھا۔ اس لئے اورخون ترکی کے ساتھ ساتھ کوک ترک ترکی بھی کہا جانے لگا۔ ان ترکوں کی مغربی سرحدات بنوامیہ کے علاقوں سے ملتی تھیں۔ قتیبہ ابن مسلم باھلی نے حجاج بن یوسف کے حکم پر انہیں کوک ترکوں سے جنگیں کیں اور علاقے فتح کئے۔ اورخون ترکی کا رسم الخط عجیب و غریب تھا۔ اس کا نام بھی اورخون ھی رکھ دیا گیا ھے۔ اس دور

میں اردو کا تلفظ Ordu ملتا ہے۔ "اور" کے معنی لشکر کے ہیں۔ اس لفظ کی اہمیت اس سے بھی ہے کہ سب سے قدیمی کتبوں میں بھی کئی جگہ یہ نظر آتا ہے۔

دور اویغور (Uyghur)۔ اورخون ترکوں کا خاتمہ ایک طرف بنوامیہ اور دوسری طرف اویغور نامی ترک قبیلے کے حملوں کے باعث ہوا۔ اویغور ترکوں کا دور نویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی کے آخر تک رہا۔ اس قبیلے کے نام پر اس دور کی ترکی زبان کا نام (اویغورچہ) Uyghurcha ہوا۔ اورخون رسم‌الخط کے بعد ترکی زبان عجیب و غریب اور مشکل رسم‌الخط میں لکھی جاتی تھی، جسے اویغور کہتے ہیں۔ اویغور قبیلے میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا، جس کا اثر یہ ہوا کہ ترکی زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ تیزی سے اور کثرت سے داخل ہونے لگے۔ اویغوروں کی اکثریت نے اویغور رسم‌الخط تبدیل کر کے عربی رسم‌الخط اختیار کرلیا۔ پھر بھی زمانۂ جاہلیت کا اویغور رسم‌الخط فاتح استانبول سلطان محمد (مشہور عثمانلی حکمدار) اور بابر کے زمانے تک ترکی دنیا میں جاری رہا۔ اویغوری دور میں عربی رسم‌الخط میں اس لفظ کے دو املا نظر آتے ہیں۔ ایک "اور دو" اور دوسرا "اردو" جس کی وضاحت آیندہ کی جائیگی۔

اس دور میں دو اہم کتابیں لکھی گئیں۔ اسلام لانے کے بعد ترکوں کی سب سے پہلی تصانیف بھی یہی ہیں۔ اس سے قبل ترکی مسلمانوں کی کوئی کتاب برآمد نہیں ہوئی۔ ترکی زبان کی تاریخ کے لحاظ سے یہ دور نہایت ہی اہم ہے۔ مسلم اویغور ترکوں کا مرکز کاشغر تھا، جو آزاد کاشمیر کے شمال میں واقع ہے۔

اہم کتابیں

(۱) قوتادغو بیلیگ (Qutadghu-bilik) بہ معنی "سعادت بخش علم"۔ گیارھویں صدی میں کاشغر میں یوسف نامی ترکی شاعر نے شاہنامے کے وزن پر یہ کتاب لکھی۔ یہ شخص وزیر اعظم کے رتبہ کا تھا اور بدھ مذہب کا دشمن، کیونکہ ترکوں کے بعض قبائل بدھ مت کے پیرو تھے۔ یہ لوگ پہلے ہی اسلام لا چکے تھے۔ یہ کتاب اسلامی اصولوں اور جہاد پر زور دیتی ہے۔ اس کتاب میں اردو Ordu مندرجۂ ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ بادشاہ کا خیمہ
۲۔ اردو گاہ
۳۔ شاہی کوشک

(۲) دیوان لغت‌الترک۔ عباسی خلیفہ کے نام پر کاشغر کے مشہور عالم اور ماہر سیاسیات محمود نے یہ کتاب گیارھویں صدی عیسوی میں، قوتادغو بیلیگ سے دو تین سال بعد لکھی۔ محمود الکاشغری نے مختلف ترکی علاقوں کا دورہ کر کے ترکی زبان کے عربی رسم‌الخط میں پہلی ترکی عربی لغت تیار کی، جس کا مقصد عربوں کو ترکی پڑھانا اور عربی گرامر سے ترکی کا مقابلہ تھا۔ یہ واضح رہے کہ قوتادغو بیلیگ اویغور اور عربی رسم‌الخط دونوں میں ہے، لیکن دیوان لغت الترک صرف عربی رسم‌الخط میں ہے۔

اس لغت میں مندرجہ ذیل معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

۱ - خاقان کے قیام کرنے کا شہر

۲ - چوہے کا بل ، گھونسلا

۳ - اردو باشی (خاقان کا بستر وغیرہ درست کرنے والا شخص)

۴ - اردو لانماق (Ordulanmaq) بہ معنی آباد ہونا اور شہر کو مرکز بنانا - دیگر اویغوری کتابوں میں یہ لفظ اور بھی معنوں میں استعمال ہوا ہے :

۱ - اسم خاص کے طور پر، مثلاً اردو بیگ (Ordu Beg) - جدید ترکی میں بھی بطور اسم خاص مستعمل ہے - مثلاً موسیٰ اردو (MusaOrdu)

۲ - اردو کند — یہ شہر کا شغر کا دوسرا نام ہے - جدید ترکی میں بحر اسود کے کنارے ایک صوبے کا نام بھی Ordu ہے - سڑکوں اور گاؤں کے نام بھی اردو ہوتے ہیں — مثلاً استانبول یونیورسٹی، اردو جادہ‌سی (اردو روڈ) پر واقع ہے —

۳ - اردو چی — فوج کو بذات خود کمانڈ کرنے والے خاقان کو کہتے ہیں — لاحقہ "چی" (Chi) کسی فعل کو ظاہر کرتا ہے - اردو زبان میں بھی ترکی سے یہ "چی" آ گیا ہے - مثلاً طبل‌چی، قتارچی، توپچی، نقل چی وغیرہ -

۴ - اوتاغ خاقان یا سلاطین کا دائرۂ حرم -

یہ بھی واضح رہے کہ اس دور میں لفظ "اردو" کے ساتھ ساتھ لشکر کے معنوں میں لفظ چیریگ (Cherig) بھی استعمال ہوتا رہا ہے — یہی لفظ دیگر ترکی لہجوں میں Chirig ، Cherik ، Cheru ہو گیا ہے - عثمانی ترکی میں بھی Cheri کی شکل میں موجود ہے - جیسے Yeni-Cheri (نئی فوج)

دور چنگیزی

منگولی سلطنت کے بانی چنگیز خاں نے اپنی سلطنت کی تنظیم کے لئے اور خاص کر خط و کتابت کے لئے اویغور ترکوں کو بھرتی کیا — اس دور میں ترکی منگولی الفاظ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے — Ordu کا لفظ منگولی میں شامل ہو گیا - لشکر کے لئے خود منگولی میں "قوشون" کا لفظ موجود تھا — منگولی زبان میں اسی معنی میں چریگ Cherig داخل ہو گیا ، جو لفظ اردو کے ساتھ ساتھ ترکوں میں اب بھی مستعمل ہے -

منگولوں میں یہ لفظ Orda کی شکل میں داخل ہوا - یہ حادثہ خاص کر اس وقت ہوا جب چنگیز خاں کے پوتے باتو خاں بن جوچی نے منگولیا سے نکل کر ترکستان کے مغرب میں اور روس میں تیرھویں صدی عیسوی میں ایک منگولی حکومت قایم کی ، جسے ترک اور منگول ، آلتون - اردو (Altun-Ordu) کہتے ہیں - عام طور سے اسے آلتون اوردا بھی کہتے ہیں - انگریزی مصنفین اس کا ترجمہ (Golden Horde) کرتے ہیں - کہنے کا مقصد ہے کہ یہ لفظ Orda کی شکل میں Horde کے معنی میں استعمال ہوا ہے - یہی نہیں بلکہ Orda بطور اسم خاص کے بھی استعمال ہوا

ہے۔ مثلاً باتو خاں کے بھائی کا نام بھی اوردا ایچن (Orda-Ichen) تھا۔ لفظ Ordu کا استعمال بطور اسم خاص ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس دور میں لفظ Ordu کہیں کہیں ملتا ہے، لیکن عام طور سے Orda ہی ہے۔ قپچاق ترک Ordu کو ہمیشہ Orda ہی کہتے آئے ہیں۔

بھی لفظ Orda تارانچی [(Taranchi) شرقی ترکستان جسے چینی سنکیانگ کہتے ہیں، غلطی سے چینی ترکستان بھی کہتے ہیں۔ مادری زبان ترکی ہے] اور آذری ترکی میں بھی مندرجۂ ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ سرائے، کوشک ۲۔ بادشاہ کا خیمہ

مشہور ترکی فاتح تیمورلنگ نے جب نسلاً منگولی اور مذہباً اسلامی سلطنت یعنی آلتون اوردوا کو ختم کیا، تو لفظ Ordu اور Urdu پھر عام ہوگیا، کیونکہ ترکستانی ترکوں میں Orda کا تلفظ شاذ و نادر ہی ہے۔ آلتون اردو کے علاقوں کو آج کل تاتارستان کہا جاتا ہے۔ کریمیا وغیرہ اسی میں شامل ہیں۔

آذری لہجہ

اس لہجے میں اردو کا لفظ بہت ہی کم مستعمل ہے۔ عام طور سے منگولی لفظ ''قوشون'' بولتے ہیں۔ آذربائیجان دو حصوں میں ہے، جو روس کے تحت ہے۔ اس کا مرکز باکو ہے، جو ایران کے تحت ہے، اس کا مرکز تبریز ہے۔ آذری لہجہ اناطولی اور ترکمانستان کی ترکی کے بہت قریب ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ حالانکہ اناطولیہ اور آذربائیجان کے اتراک، ترکمانی ہیں، لیکن آذری لہجے میں لفظ اردو کا استعمال بہت کم ہے۔ اس کی وجہ سالہا سال تک آذری ترکوں کا منگولوں کے تحت رہنا ہے۔

چغتائی لہجہ

چنگیز خاں کے لڑکے چغتائی خاں کے قبضے میں جو ترکی علاقے آئے، ان سب کو علاقۂ چغتائی کہا جانے لگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس دور کی ترکی زبان کو بھی غلطی سے یا غلط فہمی کے باعث چغتائی ترکی کہا جانے لگا۔ منگولوں کی اس حکومت کا خاتمہ مشہور ترک فاتح تیمورلنگ نے کیا۔ تیمور کے مرنے کے بعد سیکڑوں سال تک بھی ترکی زبان کو چغتائی چہ یا لسان چغتائی کہا جاتا رہا۔ تیمور لنگ کے دور میں Ordu یا Urdu بہت مستعمل رہا ہے۔ ترکوں کے اور چغتائی لہجے کے سب سے بڑے شاعر امیر علی شیرنوائی کے دیوانوں میں یہ لفظ کئی جگہ ملتا ہے۔ چغتائی زبان کے آخری سب سے بڑے شاعر اور نثار بابر کی ''تزک بابری'' میں یہ لفظ کئی بار استعمال ہوا ہے۔ لفظ Ordu یا Urdu در اصل بابر اور بابر کی اولاد کے دور ہی میں بکثرت ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکستان کی ترکی میں بابر کے زمانے میں یہ لفظ عام تھا۔ اس دور میں اردو کے ساتھ ساتھ لشکر کے معنی میں لفظ چریگ (Cherig) بھی ملتا ہے، جو بابر کے ترکی دیوان میں کئی جگہ ہے۔ لفظ اردو بابر کے دور میں ان معنوں میں مستعمل تھا:

۱۔ عسکر، کیمپ ۲۔ لشکر، حرم سلاطین۔

اردو کی دوسری شکل یعنی Orda (اوردا۔ اوردہ) بھی حرم سلاطین کے معنوں میں ملتا ہے ۔

ایک دوسرا لفظ اوردا بیگی (Ordabegi) بھی ملتا ہے، جس کے معنی آغائے حرم ، محافظ حرم یا ناظر حرم کے ہیں ۔

عثمانلی ترک

اس سلطنت کے بانیوں کا تعلق اوغوز ترکوں سے تھا، جنہیں گیارھویں، بارھویں صدی عیسوی میں ترکمن بھی کہا جانے لگا ۔ عثمانی اور سلجوقی در اصل ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ۔ اتابک وغیرہ سب اوغوزیا ترکمن ترک ہی تھے ۔ عثمانی دور ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کی خلافت کے خاتمہ کر دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے ۔ لفظ اردو عام طور سے ان معنوں میں مستعمل ہے :

۱ ۔ فوج یا لشکر
۲ ۔ فوجی دستہ
۳ ۔ کیمپ

دیگر الفاظ کے ساتھ بھی بہت استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً

۱ ۔ اردو قاضی سی (قاضئی عسکر)
۲ ۔ اردوئے همایوں (a) شاہی فوج (b) شاہی کیمپ
۳ ۔ اردو گاہ ۔ کیمپ کے معنی میں
۴ ۔ اردو لوق Ordulaq (a) میدان میں فوج کی حاضری کا وقت (b) گڑبڑ کا وقت
۵ ۔ اردویری Orduyeri (کیمپ کا مقام)
۶ ۔ اردو چیقارمق (لڑنے کے لئے فوج روانہ کرنا)

عثمانی دور میں چری (Cheri) کا لفظ بھی کافی استعال ہوا ہے ۔ مثلاً

۱ ۔ فوجی ۲ ۔ فوجی قوت، فوج
۳ ۔ چری باشی ۔ فوجی کمانڈر

عیسائیوں کے نابالغ بچوں کو پکڑ کر اسلامی تعلیمات دے کر اور ترکی زبان سکھا کر ایک زبردست فوج تیار کی گئی تھی، جس کا نام Yenicheri رکھا گیا تھا ۔ لفظ ''چری'' لشکر کے معنوں میں ہے ۔ یہی ینی چری بگڑ کر جان نثاری ہو گیا اور عربوں نے تو اسے '' انکشاری '' ہی کر دیا ۔ عثمانی دور میں Orda یا Urdu یا Orta کا وجود نہیں ملتا ۔

جدید ترکیہ

آج کل بھی یہ لفظ بہت عام ہے اور اسم خاص کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً

موسئی اردو — بحراسود کے ساحل پر ایک صوبے کا نام بھی Ordu ہی ہے — ترک اپنی فوج کو ترک اردو سو (Turkordusu) ہی کہتے ہیں، یعنی افواج ترک اور ایرفورس کو ھوا اردو سو (Havaordusu) کہتے ہیں — اردو گاہ کا لفظ بھی ملٹری کیمپ کے معنوں میں ہے ۔

'' اردو بوزان '' کا لفظ بھی ہے '' جس کے معنی ایک بیماری کے ہیں ۔

قرغز قزاق لہجہ

تلفظ Ordo ہے اور مندرجہ ذیل معنوں میں مستعمل ہے :

۱ ۔ قرار گاہ خان
۲ ۔ سانپ کا بل
۳ ۔ ایک کھیل کا نام
۴ ۔ کھیل میں ایک صف یا فریق

کہیں کہیں Oordu بھی تلفظ کرتے ہیں ۔

ان لہجوں میں Ordu کا لفظ بہ معنی مقام اور جگہ استعمال ہوتا ہے ۔ انہیں معنوں میں لفظ Orun بھی موجود ہے ۔

لشکر کے معنوں میں لفظ Ordu کی بجائے چریک (Cherig) عام طور سے مستعمل ہے ۔

موجودہ ترکستان

موجودہ ترکستان میں یہ مفقود ہے۔ یعنی جہاں ترکی زبان نے جنم لیا، وہیں استعمال نہیں ہوتا۔ Ordu کی بجائے Orda موجود ہے جو "سرائے" کے معنی میں ہے۔ چین کے قبضے میں جو ترکی علاقہ ہے، وہاں لشکر کے لئے لفظ (Cherig) ہے۔

افغانستان اور ایران کے بعض ترکی علاقوں میں اردو کا لفظ عام طور سے لشکر کے معنی میں ملتا ہے۔

ترکی کے لفظ سے عام طور سے غلط فہمی پیدا ہوتی رہتی ہے اور ہمیشہ ہر چیز کو جدید ترکیہ سے منسوب کرلیا جاتا ہے۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اردو زبان میں ترکی الفاظ ترکیہ سے آئے ہیں، مگر یہ کیسے ہوا؟ حالانکہ حقیقت صرف یہ ہے کہ ترکیہ سے کچھ نہیں آیا۔ ترکی زبان ترکستان کے علاقوں میں پیدا ہوئی اور یہیں سے سب جگہ پھیلی۔ ترکوں کی ایک شاخ نے اناطولیہ جا کر سلجوقی اور عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھ دی اور سمرقند و بخارا میں جو زبان بولی جاتی ہے، وہاں کی سرکاری زبان قرار پائی، یعنی ترکی کے ترک اور ترکی زبان در اصل ترکستان سے گئی ہے۔ دوسری شاخ ایران اور افغانستان پہونچی۔ ہندوستان و پاکستان میں جو ترکی الفاظ پائے جاتے ہیں، ان پر خالص چغتائی لہجے کی چھاپ ہے، جو بارلاس ترکوں کا ادبی لہجہ تھا۔ عثمانی آذری ترکی ترکمان ترکوں کی زبان ہے اور معمولی اختلافات موجود ہیں۔ اس لئے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ ترکی سے مراد اناطولیہ کے ترک یا ترکی زبان نہیں۔

املا کا اختلاف

اوردو۔ اردو۔ اردی

ادوار کے لحاظ سے تقسیم

۱ ۔ اویغوری — اوردو ۔ اردو
۲ ۔ چغتائی بابری — اوردو ۔ اردو
۳ ۔ آذری — اردو
۴ ۔ عثمانی جدید ترکیہ و عراق — اردو ۔ اردی
۵ ۔ ایران — اوردو ۔ اردو
۶ ۔ افغانستان — اردو
۷ ۔ مشرقی ترکستان — اوردو
۸ ۔ پاکستان و ہندوستان — اردو

اختلاف کے اسباب یہ ہیں :

۱ - ترکی زبان جب سے عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی املا میں اختلاف پیدا ہوگیا - کیونکہ O/U کی علتوں کو ظاہر کرنے کے لئے عربی رسم الخط میں لفظ کے شروع میں [او] کا استعمال ہونے لگا - اس لئے Ordu کو اوردو لکھا جانے لگا -

۲ - ایک وقت آیا جب شروع کے O/U کی آواز کو عربی رسم الخط میں "ا" پر "پیش" لگا کر ظاہر کرنے لگے اور اس طرح سے اُردو کا ظہور ہوا - حالانکہ "اوردو" زیادہ صحیح ہے - چنانچہ اویغور دور میں پہلے "اوردو" ہے پھر "اردو"- یہ دونوں شکلیں آخر زمانے تک رہیں - اب عام طور سے اردو ہی لکھا جاتا ہے -

۳ - اردی - عربی رسم الخط اختیار کرنے کے بعد ترکی الفاظ کے آخر I/i کی آواز کو ہمیشہ "ی" معروف سے ظاہر کرتے تھے، لیکن عثمانی زبان کے آخری دور میں اناطولیہ کی زبان میں خاص کر استانبولی لہجے میں "گول ہونے" اور "برابر ہونے" کا دور شروع ہوا تو الفاظ کے تلفظ میں تبدیلی پیدا ہوگئی، مگر املا کا دستور پرانا ہی رہا - مثلاً :

قدیمی ترکی لفظ	املا	استانبولی تلفظ
Oldi (ہوا)	اولدی	Oldu - اولدو
Buldi (پایا)	بولدی	Buldu - بولدو

وغیرہ یعنی شروع اور بیچ کی گول آواز O/U کے باعث الفاظ کی آخری آواز "i" کی "u" ہوگئی -

چنانچہ لفظ "اردو" اس کا شکار ہوگیا اور بعض لوگوں نے جہالت کی بنا پر "اردی" لکھنا شروع کردیا، حالانکہ یہ غلط ہے - کیونکہ لفظ اردو کا تلفظ کبھی بھی Ordi نہیں تھا، بلکہ قدیم تلفظ بھی Ordu ہی ہے - اس لئے مندرجہ بالا قانون کی گرفت سے یہ لفظ آزاد ہونا چاہئے، مگر محدود طبقے نے "اردی" لکھنا شروع کیا - صرف تعلیم یافتہ حضرات اردو لکھتے ہیں جو ہر لحاظ سے درست ہے -

اوردو - اوردہ : (۱) ترکوں نے عربی رسم الخط اختیار کرنے کے بعد یہ قاعدہ اختیار کیا کہ جن الفاظ کے آخر میں a/e کی آواز ہوگی انہیں "الف" سے دکھایا جائے گا - چانچہ اولغوری دور کے شروع میں صرف "ا" ہی نظر آتا ہے مثلاً

Orta - اورتا (یعنی درمیان)
Qara - قارا (بہ معنی کالا)

(۲) آخری دور میں "الف" کے ساتھ ساتھ a/e کی آواز کو ظاہر کرنے کے لئے "ہ" کا بھی استعمال ہونے لگا - مثلاً

Orta (اورتا - اورتہ)
Qara (قارا - قارہ)

(۳) ایک دور ایسا آیا جب بعض علاقوں میں صرف "ہ" اور بعض میں "الف" ہی رہ گیا - مثلاً عثمانی دور میں :

Orta (اورتہ)
Qara (قرہ)

ان تبدیلیوں سے واقفیت حاصل کرنے کے

بعد املا سے ہی نسخوں اور لہجوں کا پتہ چل سکتا ہے۔

ترکی زبان بڑی عجیب و غریب اصولوں کی پابند ہے۔ اگر کسی لفظ کے اندر دو صوتی آواز نکلے، تو بلا کسی دقت کے اسے چار طریقوں سے لکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً Chaqmaq (چقمق، ایک قسم کا پتھر) اور Bayram (بیرم به معنی تہوار)

۱۔ چاقماق	بایرام
۲۔ چاقمق	بایرم
۳۔ چقماق	بیرام
۴۔ چقمق	بیرم

یہ چاروں طریقے درست ہیں اور ساری ترکی دنیا میں رائج ہیں اور بعض شکلیں بعض علاقوں تک ہی محدود ہیں۔ مثلاً چقمق عثمانی شکل ہوگی اور بایرام ترکستانی۔ پاکستان اور ہندوستان میں عام طور سے بیرم ہے۔

یہ بات بھی نہایت دلچسپ ہے کہ ترک ہماری زبان کو اردو نہیں کہتے، کیونکہ اردو کے معنی ہمیشہ وہ فوج کے لیتے ہیں۔ ہماری زبان کو تین ناموں سے ترک یاد کرتے ہیں:

۱۔ Orducha استانبولی لہجہ میں اردوچہ)
۲۔ Ordutili اردوتیلی (استانبولی لہجے میں اردو دیلی)
۳۔ Ordulisani اردو لسانی (یعنی لسان اردو)

اس طرح ترک اپنی زبان کو ترکچہ (Turkche یا Turkdili) یا ترک لسانی کہتے ہیں۔ پرانے ترکی شعراء و ادبا اپنی زبان کو ترکی بھی کہتے تھے۔

✦

قدیم مہاپران اُردو میں

سہیل بخاری

لفظ ''مہاپران'' قدیم ایرانی زبان کا ایک مرکب ہے۔ اصطلاحاً اس سے وہ آواز مراد لی جاتی ہے جو گہری سانس سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ حروف جن کو سینے کے زور سے ادا کیا جاتا ہے، مہاپران کہلاتے ہیں۔ مثلاً کھ، گھ، بھ، پھ وغیرہ۔ ان کے مقابلے میں وہ حروف جو ہلکی آواز سے ہی ادا ہوجاتے ہیں ''الپ پران'' کہلاتے ہیں۔ مثلاً ک، گ، ب، پ وغیرہ۔ حروف تہجی کی اس تقسیم کا علم ہمیں سنسکرت کے گرامر نویسوں سے ہوتا ہے جنہوں نے مخارج کے اعتبار سے ان کے درجے قائم کرکے ہر درجے میں مہاپران اور الپ پران کے جوڑے بنا بنا کر رکھ دیے ہیں۔ اسی کے باعث مستشرقین نے بھی دیوناگری لپی کو بہت سراہا اور اسے دنیا کی لپیوں میں سب سے بلند مقام عطا کیا۔ انہیں لوگوں کی تحقیق سے یہ راز بھی دنیا پر منکشف ہوا کہ ویدک زبان کا سلسلہ قدیم ایرانی کے توسط سے قدیم ہند یورپی زبان تک پہنچتا ہے، لیکن جب ویدک کا قدیم ایرانی یا قدیم یونانی و لاطینی سے موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان دونوں زبانوں کے مقابلے میں ویدک میں مہاپرانوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ ذیل میں ان کا تقابلی نقشہ دیا جاتا ہے:

ویدک مہا پران	یونانی	قدیم ایرانی
کھ	x	خ
گھ		غ
چھ		
جھ		
ٹھ		
ڈھ		
تھ	θ	
دھ		
پھ	ϕ	ف
بھ		

اس نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی میں صرف تین ہی مہاپران تھے جنہیں مستشرقین کے قول کے مطابق نرم کرلیا گیا ہے۔ اگرچہ میں آج ان کے تلفظ سے انہیں مہاپران کی جگہ الپ پران ہی سمجھنے پر مجبور ہوں لیکن اس خیال سے انہیں مہاپران تسلیم کئے لیتا ہوں کہ شاید ان کے قدیم تلفظ میں سینے کے سہارے کی بھی ضرورت پڑتی ہو۔ اس کے باوجود میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ میں نے ایرانی خ، غ، ف کو ہمیشہ ویدک کھ،

کھ اور بھ کا بدل بھی نہیں پایا، بلکہ ان کی آوازیں ویدک کے دوسرے الپ پرانوں سے بھی ادا ہوتے دیکھی ہیں ۔ یونانی کے تین مہا پرانوں کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ رگ وید میں ہمیشہ کھ ، تھ ، پھ کا بدل نہیں ہوتے ۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ مستشرقین جو ویدک زبان کو مکمل طور پر قدیم ہند یورپی زبان سے مشتق گردانتے ہیں، اس قدیم ترین زبان کے مہا پرانوں کے باب میں یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ وہ سب کے سب ویدک میں کمال صحت کے ساتھ محفوظ ہیں اور اس کی دوسری شاخوں سے معدوم ہو چکے ہیں ۔ چنانچہ جوزف رائٹ اپنی کتاب " یونانی زبان کی تقابلی گرامر " میں کہتا ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان میں کھ، گھ، تھ، دھ، پھ، بھ کے مہا پران ہوتے تھے ، لیکن ان لوگوں کی یہ منطق میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ جو علاقے آریوں کے ابتدائی وطن سے قریب ہیں اور جن میں آریوں کا داخلہ ان کے ورود ہند سے ہزاروں سال قبل ہو چکا تھا ، وہ تو اپنی اپنی زبانوں سے قدیم مہا پرانوں کو کھو بیٹھے اور ہزاروں سال بعد کی ویدک زبان میں پہنچ کر وہ از سر نو آ موجود ہوئے ۔ اسی طرح اے اے میکڈانل کا اس کی کتاب " ویدک گرامر " میں یہ بیان کہ قدیم ہند یورپی زبان میں " ل " موجود تھا ، جو قدیم ایرانی سے غائب ہو کر ویدک زبان میں پھر سے ابھر آیا ، کسی منطقی استدلال سے ثابت نہیں ہوتا ۔ اسی لئے میں اس قسم کے قیاسات و مفروضات کو عالم لسانیات کی داستانیں گردانتے پر مجبور ہوں ۔

اس تمام الجھن کی وجہ یہ ہے کہ ہند یورپی لسانیات کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی ہے ۔ ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ آریہ اپنے مسکن قدیم کو چھوڑ کر جہاں جہاں بھی گئے ، ایک فاتح کی حیثیت سے پہنچے ، بڑی عجلت سے یہ نتیجہ بھی نکال لیا کہ انہوں نے مفتوح اقوام پر جہاں اپنی بالا دستی قائم کی ، وہاں اپنی تہذیب و کلچر کے ساتھ ساتھ ان پر اپنی زبان بھی تھوپ دی ۔ چنانچہ ایک طرف تو ان علمائے زبان نے یونانی ، لاطینی ، قدیم ایرانی اور ویدک وغیرہ زبانوں کی کچھ مشترک قدریں تلاش کر کے انہیں متحدالاصل ثابت کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف ان کے باہمی اختلافات کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ مرور ایام اور لسانی ارتقا کے باعث پیدا ہو گئے ہیں ۔ اس باب میں انہیں پراکرت کے گرامر نویسوں سے اور بھی مدد مل گئی جنہوں نے شمالی ہندوستان کی تمام پراکرتوں کو صرف ایک زبان سنسکرت سے مشتق ثابت کرنا چاہا ہے اور یوں ان لوگوں نے نہایت آسانی اور سہولت سے ویدک اور سنسکرت کے ساتھ پراکرتوں کو بھی ہند آریائی قرار دے دیا ۔ ادھر ہند و پاک کے جدید علمائے زبان نے بھی کچھ تو ان گرامر نویسوں کے سمجھانے سے اور کچھ مستشرقین کے کہنے سننے سے اس بات پر صاد کر دیا ۔ اس طرح ان تمام علما کے نزدیک ہند شمالی کی وہ اقوام جو آریوں کے داخلہ ہندوستان کے وقت متعدد مختلف زبانیں بولتی تھیں ، آریوں کے حملوں سے پسپا ہو کر بندھیاچل کے جنوب

میں بھاگ گئیں یا پھر همالیہ کے پہاڑی علاقوں میں جا چھپیں اور ان میں سے جو تھوڑے بہت آدمی بچ رہے، وہ آریوں کے غلام بن کر انہیں کی بولی بولنے لگے اور یوں وہ قدیم زبانیں جو هندوستان میں آریوں سے قبل بولی جارهی تھیں ایک دم هندوستان کے صفحے سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ اس قیاس یا مفروضے کے لحاظ سے صرف وهی زبانیں دراوڑی سمجھی جا سکتی هیں جو دکن میں بولی جارهی هیں اور اسی لئے اس عجیب و غریب نظریے (نہیں بلکہ مفروضے) میں هند شمالی کی زبانوں کو هند آریائی کے سوا کوئی اور لقب دینے کی گنجائش هی باقی نہیں رهتی۔

مجھے اس نظریے کے مدعیوں پر سخت حیرت ہے جنہوں نے فاتح و مفتوح کے تعلقات کو تاریخ کے شفاف آئینے میں نہیں دیکھا اور یہ نہیں سوچا کہ حاکم و محکوم اقوام میں تہذیب اور کلچر کا لین دین اک رخا نہیں دو رخا هوتا ہے۔ یعنی حاکم اگر محکوم کو اپنی کچھ چیز دیتا ہے تو اس کے عوض میں اس کی بھی کچھ چیزیں لے لیتا ہے۔ میں کیا کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ حاکم ایک شیشے کے خول میں بند محکوم کے جذب و تاثر سے بالکل الگ تھلگ رہ کر صرف اپنی هی شعائیں اس پر منعکس کرتا رهتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ هندوستان کے اس عریض و بسیط بر صغیر میں آریوں کی ایک چھوٹی سی جماعت نے اپنی تہذیب تو اس کے کثیر تعداد باشندوں کے سر منڈھ دی هو اور خود دراوڑی معاشرت کے اثرات سے بالکل بچ رهی هو۔ میرے نزدیک جو

لوگ اس قسم کے کچھ خیالات ظاهر کرتے هیں وہ دو تہذیبوں کے تصادم کو سمجھنے کی تاریخی بصیرت نہیں رکھتے۔ کم از کم هندوستان میں آنے والوں کے متعلق تو میرا یہ خیال ہے کہ وہ سب کے سب ایک دن 'هر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد' کے مصداق یہاں کی معاشرت میں یوں جذب هوگئے کہ آج دیسی اور بدیسی عناصر کا سراغ لگانا بھی بہت مشکل ہے۔ چنانچہ میں تو یہ دیکھتا هوں کہ فطرت پرست آریوں کے تمام دیوتاؤں میں جس شو اور وشنو کی اتنی دهوم ہے، وہ قدیم حیوان پرست دراوڑوں کے معبود سانپ اور سانڈ هیں، جو خود ان کے نام شیو (= فارسی شیبا = مارافعی) اور وشنو (= پراکرت بجرو = اردو بجار یعنی سانڈ) سے بھی ظاهر ہے اور گو هندوؤں کے دیوتاؤں میں شیو کا داخلہ نسبتاً بعد میں هوا ہے لیکن وشنو کی توصیف میں تو خود رگ وید کے شعرا بھی رطب اللسان هیں، جنہوں نے اس کے لئے بھجن کے بھجن تصنیف کر ڈالے هیں۔ آریائی عقائد میں دراوڑی عقائد کا یہ نفوذ و اثر ان دونوں تہذیبوں کے فکری و جذباتی اختلاط کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ هر جانے والا اپنی زبان اپنے ساتھ لے جاتا ہے یا آنے والا اپنی زبان ساتھ لاتا ہے لیکن یہ یکسر غلط ہے کہ وہ قدیم باشندوں کی زبان کو نیست و نابود بھی کر دیتا ہے۔ هندوستان آنے والوں میں فرنگیوں، مسلمانوں اور آریوں کے نام لئے جا سکتے هیں جو انگریزی، فارسی اور قدیم ایرانی بولتے هوئے آئے تھے، لیکن جس طرح انگریزی یہاں کے عوام کی زبان نہ بن سکی

اور فارسی ایک محدود و مخصوص جماعت سے باہر نہ نکل سکی۔ اسی طرح قدیم ایرانی بھی ہند شمالی کی پراکرتوں کو ملک بدر کرکے ان کی گدی نہیں چھین سکی۔ البتہ جس طرح انگریزی اور فارسی نے یہاں کی زبانوں پر کچھ اپنے اثرات ڈالے اور کچھ ان کے اثرات خود بھی قبول کئے، اسی طرح قدیم ایرانی نے بھی پراکرتوں کو کچھ متاثر کیا اور کچھ ان سے خود بھی متاثر ہوئی۔ چنانچہ میرے نزدیک جہاں یونانی، لاطینی، ایرانی اور ویدک کی مشترک قدریں ان کے متحدالاصل ہونے کی دلیل ہیں، وہاں ان کے اختلافات بھی مقامی اثرات کی نشان دہی کر رہے ہیں اور یوں یونانی و ایرانی کے مقابلے میں ویدک مہا پرانوں کے کثیر تعداد چراغ ہندوستانی لسانیات کی تاریک راہوں میں قدیم زبانوں یعنی پراکرتوں کی منزل کا سراغ دے رہے ہیں۔

دنیائے لسانیات میں بالعموم اور ہندوستانی لسانیات میں بالخصوص قدیم زبانوں کے متعلق اس غلط فہمی کا واحد سبب یہ ہے کہ علمائے زبان، زبان کی مکتوبی شکلوں پر توجہ مرکوز کرکے اس کی ملفوظی روایات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ پراکرت کے گرامر نویسوں سے آج کل کے ماہرین تک سب کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ سنسکرت کے مکتوبی الفاظ سے بھاشاؤں (موجودہ بول چال کی زبانوں) کی آوازوں کو جو پراکرتوں سے پیدا ہوئی ہیں، کسی نہ کسی طرح مشتق کر لیا جائے اور اس اشتقاق کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کلاسیکی سنسکرت کے عہد سے آج تک نت نئے اصول بنتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے باوجود ہر نئی کوشش گذشتہ کوشش کی طرح ناقص اور ناکام رہ جاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ طریق کار نہ صرف غلط بلکہ بالکل الٹا ہے۔ چنانچہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے سیدھی راہ یہ ہے کہ آواز کو حرف پر، تلفظ کو لپی پر اور ملفوظی روایت کو بے جان کتابت پر ترجیح دی جائے اور پھر یہ سراغ لگایا جائے کہ قدیم زمانے میں مختلف آوازوں کو قلمبند کرنے کا طریقہ کیا تھا۔ مثلاً جب گریرسن یہ کہتا ہے کہ مرہٹی میں چاکر کو تساکر اور ماجھا کو مادزھا لکھا جاتا ہے تو ہمیں یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ ان روپوں کا تلفظ وہاں کے عوام کی زبانوں پر چاکر اور ماجھا ہے یا تساکر اور مادزھا اور اگر ملفوظی و مکتوبی آوازوں میں اختلاف ملتا ہے تو تلفظ کو مقدم رکھ کر املا کو نظر انداز کردیا جائے کہ آواز حرف سے قدیم تر ہے۔ اسی طرح جب کالڈویل اپنی کتاب "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" میں یہ کہتا ہے کہ دکن کی زبانوں میں مہا پران نہیں ہوتے تو یہ تحقیق ضروری ہوجاتی ہے کہ وہ لپی سے تو مغالطے میں نہیں آگیا ہے، یعنی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان زبانوں میں مہا پران اور الپ پران کے لئے ایک ہی مکتوبی علامت مقرر ہو اور جب یہ بات ملفوظی آوازوں کی کسوٹی پر درست ثابت ہو تو مہاپران کو شمالی اور جنوبی ہندوستان کی زبانوں میں ما بہ الامتیاز قرار دے دیا جائے۔

بہر حال میرے نزدیک ویدک میں مہا پرانوں کی کثیر تعداد مقامی اثرات کے تحت پراکرتوں سے آئی ہے، بلکہ یہ تعداد

بھی پوری نہیں ہے ۔ یوں کہنے کو تو سبھی دیوناگری لپی کے گن گاتے ہیں کہ یہ دنیا کی بہترین لپی ہے اور آوازوں کے لحاظ سے اس کی ترتیب و نظام مکمل ہے ، لیکن مجھے تو یہ لپی پراکرتوں کی مکمل آوازیں ادا کرنے کی اہل نظر نہیں آتی ۔ میری مراد اس وقت صرف قدیم مہا پرانوں سے ہے جن کی تعداد ویدک زبان کی دیوناگری لپی میں صرف دس ہے، جب کہ پراکرتوں میں ان کی پوری تعداد سولہ تھی ۔ پراکرتوں میں جس طرح ہر مختصر حرف علت کے مقابلے میں ایک طویل حرف علت ہوتا تھا ، اسی طرح ہر الپ پران کے جواب میں ایک مہا پران بھی ملتا تھا اور یہی پراکرتوں کی قدیم لپیوں میں حروف کی بنیادی تقسیم تھی ۔ چنانچہ ویدک زبان کے ان دس مہاپرانوں پر جو سطور گذشتہ میں دئے جا چکے ہیں ، رھ ، ڑھ ، سھ ، لھ ، مھ ، نھ کا اضافہ کرنے سے پراکرت کے مہا پرانوں کی تعداد پوری ہو جاتی ہے ، جنہیں رگ وید میں دو دو حروف ملا کر تحریر کیا گیا ہے اور جن کا مزید ثبوت ہمیں اپنی موجودہ بھاشاؤں سے بھی ملتا ہے ۔ چنانچہ اردو زبان سے ان کی مثالوں میں رھ کے لئے گیارہ (۱۱) ، بارہ (۱۲) ، تیرہ (۱۳) ، پندرہ (۱۵) ، سترہ (۱۷) ، اٹھارہ (۱۸) ، لھ کے لئے چولھا ، دلھن ، دولھا ، آلھا ، ملھار (ملہار) ، مھ کے لئے تمھیں ، تمھارا ، کمھار ، نھ کے لئے انھیں ، جنھیں ، کنھیں وغیرہ الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ ڑھ کے لئے موجودہ دیوناگری لپی میں ڈھ پر نقطہ لگا لیا گیا ہے اور سھ کا مہا پران آج تلفظ سے بھی ساقط ہو چکا ہے ، جیسا کہ آئندہ سطور سے ظاہر ہو جائے گا ۔

شمالی بھارت اور پاکستان کی موجودہ بھاشاؤں کے دور تک آتے آتے ان مہاپرانوں میں جو تغیرات ہوئے ہیں ، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے کثیر تعداد الفاظ میں الپ پرانوں سے جگہ بدل لی ہے ۔ ذیل میں ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

بھیکھ = بھیک ، بھوکھ = بھوک ، بھکھ (کھانا) = بھک (بھکنا = کھانا) ، ڈھونڈھ = ڈھونڈ ، مونڈھ = مونڈ ، جھوٹھ = جھوٹ ، ھونٹھ = ھونٹ ، ٹھاٹھ = ٹھاٹ ، تمھ = تم ، سامھنے = سامنے ، مھیں = میں (اندر) ، گولھ = گول (غائب) ، ناِلھی = نالی ، بالھ = بال (رواں) ، کالھ = کل (گزرا ہوا دن) ، جالھ = جال (دام) ، اولھ = اول (ضمانت) ، مالھا = مالا (تسبیح) ، سھالھ = سالا (جورو کا بھائی) ، دھسھ = دس (۱۰) ، بیسھ = بیس (۲۰) ، تیسھ = تیس (۳۰) ، چالھیسھ = چالیس (۴۰) ، سھکڑا = سیکڑا ، انھاج = اناج (غلہ) ، چھنھالھ = چھنال (فاحشہ عورت) ، نھتھ = نتھ (ناک کی بالی) ، ابھ = اب (اس وقت) ، جبھ = جب ، تبھ = تب ، کبھ = کب ، سبھ = سب ، چھبھ = چھب (حسن) بھوبھل = بھوبل ، بھبھوت = بھبوت ، بھبھوکا = بھبوکا جیبھ = جیب (زبان) بھپھ = بھاپ ، بھپھ = بھاپ ، بھپھ = بھوپی ، سنگھ = سنگ (ساتھ) ، سنگھار = سنگار ، منگھ = مانگ (طلب) ، چھلنی = چلنی ، باڑھ = باڑ ، لاڑھ = لاڑ ،

گاڑھ = گاڑ ، پالتھی = پالتی ، تھلے = تلے ، کدھ = کد ، جدھ = جد ، تدھ تد ، دھے = دے وغیرہ۔

اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ آریوں کی قدیم آبائی زبان میں مہا پران نہ تھے ، اس لئے وہ ان حروف کو بولنے اور لکھنے میں الپ پرانوں سے اسی طرح ظاہر کرتے تھے جس طرح آج ایران اور سرحد والے کرتے ھیں یا جس طرح آج سے بہت قبل ھمارے اسلاف نے داخلۂ ہند کے وقت کیا تھا ، جن کا ھندوستان میں آکر دراوڑی زبانوں سے سابقہ پڑا تھا اور جو ابتدا میں اس کے ھر مہا پران کو الپ پران اور ھر مخی آواز کو دندانی آواز سے ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اردو کی قدیم تحریروں کے ان عام الفاظ میں بھی الپ پران نظر آجائیں گے ، جنہیں ھم آج پراکرت کے قدیم مہا پران سے لکھتے ھیں۔ مثلاً ہات (ھاتھ) ، سات (ساتھ) وغیرہ۔

مرورایام نے جو دوسری بڑی تبدیلی ان مہا پرانوں میں کی ھے اور جس کے ثبوت میں ھمیں آج شمالی ھندوستان کی ھر زبان سے بکثرت مثالیں مل سکتی ھیں ، یہ ھے کہ انہیں دو حروف یعنی الپ پران اور ھائے ھوز میں تقسیم کر دیا گیا ھے مثلاً لھسن = لہسن ، دھکنا = دہکنا (آگ کا تیز ھونا) ، لھکنا = لہکنا (ھلنا) ، (لھکلھکانا ۔ لکلکانا یعنی ھلانا) ، پنھانا = پہنانا ، نھانا = نہانا ، بھئن = بہن ، گھن = گہن ، گھنانا = گہنانا (تاریک ھونا) بھوت = بہت ، سھیلی = سہیلی ، سھارا = سہارا وغیرہ۔

رگ‌وید میں جتنے مہا پران استعمال ھوتے ھیں ، ان میں سے بہت تھوڑے سے دیوناگری لپی کے صحیح حروف سے ظاھر کئے گئے ھیں ورنہ کثیر تعداد ایسی ھے ، جنھیں یا تو صرف الپ پرانوں سے لکھا گیا ھے یا الپ پرانوں پر صفیریوں اور ھائے ھوز کے اضافے سے تحریر کیا گیا ھے۔ گو ویدک اور سنسکرت کا یہ اثر تمام موجودہ زبانوں پر پڑا ھے اور ان سب مین رگ وید کی یہ خصوصیات مشترکہ طور پر پائی جاتی ھیں ، لیکن اردو زبان میں یہ رجحانات ان سب سے زیادہ نمایاں ھیں جس کی وجہ یہ ھے کہ ایک طرف تو اس کی لپی مہا پرانوں سے خالی ھے اور دوسری طرف اس کے بولنے اور اپنانے والے وہ مسلمان تھے جو آریوں کے بعد ایک بار پھر ھندوستان پر حملہ آور ھوئے اور جن کا تلفظ قدیم زمانے کے آریوں کے تلفظ سے مکمل طور پر ھم آھنگ تھا۔

شیخ سعدیؔ ہندی

تحسین سروری

شعرائے اردو کے بعض تذکروں میں ایک شاعر شیخ سعدی کا نام نظر سے گذرتا ھے اور حسب ذیل اشعار اُن کے نام سے منسوب ھیں ۔

قشقه چو دیدم بر رخش ، گفتم که یه کا دیت ھے
گفتا ، که دُر ھو با ورے ، اس ملک کی یه ریت ھے
اے مرد ماں ، شہر شما ، کتنی بری یه ریت ھے
ھے ھے نمی پرسد کسے ، پر دیسیا ماریت ھے
ھمنا تمن کو دل دیا ، تم دل لیا اور دکھ دیا
هم یه کیا ، تم وه کیا ، ایسی بھلی یه پیت ھے
دو نین کی کھپر تھوں ، رو رو بخون دل کروں
پیش سگ کویت دھروں ، پیاسا نه جائے ، میت ھے
سعدی طرح انگیخته ، شیر و شکر آمیخته
در ریخته ، دُر ریخته ، هم شعر ھے هم گیت ھے

قائم چاند پوری اپنے تذکرۂ مخزن نکات میں تحریر کرتے ھیں :

'' اتفاق جمہور بر آن است که چوں حضرت شیخ سعدی شیرازی در ھنگام سیاحت به طرف گجرات تشریف آوردند ، به سبب مجاورت سومنات ، چنانکه در نسخهٔ بوستان مذکور است ، به زبان ایں دیار وقوف یافته ، یک دو غزل ریخته که بعد ازیں مرقوم خواھد شد مع دیگر ابیات بر سبیل تفنن ارشاد فرمودند '' ۔

لیکن ، یه خیال سراسر غلط ھے ۔ معلوم ایسا ھوتا ھے که حضرت شیخ سعدی شیرازی نے اپنی کتاب بوستاں میں جو حکایت درج کی ھے ، اُسی کی بنا پر لوگوں میں یه بات مشہور ھو گئی تھی که وہ ھندوستان ضرور آئے تھے اور سیاحت ھندوستان کی یادگار کے طور پر یا بقول قائم چاند پوری '' بر سبیل تفنن '' یه کھچڑی غزل کہی ھے ۔ اصل واقعه یه ھے که حضرت سعدی شیرازی کو شاھزادۂ محمد سلطان بن غیاث‌الدین بلبن نے دو مرتبه ملتان بلایا تھا ، لیکن پیرانه سالی کے باعث وہ نه آسکے اور معذرت کے خط بھیجے ۔ ساتھ ھی پہلی مرتبه اپنے منتخب کلام کی بیاض اور دوسری مرتبه گلستاں و بوستاں کے دو نسخے خود اپنے ھاتھ سے لکھ کر روانه کئے ۔

میر تقی میر نکات الشعراؑ میں اس خیال کی یوں تردید کرتے ھیں :

'' سعدی دکھنی ، انچه بعض ایں را شیخ سعدی گمان برده اند ، خطا است ۔ ''

میر فتح علی حسینی گردیزی بھی میر صاحب کے بیان کو پھیلا کر یوں لکھتے ھیں :

سعدی دکھنی، از شعرائے قرار دادہ دکن است و آنکہ بعض آں را بہ سبب اتحاد تخلص مغالطہ افتادہ — ریختہ ہائے سعدی دکھنی را بنام سعدی شیرازی مرقوم ساختہ اند۔"

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں:

"دکن میں ایک سعدی گذرے ہیں۔ ان کا فقط اتنا حال معلوم ہے کہ اپنے تئیں ہندوستان کا سعدی شیرازی سمجھتے تھے اور تعجب ہے کہ مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرے میں ان کے اشعار کو شیخ سعدی شیرازی ہی کے نام پر لکھا ہے۔"

یہ بات تو طے ہوگئی کہ جن شیخ سعدی کا ریختہ دستیاب ہوا ہے، وہ کسی طرح بھی سعدی شیرازی نہیں ہو سکتے، لیکن جب انہیں باشندۂ دکن بتایا جاتا ہے، تو خود اُن کی غزل کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے سے روکتی ہے۔ یہ غزل اس عہد کی یادگار ہے جب کہ اردو زبان ابھی ناہموار راستوں سے گذر رہی تھی۔ شیخ سعدی کی اس غزل کے ساتھ حضرت امیر خسرو دہلوی کی یہ غزل یاد آجاتی ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل، درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لے ہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دوچشم جادو، بصد فریبم بہ برد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے، پیارے پی کو ہماری بتیاں

چوں شمع سوزاں، چوں ذرہ حیراں زسہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجے پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

اب شیخ سعدی کی مندرجہ بالا غزل میں اور امیر خسرو کی اس غزل میں جو مماثلت ہے، اُسے بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بعض الفاظ کی مغائرت کے باوجود صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی زمانے اور ایک ہی جگہ کے رہنے والے دو شاعروں کی یہ دو غزلیں ہیں۔ لیکن چونکہ شیخ سعدی کو شمالی ہند کے تذکرہ نگاروں نے باشندۂ دکن قرار دیا ہے، اس لئے دکھنی شعراء کے تذکروں میں ہم ان کا سراغ پانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہاں اس نام کے شاعر کا کوئی وجود نہیں ملتا اور خود شیخ سعدی کی یہ غزل یہ ثبوت فراہم نہیں کر سکتی کہ اس کا کہنے والا کوئی دکھنی تھا۔

اب تک دکھنی زبان کی جتنی منظوم تصانیف دستیاب ہوئی ہیں، وہ خواہ کتنی قدیم کیوں نہ ہوں، ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس کا ایک مصرع فارسی اور ایک مصرع اردو یا دکھنی ہو۔ بر خلاف اس کے شمالی ہند کی ابتدائی شاعری کے نمونے طرز بیان اور اسلوب کے اعتبار سے حضرت امیر خسرو

کی غزل ہی کے رنگ میں ملیں گے۔ لہذا شیخ سعدی کو دکن کا شاعر تسلیم کرنا حقائق سے رو گردانی کرنے کے مترادف ہوگا۔ ان کی جو غزل پیش کی گئی ہے، خاص کر اس کا تیسرا شعر " همنا تمن کو دل دیا " قابل غور ہے۔ یہاں " همنا " میرے خیال میں " ہم نے " کی ابتدائی شکل ہے۔ یہی لفظ (همنا) دکنی میں بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے، لیکن " ہم کو یا ہمیں " کے معنوں میں — اسی طرح " تم دل لیا اور دکھ دیا " میں جو علامت فاعل (نے) محذوف ہے، یہ صرف شمالی ہند کا قدیم لہجہ ہے۔ دکنی میں یہ جملہ " تم دل لئے اور دکھ دئے " ہوتا ہے۔ شمالی ہند میں علامت فاعل کے حذف کا رواج شاہ حاتم کے زمانے تک بھی رہا ہے — چنانچہ شاہ حاتم کا یہ مشہور شعر ہے:

دل کو کوٹا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

چھان بین کرتے ہوئے جب ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں تو زمانۂ حال کے محقق اور دکنی تاریخ و ادب کے ماہر حکیم سید شمس اللہ قادری مرحوم کی ایک نئی تحقیق ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ اپنی کتاب " اردوئے قدیم " طبع اول ۱۹۲۵ء میں شیخ سعدی کے متعلق یوں انکشاف کرتے ہیں:

" حقیقت یہ ہے کہ سعدیؔ ریختہ گو نہ سعدیؔ شیرازی ہیں اور نہ انہیں دکن سے تعلق ہے، بلکہ یہ ہندوستان شمالی کے باشندے ہیں، ملا نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔"

اس کے بعد مولف اردوئے قدیم نے منتخب التواریخ سے ملا عبدالقادر بدایونی کی یہ عبارت بھی دی ہے:

" از مشائخ عظام است، خلافت از پدر بزرگوار خویش شیخ محمد مرحوم داشت، و شیخ محمد شرحے فارسی شاطبیہ نوشتہ، قریب ہفتاد جزو، و خلف صدقش شیخ سعدی صاحب و جد و حال قوی بود و ظاہر و باطن مصفا داشت و متشرع بودے و خوش وقت و آزاد زیستے، بہ یکے احباب در رقعہ ہنگام وداع نوشتہ بود:

دیدۂ سعدی و دل همراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

وفاتش اثنی والف بود (سنہ ۱۰۰۲ھ)"

میرے دلائل کی روشنی میں شمس اللہ قادری صاحب کا یہ بیان کافی اہمیت رکھتا ہے کہ "سعدیؔ ریختہ گو نہ سعدیؔ شیرازی ہیں اور نہ انہیں دکن سے تعلق ہے، بلکہ یہ ہندوستان شمالی کے باشندے ہیں"۔ لیکن ملائے بدایونی کا یہ ارشاد کہ اُن کی وفات سنہ ۱۰۰۲ھ میں ہوئی، کافی الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ آخر یہی کہنا پڑتا ہے کہ بدایونی نے جو حالات بیان کئے ہیں، وہ اُس سعدیؔ ریختہ گو کے متعلق نہیں ہیں جس کے فارسی آمیز اردو اشعار شعرائے اردو

کے تذکروں میں نقل ہوتے آئے ہیں۔

اس طرح ''در ریختہ، در ریختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے'' کہنے والے سعدی کے عہد کا تعین کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔

اگر شیخ سعدی کو نویں صدی ہجری یعنی عہد اکبری کا شاعر سمجھ لیا جائے تو خود ان کی غزل اس خیال کی تردید کردیتی ہے، اس لئے کہ اکبر کے عہد تک اردو زبان امیر خسرو اور شیخ سعدی کی پیش کی ہوئی ہیئت بدل چکی تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ سرکاری اور علمی و ادبی زبان کی حیثیت ابھی اختیار نہ کرسکی تھی، لیکن ترقی کا وسیع میدان اس کے سامنے تھا، اور تقاضائے وقت کی آبیاری سے وہ پھل پھول رہی تھی۔ اس میں شک نہیں اس کی رفتار تیز نہ تھی، تاہم ترقی کی طرف وہ گامزن ہوچکی تھی۔

ہندوستان کے مشہور فارسی اساتذہ میں پنڈت چندربھان برہمن کا نام بطور خاص لیا جاتا ہے۔ وہ شاہ جہاں کے دربار میں میر منشی کی خدمت پر فائز تھے۔ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۰۷۳ھ میں ہوا ہے۔ برہمن کی ایک اردو غزل پنڈت دتاتریہ کیفی آنجہانی نے اپنی تالیف ''کیفیہ'' میں نقل کی ہے:

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں، کروں کیسے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

حضرت امیر خسرو کی وفات سنہ ۷۲۵ھ میں ہوئی۔ ان کے عہد میں اردو کی کیا نوعیت تھی خود ان کے ہندی کلام سے ظاہر ہے۔ اکبر کے عہد تک اس زبان نے تین سو منزلیں طے کرلی تھیں جس کے بعد اردو ہمیں برہمن کی غزل کے روپ میں ملتی ہے۔ اب ظاہر ہے اس زمانے میں اردو جہاں بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی وہاں اس میں نمایاں تغیرات رو نما ہوتے گئے ہوں گے۔ اگر عبدالقادر بدایونی کے صاحب ترجمہ کو ہی ریختہ گو شیخ سعدی سمجھ لیا جائے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ شاہجہاں آباد میں جو زبان تین صدی کے بعد لسانی قدروں کی حامل ہورہی تھی، وہی زبان کاکوری میں شیخ سعدی کو امیر خسرو کے عہد کا اعادہ کرنے پر مجبور کر رہی ہو۔ لہذا شیخ سعدی ریختہ گو کو ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کی زد میں لاکر اس کو عہد اکبری کا شاعر سمجھنا اردو زبان کی قدامت کو معرض بحث میں ڈالنا ہے۔ قطعی طور پر ہمیں یہ سمجھلینا چاہئے کہ شیخ سعدی کا تعلق شمالی ہند سے تھا اور وہ حضرت امیر خسرو دہلوی کے معاصر تھے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ انکشاف اور ہوتا ہے، جسے یہاں قلم بند کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج سے بارہ سال قبل ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب (صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی) کی وساطت سے مولانا سید مطیع اللہ صاحب راشد برہانپوری سے مجھے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ راشد صاحب بڑے علم دوست اور درویش قسم کے بزرگ تھے۔ ان کی معلومات بڑی وسیع اور مطالعہ گہرا تھا۔

اُن کے پاس قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ بھی کافی تھا جن میں کتب تصوف و سلوک اور بزرگان دین کے تذکروں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہیں میں ''روائح الانفاس'' نام کی ایک قلمی کتاب بھی تھی۔ یہ کتاب اگرچہ صرف حضرت شیخ برہان الدین راز الہی کے کے ملفوظات میں تھی لیکن اس میں متعدد اولیائے کرام اور بزرگان مسلک طریقت کے حالات و واقعات زیر بحث آئے ہیں۔ انہیں میں مندرجۂ ذیل واقعہ بھی درج تھا، جسے میں نے راشد برہانپوری صاحب کی اجازت سے ۲ فروری سنہ ۱۹۵۲ء کو نقل کرلیاتھا۔

''روزے شیخ برہان الدین قدس سرہ که در اورنگ آباد مدفون است، در خدمت پیر خود شیخ نظام الدین اولیاؔ قدس سرہ رسید۔ شیخ سعدی مرید شیخ برہان الدین مذکور که در سیر پور مدفون است، همراه بود۔ شیخ برہان الدین متوجه شیخ خود گشت و شیخ سعدی با آنکه پیر پیر روبرو بود، توجهٔ پیر خود نمود۔ ایں ادا دل نشین شیخ نظام الدین اولیاؔ گردید، از شیخ برہان الدین پرسید که ایں جوان سعادت مند از مریدان کیست ؟ گفت، از خاکساران همیں بارگاہ است۔

شیخ نظام الدین ردا از کتف بر آورد و شیخ سعدی را اشارہ کرد که بگیر، شیخ سعدی گفت که اگر از پیر ما برسد میتواں گرفت۔ شیخ نظام الدین ردائے مذکور شیخ برہان الدین داد تا بواسطهٔ او شیخ سعدی آداب خدمت بجا آورد و بسرو چشم قبول نمود''۔

میں نے مولانا راشد برہانپوری سے کچھ تفصیلات پوچھیں تو انہوں نے بتایا که برہانپور میں سیر پور نام کا ایک مقام اب تک موجود ہے جہاں شیخ سعدی کے نام کا ایک مزار اور خانقاہ ہے۔ ہر سال باقاعدہ عرس ہوتا ہے۔

سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؔ رح بدایوں میں پیدا ہوئے اور جوانی تک وہیں رہے، اس کے بعد دہلی تشریف لے گئے، وہاں سے حضرت بابا فرید الدینؒ گنج شکر رح کی زیارت کو صرف ایک مرتبہ پاک پٹن گئے اور خرقۂ خواجگان چشت اور سند خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد دہلی واپس ہوئے اور آخر دم تک کہیں اور نہیں گئے۔ اس تفصیل کا مطلب یہ ہے که حضرت برہان الدین غریب رح کے همراہ اُن کے مرید شیخ سعدی کا حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہونے کا جو واقعہ روائح الانفاس میں مندرج ہے وہ دہلی ہی کا ہے اور یہ شیخ سعدی مُلّا نظام الدین احمد کی اطلاع کے بموجب شمالی ہند کے باشندے تھے۔

یہ تو صاف ظاہر ہوگیا که حضرت امیر خسرو کے ایک ہم عصر بزرگ شیخ سعدی نام کے ضرور گزرے ہیں جو نه صرف امیر خسرو کے ہم عصر ہی تھے بلکہ خود اُن کے پیر بھائی برہان الدین غریب رح کے مرید بھی تھے۔ ایسی صورت میں جن شیخ سعدی کا ریختہ تذکروں میں نقل ہوتا آرہا ہے وہ

شیخ برہان الدین غریب رحہ کے انہیں "جوان سعادت مند" مرید کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ آگے چل کر اُس کا ایک "صاحب وجد و حال شیخ طریقت" بننا کوئی ناممکن بات نہیں، لیکن خود اپنے پدر بزرگوار کی خلافت پر فائز ہونا اور سنہ ۱۰۰۲ھ میں وفات پانا یہ سب ملا عبدالقادر بدایونی کی سنی سنائی باتیں ہوں‌گی۔

سلطان محمد تغلق نے جب دلی کو اجاڑ کر دولت آباد میں لا بسایا، اس وقت حضرت شیخ برہان الدین غریب رحہ نے بھی ترک وطن کرکے دکن کی راہ لی، ان کے ساتھ اُن کے خلفاء اور مریدوں کی بڑی تعداد تھی۔ کیا عجب کہ اس قافلہ کے ایک رہ نورد شیخ سعدی بھی رہے ہوں، اور اپنے مرشد کی اجازت سے یا اُن کے حکم پر برہان پور میں سیر پور نامی جگہ پر رہ پڑے ہوں اور وہیں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ شیخ سعدی کے ساتھ ہی چونکہ خیال سعدی شیرازی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اس لئے سعدیؔ ریختہ کو ان سے بتمیز کرنے کے لئے اُن کے توطن کی مناسبت سے سعدی دکنی کا نام دے دیا گیا ہوگا۔ اور اس کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے روایتی بیانات کی بنیاد پر اُنہیں سعدی دکنی لکھ دیا۔ اس طرح مختلف قسم کے تسامحات پیدا ہوگئے۔

اُردو زبان کی قدامت اور اس کی ابتدائی لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالتے وقت حضرت امیر خسرو کا ہندی کلام پیش نظر رکھا جاتا ہے، لیکن بعض علمائے ادب اس کو مشکل سے خسرو کا کلام مانتے ہیں۔ میرے خیال میں مزید تحقیقات ہونے تک اس کلام کو کم از کم امیر خسرو کے عہد کا کلام سمجھا جائے، اور شیخ سعدی کی غزل کو آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کی اردو کا نمونہ سمجھا جائے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اولیائے کرام اور بزرگان دین کے تذکروں، اُن کے ملفوظات، اور اُن کی صوفیانہ تصانیف کے قلمی و مطبوعہ نسخوں میں تلاش جاری رکھیں تو شیخ سعدی ریختہ گو کے تفصیلی حالات اور اُن کے مزید کلام کے دستیاب ہونے کی توقع ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایسے کچھ اور بزرگوں کی بھی ایسی عبارتیں اور منظومات برآمد ہوسکتی ہیں جن کی مدد سے ہم اُردو کی قدامت اور اس کے تاریخی اور تہذیبی عوامل کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اس قلمی کتاب روائح الانفاس میں حضرت شاہ لشکر محمد عارف رحہ سے منسوب ایک اُردو جملہ میں نے نقل کرلیا تھا، ملاحظہ ہو:

"اے بھائی اپن غریب ہمو کو توکّل کہاں۔"

یہ جملہ کس موقع پر استعمال ہوا تھا، اور حضرت محمد عارف نے یہ جملہ کس کو مخاطب کرکے فرمایا تھا، افسوس کہ میں نے نقل نہیں کیا۔ بہر حال اس توقع پر اس جملے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شاعری ــــــ سماجی ترکہ!

عبدالرؤف عروج

اورنگ زیب کی تمام عمر ہنگاموں کے فرو کرنے میں گزری۔ اس نے آنکھ بند کی تو بغاوتوں اور شورشوں کا طوفان اپنے ساتھ ہر چیز کو بہالے گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد کے ڈیڑھ سو سال ہمیں ایک مجرم کے عزائم کی طرح بھیانک اور گناہ گار کے دل کی مانند سیاہ نظر آتے ہیں۔

یک وقت سب کچھ نہیں ہوگیا۔ حالات رفتہ رفتہ بگڑتے رہے۔ دولت مغلیہ اپنی تقدیر کا لکھا پورا کر رہی تھی۔ دلی کے اعمال نامہ میں بار بار لٹنا اور بسنا لکھا جا چکا تھا۔ حکومت ناعاقبت اندیش امیروں کی جاہ طلب ٹھوکروں کی گیند بن چکی تھی نااہل جانشینوں کی کمزوری اور کم عقلی نے مرکز کی شیرازہ بندی کی بجائے اسے اور بھی ضعیف کر دیا تھا۔ اورنگ زیب کے بیٹوں میں تخت کے لئے کشمکش شروع ہوئی تو شاہ جہاں کا چھوڑا ہوا سترہ کروڑ کا شاہی خزانہ بھی فوجوں پر صرف ہوگیا۔ اقتصادی بدحالی، صنعتوں اور پیشوں کے سر پہ تلوار بن کر لٹکنے لگی۔ سکھ، مرہٹہ، جاٹ اور افغان سب ایک متحدہ تخریبی محاذ پر جمع ہو گئے۔ جن لوگوں کے عزیز و اقارب کو میدان جنگ نے نگل لیا تھا وہ آمادۂ فساد ہوئے اور پھر معاشی بے چینی نے سیاسی عدم استحکام کی فضا پیدا کر دی۔ عوام اور خواص ان اثرات سے محفوظ رہیں، ناممکن تھا۔ جنگی خطروں نے یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ اناج منڈیوں سے غائب ہوگیا، اور اشیائے خور و نوش نایاب ہوگئیں۔ معظم، اعظم اور کام بخش کی جاہ طلبی و بے تدبیری اور امیروں کی حرص و آز نے ملک کو ہنگامہ زار بنا دیا۔ ان کے معرکے دیکھنے کے لئے مشہور مزاح نگار جعفر زٹلی موجود تھا۔ اس کا کلام عریانی اور فحاشی کے قریب کی چیز سہی، اس کے باوجود اس وقت کی زبوں حالی کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ بدنظمی، انتشار اور فسادات اس وقت کی معاشرتی زندگی اور تمدنی آداب پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ ان کی منحوس پرچھائیاں پھیل کر اور بھی زیادہ خوفناک ہوگئی تھیں۔ یہ بات اپنی حدوں میں غیر اہم نہیں۔ اسی سے رموزِ مملکت صاف طور پہ نکل آئیں گے۔

جعفر زٹلی نے پہلے تو کام بخش کے دربار میں مسخرگی کی خدمت انجام دی، پھر ناراض ہو کر اس کی ہجو لکھنے سے بھی نہیں چوکا۔ جب معظم نے اعظم کے خلاف حیدر آباد پر چڑھائی کی اور اس کو تباہ کر دیا تو اس نے طنز و تعریض میں ڈوبی ہوئی ایک طویل نظم اس کے منہ پر کھینچ ماری۔

معظم کا دور ایک طرح سے دولتِ مغلیہ کی رسوائی تھا۔ اس کے سریر آرا ہوتے ہی ملک کے تمام صوبوں سے بہ یک وقت بغاوتوں اور شورشوں کے طوفان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے طوفان جن کی روک تھام کسی طاقت ور حکمراں سے بھی ممکن نہیں تھی۔ شاہ جہاں کے جانشین کا وارث اس کی دولت کو اپنے مفاد کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ سلطنت کو افلاس کی تیرگی نگل رہی تھی۔ خیر و برکت کے اجالے دور ہوتے جا رہے تھے۔ جعفر زٹلی کا شہر آشوب ایسے ہی ویران دنوں اور اداس راتوں کی یادگار ہے:

گیا اخلاص عالم سے عجب کچھ دور آیا ہے ۔۔۔ ڈرے سب خلق ظالم سے عجب کچھ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائی میں وفاداری ۔۔۔ محبت اٹھ گئی ساری عجب کچھ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی — اتاری شرم کی لوئی عجب کچھ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی، جہ بیگانہ چہ زن گھر کی — بھلا دی بات سب ہر کی عجب کچھ دور آیا ہے

معظم کے چار بیٹوں میں اپنے حق کے فیصلے کے لئے تلوار نیام سے نکلی تو دوم ڈاڈیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اہل حرفہ کی تباہی نے طوائفوں کو مناصب جلیلہ بخش دیئے۔ شاہی خزانے میں پھوٹی کوڑی تک بھی نہیں تھی۔ پھر بھی جہاندار شاہ اور لال کنور کا دماغی خلل، عظیم الشان اور رفیع الشان کے لشکروں سے لوٹی ہوئی دولت پر اپنا ننگا ناچ ناچ رہا تھا۔ جہاندار شاہ نے اپنے تینوں بھائیوں کو قتل کر کے دولت مغلیہ کی جس جنت ارضی کو حاصل کیا تھا، دس مہینے کے اندر اندر وہی اس کی رسوائی کا باعث ہوئی اور اسے آدم کی طرح بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا۔ اگرچہ انحطاطی شدائد نے عمریں مختصر کر دی تھیں، اس کے باوجود ہوسناکیوں کا جو کچھ مظاہرہ ہوا، وہ آل بابر کی تذلیل و تضحیک کے لئے کافی تھا۔

فرخ سیر نے حسین علی خاں اور عبداللہ خاں کو اپنی سپر بنا کر رسم جلوس ادا کی، تو امراء کے نفاق و شقاق کا زنجیرہ کھل گیا۔ ملک و قوم کے جوڑ جوڑ ٹوٹ گئے۔ غرور، رشوت اور خودکامی، عوام و خاص کی بدگمانی کا باعث بنی۔ تہذیبی اور ثقافتی بنیادیں لرز گئیں۔ مناقشوں نے سخت اختلال پیدا کر دیا۔ عزل و نصب کے جھگڑے نے تخت مغلیہ کے تمام دعویداروں کو اندھا کر دیا۔ خود فرخ سیر کا دس سالہ بھائی ہمایوں بھی اس چنگیزی سزا سے نہیں بچ سکا۔ جن لوگوں پر مصائب ٹوٹے، جن لوگوں کی تباہی سے حکومت کا ڈھانچہ تیار ہوا، ان میں صوفیوں، شاعروں، ہنرمندوں اور عالموں کی درد ناکیوں کو ہر نسل دوسری آنے والی نسل کے حوالہ کرتی گئی۔

صوفیوں کو پکارا گیا تو شاہ قدرت اللہ (الہ آبادی) نے پھانسی کو اپنے گلے لگا لیا۔ اہل کمال کی باری آئی تو سعداللہ خاں، ہدایت کیش خاں اور قاسم شیدی نے تلواروں کے نیچے اپنی گردنیں رکھ دیں۔ شاعروں کی سمت نگاہیں اٹھیں تو جعفر زٹلی نے جلاد کی تلوار پر لبیک کہی۔ ان خونی تماشوں کا انجام جتنا بھی بھیانک اور عبرت انگیز ہو کم تھا۔ جن محسنوں نے فرخ سیر کو دلی کی سلطنت سونپی تھی، وہی بدگمان ہوئے۔ ان کی بدگمانی پیک قضا تھی۔ ترپولیہ کے قیدخانے نے دزد اجل کا کام دیا۔ سات مہینوں کے اندر اندر یکے بعد دیگرے دو بادشاہ اٹھے، رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ، ابھی ان کا دور ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ محمد شاہ کا زمانہ آگیا۔

محمد شاہ نے شہزادگی کے سات سال قید میں گزارے، پھر کہیں سترہ سال کی عمر میں تخت کی صورت دیکھی۔ پست اور ادنیٰ لوگوں کی موجودگی نے تخت کو تختہ بنا دیا۔ محمد شاہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ ذہانت خداداد تھی۔ اس نے برسر اقتدار آتے ہی، حسین علی خاں اور عبداللہ خاں کو اپنے رستے سے ہٹا دیا۔ یہ اس کے رستے کا کانٹا تھے۔ ابھی ان کی خلش محو بھی نہ ہوئی تھی کہ ہولی کے دنوں میں ایک معمولی واقعہ نے ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ شاہی خزانہ کا جوہری شبھ کرن، حافظ خدمت گار خاں داروغہ کے مکان سے واپس آرہا تھا۔ سعداللہ خاں کے چوک میں لوگ ہولی منا رہے تھے۔ کسی کے الاؤ سے ایک چنگاری اڑ کر اس کے لبادے پر جا پڑی، وہ بات چیت سے گزر کر، گالی گلوچ اور پھر فساد پہ آمادہ ہو گیا۔ یہی بات اس کے ساتھی اور ملازم جوتے والوں کے محلے میں پہنچے اور ایک بوڑھے حاجی کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ صبح ہوتے ہوتے سارے جوتے والے لاش کے گرد جمع ہو گئے اور پھر شہریوں کی بہت بڑی تعداد مذہبی نعرے لگاتی ہوئی، شبھ کرن کے مکان پر پہنچ گئی۔ شبھ کرن، موقع کی نزاکت کو بھانپ کر شیر افگن خانساماں کے مکان میں جا چھپا۔ لوگوں نے شیر افگن خانساماں سے مطالبہ کیا کہ وہ شبھ کرن کو ان کے حوالے کر دے۔ اس کے انکار پر لوگ محمد شاہ کے محل کی طرف چل پڑے۔ محمد شاہ نے

قمرالدین خاں کو شمبو کرن کی گرفتاری کا حکم دیا۔ شیر افگن خانساماں کی موجودگی میں شمبو کرن کی گرفتاری محال تھی۔ پورا دن اسی کشاکشی میں گزر گیا۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ جوتے والوں نے جلوس نکال کر سارے شہر میں گشت کی۔ اس کے بعد شاہی مسجد میں داخل ہوگئے۔ خطیب پر گالیوں اور جوتوں کی بوچھاڑ کی، یہاں تک کہ نماز اور خطبے میں خلل آگیا۔ محمد شاہ کے حکم سے قمرالدین خاں امن بحال کرنے شاہی مسجد پہنچا اور انصاف کے نام پر لوگوں کو خاموش کرنے کی کوشش کی۔ اسی اثنا میں روشن الدولہ اور شیر افگن خانساماں مسجد میں داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی لوگ بے قابو ہوگئے۔ اور پھر وہی گالیوں اور جوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بعض خدمت گاروں نے تلواریں سنبھالیں تو مسلح سپاہی عوام کے ساتھ ہوگئے۔ بڑی دیر تک کشت و خون ہوتا رہا۔ روشن الدولہ اور شیر افگن خانساماں زخمی حالت میں اپنے خدمت گاروں کے ساتھ نکل بھاگے۔ قمرالدین خاں لوگوں کو خاموش کرنے میں بہ مشکل کامیاب ہوا۔ لوگوں کی خواہش پر شمبو کرن کی حویلی ڈھادی گئی اور پھر وہیں حاجی حافظ کی لاش کو دفن کیا گیا۔

جوتا فروشوں کا یہ ہنگامہ ایک معمولی واقعے سے شروع ہوا۔ اس کی نوعیت اتنی اہم تھی نہ تشویش ناک، پھر بھی یہ ایک جوہری اور جوتا فروشوں کا معرکہ نہیں تھا، بلکہ اس کے پس منظر میں عوام کے وہی جذبات کام کررہے تھے، جنھیں شخصی نظام نے جنم دیا تھا۔ تاریخ کھلی کتاب ہے۔ مرکز میں جب بھی کمزوری پیدا ہوئی، جب بھی مخلص اور مدبر انسان کم ہوگئے، حریص اور طامع طبقے نے ذاتی اغراض پر ہر مفاد کو بھینٹ چڑھا دیا۔ چنانچہ بے نوا نے اپنے ایک مخمس میں ان ہی خیالات کی تفصیل بہم پہنچاتے ہوئے شخصی نظام سے شدید نفرت کا اظہار کیا ہے:

یہ کیا ستم ہے اے فلکِ ہرزہ نابکار — ہر تیغ بھر کے تیز کیا خنجروں کی دھار
جوتا فروش، مرد مسلمان دین دار — مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سنگِ جفا سے چور کیا لعلِ آب دار

کتنوں کو مار جیسے قضا نے گرادیا — کتنوں کا جی بچا کے بہت ہڑبڑا دیا
کاغذ پہ بے نوا نے یہ سن کر چڑھا دیا — لکھا ہے مار جوتیوں طرہ گرادیا
تاحشر ہر زبان پہ رہے گا یہ یادگار

شیخ نجم الدین آبرو، آرزو کے شاگرد تھے اور رشتہ دار بھی۔ ان کی شاعری پر ایہام کا اعتراض ہے۔ اس وقت دلّی میں ایسے ہی شاعر زیادہ تعداد میں چھائے ہوئے تھے جنھیں ایہام سے دلچسپی تھی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایہام گو اپنے وقت کے حالات سے بے خبر تھے۔ وہ بھی سیاسی انتشار اور سماجی بحران سے دوچار رہتے۔ یہ اثرات، احساس کی حدوں سے گزر گئے تو شکست و ریخت نے غزل کی دیواروں کو توڑ دیا۔ روحانی سرچشموں کی کوکھ سے ادبیت کی لہریں اٹھیں۔ شاعری کے چہرے سے حسن و عشق اور ہجر و وصال کا غبار دھل گیا۔ چنانچہ آبرو کو غزل ہی کی زبان میں کہنا پڑا:

جب زمانہ اس طرح بگڑا — کیا بنے روزگار کی صورت

اور پھر لبِ تباہی اور ... [illegible]

جو غم گزرا ہے مجھ پہ زندگی ... [illegible] ... ہوں یارا دل

امیراور مصاحب، عوام کے حالات سے بے خبر تھے۔ انھوں نے اپنا سارا تدبر عیاشی اور اسی قسم کے دوسرے بکھیڑوں میں صرف کر دیا تھا۔ جماعتی خواہشوں پہ انفرادی ضرورتوں کی تہیں جم گئی تھیں۔ مفاد پرستی اور عیش کوشی نے قیامت کی نفسا نفسی کا عالم طاری کر دیا تھا۔ اس ماحول کی کیفیت اس شعر میں دیکھئے ؎

دلی میں درد دل کا کوئی پوچھتا نہیں　　مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

یہ شعر دلی کے زوال آمادہ دور کا اذیت ناک مرقع ہے۔ اس مرقع میں حالات کی جو عبرت ناک رنگ کاری ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیب و ثقافت حد درجہ بھیانک دور سے گزر رہی ہے۔ عوام و خواص دونوں ہی متاثر تھے۔ دلی کا حقوق یافتہ طبقہ چلتی پھرتی پرچھائیوں سے زیادہ نہیں تھا۔ جاگیروں اور ریاستوں کی آمدنی اسے متحرک کئے ہوئے تھی۔ جب دلی کی مرکزی قوت ختم ہوگئی، افلاس و نکبت نے سر اٹھایا تو نوابوں کے بیوپاری دیوالیہ ہوگئے۔ جاگیروں کا سونا پھیکا پڑ گیا۔ گھر کے اثاثے نے بازار کی صورت دیکھی، کوٹھیوں اور حویلیوں کے مرقع اور دیدہ زیب سامان منظر عام پر آ گئے۔ آبرو نے یہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا:

اب کے امیرزادے بیٹھیں سگھڑ میں دھر سیس　　اکثر کو روتے ہیں گے کھٹ راگ تیج سر سیں

اور ان کو امیرزادوں کے متعلق رائے قائم کرنی پڑی:

زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی　　امیر اس جگ کے ہیں سب شیر قالی

آگرہ میں جاٹ سر اٹھا رہے تھے۔ آگرہ دلی سے دور نہیں تھا۔ آسانی سے ان کی سرکوبی ہو سکتی تھی۔ لیکن لائق وزیروں کی کمی اور آزمودہ کار سپاہیوں کا قحط ہر دفاعی منصوبے کا منہ چڑا رہا تھا۔ عہد عالمگیر کا پرانا، تجربہ کار اور جہاندیدہ بوڑھا نظام الملک دکن جا چکا تھا۔ مصاحبوں اور ندیموں کے علاوہ دلی سے قریب تھے۔ اس کے باوجود ٹھری اور دادرا کی تانوں نے ان سب کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا تھا۔ امیر الامرا کو حفاظت کی سوجھی تو منہ کی کھا کر آگرے سے لوٹ آیا۔ امیر خاں انجام نے اسی واقعہ کی تاریخ کہی:

نواب آئے ہمارے بھاگ آئے　　(۱۱۴۷ھ)

امیر خاں انجام کا خطاب عمدۃ الملک تھا۔ اس کی شان و شوکت محمد شاہی امرا میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ کئی شاعر اس کی سرکار سے وابستہ تھے۔ شاکر ناجی نے یہ شہرت سنی تو وہ بھی دکن سے دلی پہنچ کر اس کی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ وہ دکن اور برہان پور کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اب دلی مرقع عبرت بن کر اس کے سامنے تھی۔ سپاہ کو وقت پہ تنخواہیں ملتی تھیں نہ ان کے پاس سامان جنگ تھا۔ امیر خاں انجام کو محمد شاہ کی در پردہ شہ پہ قتل کر دیا گیا اور اس کی املاک کی ضبطی عمل میں آئی، تو ساٹھ لاکھ روپے نقد برآمد ہوئے۔ اس کے باوجود اس وقت تک سپاہیوں اور ملازموں کی دو ماہ کی تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ چار ماہ کے بعد ان کی تنخواہیں ادا ہوئیں، پھر کہیں جا کر اس کی لاش نے قبر کی صورت دیکھی اور اسے دفن ہونا نصیب ہوا۔

شاکر ناجی دربار کے رنگ، ارذل لوگوں کی گرم بازاری، امرا کی آرام پسندی اور روسا کی عیش طلبی کا سخت شاکی تھا۔ اس نے اپنی ایک نظم میں ایسی ہی حالت کی تصویر کشی کی ہے اور امیر خاں انجام کی شخصیت کا خاکہ اڑایا ہے:

رہے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے　　دعا کے زور سے دوائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے　　نگار و نقش سے ظاہر کر گویا چلتے تھے
گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلا کی تال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو تھا نا تھا　　　　کہ میں نشان کے ہاتھی اُپر نشانہ تھا

نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا　　　　ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دوکان نہ غلہ و بقال

عبدالحی تاباںؔ مختلف امیروں اور شاہی مصاحبوں سے قرابت رکھتے تھے۔ ان سے زیادہ ان کا آشنا کون ہو سکتا تھا نواب امیر خاں انجامؔ کی تعریف میں لکھا ہوا ان کا قصیدہ اس دعوے کی دلیل ہے۔ تاباںؔ نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ نادر کا ہنگامۂ اٹھ کھڑا ہوا۔ نادر کے مظالم انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مظفر خاں اور ان کی مستورات کا ننگا جلوس بھی نظر سے گزرا۔ ہندوستان باہر والوں سے زک اٹھاتا رہا۔ کبھی ہمت نہ ہوئی کہ آنے والوں کا منہ پھیر دے۔ آنے والے تباہی کے وقت آئے اور اپنی من مانی کر کے چلے گئے۔ شجاعت اور بسالت کی گراوٹ میں بھی شدت آگئی، اس وقت تک ان کی شاعری میں سادگی و شیفتگی کے ساتھ حسن و عشق کی باتیں تھیں۔ ہجر و وصال کے قصے تھے۔ ان کو ہندوستانی عوام کی ہزیمت خوردگی اور رسوائی کا احساس ہوا تو وہ محمد شاہ کی شکست سمجھ کر پکار اٹھے:

داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباںؔ　　　　تمہیں مقدور کہ جا چھین لوں تخت طاؤس

نادر چلا گیا۔ پیچھے تباہی اور بربادی ماتم کرتی رہ گئی۔ رہی سہی وجاہت نے دم توڑ دیا۔ امیر و وزیر آپس میں الجھ گئے، رقابت اور عناد نے ترقی کی۔ ہر امیر اس فکر میں تھا کہ حکومت کی اجڑی ہوئی بساط اس کے قبضہ میں آجائے۔ کوئی یہ نہیں چاہتا تھا کہ بادشاہ بنے لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا امورِ سلطنت میں دخیل ہو۔ محمد شاہ نے اپنے تمام ملکی امور ندیموں اور مصاحبوں پر چھوڑ دئے۔ اربابِ نشاط نے اتنا بھی موقع نہ دیا کہ وہ دلی کے احوال پر گھڑی دو گھڑی غور کرتا۔ تاباںؔ نے اس کی اسی حالت پر طنز کیا ہے:

طرح اسکندر کے تاباںؔ شاہِ ہفت اقلیم ہو　　　　گر تنک اک جرأت کرے یہ خسروِ ہندوستاں

حکومت کے بندوبست میں کینے عیاشی کی برکت سے دخیل تھے۔ انھوں نے عوام کو اور بھی بددل کر دیا۔ ملکی امور میں ایسی ابتری پیدا ہوئی کہ فرامین و احکام پٹ کر رہ گئے۔ امیر و وزیر کسی کو ہوش نہ رہا۔ امیر وزیر پر اور وزیر امیر پر سبقت لے گیا۔ ناگ رنگ رہ گئے ـــــ یا شاعری اور شاہد بازی ـــــ نادر کی ضربِ شدید نے بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ چنانچہ تاباںؔ نے امیروں اور وزیروں کو بھی حکومت کی تباہی میں برابر کا مجرم قرار دیا:

دیکھ کر ان کے تئیں شاہ بھی مردی پکڑے　　　　ہو شجاعت کا اگر جزو امیروں کے بیچ

دلی اپنے عروج کے زمانے میں عروس البلاد تھی، بادشاہوں کے زوال نے اسے بھی زوال پذیر کر دیا۔ مرہٹوں، روہیلوں، جاٹوں اور سکھوں کے ہاتھوں لٹ کر ملبہ ہو کر رہ گئی۔ پھر یہ حال ہو گیا کہ ابھی تباہی کو آبادی سے بدلا کہ پھر کوئی چڑھ آیا اور پھر وسائلِ زندگی بھی مفقود ہو گئے۔ ہنرمندوں، عالموں، فاضلوں اور صنعت کاروں کے ہاتھ میں لے دے کر ایک کاسۂ گدائی رہ گیا۔ امیروں اور وزیروں کی حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کو "پارۂ نانِ شبینہ" بھی ملنا مشکل ہو گیا۔ وہ اپنی ریاستوں اور جاگیروں کو نیم تعزیت سمجھنے لگے۔ دلی کی بربادی کا نقشہ دیکھئے:

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے بچھا کے　　　　اب میسر ان کو نہیں بوریا ٹاٹ

گھر کے گھر خاک ہوئے جورِ فلک کے ہاتھوں　　　　ہے نمودار اس کی خرابی کے بجھے آثار ہنوز

پھر امیروں اور وزیروں کو تاکید کی :

وہ کام تو کر جس سے تری گور ہو گلزار — کیا خانۂ دیوار کو کرتا ہے مقرنس

یہ دولت مند اگر شب کو رہیں یار تو پھر کیا ہے — کہ یہ ہیں چاندنی راتوں کو بھی محتاج مشعل کے

زندگی بسر کرنے کا لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے :

مرد کہتے ہیں اسی مرد کو سب اہل تمیز — جو کرے زیست زمانے میں قلندر کی طرح

یہ شعر نہیں ہیں، ہندوستان کی بالیں پر بدحالی انجیل پڑھ رہی ہے۔ اس سے اس دور کے رجحانات کا جامع ترین خاکہ ذہن میں مرتب ہوتا ہے۔ ناکارہ خواص بسم اللہ کی چار دیواری میں محصور تھے۔ روحانی اور مذہبی مدد پر جینے والا طبقہ، اپنے آپ کو ہر خطرے سے محفوظ سمجھ رہا تھا۔ لیکن وقت نے اسے بھی روئی کے گالوں کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ پیری و مریدی، فقیری و مشیخت نے بھی موت کی سی چپ سادھ لی۔ محمد شاہ کے مصاحبوں میں شاہ عبد الغفور کی کشف و کرامات کا بڑا چرچا تھا۔

شاہ عبد الغفور ٹھٹھہ کا رہنے والا جولاہا تھا۔ دلی کے وہم زائیدہ امیروں نے اس کو سیادت بخش دی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مشہور کر دیا تھا کہ جنات اس کے قبضہ میں ہیں۔ یہ واقعہ دلی کے گلی کوچوں اور بازاروں سے نکل کر دربار میں پہنچا تو قدسیہ بیگم اور رحیم النسا اس کے عروج کا باعث بن گئیں اور محل میں اس کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اس کی روزانہ کی آمدنی پانچ ہزار سے کم نہ تھی۔ رشوتوں کا بازار الگ گرم تھا۔ بارہ برس تک کشف و کرامات اور سحر و اعجاز کے کاروبار چلتے رہے۔ جب سرکاری مالیہ کے خورد برد کے الزام میں تحقیقات ہوئیں تو ساٹھ لاکھ روپے شاہ عبد الغفور کے نام نکل آئے۔ جب مزید تحقیق کیا گیا تو تین کروڑ کا حساب نکلا۔ بڑی سختی کے بعد بیس لاکھ روپے برآمد ہوئے۔ قید میں ڈال دیا گیا۔ پھر قریباً چار سال کے بعد موت نے اس کی زندگی کی حساب فہمی کر دی۔ تاباں نے اپنے بعض شعروں میں شاہ عبد الغفور پر ہی طنز نہیں کیا ہے بلکہ اس قماش کے ان تمام نام نہاد فقیروں اور صوفیوں کی بھی نشاندہی کی ہے جو عوام کو دام تزویر میں پھنسا کر اچانک دولت مند بن بیٹھے تھے۔

یہ جو ہیں اہل ریا آج فقیروں کے بیچ — کل گنیں گے حمقا ان ہی کو پیروں کے بیچ

اور پھر مساوات کا درس دیا :

ہے شاہ و گدا میں فرق لیکن تاباں — آزاد کے نزدیک ہیں دونوں یکساں

خاک تو کسی طرح سے دنیا میں نہ رہ — دن عمر کے پھر طرح سے کٹ جائیں گے یاں

تاباں کے اور شعر دیکھئے شاید ان سے اس دور کے عبرت ناک مرقع میں اور زیادہ شدت اور حزن پیدا ہو :

آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا — جس کو دیکھا ہوا اپنے مطلب کا

یا کبھی بھی مجھے خدا نے دیا — پھر کبھی تاباں رہا ہیں خانہ بچا

انعام اللہ خاں یقین مجددی پیرزادہ تھے۔ اگرچہ نوجوانی ہی میں [illegible]
اس کے باوجود انھوں نے بادشاہوں کی نااہلی [illegible] جاہل پرستی، [illegible] لوگوں کی قوم فروشیاں دیکھی تھیں۔ امرا، جن کے لیے [illegible]

پوری کر لی جاتی تھی۔ رشوت ستانی نے غرض مند طبقہ کو الگ مار رکھا تھا۔ محمد شاہی عہد کے مزاج میں غزل برگ حشیش کا نقشہ بن کر رچ بس چکی تھی۔ یقین نے بھی اسی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور پھر اسی سے ماحول کی صورت گری کی:

خدمتوں میں ہے تجارت سے زیادہ منفعت　　　رشوتوں میں تب تو لاکھوں دے کے لیتے ہیں کروڑ

یقین کا یہ شعر ان کی غزل ہی میں موجود ہے اور ان لوگوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے جو غزل کو مسائل کے اظہار سے الگ رکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ تغزل محض معاملہ بندی سے پیدا ہوتا ہے۔ یقین کے اور شعر دیکھئے۔ ان میں انھوں نے دبے دبے لفظوں میں تبدیلئ زمانہ کی خواہش کا اظہار کیا ہے:

عمر آخر ہے جنوں کروں بہاراں پھر کہاں　　　ہاتھ پکڑو میرا یارو یہ گریباں پھر کہاں

بہار آئی ہمیں کیا حکم ہے اسے باغباں سچ کہہ　　　چمن میں اپنے پائے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ

حاتم دلی کے سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ ایک سپاہی کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہوگی کہ وہ باورچی خانے کا داروغہ ہو جائے۔ امیر خاں انجام الہ آباد کا صوبہ دار تھا تو حاتم نے بھی اس کے باورچی خانے کی داروغگی قبول کرلی۔ تیرو تفنگ سے کھیلنے والے ہاتھ ہانڈی اور چولھے سے جلد ہی اکتا گئے اور حاتم کو اپنی گلو خلاصی کے لئے لکھنا پڑا:

ہوا ہوں جب سے داروغہ ترے باورچی خانے کا　　　اگر شکوہ کروں اس کا تو یہ کفرانِ نعمت ہے

وے قیدی ہوا ہوں ایں کہ رات اور دن کی محنت سے　　　ہے مطبخ کان نعمت پر مجھے زندانِ نعمت ہے

یہی ہے عرض خدمت میں ترے حاتم بکا ول کی　　　یہ خدمت کر عنایت اس کو جو خواہانِ نعمت ہے

شاعروں اور عالموں کی قدر کرنے والا طبقہ کنارے پہنچ چکا تھا۔ ہدایت علی خاں، مراد علی خاں، فاخر علی خاں اور اسی قسم کے دوسرے نودولتیے امیروں نے مدد کی بھی تو وہ طفل تسلی سے آگے نہ بڑھ سکی اور حاتم کو کہنا پڑا:

نہیں صلہ کی طمع مجھ کو اہل دولت سے　　　میں سرفروش ہوں حاتم سخن فروش نہیں

یہ جاگیر دارانہ نظام کی شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ اس کی ہر بات حاتم کے لئے نئی تھی۔ دولت محلوں سے نکل عوام میں آ رہی تھی۔ متوسط طبقہ ہر دور میں امرا کا دست نگر رہا۔ وہ اس وقت بھی پریشان و خوار تھا۔ دلی کے بادشاہوں کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ وہ اپنی فوج رکھ سکیں۔ شعرا کی سرپرستی کس برتے پہ کرتے۔ محض باتوں سے کام چلا رہے تھے۔ اس کشمکش میں حاتم کو نہ بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی حاصل ہوئی نہ وہ کسی رئیس کی فوج میں بھرتی ہو سکے۔ نتیجہ میں انھوں نے ایک صوفی محمد امین کی بیعت کرکے تعلقات ظاہری سے کنارہ کشی کرلی اور پھر دلی کے بگڑتے ہوئے حالات کا تماشا کرتے رہے:

شہوں کے بیچ سلطنت کی کچھ نشانی نہیں　　　امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں

بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں　　　تواضع کھانے کو جاؤ کہیں تو پانی نہیں

گویا جہان سے جاتی رہی سخاوت پیار

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور　　　یہاں کے دیکھو سب اہل کار ہیں گے چور

یہاں کرم سے نہیں [illegible]　　　یہاں [illegible]

یہاں نہیں ہے [illegible]

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے — جو چور تھے سو ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے سو ان دنوں ہیں زور ہوئے — جنھوں کو زور تھا سو اب مثالِ مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

جہاں میں صاحبِ خس خاد گھاس والے ہیں — جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے بھی ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں — سو اب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب کہ ہوں دوچار

عجب یہ الٹی بہے ہے گی باد دلّی میں — کہ شاہباز چڑی مار کی ہے انٹی میں
روغن فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں — جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

(انتخابِ شہر آشوب)

اسی شہر آشوب کے موضوع پر حاتم نے (۱۹) شعر کی ایک غزل بھی لکھی۔ اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ارزل طبقہ کی بن آئی تھی اور وہ نجیب و وضیع لوگوں کو ذلت و خواری کے گڑھے میں دھکیل کر بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا:

کیا بیاں کیجئے نیرنگیٔ اوضاعِ جہاں! — کہ بہ یک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں

سودا، عالمگیری وقایع نگار نعمت خانِ عالی کے نواسے اور محمد شفیع کے بیٹے تھے۔ معظم اور جہاں دار شاہ کے عہد حکومت میں ان کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ حالات کو سمجھ سکیں۔ فرخ سیر کا دور آیا تو ان کی عمر اتنی ضرور ہو چکی تھی کہ حالات سے تاثر قبول کریں۔ محمد شاہ کا دور حکومت اور ان کا دور شباب ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔

مرہٹوں کے نزدیک ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ جب قتل و غارت پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے سب کو تلپٹ کر دیتے تھے۔ ان میں عجیب بات یہ تھی کہ شکست کھا کر کبھی ہمت نہیں چھوڑتے تھے۔ پسپا ہونے کے بعد اسی تیزی، تندہی اور طاقت سے حملہ آور ہوتے تھے کہ یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ انھوں نے شکست بھی کھائی ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے دلّی پر حملہ کر کے کالکا کے میلے کو لوٹ لیا تو شہر میں ہل چل مچ گئی۔

مرہٹوں کا معاملہ حد سے زیادہ تجاوز کر گیا۔ محمد شاہ نے ان کی شورشوں اور ہنگاموں سے تنگ آ کر سلطنت کے سب سے بڑے امیر اور وزیر قمر الدین خاں کو مقرر کیا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کو نیست و نابود کر دے۔ چلنے کو قمر الدین خاں چل پڑا لیکن آخر عیاش محمد شاہ کا عیاش وزیر تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مرہٹوں کی اتنی بڑی جمعیت اور اتنے بڑے لشکر پر حملہ آور ہو جاتا۔ ڈر ڈر کر قدم آگے بڑھا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح صلح ہو جائے۔ اسی واقعہ کو سودا نے دیکھا اور پھر اپنی مشہور ہجو تضحیک روزگار لکھی:

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے — ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے جور سے — موچی سے کفش کر بھی گنٹھاتے ہیں وہ ادھار
نوکر ہیں سو روپے کے دولت کی راہ سے — گھوڑا لے کے ہیں ایک سو تھا نیل و خوار
دلّی تلک آن پہنچے تھے جس دن کہ مرہٹہ — مجھ سے کہا نقیب نے آ کر ہے وقتِ کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ — ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار
جس شکل سے سوار تھا اس روز اس پہ میں — دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ — ٹک ٹک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار
آگے تو تو بڑہ اسے دکھلاتے تھا سئیس — پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام — اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہوئے یہ رواں — یا بادبان باندھو یوں کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہو الجھ سے کیا گناہ — کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم — اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وال گزار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر — پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار
دست دعا اٹھا کے میں پھر وقت روز جنگ — کہنے لگا جناب الٰہی میں یہ پکار
پہلا ہی گولہ چھوٹتے اس گھوڑے کے لگے — ایسا لگے یہ تیر کہ ہووے نہ تن کے پار
یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعد بہ جنگ — اتنے میں مرہٹہ بھی ہوئے مجھ سے آ دو چار
جاتا تھا میں ڈپٹ کے جب اس کو حریف پر — دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں یوں بنی ہے شکل — لے جوتیوں کو ہاتھ میں کوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف — القصہ میں نے آن کے گھر میں لیا قرار

(از تضحیک روزگار)

یہ اسی مشہور گھوڑے کی صفات تھیں جس پر سوار ہو کر قمر الدین خاں مرہٹوں کے قضیہ کا دفعیہ کرنے کارکا کے میلے پہنچا تھا۔ سودا نے اس ہجو کے ذریعہ اس بدحالی کی تفصیل بہم پہنچائی ہے جو امیروں، وزیروں، مصاحبوں اور درباریوں کی بے تدبیری اور عیش پرستی کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ ایک طرف ملکی خزانہ خالی تھا، دوسری طرف عامل بیرونی علاقوں سے محاصل وصول کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ محاصل سے جتنی کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ شاہی خزانہ میں پہنچتے پہنچتے ختم ہو جاتی تھی۔ دلی میں امیروں کو ان کی عیش پسندی نے اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ حکومت کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتے۔ سپاہی کئی کئی مہینے تنخواہوں سے محروم رہنے کے بعد کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کرتے تھے۔ سودا کی اس ہجو سے اس نظام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ بظاہر ایک گھوڑے کی ہجو ہے، لیکن اس ہجو کی زد پورے شاہی لشکر اور فوجی نظام پر پڑتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ دلی کا زوال اپنی مضحکہ خیز حدوں تک پہنچ چکا تھا۔

عمال چوروں کے سرپرست تھے۔ انھوں نے چوریوں کو ایسی ہوا دے رکھی تھی کہ لاکھوں کے امیر کوڑیوں کے مول ہو گئے۔ رئیسوں اور امیروں کو تباہی اور بربادی کے چنگل نے جکڑ لیا۔ دلی کا کوتوال فولاد خاں جانتا تھا کہ شہر کی چوریوں کے پیچھے شاہ محمد خاں کا گروہ اور کوکہ خاں (داروغۂ محلات شاہی) کی سرپرستی کام کر رہی ہے۔ کوکہ خاں کی موجودگی میں وہ اتنی جرأت کہاں سے لاتا کہ شاہ محمد خاں کو گرفتار کر سکے۔ جب محل کے خدمت گاروں نے بر سر دربار اسے پکڑ لیا تو اس کوشش میں کئی زخمی ہو گئے بڑی فکر کے بعد تین لاکھ کی نقدی کا سراغ ملا اور پھر وہ شاہی ملازم اور عمال بھی سامنے آ گئے جو چوروں

ڈاکوؤں اور قاتلوں کو پناہ دے کر ان کی سرپرستی کر رہے تھے۔ سوداؔ نے فولاد خاں کوتوال کی ہجو لکھی ہے۔ یہ ہجو ذاتی عناد کا مسئلہ نہیں۔ اسے اس واقعہ کے پس منظر میں پڑھیں تو دلی کے شہری انتظام کا سارا طلسم کھل کے رہ جاتا ہے:

اب جہاں دیکھو واں جھمکا ہے ــ چور ہے، ٹھگ ہے اور اُچکا ہے
کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال ــ شیدی فولاد اب جو ہے کتوال
چور کب اس کا زور مانے ہے ــ .... کا بال اس کو جانے ہے
ہو یہ کتوال تو وہ مانے زور ــ یہ تو مچھر کی جھول کا ہے چور
ان سے رشوت لیے یہ اینٹھا ہے ــ اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
اپنے دروازہ آگے رکھ نٹ کھٹ ــ کیے ہیں ان نے گھر کے گھر چوپٹ
گشت اس کا جو پھرتا آتا ہے ــ یہی نرسنگھا بجاتا ہے
جو نظر باز اس کا چھترا ہے ــ خوب دیکھو تو جیب کترا ہے
بعض کا مفسدوں کے زور ہے یہ ــ چور کا بھائی گٹھری چور ہے یہ
جتنے نوکر ہیں اس کے خدمت گار ــ چوری اور ڈاکے کے ہیں بانی کار

(انتخاب ہجو فولاد خاں کوتوال)

سوداؔ نے جس ملکی ماحول کی ترجمانی کی ہے وہ بالکل وہی ہے جو آگے چل کر اہلِ فن کی رسوائی کا باعث ہوا اور وہ دلی سے دل برداشتہ ہو کر لکھنؤ، فرخ آباد اور دکن کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ان اہل فن کی جگہ اربابِ نشاط نے لی تو ذہنی اور فکری آداب کا جنازہ نکل گیا۔ شاعری کی متاعِ عزیز کم ظرفوں اور نااہلوں کے ہاتھ میں آئی تو اعتبارِ سخن بھی اٹھ گیا۔

میرؔ صیقل گر ہے، محمد امان نثار معمار ہے، حسین بخش پارچہ فروش ہے، مدھو سنگھ شگفتہ آہن گر ہے، خواجہ بینگا شیدا علاقہ بند ہے، میر صادق علی فیل بان ہے، شمبھوناتھ عزیز مہاجن ہے، میر لطیف علی دلال ہے، بدر الدین مفتون بزاز ہے، یک رنگ سنار ہے، محمد ہاشم شائق خیاط ہے، محمد عارف رفوگر ہے، عنایت اللہ کلو حجام ہے، غلام ناصر جراح ہے، مرزا مقصود سقہ ہے، قربن خاکروب ہے۔ یہ فہرست اور بھی زیادہ طویل ہو جائے گی اگر اس میں عطار، بانکا، صاحبقراں، شہوت، پھکڑ، جنگ، اوباش، عیاش، عشاق، کافرکلا، پنجا، جھینپا، کھرا اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کے نام شامل کر لیے جائیں۔ سوداؔ نے اسی پر آشوب فضا کو دیکھا اور برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شہر آشوب ہمیں مورخوں کے بیان کردہ واقعات سے قریب کی چیز معلوم دیتے ہیں۔

کبھی آگرہ کی ہر گلی میں عارف، کامل، فاضل، فقیہہ، شاعر، منشی، دانشمند، متکلم، حکیم، صوفی، محدث، مدرس، درویش، متوکل، شیخ، ملا، حافظ، قاری، امام اور موذن ہوتے تھے، لیکن سورج مل جاٹ کے قبضے اور مرہٹہ گردی نے اس کی مسجدیں، خانقاہیں، مہمان سرائیں، تکیے، محلات اور باغات سب کچھ تباہ کر دیے۔ شرفا اور امرا کی تمام املاک ہجرت پا در چلی گئیں۔ معاشی بدحالی نے ایسے انتشار کو جنم دیا کہ گھر گھر کہرام مچ گیا۔ نظیر اکبر آبادی جیسے تارک الدنیا شاعر تک یہ سوچنے پر مجبور ہوئے۔

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں	کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
دنیا میں کون ہے جو نہیں مبتلائے زر	ہر ایک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

آگرہ کی بربادی کی تفصیل میرؔ نے اپنی سرگزشت "ذکرِ میرؔ" میں لکھی ہے۔ اسے نظیرؔ اکبرآبادی کی کلیات میں پوری دردناکی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ نظیرؔ اکبرآبادی نے اپنی شاعری کا رشتہ براہ راست عوام سے استوار کیا تھا اس لیے ان کے بیشتر معاصرین نے ان کی شخصیت اور شاعری سے چشم پوشی کی ہے۔ غالباً اس دور میں ان سے بڑا شاعر اور کوئی نہیں تھا، جس نے عوامی تقاضوں اور مطالبوں کو شاعری کے ذریعہ پیش کر کے سیاسی اور سماجی انتشار کی تصویر کشی کی ہے:

وہ عظیم الشان مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں	ہنس کے طاق آسمان کو طاق ابرو سے جواب
ان میں تھے وہ صاحب ثروت جنھیں کہتی تھی خلق	کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب
مہروش بہرام صورت بدر قدر و چرخ رخش	مشتری ہمت، ثریا بارگہ کیواں جناب
یا تو وہ ہنگامۂ تفشیط تھا یا دفعتاً	کر دیا ایسا کچھ اس دورِ فلک ستے انقلاب
دو تو سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر	رہ گئے عبرت کو ان کے قصر ویران و خراب
خواب کہئے اس تماشا کو نظیرؔ اب یا خیال	کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

آگرہ کی اس تباہی اور بربادی کو غازی الدین عماد الملک کی فوج کشی نے اور بھی زیادہ بھیانک بنا دیا۔ اس نے مرہٹہ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر صفدر جنگ کی حمایت کے جرم میں سورج مل جاٹ پر چڑھائی کر دی اور آگرہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ صفدر جنگ کہنے کو وزیر تھا، لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ غازی الدین عماد الملک اور مرہٹوں کی سپاہ کا مقابلہ کرے، ڈر کر چلتا بنا۔ نتیجے میں سارا شاہی لشکر لٹ گیا اور زمام وزارت غازی الدین عماد الملک کے ہاتھ آ گئی۔ اشرف علی خاں فغاںؔ احمد شاہ بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے انھوں نے صفدر جنگ کے اس لشکر کی حالت دیکھی تھی جس کی قیادت راجہ رام نارائن میر لشکر کر رہا تھا۔ وہ لشکر کیا تھا، ان کے شعروں ہی میں دیکھئے:

کیونکر کٹیں گے یارب یہ بے شمار فاقے	مجھ کو تو دوسرا ہے نفروں کو چار فاقے
اعلیٰ سے تا بہ ادنیٰ جتنے ہیں گرسنہ ہیں	لشکر میں ہو گئے ہیں بے اعتبار فاقے
شاہ و گدا کی حالت یکساں ہے میرے صاحب	تنخواہ خوار بھوکے روزینہ دار فاقے
بندے سبھی خدا کے بھٹکے پھرے ہیں ہر سو	القصہ کیا کہوں میں سارا دیار فاقے

ان حالات میں زندگی کرنا بہت مشکل کام تھا۔ غازی الدین عماد الملک نے احمد شاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر معظم کے پوتے عالمگیر ثانی کو تخت نشین کیا تو اشرف علی خاں فغاںؔ کی زندگی تاریک تر ہو گئی۔ وہ اپنی تباہی اور بربادی کا نوحہ کہتے رہے۔ دلی کے خود غرض امیروں اور مصاحبوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو ان کی سابقہ حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ان کی آمد و رفت پر کان دھرے۔ مجبوراً مرشد آباد کی راہ لی:

یہاں جن سے کرتے ہیں ہم اعتماد [illegible]	[illegible]
سفر کر گئے اہل دل اس جہاں سے	[illegible]

[illegible]

شاہی اختیار کے باوجود ہر نیا صوبہ دار پرانے صوبہ دار سے جنگ کئے بغیر قابض نہ ہوتا تھا۔ ہر مرتبہ نئے تقرر پر ملک میں تباہی پھیل جاتی تھی۔ وزراء ذلت بھرے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے مرہٹہ تو مرہٹہ جاٹوں جیسی پست جماعت کو اپنے ساتھ ملا کر بدترین چالیں چل رہے تھے۔ انھوں نے پنجاب کے صوبہ دار معین الملک کی بیوی کے ساتھ بدسلوکی کی تو احمد شاہ ابدالی اپنی بھاری جمعیت کے ساتھ دلی آن پہنچا۔ نادر سے جو کچھ تن کے کپڑے بچ رہے تھے وہ بھی اتروا لئے۔ اتنی غارتگری نہ کی جتنی آبروریزی کی۔ شریفوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ بہت سوں نے خودکشی کرلی، بہت سے جنگلوں کی سمت نکل گئے۔ کون بچاتا، کون سفارش کرتا، ہزاروں درباریوں اور امیروں کی موجودگی میں ایک بھی نظام الملک امن کا ملجا بن کر نہ اٹھا۔ یوں کہنے کے لئے نظام الملک کے ایک، ناخلف پوتے غازی الدین عماد الملک نے بساط سیاست پر کیا کیا گل نہ کھلائے تھے۔ ابدالی کی سپاہ تین دن تک مسلسل لوٹ مار کرتی رہی۔ دیوان خاص کی نقرئی چھت اتارلی۔ قدم شریف اور نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں سونے کا جو کچھ سامان تھا وہ سب غصب کرلیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ میر اپنے مستقد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان کی زندگی ان ہی مصیبتوں کی زندگی تھی۔ ذاتی، سماجی اور سیاسی اثرات نے ان کو اتنا مایوس اور پژمردہ کردیا تھا کہ مایوسی اور پژمردگی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ وہ دلی کی تباہی اور بربادی پر روتے تھے:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے　　　جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہند میں ہوگئے برباد ہزاروں اس سال　　　شامت بخت یہ ہے بار خدا کس کی ہے

اب شہر ہر طرف سے میدان ہوگیا ہے　　　پھیلا تھا اس طرح سے کا ہے کو یاں خرابہ

دلی کی یہ تباہی میر کے لئے دوہری مصیبتوں کا پیش خیمہ تھی۔ ایک طرف حکومت کی چولیں ڈھیلی پڑ رہی تھیں، دوسری طرف ان کے سرپرستوں، رفیقوں اور دوستوں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ صمصام الدولہ کی موت کے بعد باقی قدر دانوں کو بھی، ان جنگ بازیوں نے ان سے جدا کردیا تھا:

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں　　　نادان یاں کسو کو کسو کا بھی غم ہوا

مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں　　　لوگ وے بل مارتے کیدھر گئے

خانوادے ہوگئے کیا کیا خراب　　　خانہ کی یوں ندمیں کیسے مرگئے

میر نے اپنی تباہ حالی کے ساتھ ان امیروں اور رئیسوں کی سیاہ بختی بھی دیکھی جو کبھی ہاتھیوں پر نکلتے تھے، لیکن آج ان کے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی تھا اور بس:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں　　　تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

مثال کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی　　　انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

دلی اتنی بار اجڑی اور اتنی بار آباد ہوئی کہ لوگ ہر اختلال کے عادی ہوگئے۔ کاشتکاروں کے نزدیک جنگ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ پاس کا میدان رزم گاہ بنا ہوا ہوتا تھا پھر بھی وہ آرام و اطمینان سے اپنے کھیتوں میں ہل جوتتے اور فصل کاٹتے تھے۔ البتہ ان جنگوں نے صرف ان ہی لوگوں کو سخت نقصان پہنچایا جو دلی اور اس کے قرب وجوار میں آباد تھے۔ ان میں بھی زیادہ تعداد سپاہیوں ہی کی تھی۔ سپاہی تنخواہ نہ ملنے کے باعث مہینوں پریشان رہتے۔ اس پر بھی کوئی علاج کی راہ نہ نکلتی تو اسلحہ وغیرہ کی فروخت سے کام چلاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان سے بتدریج سپاہیانہ تدبر رخصت ہوتا چلا گیا اور وہ اپنے

آقاؤں کی وفاداری کی بجائے شورشوں اور بغاوتوں کے عادی ہو گئے۔ میر نے ان ہی اسباب کو سامنے رکھ کر ہجو لشکر لکھی یہ ہجو امیروں اور بادشاہوں سب ہی پر ایک طرح کی سخت گیر تنقید ہے :

جس کسو کو خدا کرے گمراہ　　آئے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ　　جس کو دیکھو سو ہے بہ حال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

جانیے جس کے یاں وہ روتا ہے　　یا کہے چوبدار سوتا ہے
جو مقدر ہے سو وہ ہوتا ہے　　کون وقت عزیز کھوتا ہے
میں تو تھوکوں نہ رئیسوں پر واللہ

فوج میں جس کو دیکھو ہے وہ اداس　　بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس　　چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ

خاک اڑتی ہے صبح سے تا شام　　شام سے صبح تک ہے فکر طعام
رحم کی جا ہے حال نیک انام　　ایک دو ہوں تو لوں کسو کا نام
سیکڑوں کے نہیں جگر میں آہ

دیکھے میں نے مصاحبان شہ　　نکلے سب بے حقیقت و بے تہہ
نہری آخر کوان سے کچھ مت کہہ　　رہ سکے ہے کسی طرح تو وہ
ورنہ لشکر سے جا خدا ہمراہ

(از ہجو لشکر)

میر نے اپنی نظموں میں سرکاری عمال کی بد معاملگی اور نظم و نسق پر کڑی تنقید کی ہے۔ نجیب الدولہ شاہ عالم کے نام پر دلی میں بیٹھا ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی علالت طول پکڑ گئی اور اس نے اپنی زندگی کا چراغ گل ہوتے ہوئے محسوس کیا تو الہ آباد لکھ بھیجا، اب حکومت سنبھالیئے، مجھ سے جو کچھ ہو سکا کر گذرا۔ شاہ عالم نے الہ آباد سے دلی کا رخ کیا۔ فرخ آباد میں احمد خاں بنگش میر بخشی کے انتقال کی خبر بھی سن لی۔ پھر مرہٹوں کا سوار سندھیا اسے للکر دلی چھوڑ گیا۔ یہاں شاہی سپاہ کی حالت شرمناک حد تک تباہ تھی۔ اسے میر کے ان شعروں میں دیکھئے :

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش　　آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرز معاش　　ہے لب ناں پہ سو جگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب　　جو غنا سا ملا تو ہے اسباب
تنگ دستی سے سب بحال خراب　　[illegible]
[illegible]

ننگ گانی ہوئی ہے سب پہ دہال | کپڑے جھکیں ہیں بٹتے ہیں بقال
پوچھو مت کچھ سپاہیوں کا حال | ایک تلوار نیچے ہے اک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلاش

لال خیمہ جو ہے سپہرا ساس | پالیں ہیں لنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس | رعب کر لیجیے یہیں سے قیاس

قصہ کوتہ رئیس ہے عیاش

یک بیک گر کسو کی موت آئی | اس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیونکہ پہنچی ہے جن کو امرائی | سب وہ اولادِ حاتم طائی

کون دے کر کفن اٹھائے لاش

امرا اور رئیس سیاسی لوٹ کھسوٹ کے ہاتھوں تباہ ہوگئے تو انھوں نے عوام کا استحصال شروع کردیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو محتاج تھے وہ محتاج تر ہوگئے۔ میر نے اپنے آپ کو بھی ایسے ہی پامال طبقہ کا ایک فرد محسوس کیا:

نہ مل میر اب کے امیروں سے تو | ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

جھمن لال دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے دلی اپنی تباہی اور بربادی کے کئی ورق الٹ چکی تھی۔ نادر کا حملہ، ابدالی کی شکست و ریخت، مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی غنڈہ گردی، ان مصیبتوں اور صعوبتوں نے سہارن پور تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ابھی وہ غوث گڑھ جاکر ضابطہ خاں کی سرکار میں منشی گیر ہوئے تھے کہ مرہٹے شاہ عالم کو نشان کا ہاتھی بنا کر غوث گڑھ پر ٹوٹ پڑے۔ محلے اور آبادیاں تلپٹ کر دیں۔ نجیب الدولہ اور اس کے ناموس کو ذلیل کیا۔ بوڑھے، بچے، عورتیں، مرد سب ہلاک کر دیئے۔ ضابطہ خاں فرار ہوگیا تو مرہٹوں نے ظل الٰہی سے سہارن پور کی مختاری کی سند بھی حاصل کرلی۔ ان کا قائم کردہ مختار کیا تھا خدائی قہر تھا۔ بیدادپسندی حد سے بڑھی تو جھمن لال بلبلا اٹھے:

یہاں مختار جو با جاہ آیا | برائے قتل خلق اللہ آیا
نہ تھے کچھ شاہ جی پر شاہ حاجی | وہ نادر شاہ تھے یہ شاہ آیا

قائم کا مولد چاند پور تھا۔ پریشان حالی ان کو شہر شہر لئے پھرتی رہی۔ شاہ عالم کے شاہی توپ خانے کے داروغہ ہو گئے اس وارفتگی کے زمانے میں انھوں نے شاہ عالم کو بہت قریب سے دیکھا۔ مرہٹے اس کی برائے نام حکومت کے سربراہ بنے ہوئے تھے۔ عماد الملک جیسے نمک حرام کا وزیر اس کا سودا کرتا تھا۔ افراتفری اور کشمکش نے مسلمانوں کو یکجہتی اور اتحاد سے بیگانہ کردیا تھا۔ غازی الدین عماد الملک جیسے نمک حراموں کا وجود دورہ تھا۔ اسلامی حریت کے پیچھے سو رہا نجیب الدولہ جیسے شریف انسان کے ذلیل پوتے، غلام قادر خاں نے شاہ عالم کے سینے پر چڑھ کر تلوار سے ان کی آنکھیں نکال لیں، اندھا کردیا اور پھر اپنے ظلم پر یہ دلیل بھی گھڑی کہ اس نے میرے باپ پر حملہ کرکے مرہٹوں کے ذریعہ نجیب آباد کو لٹوا دیا تھا۔ حالانکہ اصل سبب کچھ اور ہی تھا۔ بادشاہی سمٹ کر دلی کی چار دیواری تک محدود ہوکر رہ گئی۔ وہ شہر جو قلعان شرکت منزش علی مرشد [illegible] زینت اور قصر و امارت کے لحاظ سے رشک صد بغداد تھا، دیکھتے دیکھتے جنگلوں اور بھتوں کا گہوارہ بن گیا۔ قائم نے یہ صورت حال دیکھی تو محمد یار خاں کی سرکار کی راہ لی اور رام پور پہنچ گئے۔ ان کے ایک شہر آشوب سے [illegible] کہ ان کو مرہٹوں سے کس قدر نفرت تھی۔ انھوں نے غالباً شاہ عالم

کی مرہٹہ نوازی کے باعث اس سے شدید ترین نفرت کا اظہار کیا:

کیسا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے　　ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے

یہ ایک آپ ساتھ میں شہری سپاہ ہے　　ناموسِ خلق سایہ میں اس کے تباہ ہے

شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظلِ الٰہ ہے

لشکر میں مرہٹہ کے جو کوئی رہے ہے بند　　دیکھے ہے ان کے ظلم کے سب پست اور بلند

اب نام فوج سن کے جو اڑ جائیں وہ پرند　　سچ ہے کہ جس کو مار سے پہنچے کبھو گزند

رسی کو جانتا ہے کہ مارِ سیاہ ہے

سمجھا تو اس قدر بھی نہ بھڑوے خبیث خر　　کس پہ ہوا یہ مظلمہ، لوٹا کنھوں کا گھر

ہر نیک و بد پہ آدمی کرتا ہے یاں نظر　　تو ہے خدا کے فضل سے اس باپ کا پسر

جس کا خطاب شاہ حماقت پناہ ہے

دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا　　کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا

اس خانداں میں حمق کا جاری ہے سلسلا　　دوں دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا

آخر گدھا پن ان کا تما عذر خواہ ہے

گردش کا آسمان کی جو ہے کوئی سبب　　اہلِ زمیں پہ آئے ہے اک رنج با تعب

ٹوٹے غضب یہ تجھ سے نہ اتنا کہیں غضب　　مردوں کی جو کھڑنک سے پر ہو نہ تا بہ لب

ایسی نہ باولی ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے

میر جعفر علی حسرت دلی میں رہے، لکھنؤ مدفن بنا۔ عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد دلی کی حالت ایسی نہیں رہ گئی تھی کہ اسے لوگ اپنا مامن سمجھ لیں۔ نظام الملک جیسے سیاسی، ذہین، دانش ور وزیر الممالک کا ناخلف پوتا حکمرانوں کو شطرنج کے پیادوں کی طرح بدل رہا تھا۔ احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ جہاں ثانی یہ سب اسی کی بساط اقتدار کے پٹے ہوئے مہرے تھے۔ وہ ایک اچھا شاعر ضرور تھا۔ لیکن اس نے نہ تو شاعروں کی سرپرستی کرنا سیکھی تھی نہ ان کے مصائب سے آشنا تھا۔ سودا نے اس کے اور اس کے آوردہ حکمران عالمگیر ثانی کے قصیدے لکھے تو صلہ کی تمنا بھی نہ پوری ہوئی۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ ابدالی کے خوف سے احمد خاں بنگش کے پاس فرخ آباد جارہا اور سودا کو اس سے گلوخلاصی کا بہتر موقع ہاتھ آگیا۔ ان حالات میں ان شاعروں اور ادیبوں پر قیامت گزر گئی جو کسی دربار کے متوسل تھے نہ کسی سرکار سے روزینہ ملتا تھا۔ ان کی ذات کئی سمتوں سے حوادث کا نشانہ تھی۔ شاہ عالم جب اپنا زمانۂ شہزادگی جلا وطنوں کی طرح دلی سے باہر گزار رہا تھا، عوام کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ حسرت نے بھی عافیت اسی میں دیکھی کہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ لکھنؤ چلے جائیں۔ اس کے باوجود دلی کی تباہی اور بربادی ہر وقت ان کی نگاہوں میں گھومتی رہی۔ وہ زندگی بھر اس کی شکست و ریخت پہ افسوس کرتے رہے:

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں　　کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالتِ بستاں

نہ سیلِ حادثہ لائے کسی پہ یوں طوفاں　　گزر گیا ستمِ افغان کے ظلم سے جو یاں

فغاں کہ ہو گیا ہے گلشنِ شہر سب پامال

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت و تاج — وہ اپنی قوت کو اطفال کے ہوا محتاج
خدائی ہے جسے دیتا تھا سارا ہند خراج — غنیم آن کے لے اس سے اس کے شہر سے باج
وہ شکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال

جواہر اور خزانہ تو سب لٹا یکسر — رہیں کس آس پہ فرقہ کے نوکر اور چاکر
رہا نہ مال بجز سنگ کوٹھوں کے اندر — جو چھت تھی چاندی کی دیوان خاص میں پیندر
سو وہ وزیر نے کی خرچ بھیج کر ٹکسال

جو بخشی آن کے مانگے سپاہیوں کی طلب — تو بے جواب کہ تھا صرف خاص صرف میں جب
تو کچھ نظر ہمیں پڑتا تھا فوج رکھنے کا ڈھب — ہے بادشاہ فقط چتر و مورچھل پر اب
یہ جھاڑو لوٹ کر اکس کے ہو . . . . ڈال

کہاں سے دیجے طلب اب کہاں خزینہ ہے — کہ لال قلعہ میں کہہ تو کہاں دفینہ ہے
مرا بھی کہہ تو سہی تو کہیں مہینہ ہے — جو ملک تھا سو وہ اب سرکشوں نے چھینا ہے
جو لکھ دو ٹھیکری، پروانہ مانے کیا عمال

جو ہوسکے تو محلہ تو ان کا دکھلا دے — گزشتہ سال سے برطرفی ان کو دکھلا دے
نہ مانے وہ تو مرے دستخط سے سمجھا دے — جو پھر بھی رکھنے پڑیں گے سوار اور پیادے
تو ان سے کہیو کیا پھر سے تم کو حال بحال

ہے میری ڈیوڑھی کے ناظر کو تیرا فاقہ — جو محل دار ہے اس نے دیا ہے استعفا
مچایا ترکنی کشمیرنی نے اب غوغا — رہے بچارے سلاطین ان کا حال سو کیا
کسی کے مرنے کی نوبت کوئی پڑا ہے نڈھال

(از شہر آشوب)

اس سیاسی اور سماجی انتشار کے پیچھے سکھوں، مرہٹوں، افغانوں کے علاوہ انگریزوں کا بھی ہاتھ تھا۔ انھوں نے اندھے بادشاہ شاہ عالم سے دیوانی کے اختیارات لے کر اور بھی اپنے قدم مضبوط جما لئے۔ شاہ عالم کے لئے صرف جینے کا حق باقی رہ گیا اور بس۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شہ رگ کٹ چکی تھی۔ یہ سیاسی استحصال حد درجہ گراں تھا۔ ایک طرف ایک تہذیب ختم ہو رہی تھی دوسری طرف ایک محکوم دنیا کا ڈھانچہ تیار ہو رہا تھا۔ انگریزوں کے سرمایہ دارانہ تصور کی بدولت ہندوستان کی دولت، لندن پہنچ رہی تھی۔ خام مال انگلینڈ کے بازاروں میں فروخت ہو رہا تھا۔ ان حالات کو مصحفی نے پوری شدت سے محسوس کیا۔ غالباً مصحفی اردو کے ان شاعروں میں سے پہلے ہیں جن کی آواز انگریزوں کے خلاف بلند ہوئی۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی — کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ طرہ یہ کہ مرہٹہ گردی نے ہندوستانی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب تک لوٹ مار کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔ عماد الملک کی موجودگی اور پھر شاہ عالم کی تخت نشینی نے ان کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ نجیب الدولہ کی موت اور حافظ رحمت خاں کے قتل کے بعد کسی کو ژمی کے شفتہ ہندوستان کے

دست و بازو جھڑ چکے تھے۔ نفس کی آمد و شد باقی رہ گئی تھی، تو اسے بھی شاہ عالم کی غریب نوازی نے اختلاج سے بدل دیا تھا۔ سوبھٹے تہذیب و ثقافت کے مردہ جسم پر مردار خور گدھوں کی طرح جھپٹ رہے تھے۔ اس معاشی بدحالی اور سیاسی لوٹ کھسوٹ نے، شاہ عالم کو خود بھی انگریزوں کا خیرات خوار محض کر دیا تھا اور نتیجہ میں عوام بھی اس کا عذاب اور خمیازہ بھگت رہے تھے۔ بھوک، فاقہ، بے روزگاری اور اسی کے ساتھ جہالت ان کا نقطۂ امتیاز بن رہی تھی۔ یہ پس منظر مصحفی کے ان شعروں میں صاف طور پر نمایاں ہے:

کہتی ہے جسے خلقِ خدا سب شہِ عالم — شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے
اطراف میں دلّی کے ہے لٹھ ماروں کا یوں شور — جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ دہاں ہے
اتری ہیں یہاں پگڑیاں بس شام کے ہوتے — چالاکیٔ دست ایسی یہ اندھیر کہاں ہے
جز دیدۂ گریاں نہیں منبع کسی گھر میں — ناسور ہے سینے کا اگر آب رواں ہے
آتے ہیں نظر جوں دلِ عشاق شکستہ — اس شہر میں جو قصر فلاں ابن فلاں ہے
نواب نہ خاں کوئی رہا شہر میں باقی — نواب جو گوجر ہے تو میواتی بھی خاں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بے چاروں کے اوپر — جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے
گل جائے زباں میری کروں ہجو گرانِ کی — یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کی بیاں ہے
اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک — ہے صاف تو یہ گلشنِ دلی میں خزاں ہے

(از شہر آشوب مصحفی)

چند شعر اور پڑھیے:

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں — ویران ہے محلہ سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں بادِ خزاں کے ہاتھوں — اکھڑے ہوئے زمیں پر کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغ سے اب کیسے نشاں بتاؤں — بیرونِ در چمن کے کچھ بال و پر پڑے ہیں

(انتخاب شہر آشوب مصحفی)

یہ حالت [illegible] انحطاط ہی کو معراجِ کمال تک نہیں پہنچا رہا تھا بلکہ ثقافتی اور تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت سے دوچار تھی۔ افلاس نے اہلِ کمال کو [illegible] کر دیا تھا۔ امیروں اور رئیسوں اور صاحبوں کے پاس فراغت تھی نہ دولت۔ مصحفی کے [illegible] تک کو تین تین دن تک فاقے کی نوبت آجاتی تھی۔ وہ تلاش میں [illegible] اپنا مسودہ فروخت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ مصحفی اس کو محسوس کیا

[illegible] دوپہر کیسے گزرا — اس [illegible] میں [illegible]

[illegible] ایسے تباہ اور تاراج شہر میں رہتا کوئی آسان کام نہ تھا۔ [illegible] کی [illegible] سے [illegible] بھی جائیں۔ [illegible] مصحفی نے دلی کی عبرت کی [illegible] کے حد سے [illegible]

[illegible]

انشاؔ زیادہ دنوں دلی میں رہے۔ ان کو شاہ عالم کے دربار سے توسل تھا۔ مرہٹوں نے شاہ عالم کو اس کے اندھا ہونے کے بعد دوبارہ تخت پر لاکر اپنے حصول اقتدار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ شاہ عالم کی تفریح انشاؔ کے ہاتھ آئی تھی۔ محض تفریح سے گزر اوقات ممکن نہیں تھی۔ شاہ عالم کی حکومت دلی سے پالم تک رہ گئی تھی۔ انشاؔ نے ابتدا ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ دلی کی حکومت چند دنوں کی مہمان ہے۔ مرہٹوں کی شورش یقیناً کوئی فتنہ یا فساد برپا کردے گی۔ انھوں نے "ہجو لشہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم بظاہر مچھر کی ہجو ہے۔ اس پر غور کیا جائے تو اس کے ذریعہ مرہٹوں کی تمام شورہ پشتی پوری جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ جو لوگ علامتی اظہار کو آج کی اختراع سمجھتے ہیں انھیں انشاؔ کی یہ نظم ضرور پڑھنی چاہیے:

مچھروں کو ہوا ہے اب کے اوج　　　دب گئی ان سے مرہٹوں کی فوج
سوکھے سوکھے ہیں کالے کالے ہیں　　　یہ مگر پیر گھوڑی والے ہیں

(ہجو لشہ)

دلی کی تہذیب کے بنائے ہوئے، دہلی کی تربیت کے سدھائے ہوئے، اودھ کے نوابوں کی داستانیں بڑی حسرت سے سن رہے تھے۔ ہر صاحب فن اودھ کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔ اس بنا پر ادبی تذکرہ نگاروں نے بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کا شباب تھا۔ دولت کے دریا بہہ رہے تھے۔ آسمان سے دھن برس رہا تھا۔ دور دور سے باکمال اور اہل فن کھنچے چلے آرہے تھے۔ لکھنؤ تھا کہ ہر ایک کے لئے اس کی آنکھیں فرش راہ تھیں"!

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی ان ہی خیالات کی یوں تائید کی ہے:

"لکھنؤ میں دھن برس رہا تھا۔ خزانے میں کروڑہا روپیہ جمع تھا اور بے دریغ خرچ ہو رہا تھا۔ آصف الدولہ کی فیاضیاں غریبوں کو امیر بنانے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھیں"

اودھ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ نہیں، حسن بن صباح کی دوسری جنت تھا۔ وہاں کے تمام نواب وزیر اور مصاحب اپنے وقت کے علی بابا تھے۔ برہان الملک نے ہندوستانی ذہن سے غداری کرکے اودھ کا نظم و نسق سنبھالا تھا اور پھر اسی بہانے بیسواڑہ، بلرام پور، تلوئی، پرتاب گڑھ، گونڈہ اور رسالپور کی بیشتر آبادی تہہ تیغ کی تھی۔ عوام و خواص دونوں اس کی بربریت سے نالاں تھے۔ اس نے دلی میں زہر کھا کر خودکشی کی تو اودھ کے مظلوم طبقہ نے فراغت کا سانس لیا اور پھر کہنے والے یہ بھی کہنے سے نہیں چوکے کہ "بے سعادت نمک حرام بمرد"

صفدر جنگ میں تدبر تھا نہ دانش مندی۔ فراست تھی نہ استقلال، وہ بزدل تھا۔ عنان اقتدار اس کے ہاتھ میں آئی تو اس نے جالیسر، فرخ آباد اور کوڑہ کے علاقے خوشامدیوں کی طرح مرہٹوں کے حوالے کر دیئے۔ مرہٹوں نے لوٹ کھسوٹ کی ایسی بے پناہ مثال قائم کی کہ دانش ور طبقہ ہمیشہ کے لئے شاکی ہو گیا۔ معترضین، معتزلہ اور عالموں کی آبادیاں شہروں سے دور ہو گئیں۔

شجاع الدولہ بزدل باپ کا عیاش بیٹا تھا۔ اس نے مسلمانوں کی تاریکی میں ہندوؤں کے ایک کھتری کی لڑکی اغوا کی اور پھر اسے اس وقت رخصت کیا جب کہ وہ اپنا گوہر عصمت گم کر چکی تھی۔ دلی کے حکمران [illegible] اودھ کے نوابوں نے وہ بھی کر دکھایا۔ بلکہ یہ ملکہ ایک صدائے احتجاج بن گئی۔ [illegible]

کام آگیا۔ ورد حسین علی خان سے مربیدہ کے معاوضہ میں حاصل کی جانے والی صوبہ داری کی بساط الٹنے میں دیر کتنی تھی۔ اس واقعہ سے آنکھیں کھلی بھی نہیں تھیں کہ پھر بگڑی ہوئی عادتوں کا غلبہ بڑھ گیا۔ قرآن مقدس اور ائمہ طاہرین کی قسمیں کھا کھا کر شجاع الدولہ نے میر قاسم کو اپنے یہاں پناہ دی، اس کے باوجود اس کا ساز و سامان غصب کرنے میں تنگ محسوس نہیں کیا۔ اس وقت بھی اس کا دل نہیں پسیجا جب کہ میر قاسم نے اودھ میں در در بھیک مانگی۔

اودھ میں شجاع الدولہ کے قدم روکنے والا کون تھا۔ کونسی بے اصولی باقی رہ گئی تھی جو تحصیل زر کے لئے اس سے نہیں ہوتی۔ جاگیرداروں پر معیشت کے دروازے بند کر دیئے۔ زمینداروں کو ہلاک کرنے میں تکلف نہیں کیا۔ ہر ذریعے اودھ کی دولت سمیٹ کر اپنے محلسرا میں پہنچا دی یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر بھر دیئے۔ فیض آباد کی جھونپڑیاں خاکستر کر کے محلات کی جگہ نکالی۔ وظیفہ خواروں کا وظیفہ موقوف کر کے معماروں کا قرض چکایا۔ اس کھلی زیادتی پر لوگوں کو غیرت آئی تو وہ خاک و خون میں نہلا دیئے گئے۔ مسجدیں اور خانقاہیں منہدم ہو گئیں۔ عفتوں اور عصمتوں نے دم توڑ دیا۔ بچے ماؤں کی چھاتی پر مر گئے، بچیوں اور شریفوں نے خودکشی کر لی، وضیع اور غیور روپوش ہو گئے، مفکروں، عالموں اور فاضلوں اور صوفیوں کو قید کر دیا گیا۔

شاہ واقف دلی کے صوفی شعرا میں سے تھے۔ دلی کی بربادیوں نے ان کو کبیدہ خاطر کر دیا تھا۔ انھوں نے شجاع الدولہ کی قدردانی کی شہرت سنی تو فیض آباد جا پہنچے۔ فیض آباد علم و ادب کا گہوارہ نہیں فکر و دانش کا مرگھٹ تھا۔ ان کے سر سے موج خوں گزر گئی۔ قید و بند سے کام نہیں نکلا تو یقینا پوری جلادوں نے موت سی مشکل چیز آسان کر دی۔ گرفتاری سے موت تک سیکڑوں صعوبتیں اور اذیتیں تھیں۔ ان صعوبتوں اور اذیتوں نے ستر و لبراں کو حدیث دوراں بنا دیا:

دور آیا ہے کہ ہوں شاہ و گدا بہرے میں
بے خطا بہرے میں اور اہل خطا بہرے میں

اودھ بیرونی خطروں سے محفوظ تھا لیکن اس کے اندرونی نادر اور ابدالی حرص ملکیت کے ہاتھوں اس کی تخریب میں مصروف تھے۔ سحر البیان کا شاعر میر حسن یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے گرد و پیش تباہی کی داستانیں بکھری رہیں۔ پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو پکار اٹھا:

اس نے خلعت پہن کے عباسی
کتنے ہی سیدوں کا خون کیا

عباسی یہ غزل کا لفظ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کتنے ہی صوفیوں، عالموں اور فاضلوں اور شیوخ کے قتل کی داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ میر حسن نے ان خونی مناظر کو دیکھنے کے لئے فیض آباد کی تمنا نہیں کی تھی۔ دلی کے شام دیگر کو الوداع نہیں کہا تھا۔ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ حاتم کی قبر پر لات مارنے والے اتنے تنگ دل اور بے مروت ہوں گے:

فلک کی بھی یہ کیا کیا گردشیں ہیں ــــــ کہاں بیٹھے تھے کل آئے کہاں آج
میں سوختہ دل خستہ جگر آہ حزیں ہوں ــــــ نے نغمۂ بلبل ہوں نہ شور و شغب طاؤس

دلی کے حوادث رونے رلانے کے لئے کافی تھے۔ اودھ کے نوابوں نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ خوابوں کی [illegible] کا ماتم ہو گیا۔ فرحت کدے، ماتم بادشہ نظر آنے لگے۔ دل کے حلقوں نے یادگار جگر خون کر دیا۔ آرزو کے [illegible] کے راستے، کتنی ہی محفلیں کتنی ہی یادیں اور رہتی رہیں۔

گئے وہ دن کہ رہتے تھے جہاں آباد میں ہم بھی ـــــ خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو
پوچھتا ہے حال کیا آوارگانِ ہند کا ـــــ کچھ ادھر کو اٹھ گئے اور کچھ ادھر کو اٹھ گئے

یہ غزل کے شعر ہیں۔ یا زناں گفتنی والی بات نہیں۔ یہ حزن پس منظر اس وقت زیادہ طویل ہو جاتا ہے جب ہماری نظر میر حسن کی ایک دوسری مثنوی گلزار ارم پر جاتی ہے۔ "گلزار ارم" کا پہلا حصہ لکھنؤ کی مذمت ہے۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ بعض محقق اس مثنوی کو اس وقت کی یادگار بتاتے ہیں جب فیض آباد اودھ کا دار القرار تھا۔ یہ مثنوی میر حسن نے اپنے انتقال سے چھ برس پہلے لکھی تھی، لکھنؤ اس وقت اودھ کا دار القرار نہیں تھا۔ لیکن شجاع الدولہ کی مستقل سکونت نے اسے "گلزار ارم" کر دیا تھا۔ یہ وہی "گلزار ارم" ہے جہاں سے حرص ملکیت ابھر کر لکھنؤ کو کوفہ کا ہم عدد کر رہی تھی۔

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں ـــ نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا ـــ ولے جا گر جو بد ہو تو کریں کیا
نہیں یہ لکھنؤ یہ ہے زمانہ ـــ زمانہ پر عبث رکھا بہانہ
فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے ـــ ہر اک گھر قبر کا کونہ یہاں ہے
جو اس کے زیر سایہ آن نکلے ـــ رکے دم اور اس کی جان نکلے
سوائے تودۂ خاک اور پانی ـــ یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی
زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے ـــ اگر شیعہ کہیں نیک اس کو بد ہے

باپ کا جنازہ نقار خانے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ بیٹے نے اپنی مسند نشینی کی نوبت بجوا دی۔ عیاشی کا فاسد خون پہلے سے رگوں میں موجود تھا ہر وقت کی شاعری نے اسے اور بھی ترقی دی۔ اودھ کے عالموں سے علم اٹھ گیا۔ نغمہ و ساز رہ گئے۔ یا شاعری ـــ!

"جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ" یہ کہاوت "خم خانۂ جاوید" کے مولف کی قافیہ آرائی ہے یا ذہنی اختراع لکھنؤ میں دولت کے دریا بہہ رہے تھے نہ خزانے میں کروڑہا روپیہ جمع تھا۔ یہ محض فریب نظر تھا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا دکھائی دے رہی تھی۔ دلی کے سیکڑوں باکمال لوگوں کو آصف الدولہ کی کشش لکھنؤ لے گئی۔ لیکن انھوں نے وہاں پہنچ کر یہی محسوس کیا کہ ہم کسی طلسم ہوش ربا میں آکر پھنس گئے ہیں۔ آصف الدولہ کے پیش نظر شاعروں کی سرپرستی کم اور اپنی تفریح زیادہ تھی۔ اس نے شاعروں کی اتنی سرپرستی نہیں کی جتنا کہ ان کو رسوا کیا۔ ان کے معرکوں اور ہنگاموں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور یہ سلسلہ فکری استیصال تک جا پہنچا

میر سوز کو "کلام الملوک ملوک الکلام" پر فاقہ کر کر کے اصلاح دینی پڑی۔ میر حسن کیا چھوڑ کر مرے تھے کہ ان کا بیٹا گھر کی کفالت کرتا! اسے غزلیں بیچ بیچ کر گزر اوقات کرنا پڑی۔ میر حیدر علی حیراں اپنی تمام زمزمہ سنجیوں کے باوجود مفلس تھے مفلس رہے۔ حسرت دلی میں اچھے خاصے طبیب تھے، لکھنؤ آئے تو عطاری بھی راس نہ آئی۔

آصف الدولہ کی فیاضی دھوکہ تھی، دھوکہ جعل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے کسی بڑھیا سے کوڑی کی تسبیح لاکھوں میں خریدی تھی لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ حصول دولت کے لئے وہ حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں کے خاندانوں پر بہرستم سے گزرگیا۔ اس کی بے مروتی اور شقاوت نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جس عورت کا سامان لوٹا گیا وہ سعد اللہ خاں کی بیوی تھی۔ سعادت علی

نے آصف الدولہ کے خاندان کے ساتھ جو احسانات کئے تھے ان کا بدلہ اس کی املاک ضبط کر کے چکایا جا رہا تھا۔

قمرالدین منت نے بڑے ارمانوں کے ساتھ لکھنؤ میں قدم رکھا تھا لیکن آصف الدولہ کی بے رحم فیاضیوں نے جلد ہی اس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ یہ کہتے ہوئے لکھنؤ سے فوراً رخصت ہو گیا:

خوانِ کرم پہ تیرے ہے سیر ایک عالم! ہم بے نصیب اب تک پا پیٹ ہی بیٹھے ہیں

بے محل ہنسنے، گالی دینے، اور پھر فحش جواب کا ترکی بہ ترکی طالب رہنے والے نواب نے یہ طنز بھی حقے کی نے کا دھواں جا دیا۔ صلاحتیں بھنگ اور افیون میں تحلیل ہو گئیں۔

لکھنؤ میں قحط پڑا تھا اور لوگ بھوکوں مر رہے تھے تو آصف الدولہ نے ان کو فاقہ کشی سے بچانے کے لئے عمارتوں کی تعمیر کی منصوبہ بندی کی تھی۔ عمارتوں کی تعمیر کا کام راتوں میں ہوتا تھا تاکہ لکھنؤ کے شریف اور وضع دار لوگ بھی مزدوری کر سکیں۔ آصف الدولہ کی رعایا پروری کی یہ داستان مبالغہ سے خالی نہیں۔ عمارتوں کی تعمیر کا شوق آصف الدولہ میں ابتدا ہی سے تھا۔ یہ بات اس کے اس شعر سے بھی واضح ہوتی ہے:

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے عمارت بناتے چلے جایئے

ہر سمت اور ہر طرف عمارتیں بنانے کا جذبہ بڑا خوبصورت ہے۔ لیکن بسا اوقات اسی جذبے سے اقتصادی بدحالی اور معاشی بحران کی لہریں بھی اٹھتی رہی ہیں۔ اس جذبے کے مہیب انجام کو انتظام الدولہ خان خاناں کی بیٹی اور اس کی بیوی دلہن بیگم نے آغاز ہی میں دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکی:

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیر فلک خانۂ دل جو گرا ہے اسے تعمیر کرو

ادھر دکن میں حیدر علی نایک نے انگریزوں کو بری طرح کچل دیا تھا۔ حیدر آباد سے ملے ہوئے اور مدراس و ملیبار تک پھیلے ہوئے علاقے بے مغل دلیری کے سبب اس کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ارکاٹ کے میدان نے انگریزوں کی ساری عزت خاک میں ملا دی تھی۔ ان کو مالی اور فوجی امداد کی ضرورت تھی۔ ان کے نزدیک آصف الدولہ سے زیادہ بے شعور اور بے خرد کون ہو سکتا تھا چنانچہ آصف الدولہ نے ان کے کمانڈر انچیف کا الہ آباد پہنچ کر استقبال کیا۔ اس استقبال کی صورت کشی میر نے "ذکر میر" میں یوں کی ہے:

"ہر منزل پر نئی نئی ضیافت ہوتی تھی۔ نئے نئے خیمے، عجیب عجیب کھانے، ترکی و تازی گھوڑے، دیو پیکر ہاتھی، قیمتی لباس، جواہر کی کشتیاں، ان گنت میوے، تلواریں، چاچی کمانیں، ہر جگہ بہار دکھا رہی تھیں۔ ہر رنگ رنگارنگ فرش، نرم و ملائم بستر، معطر و معنبر ملبوس، سیمیں دیواریں، زرین دیواریں، زرین ایوان، سب مستی آفرین تھے۔ غرض کہ ایسی شان و شوکت کا مہمان، اور آصف الدولہ کا سا میزبان اب تک زمانے کی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔"

آصف الدولہ کے خزانے میں اتنا روپیہ نہیں تھا۔ لوگوں کی تنخواہیں روک دی گئیں۔ مناصب بند کر دیئے گئے۔ جاگیرداروں اور زمینداروں سے قرض لیا گیا پھر بھی استقبال کے اخراجات پورے ہوتے نظر نہیں آئے۔ ماں اور دادی پر تشدد کر کے چوبیس لاکھ روپیہ وصول کیا تھا۔ وہ چھ مہینے تک ستارہ اور پھر اتی بن کر مہمان داری کے کام آتا رہا۔

میر نے یہ کہہ کر جرأت کی ہنسی اڑائی تھی کہ وہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔ جرأت اندھا تھا۔ اس کو آصف الدولہ اور انگریزوں کے اتحاد کی اندھیرے میں دور کی سوجھی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کمانڈر انچیف نے لکھنؤ آ کر انگریزی اخلاق کی تکمیل کر دی ہے

ملک گیری کی ہوسناکیوں اور سفرکشی کی حرص پرستیوں کو آخری حد پر پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ اس کی فکر اس وقت کے بیشتر استادوں اور مبصروں سے بازی لے گئی:

کہیے نہ انھیں امیر اب نہ وزیر　　انگریز کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں　　بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

مصاحبوں نے یہ شعر آصف الدولہ تک پہنچا دیئے۔ اس پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ اس کی حمیت پورے اودھ کو اقتصادی بدحالی کے جہنم میں جھونک کر مطمئن تھی۔ سپاہی کم کئے گئے تو ان کا اسلحہ حیدر علی نایکسے کے کام آیا۔ ان ہی دنوں مصحفی کو بھی ان کی اپنی بدقسمتی لکھنؤ لے گئی۔ لکھنؤ کس کو راس آیا تھا جو مصحفی کو راس آتا۔ اس سم سم میں گرفتار ہوئے بغیر اس کی حقیقت نہیں کھلتی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ پہنچتے ہی ان کی زبان سے بے اختیار نکلا:

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے　　ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت　　اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

مصحفی کو لکھنؤ میں فراغت نہیں ملی۔ دربار کا توسل بھی بے سود رہا۔ دلی میں فارغ البالی نہ سہی دو وقت کی روٹی تو مل جاتی تھی۔ لکھنؤ آکر اس سے بھی محروم ہوگئے۔ ستر پوشی کے لئے کپڑوں کا سہارا بھی مشکل ہوگیا۔ غزلوں کی فروخت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ پیٹ کا جہنم بھر سکیں۔ بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے غیرت کا دامن بھی ہاتھ سے دے دیا:

شاہا کہ وسیع ہے ترا دست سخا　　گزرے کئی ماہ از لطف و عطا
انعام ہوا تھا جو دوشالہ مجھ کو　　رنگت کے لئے ہے وہ کھٹائی میں پڑا

یہ آصف الدولہ کی فیاضی کا حال تھا۔ مصحفی نے سخاوت کے واسطے دیئے، بھیک مانگی، وہ بھی نہیں ملی۔ اب آصف الدولہ کے امیروں اور مصاحبوں کے حال دیکھئے۔ مرزا نعیم اللہ خاں نے مصحفی کی بڑی قدردانی کی، اپنی سرکار میں ملازم رکھا۔ بہانوں اور تسلیوں میں کئی مہینے گزر گئے۔ مصحفی نے چھ مہینے نوکری کی لیکن ایک دن بھی تنخواہ کی صورت نہیں دیکھی۔ مجبور اور بے بس شاعر کس سے فریاد کرتا۔ آصف الدولہ کو ارزل اور پوچ نوکروں کی صحبت سے فرصت کب تھی۔ فرصت نکل بھی آئی تو کون غیرت مند ایسے نواب کو منہ لگاتا، جس کا دماغ اوباشی اور شراب نوشی نے خراب کر دیا تھا۔ مصحفی نے وہی کچھ کیا جو عام طور پر مجبور آدمی کرتا ہے۔ اپنی پوری بے بسی اور محرومی ان رباعیوں میں منتقل کر کے رکھ دی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ آصف الدولہ حسب مراتب سب کی سرپرستی کر رہے تھے:

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں　　تنخواہ کہاں نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے　　بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

دی بانٹ محل میں چن چن کے تنخواہ　　اور ہم کو بہانوں میں ٹالا کئی ماہ
انصاف سے کتنا دور ہے میر نعیم　　لاحول ولاقوۃ الا باللہ

لکھنؤ کی سیاسی اور سماجی خرابی دلی کے مہاجر شہزادوں پر بھی اثر انداز ہوگئی تھی۔ وہ دلی میں علم و ادب کے بارے میں مخلص تھے لیکن لکھنؤ میں مرغوں اور بٹیروں کی طرح شاعروں کو لڑا رہے تھے۔ سلیمان شکوہ نے اس جرم میں جرأت کی تنخواہ بند کر دی تھی کہ وہ اچھا مصاحب ثابت نہ ہوسکا تھا۔ جرأت نے اس کے اعتراض کا جواب بڑے تلخ پیرائے میں دیا تھا:

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں ہم　　　　کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دیوے

یہی قیامت مصحفی کے ساتھ بھی گزر گئی۔ استادی کا صلہ یہ ملا کہ پچیس کے پانچ رہ گئے۔ بوڑھے استاد نے فریاد کی تو لکھنؤ ادب پروری اور علم دوستی کا المیہ نظر آنے لگا:

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں ان کے　　　　ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لائق

استاد کا کرتے ہیں امیراب کے مقرر　　　　ہوتا ہے جو دو ماہ کے سائیس کے لائق

آصف الدولہ نے انتقال کیا تو گھر گھر برائیاں پھیل گئیں۔ برہان الملک کا خاندان برسرِ عام رسوا ہوگیا۔ آصف الدولہ کے تمام بیٹے حرامی النسل قرار دے دیئے گئے۔ خود اس کی بیوی اپنے شوہر کو نامرد کہتے ہوئے نہیں شرمائی۔ یہ افراتفری انگریزوں کے لئے رحمت تھی۔ ان کو بہانہ مل گیا۔ انھوں نے آصف الدولہ کے جلاوطن بھائی سعادت علی خاں سے سودے بازی کی۔ اس نے نصف اودھ انگریزوں کے حوالے کر کے حصولِ مسند کا خواب پورا کیا۔ آصف الدولہ کے وعدہ کے مطابق انگریزوں کو ۵۰ لاکھ، ۷۷ ہزار ۶ سو ۶۸ روپے کی رقم دی جاتی تھی۔ اس میں ۲۹ لاکھ ۴۲ ہزار ۳ سو ۶۲ روپے کا مستقل اضافہ ہوگیا۔ اودھ میں غریب رعایا پر قیامت ٹوٹ گئی زرِ تحصیلِ مالگزاری موت کا پھندہ بن گیا۔ عدل و انصاف منہ چھپا گئے۔ سعادت علی خاں کی فوج محض خوگیر کی بھرتی تھی۔ سپاہیوں نے بڑے فاقے جھیلے۔ تنگ آکر پانچ ماہ کی تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ سعادت علی خاں سمجھ رہا تھا تین ماہ کی تنخواہ نہیں دی سپاہیوں نے یقین دلایا کہ پانچ ماہ کی تنخواہ واجب الادا ہے۔ تین مہینے کی تنخواہ پر قضیہ ختم ہوا تو سپاہی موقوف کر دیئے گئے۔ نتیجہ میں بے کاری عام ہوگئی۔ سیاسی انتشار کے ساتھ معاشی بحران بھی آگیا ان حالات میں یہ مدح کتنی عجیب ہے کہ:

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا　　　　یارب سینے بنی میں ہمیشہ بنی رہی

سعادت علی خاں کا زمانہ ابتلا اور مصیبت کا زمانہ تھا۔ اس زمانے کی کیفیت غلام علی راسخ کے ان شعروں میں دیکھئے:

زراعت کا پیشہ بھی لے آب ہے　　　　تو رِعایاں تو نایاب ہے

سپاہی کی مٹی بھی اب ہے خراب　　　　کہ تیغہ ہوا نوکری کا تو آب

لکھوں خوش نویسوں کا احوال کیا　　　　نوشتہ پہ اپنے ہیں گریاں سدا

انگریزوں نے آصف الدولہ کے زمانے میں برہان الملک اور شجاع الدولہ کی عزت کو ننگا کر کے تلاشیاں لی تھیں جسم کی کھال تک کو ٹٹول لیا تھا۔ کہنے کو تین لاکھ اور حقیقت میں ۶۰ لاکھ وصول کئے تھے۔ سعادت علی خاں نے ان کی ملک گیری کی ہوس کو کبھی تیز کر دیا۔ مزارِ سعادت گردانِ ملکیت بن گئے۔ دیسی فوجوں کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں نے لے لی تو معاشی طور پر اودھ دیوالیہ ہوگیا۔ لنقار سعادت علی خاں کے مزاج میں دخیل تھے، ان کو دربار داری بھی آتی تھی۔ انھوں نے سعادت علی خاں کو مخاطب کر کے کسی وقت کہا تھا:

آئینہ عقل میں ہے ہنوز　　　　تیرا میرا کیا ہے ہنوز

لیکن جب انقار آج کے حالات میں یہ کہنے سے بھی نہیں گھبرائے:

جس پاس کروڑ لاکھ روپے کا بھی نہیں ملک　　　　اس شخص پہ اصلاً نہیں نواب کی پھبتی

اور بے کاری کا بھی طعنہ دیا:

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو — جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

شجاع الدولہ کی سرپرستی، آصف الدولہ کی فیاضی، سعادت علی خاں کی سخن فہمی، یہ سب بے حقیقت افسانے ہیں۔ ان میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کریں۔ ان کے خزانوں میں اتنا روپیہ نہیں تھا کہ وہ اس کا صحیح مصرف نکالیں۔ مصاحبوں کی کمی پوری کرنے کے لئے انھوں نے شاعروں کو لاسہ پر لگا رکھا تھا۔ اگر وہ واقعی دریا دل اور حاتم صفت ہوتے تو پھر منت، انشاء، رنگین، اور دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح پناہ گزین شہزادوں میں سلیمان شکوہ، جہاندار شاہ، فرخندہ بخت اور علی بخت اظفری کو لکھنؤ کے باہر جاکر پناہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔

میر کو آصف الدولہ نے لکھنؤ بلایا تو وہ یہی سمجھے کہ انھیں ایک ایسا آسرا مل گیا جو حوادث سے محفوظ ہے۔ یہاں ان کے دل نے زندگی کی دلچسپیوں کی گرم لہر محسوس نہیں کی۔ وہ جشنوں اور شکار کی مہموں میں بادل ناخواستہ جیتے رہے۔ دلی کی صحبتوں، جلسوں اور رنگ رلیوں کی یاد ان کے دل و دماغ کو ڈستی رہی :

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا — وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا — مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش
برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک — یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

میر کی تباہی اور بربادی کی یہ داستانیں ان کے شعروں کے ذریعہ دکن پہنچی تو وہاں کے ایک جاگیردار غلام حسین نے ان کو لکھنؤ سے دکن آنے کی دعوت دی۔ اس سے پہلے کہ وہ دکن کی راہ لیتے قضا نے ان کو موت کی راہ پہ گامزن کر دیا۔

(۱۷۰۰ تا ۱۸۰۰ء تک)

★

فہرست ماخذات :-

تواریخ :- تاریخ اودھ مولفہ نجم الغنی، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ مولفہ عبدالحلیم شرر، قیصر التواریخ مولفہ سید محمد زاہد، سیر المتاخرین، مولفہ غلام حسن، تاریخ ہندوستان مولفہ ذکاء اللہ، تاریخ پاکستان و بھارت مولفہ ہاشمی فرید آبادی

تذکرہ جات :- نکات الشعراء میر تقی میر، تذکرہ ہندی گویان مصحفی، تذکرہ ریاض الفصحاء مصحفی، تذکرہ گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطف۔ تذکرہ مجموعہ نغز قدرت اللہ قاسم۔ آب حیات مولفہ محمد حسین آزاد، گل رعنا مولفہ عبدالحی، خم خانہ جاوید مولفہ لالہ سری رام، تذکرہ شعرائے اردو مولفہ اسپرنگر، تذکرۃ الشعراء میر حسن، تاریخ ادب اردو مولفہ رام بابو سکسینہ، سودا مولفہ شیخ چاند، ذکر میر میر تقی میر، سرگزشت حاتم مولفہ محی الدین قادری زور۔ واقعات اظفری مولفہ علی بخت اظفری۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، مولفہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، دلی کا دبستان شاعری مولفہ نورالحسن ہاشمی، طبقات الشعراء مولفہ کریم الدین

دواوین :- کلیات سودا نول کشور، کلیات میر مولفہ عبادت بریلوی، دیوان میر حسن نول کشور، غزلیات میر حسن مولفہ [illegible] کلیات ناسخ نول کشور، کلیات مصحفی قلمی (لاہور)، دیوان جرأت علیگڑھ، کلیات انشاء نول کشور، دیوان حسرت مولفہ حسرت موہانی۔ کلیات جعفر زٹلی نول کشور۔ دیوان تاباں انجمن ترقی اردو۔ انتخاب یقین مرتبہ فرحت اللہ بیگ، دیوان فغاں انجمن ترقی اردو۔ دیوان راسخ، [illegible]

شیبِ جواں

جوش ملیح آبادی

ہر ایک موجِ نفس جاں نواز ہے اب تک — کہ دوشِ عمر پہ زلفِ دراز ہے اب تک

بتوں کے طوف سے کیوں روکتے ہیں اہلِ حرم — پکار دو کہ خدا کارساز ہے اب تک

رواں دواں ہے بگولوں میں دولتِ محمود — مگر حدیثِ جمالِ ایاز ہے اب تک

کبوترانِ حرم کے جوار میں ہے قفس — مگر وہی نظرِ شاہ باز ہے اب تک

مبصروں کا خدا ہے ازل سے غرقِ نیاز — مصلیوں کا خدا بے نیاز ہے اب تک

کبھی طلوع کی رَو نے جسے بجایا تھا — مرے غروب میں لرزاں وہ ساز ہے اب تک

صدائے نے سے ہوا تھا جو پر فشاں اک روز — رگِ حیات میں وہ اہتزاز ہے اب تک

کبھی جو کی تھی بغاوت مذاقِ تقویٰ سے — اسی شعارِ بغاوت پہ ناز ہے اب تک

محلِ شیب میں بھی ہے شراب و شاہد و چنگ — زہے نصیب کہ دل پاک باز ہے اب تک

نقوشِ خانقہ و چہرۂ فقیہاں سے — بایں زوالِ نظر، احتراز ہے اب تک

بزعمِ اہلِ درود و بجائے صوم و صلوٰۃ — کسی نگار سے راز و نیاز ہے اب تک

زہے جنوں کہ یہ کافر دل حقیقت سنج — خرابِ نرگسِ حسنِ مجاز ہے اب تک

حریمِ بادہ و محرابِ رقصِ ترکاں میں — ہزار شکر کہ مشقِ نماز ہے اب تک

طلوعِ صبح کا سر پر جلوس ہے پھر بھی — شبِ تصورِ خوباں دراز ہے اب تک

بلوغِ عمر سے ہموار ہو چکی ہے نظر — زمینِ دل پہ نشیب و فراز ہے اب تک

سن اے تصورِ تمکین و عمرِ امن پسند — اُن انکھڑیوں میں ذرِ فتنہ باز ہے اب تک

کبھی بتوں کے پگھلتے تھے جس سے دل اے جوش — وہ سر میں شعلۂ مرمر گداز ہے اب تک

نادرات

تذکرۂ مجمع الانتخاب کا ایک اور مخطوطہ

نثار احمد فاروقی

(۱)

دیباچہ :

تذکرۂ مجمع الانتخاب (۱) شاہ محمد کمال ساکن کڑا مانک پور، شاگرد قائم و جراءت کی تالیف ہے۔ اس کا زمانۂ تالیف ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳-۴ء) اور ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴-۵ء) کے مابین ہے۔ اس کا ایک مکمل نسخہ مکتوبہ ۵ ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ (مطابق ۵ فروری ۱۸۰۵ء روز سہ شنبہ) کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے جس کی تلخیص میں نے اشاعت کے لئے تیار کی ہے۔ یہ نسخہ (۸۱ ورق) اوراق کو محیط ہے اور خود شاہ کمال نے نواب تیار کرایا تھا، مگر اغلاط سے خالی نہیں ہے۔ دوسرا ناقص نسخہ، جو غالباً کمال کا مسودۂ اولیں ہے، اسی کتب خانے میں اور بھی ہے، جس کے بارے میں کتب خانہ سالار جنگ کے فہرست نگار جناب نصیرالدین ہاشمی کو علم نہیں ہو سکا اور انہوں نے اسے اپنی فہرست میں مجہول الاحوال کتابوں کی صف میں جگہ دی ہے (۲)۔ اس نسخے کا نورالامراء کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے تفصیلی تعارف اور تلخیص، اردو نامہ (شمارۂ چہارم، اپریل تا جون ۱۹۶۱ء) میں پیش کر چکا ہوں۔ تذکرۂ کمال کا تیسرا نسخہ جو میری نظر سے گذرا ہے، کتب خانہ

---

(۱) قاضی عبدالودود صاحب نے اردو نامہ (شمارہ چہارم) میں میرا مضمون ملاحظہ فرما کر یہ لکھا تھا کہ تذکرے کا نام "مجموعہ انتخاب" بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ اس سے تاریخ برآمد ہوتی ہے (=۱۲۱۸ھ) مجھے آن کی رائے سے اتفاق ہے، لیکن تذکرۂ کمال کے جتنے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں سب میں "مجمع الانتخاب" لکھا ہوا ہے۔ نسخۂ سالار جنگ تو خود کمال نے اپنی نگرانی میں تیار کرایا تھا، اس میں بھی "مجمع الانتخاب" ہی لکھا ہے (مثلاً ورق ۸۱ب/الف) اسی نسخے کے خاتمہ میں شاہ کمال نے ایک قطعہ تاریخ بھی دیا ہے جس میں شعر ہے :

مجمع الانتخاب جمع یہ آہ + تب ہوا ہے اے قبلۂ حاجات

علاوہ ہذا نسخۂ علی گڑھ میں بھی (ورق ۹ ب) پر یہی آیا ہے۔ میں نے عنوان میں اسی لئے یہ نام رکھا ہے۔

(۲) ہاشمی : کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست /۸۳۱-۸۳۲

انجمن ترقی اردو (ھند) علی گڑھ میں محفوظ ھے(۳) - یہ ناقص ھے اور اسی کا تعارف یہاں پیش کیا جاتا ھے - چوتھا نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ھے - اس کے بارے میں ایک مختصر سی یادداشت میں نے محب مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد (ریڈر شعبۂ علوم اسلامی، علی گڑھ) کے پاس دیکھی تھی - اُن کا بیان ھے کہ یہ نسخہ بہت خوشخط اور مکمل ھے - پانچویں نسخے کے بارے میں مجھے مخدومی قاضی عبدالودود صاحب (بیرسٹرایٹ لا ، پٹنہ) نے اطلاع دی ھے کہ کتب خانۂ ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) میں ھے - ان پانچ نسخوں کے سوا ، جن میں تین مکمل ھیں ، اور کسی نسخے کا ابھی تک سراغ نہیں ملا ھے -

تذکرۂ کمال کا نسخۂ انجمن ۱۷ سطری مسطر کے (۳۶۱) اوراق پر مشتمل ھے - ناقص الاخر ھونے کی وجہ سے کوئی ترقیمہ نہیں ھے - کلام سودا کے انتخاب پر تمام ھوجاتا ھے - اس کا دیباچہ بعض اھم لفظی اختلافات ھونے کی وجہ سے یہاں پورا نقل کیا جاتا ھے - نسخۂ سالار جنگ کے اختلافات حواشی میں ظاھر کردئیے گئے ھیں -

"[ورق ۱ب] . . . خاکپائے فقرا شاہ محمد کمال ، ولد سید قادر نواز خاں ، کہ اھل منصب و جاگیر بودند از شاہ جہان آباد ، در عہد آخر [ظل سبحان] (۱) محمد شاہ فردوس آرام گاہ (۲) ، پشت پا بدولت دنیائے بے ثبات زدہ ، ترک روزگار نمودہ ، (۳) در دارالسلطنت شاہ جہان آباد آمدہ (۴) ، بجناب قدوۃالواصلین شاہ محمد تقی صاحب ابن سید گسائیں (۵) ، اشرف اولاد غوث الصمدانی (۶) قدس‌اللہ سرہ بود ، مشرف شدہ (۷) بیعت و خلافت بخانوادۂ قادریہ گرفتہ ، ترک لباس کردہ ، بوساطت مرشد اکرم کہ فردوس آرام گاہ از آں جناب ارادت دلی داشت ، سندیک دیہات (۸) در پرگنہ صوبہ بہار کہ پنج کروہ بسمت مشرق است کہ موضع محی الدین پورنام دارد ، بنام خود مقرر کنانیدہ و فرمان [آں] از حضور حاصل نمودہ همراہ غلام محی الدین خاں صاحب خلف الصدق زبدۃ العارفین [بعظیم آباد] رسیدہ قصبہ آباد کردہ ، بنام مرشد زادہ موسوم

---

(۳) فہرست کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ھند) علی گڑھ نمبر شمار ۱۲۴ ، نمبر کتاب ۹۲۰

(۱) جو الفاظ قوسین میں ھیں اُن سے مراد یہ ھے کہ نسخۂ سالار جنگ (مکتوبہ ۱۲۱۹ھ) میں نہیں ھیں - (۲) سالار جنگ : "...فردوس آرام گاہ ، بموجب حکم ملازمان حضور عازم جنت البلاد بنگالہ نزد سراج الدولہ مرحوم گشتہ ، مخیم جاہ وجلال را دربلدہ مرشدآباد افراختہ ، چندے سکونت ورزیدہ ، پشت پا..." الخ (۳) سالار جنگ : "جانب عظیم آباد رھگرائے گشتہ باز بسمت شاہ جہان آباد..." (۴) سالار جنگ : "روانہ شدہ رخت اقامت افگندہ بجناب..." الخ (۵) سالار جنگ : کہ ابن حضرت سید گسائیں (۶) سالار جنگ : حضرت غوث الصمدانی (۷) سالار جنگ : رسیدہ ملازمت حاصل نمودہ بیعت... الخ (۸) سالار جنگ : سندیک دیہہ جہت اقامت... در صوبہ بہار متصل عظیم آباد کہ محی الدین پور نام دارد...

گردانیده، (۹) دران جائے، جائے خوابگاه آخرت یعنی مقبرهٔ خود روبروئے خویش مع مهمان سرائے و مسجد و خانقاه بنا کرده، بطور تکیهٔ درویشان ساخته، پا بدامن قناعت کشیده، در کنج انزوا آرمیده، بعنایت الهی بموجب ارشاد مرشد مشغول (۱۰) و سوائے دیهات (۱۱) مذکور مدد معاش زر خرید کرده پیش آن بهم رسانیده (۱۲)، معاش بخوبی صرف می ساخت۔ و خدمت فقرا و بزرگان و وارد و صادر بجان و دل بجا می آورد و بعد انقضائے (۱۳) چند سال مقام قالب عنصری گذاشته، سوئے قصر جاودانی شتافت و بهمون مقبرهٔ مذکور مدفون گردید۔ قصه کوتاه دران ایام سن فقیر قریب چهارده سال رسیده بود، شور سیاحت در سر هجوم آورده، چنانچه (۱۴) برادر کلان را بکفالت امورات مرجوعه (گذاشته) وارد فیض آباد در ابتدائے ایام وزارت نواب آصف الدوله مرحوم گردیده و احوال خوشدانیٔ خلائق که دران عهد بود چه بیان سازد، آن صحبت درین زمان خواب و خیال است۔ بعد انقضائے چهار سال وارد لکهنؤ گردیده۔ چون دل محبت منزل، مائل شعر و سخن بود، در فیض آباد مذکور همین مذکور باعث قیام مرزا صاحب مرزا رفیع سودا مرحوم و مغفور، که بموجب طلب بندگان نواب معز الیه حاضر شده بود، و میان حسرت صاحب و شاه واقف صاحب و میان جرأت صاحب سلمه الله تعالیٰ و دیگر مرثیه گویان مثل مرزا مرزا گدا علی صاحب گدا تخلص و مثل شیخ سعد الله سکندر تخلص وغیره مجتمع بودند۔ بازار شعر و سخن هندی بسیار گرم بود که گاه گاه شعرے و غزلے (۱۵) فقیر هم می گفت، لیکن [از باعث نو مشقی] بنظر کسے نمی گزرانید۔ چون که به لکهنؤ (۱۶) رسیده بشاگردی میان محمد قائم صاحب که شاعر (۱۷) مسلم الثبوت و شاگرد رشید مرزا صاحب

---

(۹) سالار جنگ: و نام بخشیدهٔ مرشد قبله گاهی مرحوم نیز همین بود دران جا مهمان سرائے و مسجد و جائے خوابگاه آخرت یعنی مقبره خود روبروئے خویش آراسته (۱۰) سالار جنگ: مشغول گشته (۱۱) سالار جنگ: دیهه (۱۲) سالار جنگ: پیش آن جائے نیز بکوشش بهم رسانیده و معاش بطور امیران صرف می ساخت (۱۳) سالار جنگ: امضائے (۱۴) سالار جنگ: برادر کلان خودرا بتمامی آراستگی امورخانه گذاشته بعظیم آباد که از مکان فقیر متصل بود بخانه عمون خود رسیده چند روز بالفت بهائی اسیر الله صاحب که برادر نسبتی فقیر هستند حق تعالیٰ سلامت دارد قیام نموده وارد فیض آباد من ابتدائے ایام وزارت نواب آصف الدوله مرحوم گردیده سه سال در مکان شفقت علی خان خواجه سرا بجکانه (کذا) میان مطبوع علی خان خواجه سرائے مختار کل بیگم صاحبه کلان یعنی والده ماجده نواب شجاع الدوله مرحوم بود و نیز خان مذکور مقام سکونت متصل عتبهٔ آن عصمت مآب داشت، فقیر بستر اقامت گسترده و نیز بوسیله آن خان مرحوم به سرکار بیگم صاحبه مرحومه سرشته معاش بعمدگی گشته بعد انقضائے سه سال وارد لکهنؤ شده چون دل تودد منزل مائل شعرو سخن بود در فیض آباد مذکور هم همین صحبت باعث قیام مرزا رفیع السودا مرحوم و مغفور که از فرخ آباد تازه بموجب طلب نواب معزالیه حاضر شده بود و میان حسرت صاحب و شاه واقف صاحب نیز قیام داشتند و اکثر اهل سخن و مرثیه گو میان سکندر و گدا وغیره مجتمع بودند..." الخ (۱۵) سالار جنگ: شعر و غزل (۱۶) سالار جنگ: فقیر به بلدهٔ لکهنؤ (۱۷) سالار جنگ:

مرحوم مذبور (۱۸) بودند، در آمده، (۱۹) مشق سخن می نمود (۲۰) [ودیوان صائب از قمرالدین منت می خواند لیکن درس عربی که پیش قبله گاهی مرحوم بود باعث شغل شعر هندی موقوف ماند۔] ازان جا به حضرت سلوان [که متصل کڑی مانک پور که قدیم مکان سکونت بزرگان فقیر است] رفته بر آستان عرش توامان ملازمان قبله راستان حضرت پیر و مرشد زمان سرخیل گروه پیش روان آرایش مسند فقر و قناعت و زینت بخش خرقهٔ تارکان دنیا، حضرت شاه کریم عطا صاحب مد الله جلالهٔ و نوالهٔ منسلک بخانوادهٔ چشت بموجب پیرویٔ بزرگوار که الولد سر لابیه (معنی از انست) فقیر شده و پشت پا به ما سوالله زده۔ چون مهاراجه ٹکیٹ رائے و هلاس رائے صاحب [نائب و دیوان وزارت نواب مرحوم و مغفور بودند] بکمال ارادت می خواستند که یکے پیروان آن جناب فیض بخش رونق افزائے [کلبهٔ] امارت باشد، درین اثنا فقیر از [حضرت] پیر و مرشد خود رخصت گرفته، به لکھنؤ وارد شده، از مها راجه ٹکیٹ رائے و راجا هلاس رائے صاحب موصوف ملاقی شده (۲۱) باین حد مجوز قیام فقیر شدند۔ دران (۲۲) ایام خطاب راجگی بیکے ازان هانه شده بود [صورت ترقی این ها] رو بروئے فقیر شده۔ [غرض] برائے بود و باش فقیر به ڈیهوڑهی خود، یک مکانے است متعلق باسام باڑه و مسجد، اگرچه مکان مختصر بود مگر جائے دلکشا و فرحت افزا که هر کنگره اش (۲۳) سر بلندی بر گنبد چرخ خضرا می زد و مسجد مانند مسجد اقصی، سر بازار واقع (۲۴) و انبوه خلائق از امیر تا فقیر زیر آن مکان (۲۵) می ماند، سکونت ورزید و نیز دل جمعی ما یحتاج کردند و خدمت فقیر بدل و جان می نمودند و بسیار برسوخ و اعتقاد پیش می آیند و ازان روز (۲۶) که فقیر قیام ساخته روز بروز ترقی جاه و جلال (۲۷) مها راجا و راجا [هلاس رائے موصوف] افزود [تا کجا شرح دهد] (۲۸)۔ فقیر را غیر از افکار سخن گفتن و نوشتن فکرے که

بسیار مسلم الثبوت (۱۸) سالار جنگ : مرحوم و مغفور (۱۹) سالار جنگ : در آمد (۲۰) سالار جنگ : وبسکه شوق اجتماع نمودن شعر بسیار بود، دیوانهائے اساتذه ریختیه گویان جمع می نمود، دوسه دیوان فارسی از طفولیت همراه داشت، یک و نیم سال در لکھنؤ قیام کرده ازان جابه حضرت قصبهٔ سلوان...الخ (۲۱) سالار جنگ : ملاقات کرده بسیار مجوز قیام فقیر...الخ (۲۲) سالار جنگ : چنان چه دران ایام براجا صاحب مذبور هیچ کار از حضور نشده بود و خطاب راجگی نیز روبروے فقیر شده۔ مهاراجه و راجا صاحب برائے بود و باش فقیر بر ڈیهوری خود که یک مکان بسیار بر بلندی بود و باسام باڑه و مسجد معروف اگرچه مکان مختصر بود مگر مقام دلکشا و فرحت افزا...الخ (۲۳) سالار جنگ : طعن سر بلندی (۲۴) سالار جنگ : وسر بازار واقع شده (۲۵) سالار جنگ : شبانه روز می ماند و ازان جا ڈیوڑهی مهاراجا هم چند قدم بود؛ معین فرمودند و نیز دل جمعی از مایحتاج نمودند (۲۶) سالار جنگ : ازان باز که فقیر نزد مکان راجا صاحب منزالیه قیام ساخته...الخ (۲۷) سالار جنگ : جاه و جلال راجه صاحب و مهاراجا می افزود (۲۸) سالار جنگ : مگر انچه از فقیر وعدهٔ چند دیهات معافی بود بظهور نه پیوسته

خاطر را در سلک اندوه و ملال آرد (۲۹) نبود و هر غزلیکه طبع زاد می شد (۳۰) بخدمت میاں [شاه] محمد قائم صاحب رحمته‌الله علیه می گز رانید و اصلاح می گرفت ـ چوں فلک شعبده باز هر جا که پیوستگی می بیند سنگ تفرقه می اندازد و در مقامیکه دو همدم را قریب ملاحظه می نماید [ورق ۳ ب] دوزمی‌سازد [الغرض بعد از چند سال (۳۱) میاں محمد قائم] حسب‌الطلب [نواب احمد یار خاں صاحب برادر زاده] نواب فیض‌الله خاں افغان جانب رامپور رهگرائے گر دیده ، هنگامیکه کمر عزیمت بسته خواستند که حرف و داغ را بطور پند برائے مشق سخن یادگار گذارند فقیر سوال نموده که حالا شعر گفتن (۳۲) موقوف شده سخن از که خواهم نمود (۳۳) زمزمه سازی آهنگ کلام از که خواهم (۳۴) آموخت که نے بے دم بفغاں نیاید و تار بے مضراب و ناخن مقام عشاق را از پرده (۳۵) بیروں نیا ورد و مطربیکه آواز ندارد چساں خواهد نالید ، فرمودند که میاں قلندر بخش جرأت درسخن سنجاں نظیر و در معنی آفریناں عدیلے (۳۶) ندارد ، اگر سحبان فصاحت [بیان] کلام [ایشان) می شنید ، غاشیه ، اذعانش بر دوش می کشید ـ طوطیان شیریں مقال را از بیان شکر افشانش حلاوت قندعاری (۳۷) غزل خود بنظر آں زمزمه ساز باید گزرانید فقیر بموجب فرموده عمل نموده ـ انچه غزلهامی گفت بنظر میاں [جرات] صاحب موصوف (۳۸) می گذرانید و بروز اصلاح که در هفته دو روز مقرر بود یعنی روز چهار شنبه و یکشنبه ، که همه شاگرداں یکجا شده (۳۹) غزلهائے خود می خواندند و اصلاح هر یک می شد [این صحبت و جلسه در تمام شهر هیچ جا نبود] (۴۰) و بر حال فقیر چنداں (۴۱) التفات و اشفاق می فرمودند [که] از تحریر وتقریر بیرونست ـ حق سبحانه ، [جل‌شانه] (۴۲) دبر گاه سلامت دارد (۴۳) و چوں غیر از سخن انیسے و بجز شعر جلیسے از عالم طفولیت بنظر نیامده ازین جهت تا نوزده سال از شوق کمال نقل دواوین اساتذه [ورق ۴ ـ الف] یعنی هر که صاحب دیوان بودند به تمام و کمال دیوان نویسانیده ، باین طور که یک شعر فرو گذاشت نشده ، و هر که نو مشق و کم گو بودند شعر و غزل و مثنوی و فرد و مخمس و منقبت و مرثیه و سلام ، هر چه کلام

باعث غفلت ملتوی ماند چناں‌چه بعد ابتری معامله تاسف بدل سهاراجا وراجا صاحب بسیار ماند غرض تا کجا شرح دهد بجمیع او صاف موصوف بودند ـ فقیر غیر از افکار...الخ (۲۹) سالار جنگ : اندازد (۳۰) سالار جنگ : طبع زاد رقم می کرد (۳۱) سالار جنگ : دریں اثنا بعد از یک دو سال حسب‌الطلب فیض الله خاں افغان جانب رامپور...الخ (۳۲) سالار جنگ : شعر گفتن فقیر موقوف شده مشق سخن...الخ (۳۳) سالار جنگ : وزمزمه سازی (۳۴) سالار جنگ : خواهد (۳۵) سالار جنگ : از مقام پرده (۳۶) سالار جنگ عدیل (۳۷) سالار جنگ:شکر افشانش گرم بازاری و از چاشنی گفتارش حلاوت قند...الخ (۳۸) سالار جنگ : مذبور (۳۹) سالار جنگ: مجتمع شده غزلهائے خود...الخ (۴۰) سالار جنگ: و فقیر هم در جلسه هائے خود اصلاح فی کنانید (۴۱) سالار جنگ: چنداں که(۴۲)سالار جنگ: و تعالیٰ (۴۳) سالار جنگ:

معقول بدست می آمد و بخاطر پسند می افتاد ، آن را نیز یک جا جمع می ساخت ۔ چنان‌چه اسم شریف همه بزرگواران ، که صاحب دیوان بودند و فقیر کلیات آن ها داشت ، از تفصیل فهرست که در آخر کتاب انتخاب قلمی شده (۴۴) هویدا خواهد شد ۔ و خدمت شعرا این قدر بجامی آورد که کسے اهل سخن از فقیر به هیچ امر(۴۵) رنجیده‌ نشده ، وکسے نخواهد بود که بر حال فقیر اشفاق و التفاتے نداشته باشد یا که بمکان فقیر از راه کرم قدم رنجه (۴۶) ننموده باشد و مبلغ خطیر(۴۷) دریں کار صرف نموده ومدتها در همیں فکر عمر گران مایهٔ خودرا تلف نموده ، (۴۸) ایں قدر اشعار بهم رسانیده که در کتب خانهٔ [آصف الدوله مرحوم نبودند] (۴۹) ونه جائے دیگر ۔ و فقیر اکثر تصویر صاحب دیوان (۵۰) [یعنی مرزا رفیع سودا مرحوم و مغفور و میر محمد تقی صاحب سلمه الله تعالیٰ و میر حسن صاحب و میاں محمد قائم صاحب مرحوم و مغفور وغیره] قریب بیست شعراٴ صاحب دیوان جمع نموده بود که بودن تصویر سبب اعتبار است ۔ [چوں هنگا میکه تالیف دواوین تمام و کمال مع شعر متفرقات از وزیر تا بادشاه و از امیر تا فقیر مع شاعر قدیم دکهنی یک جا گر دیده بسیار بارگراں بنظر آمده ۔ چناں چه از هماں وقت ملحوظ خاطر بود که ازیں دواوین انتخابے که کسے بایں طور ننموده و نایں قدر اشعار[۴ب] هندی کسے جمع کرده باشد ، تیار سازم که بصفحهٔ روزگار یادگار بماند وهرجا که بروم همراه باشد ، احتیاج اشعار دیوان کسے نماند ۔ مگر فرصت نمی یافت ۔ ایں گرانیٔ بار دواوین که احمال آں غیر از بار اشتراں محال بنظرمی گذرد ، خصوصاً درسفر دشوار تر ، زیرا که درعالم آزادگی شمیم راخرقهٔ کل بارگراں وکل‌را مانند کوه قطرهٔ باراں ۔ مجردآں را از قید بضاعت چه کار ۔ مگر از شوق لاچار و آزاداں را بند تعلق سلسلهٔ پایدار ، چناں چه همیں بار در راه سفر حیدرآباد از لکهنؤ تا ایں جا که به سنه یک هزار و دو صد و پانزده (۱۲۱۵ ه) هجری گردیده بود ، سه اشتر جوان و یک راس اسپ کلاں صرف از بار دواوین براه از پا فتادند ۔ قصه کوتاه دراں میاں] (۵۱) رفته رفته ایں خبر(۵۲) بحضور نواب سخن آفریں ، شعر پسند ، معنی پرور وزیرالممالک (۵۳)نواب آصف الدوله رسید ۔ یکے روز [بحضور برائے ملاقات طلبیده] (۵۴) بسیار بجوشش فرمودند که شاه

سلامت با کرامت دارد و چوں... الخ (۴۴) اتفاق سے یہ فہرست تذکرۂ کمال کے کسی نسخے میں دریج نہیں ہے ۔ اگر دستیاب ہو جائے تو بہت کارآمد ہوگی ۔ (۴۵) سالار جنگ : از فقیر بکسے...نه رنجیده الخ (۴۶) سالارجنگ : کرم ننموده باشد (۴۷) سالار جنگ : صدها روپیه (۴۸) سالار جنگ : فقط به شوق شعر تلف نموده (۴۹) سالار جنگ: که در کتب خانه نواب وزیر که بیشتر مذکورش خواهد آمد نه بود ، و نه بکسے دیگر جائے در لکهنؤ جمع بودند (۵۰) سالار جنگ : و فقیر اکثر تصویر صاحب دیوان که نامی بودند کشا نیده ، لوح و جدول طلائی کنا نیده قریب بیست دیوان بایں طور جمع نموده بود که باعث تصویر زیاده اعتبار داشت ۔ (۵۱) نسخهٔ سالار جنگ میں یہ عبارت نہیں ہے (۵۲) سالار جنگ : ایں خبر زبانی مهر سوز صاحب مرحوم و مغفور بکسے قالب بحضور الخ (۵۳) سالار جنگ : نواب وزیرالممالک جنت آرام گاه نواب الخ (۵۴) سالار جنگ : یکے روز ملاقات شده بسیار بجوشش ارشاد فرمودند الخ ۔

صاحب کارے نموده اند که بچندیں شوق ومشقت دواوین جمع کرده اند(۵۵) که (در) قیاس نگنجد، فقیر ایں قدر متوجه شده خاموش شدند ـ بعد یک سال یک روز سوارئی فیل فرستاده و فقیررا باعزاز و اکرام بطور یکه سابق هم یاد می فرمودند طلب فرمودند ـ که نزد صاحب دواوین اساتذه بسیار بصحت (۵۶) جمع شده اند اگر مارا بدهند بحضور ما هفت صد خوشنویس [نوکر] هستند بیک روز نویسانیده فرستاده خواهدشد ـ وقسم فرق مبارک خود دادند ـ فقیر لاچار [بمکان خود آمده] (۵۷) همه دواوین واجزاے اشعار متفرقات که بمحنت نوزده سال جمع شده بودند] براے نقل یک بار روانهٔ حضور نموده ـ بسیار از فقیر خوش شدند وهم چنیں شده که بعرصه ده روز نقل [کنا نیده و گرفته] (۵۸) که از یک صد دیوان زیاده بودند [ورق ۵ ـ الف] ـ پیش فقیر مع ده هزار روپیه نقد ویک دو شاله الفی ویک رومال الفی که شاید چشم فلک هم ندیده باشد واکثر تاجران کشمیر بملاحظهٔ آن بعالم حیرت می آمدند وقسم می خوردند که من ایں قسم دو شالهٔ الفی ندیده ـ [دوشاله] در طولانی شش درعه [ودر عرض دونیم درعه بطور نذر و سرفراز خلعت عنایت فرمودند] (۵۹) ونقل همگیں دواوین که شده بودند (۶۰) بعد تناول خاصه [روز] یک دو ساعت مقرر [دانسته بودند] (۶۱) ملاحظه می فرمودند ـ ونقل دیوان [کلیات] میاں جرأت صاحب که شده [بسیار زخیم (کذا)] بود (۶۲) هر لحظه بر پلنگ می ماند [ومعمول حضور همیشه چنیں بود که دیوان کلیات مرزا صاحب مرزا رفیع سودا بر پلنگ می ماند ازاں باز که کلیات میاں جرأت صاحب بحضور گذشته بجائے آں دیوان مذکور میاں جرأت می داشتند و از مطالعه آں مسرور می شدند و می فرمودند که مارا کیفیت کلام جرأت معلوم نبود ـ در شهر ما سوداے جواں پیدا شده است ـ بار ها ایں کلمه می فرمودند] (۶۳) بعد از چند سال فرمودند که باز همگیں دواوین اگر براے صحت بدهند بعرصهٔ قریب صحت کنانیده خواهم فرستاد ـ و فقیر بموجب فرموده همه دوانین (کذا) روانه حضور [بدستور] ساخته و اتفاق وقت [ازخواهش الهی] چنیں شده که بعد [از] چند روز مزاج مبارک [نواب صاحب] (۶۴) علیل گشته،

---

(۵۵) سالار جنگ: جمع نموده اند (۵۶) سالار جنگ: خوب بصحت (۵۷) سالار جنگ: پذیره آمده و پانصد همراه فقیر در یک تهیلی نموده دادند که روپیه نیاز به شاه صاحب بگو یند که قبول شود غرض فقیر بصلاح راجا صاحب مذکور گرفته ودواوین مذکور براے نقل ایکبار... الخ (۵۸) سالار جنگ: بعرصه ده روز نقل همه دواوین که از پنجاه زیاده بودند گرفته پیش فقیر دواوین و باز پانصد روپیه ویک دوشاله یعنی رومال الفی که شاید چشم فلک هم ندیده باشد الخ (۵۹) سالار جنگ: ورو مال هم در طولانی ایں قدر بود که فرد شال بود عنایت فرمودند (۶۰) سالار جنگ: شده بود (۶۱) سالار جنگ: مقرر بود که ملاحظه می فرمود (۶۲) سالار جنگ: بالله که هر لحظه بر پلنگ می ماند واز مطالعهٔ آں مسرور می شدند (۶۳) سالار جنگ: باز یکسے روز از فقیر بمکان راجا مذکور ملاقات شده فرمودند که امروز صاحب دیوان خود طلبیده پیش ماخوب غزلهاے خود بخوانند، چناں چه فقیر قریب پنج شش غزل و یک مخمس فقیرالله خواند بسیار مسرور شده مخاطب بفقیر شدند که اگر براۓ صحت باز همگیں دواوین به‌فرستند بعرصهٔ چند صحت کنانیده خواهم فرستاد، فقیر بموجب فرموده الخ (۶۴) سالار جنگ: حضور

مناسب طلب دوانین مرقومیں (کذا) نمی دانست۔ دریں اثنا سرائے دنیائے دنی را پشت پازده در قصر خلد بریں که منزل جاودا نیست رخت [ورق ۵ ب] افگنده ، همه دواوین فقیر برباد شده [و کارجمع نمودن انتخاب ملتوی ماند] و غم نواب مرحوم بخاطر فقیر از غم دیوان (۶۵) که چیز [ے] شوق (کذا) بود دو چنداں آمده (۶۶) ولوله وحشت پیدا شده (۶۷) مگر بعضے بعضے مسوده که نایاب بودند [حالا] هم نزد فقیر موجود اند بدست داشت و مسوده (۶۸) دیوانے که پیش فقیر نبودند باز صدها روپیه خرچ نموده ، نقل کنانیده ، (۶۹) مگر ایں مسوده ایں قدر صحیح هستند که قدر ایں بفقیر است [و ازیں مسوده هائے خود فقیر عشق دارد] (۷۰)۔ مگر تصویر معدوم گشت ۔ داغ ایں پر طاؤس (۷۱) بدل رسیده ۔ بعد انتقال نواب [مرحوم] (۷۲) بعرصهٔ یک و نیم سال مهاراجا ٹکیٹ رائے نیز فوت کرد ۔ (۷۳)۔ فقیر بمقامیکه قیام داشت بخاطر آشفتگی بظهور آمد (۷۴) ورنگ دگرگوں شده [فقیر همه دواوین اساتذه و کبوتراں که شوق ایں از طفولیت دامن گیر است یکا یک از راجا هلاس رائے که قائم مقام مهاراجه بود رخصت خواسته ۔ اگرچه بسیار سد راه فقیر شدند] (۷۵) فقیر دل شکنی راجا صاحب مذبور نموده بر خواسته بر آستان (۷۶) عرش مکاں مرشد برحق وهادی مطلق رهگرائے گردیده سعادت ابدی حصول نموده چهار ماه (۷۷) بحضور [عالی] سکونت ورزیده ۔ چوں عزم سیاحت درسر داشت رخصت خواسته ، کمال غم مفارقت حضرت پیر و مرشد خود بدل فقیر آمده ۔ چنداں که ملازمان حضور (۷۸) از پند ونصائح سدراه گشتند ، آب و دانه نگذاشت که ساعتے بیاساید ۔ کشاں کشاں جانب حیدرآباد آورد نظر بر (۷۹) [قدر شناسی وسخن سنجی و فقیر پروری سلطان تاجدار دکن سرفراز رحمت ذوالمنن بندگاں (ورق ۶ ـ الف) سکندر جاه بهادر گیتی پناه:

آں صفدرے که اسم سکندر بدو سزاست
واں سرورے که اسم سلیماں از و عیاں

---

(۶۵) سالار جنگ: دواوین خود (۶۶) سالار جنگ: صد چند آمده (۶۷) سالار جنگ: پدیدار شد (۶۸) سالار جنگ: وبرمسوده (۶۹) سالار جنگ: تاهم باعث جلدی بطور مسوده گردیده ، مگر ایں الخ (۷۰) سالار جنگ: و فقیر اکثر ، از مسوده مولف عشق دارد مگر تصویر شعرا معدوم گشت (۷۱) سالار جنگ: چوں طاؤس بدل الخ (۷۲) سالار جنگ: نواب وزیر (۷۳) سالار جنگ: فوت نموده (۷۴) سالار جنگ: آمده (۷۵): رنگ دگرگوں شده ، تیاری اشتر و چوپاله وبا (بو) نموده بعزم سفر دکن یکایک از راجا هلاس رائے صاحب رخصت خواسته اگرچه تا دو سه ماه سد راه فقیر بودند ، فقیر دل شکنی راجا صاحب مذکور نموده الخ (۷۶) سالار جنگ: بهآستانهٔ (۷۷) سالار جنگ: شش ماه (۷۸) سالار جنگ: حضور حضرت پیر و مرشد بر حق سد ره راه فقیر الخ (۷۹) سالار جنگ میں یہاں سے دیباچے کی عبارت بالکل بدل جاتی ہے ، چوں کہ وہ نسخہ نواب نورالامرا بہادر کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لکھا گیا تھا ، اس لئے انہیں کی تعریف ، تقریب ملاقات ، توسل اور قدر دانی کا ذکر ہے ، اس کے برخلاف نسخۂ انجمن میں نواب سکندر جاہ اور نواب میر عالم کی مدح کی گئی ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ان میں سے کسی کو نذر کرنے کے لئے تیار کرایا گیا تھا ۔ نشان زدہ عبارت کے بعد نسخۂ سالار جنگ میں یہ الفاظ ہیں :

سخن طرازے کہ چوں ناطقہ را بہشکر افشانی برکشاید سخنان بزنگ طوطی تصویر گردد ـ از فصاحت سخن سنجی او امرء القیس مضطر ـ ضفدر یکہ رستم ہجا پیش او زال و شیر ژیان مانند شغال می نماید ، نمودہ قیام ساختہ، بعد ازاں بخدمت نواب مستطاب معلی القاب میر عالم بہادر من ابتدائے دیوانی رسیدہ ملاقات نمودہ ازاں ایام بخاطر خطور کردہ ، انچہ مسودہ عمر گران خود را صرف نمودہ مجتمع کردہ بود ، ہمراہ داشت و موافق ما یحتاج نیز از حضور میر عالم بہادر مقرر یافتہ فرصت وقت بود ـ سہ سال شبانہ روز درس کار مشغول بودہ با تمام رسانیدہ ـ وقتیکہ تالیف دواوین تمام و کمال مع شعر متفرقات بلکہ بعضے بعضے شاعر دکھنی قدیم ، و جدید کہ حالا بحیدرآباد اند ، بایں طور ایں جانب دواوین ردیف وار باسم شعرا بموجب قاعدہ حروف تہجی نمودہ ہر کسے کہ صاحب دیوان بودند از ابتدا تا انتہا ملاحظہ کردہ ہر قسم اشعار کہ پسند آمد نوشتہ شدہ ہر کسے کہ صاحب دیوان نبودند شعر آن ہا داخل کردہ‌ام ، فروگذاشت نشدہ ـ اگر کسے یک شعر ہم گفتہ است بنام آن داخل کردہ‌ام ـ بعد حمد و نعت اول یک شعر تبرک حضرت ظل سبحانی شاہ عالم پادشاہ غازی کہ توصیف باریافتگان حضور اظہر من الشمس است متخلص بآفتاب و اشعار کلام الملوک ملوک الکلام کہ چند اشعار آبدار عندالضرورت بدست آمدہ، بقید قلم آوردہ ـ بعد ازاں شعر نواب وزیر مرحوم نوشتہ بعد ازاں ہمیں طور ردیف‌وار بقید اسم شعرا مندرج [۶ب] نمودہ شد و این تذکرہ در ۱۲۱۸ یک ہزار و دوصد و ہجدہ

"...نظر بر شناسائی قدیم نواب مستطاب معلی القاب خورشید سپہر بختیاری و نیر صبح اقبال تاجداری نواب نورالامرا بہادر کہ بوقت روانگیٔ حیدرآباد ، فقیر در چھاؤنی دارا نگر حاضر شدہ بود و پانزدہ روز در چھاؤنی کہ تکیۂ درویش بود و چند روز در قصبۂ دارا نگر ، و بہمان عرصہ یک غزل دعائیہ گفتہ بحضور نواب صاحب بمقدمہ سفر دکن بنا بر تفاؤل نذر گذرانیدہ بود چناں چہ بر سبیل مذکور بقید قلم می آرد اینست : (اس کے بعد ایک غزل کے (۹) اشعار دئیے ہیں ، مطلع ہے :

موسم دے ہے ہوا تبریک گویہ لالہ زار   غم نہ کھا ، بعد خزاں آتی ہے پھر فصل بہار

...بعد ازاں چند روز کوچ نواب صاحب معزالیہ از دارا نگر مذکور بطرف حیدرآباد گردیدہ تا شہر دہلی فقیر ہمراہ بود ـ بعد ازاں بطرف اجمیر برائے زیارت فقر راہی شدہ ، غرض وقتیکہ ایں خاکسار بحضور نواب صاحب رسیدہ ملاقات ساختہ بسیار بہ تلطف و کرم پیش آمدہ خورسندی دلی کہ بضاعت درویشاں است بدست آوردہ ، کامیاب گشتہ، ملاقات از شاہ و وزیر بخوبی با عزاز تمام کنانیدہ و خود خدمت بذل می فرمایند و الآنہ ہنوز از در کسے فقیر آگاہ نیست حق جل شانہ صدو بی سال سلامت با کرامت داود بحق محمد و آلہ الا مجاد ـ چوں ہنگامیکہ تالیف دواوین تمام وکمال مع شعر متفرقات ازوزیر تا پادشاہ ـ واز فقیر تا امیر مع شاعر دکھنی قدیم مع سعدیٔ شیراز کہ مذکوراین بزرگوار و انتخاب ریختہ خواجہ آں ایجاد ریختہ کہ بنا کردۂ اوست، و از اشعار شعرائے حیدرآباد کہ حالا موجود اند حق تعالی ہمہ را سلامت دارد نیز بانتخاب داخل نمودہ و اسامیان سہ تذکرہ یعنی یکے سید مصحح قلم صاحب مرحوم و دیگر میاں مصحفی صاحب و سوم میر محمد تقی ـ سلمہ اللہ تعالی، یک جا گردیدہ و ہمہ از نظر فقیر گذشتہ

هجری ترکیب یافته ۔ باعث افراط اشعار مجمع الانتخاب نام نهاده شد وقطعه تاریخ ابن نیز فقیر در آخر جلد این انتخاب گفته ، داخل است ۔ حالا صرف مصرعه تاریخ برائے دریافت سنه می نویسم ، مصرع اینست :

"جنگ اشعار و مجمع ابیات" (۱۲۱۸ ھ)]

۱۲۱۸ھ

(۲)

متن تذکرہ

تعداد تراجم شعرا اور ان کی تلخیص

اس نسخے میں [ورق ۸ ۔ الف] کے حاشیہ پر بھی لکھا ہے " تذکرہ ، دریں جلد اشعار همه شعرا مندرج است از باعث افراط اشعار و مجمع الانتخاب، نام نهاده شد" ۔ اس بات کے لئے متعدد قرینے موجود ہیں کہ یہ نسخہ انجمن بھی شاہ کمال کی نگرانی میں لکھا گیا ہے اور عجب نہیں کہ انہوں نے اس کی تصحیح اور نظر ثانی بھی کی ہو ۔ دیباچہ اس میں مکمل ہے اور نسخہ سالار جنگ میں ناقص ہے ۔ علاوہ بریں دیباچے کی آخری عبارت (جسکی نشان دہی کی گئی ہے) دوسرے کسی نسخے میں نہیں ملتی ۔ املا اور انشا کی متعدد غلطیاں تقریباً ہر نسخے میں ملیں گی ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاہ کمال معمولی علمیت کے آدمی تھے ، ان کی فارسی بھی پر غلط اور کچہری کے ڈھب کی ہے ۔ یہاں نسخہ انجمن کی تلخیص پیش کی جاتی ہے ۔ قوسین میں (= م) سے مراد یہ ہے کہ حالات وہی ہیں جو نسخہ سالار جنگ میں ملتے ہیں ، اگر اضافہ ہوا ہے تو اسے ظاہر کر دیا گیا ہے ۔ جن شعرا کے تخلص کو زیر خط کر دیا گیا ہے ۔ ان کا ترجمہ نسخہ انجمن میں نہیں ہے ، صرف انتخاب درج ہوا ہے ۔

بسیار بار گران منظر آمده چنان چه از همان وقت ملحوظ خاطر بود که ازیں مجوعه اشعار انتخابے بطور خود که کسے بایں طور هنوز در ریخته نوشته و تا این قدر اشعار جمع کرده تیار سازم که بصفحه روزگار یادگار بماند و تادم زیست همراه باشد مگر فرصت وقت نمی یافت که این گرانی بار دیوان که احمال آن غیر از بار اشتران محال بنظرمی گذرد خصوصاً در سفر ، فقیر را دشوار تر ، زیرا که در عالم آزادی شمیم را خرقه گل بار گران و گل را مانند کوه قطره باران ، مجردان را از قید بضاعت چه کار مگر از شوق لاچار و آزادان را بند تعلق سلسله پابداو چنان چه همیں بار در راه حضر حیدرآباد از لکهنو تا این جا یک اشتر جوان و یک راس اسپ ماده کلان صرف از بار دواوین همراه از پا افتادند ۔ صرف فضل الهی شامل حال بود که بخیریت تمام مع دواوین اساتذه بحیدرآباد رسانیده ۔ دریں هنگامه میل خاطر ملازمان نواب صاحب معزالیه سلسله جنبان انتخاب دواوین اساتذه وغیره گشته که یک انتخاب بطور خود شعر ریخته گویان یک جا کرده دهند کمنار همه یاد گرے بماند ۔ فقیر بموجب فرموده نواب معلی القاب که از مدتے منظور خاطر نواب مستطاب معلی القاب نواب آصف الدوله ......

یہاں نسخہ سالار جنگ کا دیباچہ اچانک ختم اور متن تذکرہ شروع ہو جاتا ہے ۔ اس اعتبار سے سالار جنگ اور انجمن کے نسخوں میں بہت فرق ہے ۔ نسخہ انجمن میں بعض شعرا ایسے بھی ہیں جن کے تراجم نسخہ سالار جنگ میں نہیں ملتے ۔

(۱) [۱-الف] آفتاب (۱) - (۲) [۱ب]
آصف‌الدولہ (۳) [۶ب] اثر (۴) [۱۰-الف]
اکبر تخلص عرف بہچو (=م) (۵) [۱۲ الف]
ادھم (= م) (۶) [۱۲ ب] آغاز (= م)
(۷) [۱۳ - الف] امیر (= م)
(۸) [۱۴ - الف] احمد یار خان افسر ...
ولد نواب محمد یار خان... فقیر وقتیکہ برام‌پور
رفتہ بود (۲) چند شعر در بیاض فقیر ... خود
نویسانیدہ بودند ... ' (=م) (۹) [۱۴ب]
آبرو (=م) اشعار تذکرہ مصحفی سے اخذ کئے
ھیں - (۱۰) [۱۵ - الف] " از شیخ
امیرالزمان متوطن لکھنؤ اوباش تخلص نیز از
تذکرہ‌سیان مصحفی صاحب نوشتہ - (۱۱) الہام
(= م (۱۲) [۱۵ ب] الم (=م)
(۱۳) امجد (۱۴) [۱۶ - الف] امانی
(= م) (۱۵) احسن (= م) (۱۶)
[۱۷ ب] آشفتہ (=م) (۱۷) [۱۸-الف]
امین (=م) (۱۸) احقر (=م) (۱۹)
آشفتہ (=م) (۲۰) [۱۸ ب] افسر (=م)
(۲۱) اکبر علی خان اکبر - مصرع تاریخ
وفات : " باب جنت میں جا ہوئے داخل "
(۲۲) [۲۰ ب] محمد افضل (=م) (۲۳)
آزاد (=م) (۲۴) اشتیاق (=م) (۲۵)
انسان (=م) (۲۶) [۲۶ - الف] اکرم
(=م) (۲۷) انجام (=م) (۲۸) امید
(=م)
(۲۹) [۲۶-الف] میر شیر علی صاحب
افسوس تخلص، نقل دیوان از میر صاحب
در لکھنؤ گرفتہ بودم، چنانچہ از ھمان دیوان
اتفاق انتخاب اشعار و غزلہاے، بشہرحیدرآباد
بفرمایش نواب نورالامراؑ بہادر ساختہ - " (۳)
(۳۰) [۳۴ب] ارمان (=م)
(۳۱) [۳۶ - الف] یہ عبارت بعد
میں حاشیہ پر غالباً خود شاہ کمال کے قلم سے
اضافہ ہوئی ہے - (۴)

" میر امان‌اللہ خان صاحب ولد میر نجم
خان ایمن تخلص، متوطن شہر حیدر آباد
شاگرد معلوم شدہ سہ کس ہستند اول شیرمحمد
خان صاحب دوم میر جان امیں صاحب کہ
فاضل اند، سوم تجلی شاہ درویشے بودند بعہد
میر نظام علی خان رئیس دکن - بجمیع فنون
ممتازی و مصور و خوش نویسی غرض‌تا کجا
نویسد، این چند اشعار بر سبیل مذکور بوقت
روانگی فقیر سمت ہندوستان از دست خان
صاحب موصوف کہ از فقیر بسیار ربط و اتحاد
دلی بود، بدست آمدہ بود، داخل مجمع‌الانتخاب
نمودہ شد - تا بر صفحۂ روزگار یادگارے ماند -
حق تعالیٰ سلامت دارد - یک روز قبل از
رخصت شہر حیدر آباد نوشتہ شدہ روز
چہارشنبہ سیوم ماہ ربیع الاول ۱۲۲۴ھ " (۵)

۱- نسخۂ سالار جنگ میں شاہ عالم آفتاب کا ترجمہ نہیں ہے - آصف الدولہ کے کلام سے آغاز ہوا ہے - (۲) نسخۂ انجمن میں یہاں حاشیہ پر سفر رامپور کا سنہ (۱۲۱۲ھ) لکھا ہوا ہے - (۳) نسخۂ سالار جنگ میں [۳۸ - الف] افسوس کے کلام کا انتخاب موجود ہے لیکن ترجمہ نہیں ہے - غالباً کچھ اوراق غائب ہیں -

۴- نسخہ سالار جنگ میں ایمن کا ترجمہ نہیں ہے -

۵- اس سے کمال کے حیدرآباد سے واپس آنے کی تاریخ کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ وہ ۳ ربیع الاول

(۳۲) [۳۶ب] غزل از میر احسان متوطن حیدر آباد کہ از فقیر بسیار ربط داشت بطور یادگار می نویسم (۱)
(۳۳) [۳۹ - الف] نشا (= م)
(۳۴) [۷۷ - الف] میر اکبر علی اختر (=م)
(۳۵) [۷۸ - الف] ایمان (= م)
(۳۶) [۸۱ ب] آفاق (= م)
(۳۷) [۸۷ - الف] ایما تخلص، اسمش میر حسین علی خان متوطن اورنگ آباد دکن است - مرد میدان سخنو ریست و آفتاب سپہر نکتہ پروری - در ستایش او لب کشادن داد خامہ فرسائی دادن است - در عہد سکندر جاہ سنہ ۱۲ حیدر آباد آمدہ بزمرہٗ مصاحبان مہاراجا چندولال بہادر داخل شدہ بہ منصب پانصدی سرفراز گردید - در ۱۲۳۰ھ براہ عدم پانہاد (۲)
(۳۸) [۹۶ - الف] مولانا صاحب نام دارد، تخلص احسن متوطن حیدرآباد، کلامش ازیں غزل ہویدا، در مشاعرہ ایں غزل گرفتہ بودم، اینست :

لخت دل مارے ہے آ دیدۂ تر میں غوطہ
آہ اب مارے نکیوں خون جگر میں غوطہ (۳)

(۳۹) [۹۶ ب] بیدار (= م) (۴۰) [۹۷ ب] بیان (= م) (۴۱) [۹۸ ب] بیتاب ... شاگرد میاں قائم (=م) (۴۲) بے جان (=م) (۴۳) بے باک (=م) (۴۴) [۹۹ - الف] برق (=م) (۴۵) پروانہ (=م) (۴۶) [۹۹ ب] راجا جسونت سنگھ پروانہ (=م) (۴۷) بشر (=م) (۴۸) بے نوا (=م) (۴۹) بیتاب (=م) (۵۰) [۱۰۰ب] بقا تخلص، اسمش محمد بقا (۴) ولد حافظ لطف اللہ از مزرا فاخرالمتخلص بہ مکیں تلمذ داشت - شنیدہ شد کہ در راہ چوں بزیارت عتبات عالیات ۱۲۰۶ھ رفتہ بود لعالم بقا منعطف گردید خداوند عالم بیا مرزد...
(۵۱) [۱۰۸ ب] باقر (= م) (۵۲) [۱۱۰ ب] تجلی (= م) (۵۳) [۱۱۴ب] تصور (= م) (۵۴) [۱۱۶ ب] بزبانیٔ میر ولی‌الدین صاحب متوطن بدر (بیدر ؟) تحقیق معلوم شدہ کہ ایں شعر سلطان بلحسن (ابولحسن ؟) ... تاناشاہ است، از باعث اشتہار حاجت بیان نیست، شاہ دکن بود -

---

۱۲۲۴ھ (مطابق ۱۹ - اپریل ۱۸۰۹ء چہار شنبہ) کو وہاں سے چلے تھے - دوبارہ وہ پھر دکن گئے یا نہیں اس کا ہمیں علم نہیں ہے -

۱— نسخۂ سالار جنگ سے غیر حاضر -

۲— نسخۂ سالار جنگ میں ہے : سید حسن علی خان ولد میروفاخاں ... اصلش ... خراسان است حالا سکونت بہ حیدرآباد دارد ... از نزد فقیر نقل قریب دہ دوازدہ دواوین اساتذہ نیز گرفتہ از فقیر بدل اتحاد وار تباط دارند " [ورق ۱۱۳ — الف]

۳ نسخۂ سالار جنگ میں ترجمہ احسن نہیں ہے -

۴ سالار جنگ : شیخ بقاء اللہ بقا ... ولد حافظ لطف اللہ خوشنویس سکان اکبر آباد از فقیر در لکھنؤ ہمیشہ ملاقات در عہد آصف‌الدولہ بہادر می ماند و بمکان فقیر اکثر تشریف ہمراہ میاں مصحفی صاحب می آورد، عرصہ ہفت سال می شود کہ برائے زیارت عتبات عالیہ رفتہ است حق تعالیٰ سلامت دارد — [۱۲۷ ب]

اینست :

آئے سیں پیو کے غم دکھو غائب ہو کر رہ گیا
وہ بھیج کہیں چھپا ہے وگرنہ انال تھا (کذا) ۱

(۵۵) [۱۱۶ الف] تاثیر تخلص، میر صادق علی متوطن حیدرآباد ، احوال طبیعت از شعر در مشاعرہ وہ بمکان خود اکثر ملاقات می شد از قوم سادات است وایں غزل طرحی نیز در مشاعرہ موجود بود بدست آمدہ بود ، عندالضرورت بقید قلم آمدہ (۲)

(۵۶) میر اسد علی تمنا تخلص ، متوطن اورنگ آباد و در حیدرآباد اکثر می ماند ، فقیر اورا ندیدہ مگر احوالش از شاگردان میر موصوف کہ دریں جا حاضر اند، معلوم شدہ [۱۱۶ ب] کہ بسیار شاعر مسلم الثبوت دریں ملک بود چند سال است کہ فوت نمودہ و غزلہاے ایشاں نزد حکیم صحت طلب خاں کہ شاگرد خان مذبور اند و ذکر در ردیف شین خواهد آمد ، بودند ، فقیر گرفتہ در انتخاب داخل ساختہ (۳)

(۵۷) [۱۱۷ ب] محمد عیسیٰ تنہا (=م) (۵۸) [۱۱۸ - الف] محمد اسحاق تمنا (=م) (۵۹) [۱۱۸ ب] تاباں (=م) (۶۰) [۱۱۹ ب] تسکین (=م) (۶۱) [۱۱۹ ب] تسلی (=م) (۶۲) [۱۲۰ الف] ثنا (=م) (۶۳) ثاقب (=م)

(۶۴) [۱۲۰ ب] جولاں (=م) (۶۵) [۱۲۱ ب] محمد عابد جوشش (=م) (۶۶) رحیم اللہ جوشش (=م) (۶۷) [۱۲۱ ب] جواہر سنگھ جواہر، شاگرد میاں جرأت صاحب ، مہاراجا ٹکیٹ رائے بفرزندی پرورش ساختہ باوجا گر طوائف کہ در لکھنؤ بحسن و جمال نظیر ندارد تعشق داشت چناںچہ بہماں ایام ایں غزل گفتہ ، بمسودہ فقیر بود ، انتخاب براے یادگار بقید قلم آوردہ (=م) (۶۸) [۱۲۲ - الف] جہاندار (=م) (۶۹) [۱۲۲ ب] جوان (=م) (۷۰) جولاں (=م) (۷۱) جعفر زٹلی (=م) (۷۲) [۱۲۳ ب چندا (=م)
خدمت فقیر بجا آوردہ کے بعد حاشئے پر اضافہ = و بعد شیر محمد خاں ایمان بشاگردی فقیر نیز در آمدہ است‘‘ ۔

(۷۳) [۱۲۵ - الف] چراغ (=م) (۷۴) [۱۲۶ الف] جرأت (=م) ۔ [ورق ۲۲۰ ب] پر
’’ تاریخ وفات محمد قائم شاعر‘‘ درج ہے (مستزاد) : ۴

جب سیل فنا ملک عناصر میں بھی
آکر ناگاہ
قائم کے جو تن کی تھی عمارت سوڈھی
لی زیست نے راہ

---

۱ - سالار جنگ : ندارد ۲ - سالار جنگ : ندارد ۳ - سالار جنگ : ندارد ۔

۴ - نسخہ سالار جنگ میں یہ تاریخ نہیں ہے ۔ اس کی جگہ چھوڑی گئی تھی مگر نقل ہونے سے شاید رہ گئی ۔ دیوان قائم کا جو نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اس میں ایک جگہ حاشیہ پر لکھا ہوا ہے ’’قطعہ تاریخ وفات محمد قائم بفرمائش شاہ کمال گفتہ شد‘‘ ۔ اس کے بعد یہ قطعہ تاریخ درج ہوا ہے۔ مقدمہ مخزن نکات میں یہ قطعہ مولوی عبدالحق مرحوم نے نقل کیا تھا ۔ مگر وہ جس صورت میں ہے اس سے تاریخ مطلوبہ برآمد نہیں ہو سکتی ۔ اس قطعہ میں ’’کہیٹے‘‘ کے اعداد (۴۵) اور ’آہ‘ کے (۷) شمار کریں تو ۱۲۰۸ھ مستفاد ہوتا ہے ۔

جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات
یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نرہی
کیا کہئے اب آہ
(=۱۲۰۸ھ)

[۲۲۱.الف] قطعہ تاریخ ماتم وزیرعلی‌خاں :
... مقید ہوا وہ بقید فرنگ
جو تھا صاحب فوج باعظم و شاں
جو پوچھی میں جرأت سے تاریخ قید
کہا: ''شور محشر ہوا یہ عیاں''
(=۱۲۱۲ھ)

[۲۲۱ ب] قطع نشستن بر مسند وزارت وزیر علی خاں بہادر...

[۲۲۲ الف] تاریخ رحلت واصلا کنچنی :
ھاتھ مل کر یوں کہی جرأت نے تاریخ وفات
واصلا کیا مر گئی اب حیف ٹپا مر گیا (۱)
(=۱۲۰۴ھ)

(۷۵) [۲۵۸ - الف] جعفری تخلص
شاعر بسیار پر گو و مستعد ، بجمیع اوصاف موصوف ـ چناں چہ روضہ احوال جناب سید الشہدا برائے میر عالم وزیر دکن نوشتہ تیار کردہ و از فقیر بسیار ربطے دارد وگاہے بمکان فقیر ہم کرم می کند ـ ایں چند شعر بطریق یادگار نوشتہ دادہ است ... (۲)

(۷۶) [۲۵۸ الف] میر جولاں ، تخلص ولد میر عبدالواحد ولد میر نجیب‌اللہ‌خاں [۲۵۹ - الف] منصب‌دار پادشاہ عالم‌گیر، قوم سادات حسینی ـ وطن قدیم جد میر مذکور سنبھل مراد آباد کہ در ہندوستان است ، والد میر مذبور و میر مسطور خجستہ بنیاد یعنی اورنگ آباد از چند سال اقامت در بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدر آباد وارد بصیغۂ منشآت بحضور میر عالم بہادر کہ وزیر الممالک دکن اند ، سرفراز و ممتاز است و از فقیر آشنا ـ چند شعر بر سبیل مذبور کہ گاہ گاہ بزبان ریختہ موزوں می سازد می آرد ... (۳)

(۷۷) [۲۶۰ - الف] جعفر علی حسرت (=م) (۷۸) [۲۷۵ ب] میر حسن، حسن (=م)

اس نسخے میں ورق ۲۵۸ ب کے بعد اوراق غائب ھیں ـ میر حسن کے انتخاب کے ساتھ اچانک حاتم کا انتخاب کلام شروع ہو جاتا ہے اور اس پر شمار [ورق ۲۸۶ - الف] دیا ہوا ہے ـ ورق ۲۹۳ - الف سے ۲۹۴ ب تک حاتم کی اردو نثر کا ایک نمونہ بعنوان '' نسخہ مفرح الضحک '' دیا گیا ہے ـ یہ شمالی ہندوستان میں اردو نثر کے قدیم ترین نمونوں میں سے ایک ہے اور اس اعتبار سے بہت اہم ہے ـ

(۷۹) [۲۹۴ ب] نام حافظ فقیر ، حافظ تخلص متوطن حیدر آباد ، شعرش در حیدر آباد مذکور در مشاعرہ لالہ گلاب چند بدست آمدہ اینست ـ احوال شاعری از کلام ظاھر... (۴)
نہیں دنداں کو فقط آب گہر میں غوطہ

۱ - نسخۂ انجمن میں اس مصرع کا املا اگر غلط ہے تو حروف کی تبدیلی کے ساتھ سنہ میں بھی فرق پڑ سکتا ہے ـ
۲ - سالار جنگ : ندارد ۳ - سالار جنگ : ندارد ـ
۴ - سالار جنگ : ندارد

لب نے کھایا ہے جدا شیرو شکر میں غوطہ
(۸۰) [۲۹۴ ب] حافظ خاں حافظ تخلص متوطن حیدرآباد، شاگرد میر جان امین کہ ذکرش در ردیف الف گذشتہ، این غزل طرحی در مشاعرہ مذکور بدست آمدہ بود...
(طرح: گھر میں غوطہ، جگر میں غوطہ) (۱)
(۸۱) [۲۹۵ - الف] خلیق (= م)
(۸۲) [۲۹۷ ب] میاں خیراللہ خیر (=م)
(۳۸) خنداں (= م) ...مہاراجا ٹکیٹ رائے از مراجعت سفر رھڑے ھمراہ خود بہ لکھنؤ آوردہ بودند...

(۸۴) [۲۹۸ ب] خاکسار، (= م)
(۸۵) [۲۹۹ ب] میر احسن خلق (=م)
(۸۶) امیر خسرو (=م) (۸۷) [۲۹۹ ب] خواجہ میر درد (=م) (۸۸) [۳۰۲ ب] دانا (=م (۸۹) [۳۰۳ - الف] رنگین (=م
(۹۰) [۳۲۹ ب] ترجمۂ حاتم یہاں بعد میں حاشئے پر اضافہ ھوا ھے اور انتخاب کلام [ورق ۲۸۶ - الف] پر گذر چکا ھے۔ ظاھرا معلوم ھوتا ھے کہ یہ ورق بعد کو لگایا گیا ھے اور اس کا قلم بھی غالباً مولف تذکرہ ھی کا ھے۔

"حاتم تخلص اسمش شیخ ظہورالدین عرف شاہ حاتم، مرد سپاھی پیشہ نیک اندیشہ بود۔ در جہان آباد عالمے ازو بہرۂ متوافر ربود۔ سودا ھم یکے از پشانست دیوانش بنظر درآمدہ پارۂ ازاں برداشتم"۔ اس کے بعد [ورق ۳۳۰ - الف] سے پھر سعادت یار خاں رنگیں کے کلام کا انتخاب شروع ھو جاتا ھے۔

(۹۱) [۳۳۲ - الف] رند (=م) رند کے ساتھ ھی رقت کا انتخاب کلام شروع ھو جاتا ھے [ورق ۳۳۳ وغیرہ] یہ شاید شیرازہ بندی کا نقص ھے۔
(۹۲) [۳۴۸ ب] رفاقت (=م) (۹۳) رضا (=م) (۹۳) [۳۴۹ - الف] رسوا (=م)
(۹۴) ربط (=م) (۹۵) [۳۵۱ ب] راقم (= م) (۹۶) [۳۵۳ - الف] سہرے علی راقب شاعر قدیم است۔
(۹۷) [۳۵۳ - الف] مرزا حسن رضا، رضا (=م)
(۹۸) [۳۵۹ ب] یہ عبارت بعد میں غالباً مولف ھی کے قلم سے اضافہ ھوئی ھے:
"سلیمان تخلص، اسمش مرزا سلیمان شکوہ بہادر خلف شاہ عالم بادشاہ۔ طبعش را اندرس فن مناسبتے خاص بود۔ اکثر سخن وراں برخوان بزل او جامی یافتند۔ در ۱۲۵۳ھ محمل عزم سمت عدم راند۔ از "رحمت خدا" سال وفات او بر می آید۔ اکبر آباد خوابگاہ اوست، دیوانے ازو یادگار ماندہ..."
(۹۹) [۳۷۱ - الف] محمد یار بیگ سائل (=م) (۱۰۰) سعادت (=م) (۱۰۱) سکندر (= م) (۱۰۲) [۳۷۲ - الف] سجاد (=م) (۱۰۳) [۳۷۲ ب] سلیم (=م) (۱۰۴) [۳۷۴ ب] سوزاں (=م) (۱۰۵) سرسبز (=م) ۱۰۶ [۳۷۶ - الف] سبقت (=م)
(۱۰۷) [۳۷۶ ب] میاں محمد قائم

۱۔ سالار جنگ: ندارد۔

صاحب در تذکرہ خود از روے تواریخ احوال سعدی شیرازی نوشتہ شد در ہنگام سیرو سیاحت بطرف گجرات تشریف آوردند ۔ بسبب مجاورت سومنات چناں کہ در نسخۂ بوستاں خودش ایمائے برآں فرمودہ اند ، غرض بزبان ایں دیار وقوف یافتہ یکدو بیت ریختہ کہ بعد ازیں مرقوم خواھد شد ، بر سبیل تفنن بقید قلم در آوردہ موجد زبان ریختہ سعدی شیرازیست بعد ازاں حضرت امیر خسرو بر ہماں بنا طراحی و تعمیر ہای بسیار بکار بردند از وست ...'' ۱
یاراں دریں شہر شما کیسی بھلی یہ ریت ہے الخ
(۱۰۸) [۳۷۶ ب] سلمان نام جوانیست کہ سلمان تخلص می ساخت در شاہ جہاں آباد بود ...
(۱۰۹) [۳۷۷ ۔ الف] سودا (= م)
(۱۱۰) [۳۴۵ ب] شاکر از قدیم شعرائے دکن است ۔ مثنویش بدستم رسید ۔ ترجمۂ شمائل کہ بزبان فارسی بود بزبان دکھنی نمودہ ۔ ضخامت تقریباً پانزدہ جز است ۔

اس تذکرے کا بنیادی مقصد ، جیسا کہ دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے ، شعرا کے کلام کا زیادہ سے زیادہ انتخاب پیش کرنا تھا ۔ اس لئے مولف تذکرہ نے حالات کی فراہمی میں کدوکاوش نہیں کی اور انتخاب ہی پر توجہ مرکوز رکھی ہے ۔ اس کی تالیف کا خیال آصف الدولہ کی زندگی ہی میں یعنی ۱۲۱۲ھ سے پہلے پیدا ہو چکا تھا لیکن ترتیب وتسوید کا کام باقاعدہ طور پر ۱۲۱۸ھ میں شروع ہوا ۔ بعد میں شاہ کمال نے اس میں بہت اضافے کئے ہیں ۔ چنانچہ اس نسخۂ انجمن میں سلیمان شکوہ کی وفات کا ذکر کیا ہے جو ۱۲۵۴ھ کا واقعہ ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظر ثانی اور حک و اضافہ اس سال کے بعد تک ہوتا رہا ہے ۔

نسخۂ انجمن میں بعض شعرا کا بھی اضافہ ہے جن کا حال یا کلام نسخۂ سالار جنگ میں نہیں ہے ۔ یہ نسخہ ناقص ہے ۔ اگر اس کا مکمل مسودہ ملتا تو شاید یہ تذکرۂ کمال کی ضخیم ترین روایت ہوتی ۔

۱ ۔ بعض تذکرہ نگاروں کی طرح کمال بھی اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے یہاں ریختہ کی بنیاد ڈالی تھی ، یہ افسانہ محض ہے ۔ بعض نے سعدی کو دکھنی بتایا ہے ۔ لچھمی نرائن شفیق ان کا مرقد برہان پور میں بیان کرتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ مخدوم کمال الدین سعدی کا کوروی ہیں جنھوں نے اکبر اعظم کا زمانہ پایا تھا ۔ سورۂ اخلاص سے ان کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے (ملاحظہ ہو میرا مضمون بعنوان سعدی کاکوروی مطبوعہ ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ مئی ۱۹۵۶ء) ۔ جو غزل سعدی کی طرف منسوب ہے علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں (ذخیرۂ عبدالسلام بیاض ۳/۳ ورق (۱۰) پر ہے اس غزل کے (۹) اشعار باختلاف روایت عام ملتے ہیں ۔ ان میں تخلص سعدی ہی آیا ہے ۔

—:o:—

ترقی اردو بورڈ کی قابل مطالعہ کتابیں

جذباتِ نادر

حصہ اول و دوم نیز مثنوی لالہ رخ یک جلد
نادر علی خاں نادر کاکوروی (متوفی ۱۹۱۲ء) کے
جدت آفریں کلام کا مجموعہ۔ دیدہ زیب طباعت
مع مقدمہ
از جناب ممتاز حسن
ناشر: اردو اکیڈمی (سندھ) کراچی
قیمت مجلد گرد پوش دس روپے

بورڈ کے اشاعتی پروگرام میں عورتوں اور بچوں کے مطالعے کے لئے مفید ادب کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ نئی نسل اپنی زبان اور کلاسکی ادب سے بیگانہ نہ رہے۔ اس سلسلے میں جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں حسب ذیل بھی شامل ہیں۔

منتخب الحکایات

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم
مع مقدمہ و فرہنگ
از
جناب شاہد احمد دہلوی
ناشر، ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور
قیمت دو روپے ۶۲ پیسے

مرآۃ العروس

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم
مع مقدمہ و فرہنگ
از
جناب ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ
ناشر، ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لاہور
قیمت ۳ روپے

اُردو الفاظ کی رومن املا

ڈاکٹر گیان چند

اردو نامہ کے چوتھے شمارے بابت اپریل تا جون ۶۱ء میں جناب شان الحق حقی کی رپورٹ اردو الفاظ کی رومن املا ، کے عنوان سے شائع ہوئی ہے ۔ میری نارسائی کے باعث یہ رپورٹ اب میری نظر سے گذری ، اس لئے اس قدر دیر سے اس پر اظہار خیال کرنے کی معذرت چاہتا ہوں ۔ یہ مسلم ہے کہ بعض موقعوں پر اردو الفاظ کو رومن میں لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بہتر ہے کہ ایسے مخصوص مواقع کے لئے اردو آوازوں کی مقابل رومن علامات متعین کرلی جائیں ۔

رومن رسم الخط کو انگریزی رسم الخط کے مترادف سمجھ لینا بڑی غلط فہمی ہے ۔ رومن خط ایک ایسا لچکدار سانچہ ہے جو تھوڑی سی ترمیم کے بعد ہر زبان کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کا کتا بچہ ”اردو رسم خط اور طباعت“ نہایت مفید اور بصیرت افروز ہے ۔ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط (I. P. A.) رومن رسم الخط ہی پر مبنی ہے ۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جس صحت کے ساتھ یہ رسم الخط کسی بھی زبان کی آوازوں کو ادا کرتا ہے اس صحت ساتھ خود اس زبان کا رسم الخط بھی ادا نہیں کرسکتا ۔ اردو کو مخصوص موقعوں پر رومن رسم الخط میں لکھنے کے لئے کیوں نئی نئی علامات وضع کی جائیں جب کہ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط کی نعمت عظمیٰ موجود ہے ۔

رسم الخط کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ اولین اصول نہ بھولنا چاہئے کہ زبان کی اصلی اور بنیادی شکل تقریر ہے ۔ تحریر تقریر کی پیش خدمت اور تابع ہے ۔ رسم الخط کا کام تکلم کو زیاد از زیاد صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے لیکن یہ ترجمانی بیشتر ناقص رہتی ہے ۔ جو رسم الخط تقریری تلفظ سے بغاوت کرے غاصب ہے ۔ بہترین رسم الخط وہ ہے جو صحیح بھی ہو اور سہل بھی ۔

اردو رسم الخط کا رومن املا طے کرنے سے قبل اگر ہم یہ طے کرلیں کہ اردو میں کتنی آوازیں ہیں، تو ہم بہت سی الجھنوں سے محفوظ رہیں گے ۔

۱ ۔ جیسا کہ حقی صاحب کی رپورٹ میں مذکور ہے ،اردو میں ۱۳ مصوتے (حروف علت) ہیں ۔ ان میں سے دس مشہور مصوتے ہیں جن پر تین کا حال میں اضافہ کیا گیا ہے ۔ رپورٹ میں انہیں اِ اوسط ۔ آے اوسط ۔ اور آ اوسط نام دیا گیا ہے ۔ راقم الحروف نے ان کے بارے میں ایک مضمون اردو مصوتوں کی صحیح تعداد مشمولہ ” نیا دور لکھنؤ بابت ستمبر ۶۱ء میں تفصیل سے بحث کی ہے ۔یہ مصوتے دراصل اِے آے آو کی خفیف شکلیں ہیں ۔ جو فرق یائے معروف و یائے مجہول یا واؤ معروف و واؤ مجہول میں ہے وہی ’اِ نصف‘ اور اِ اوسط، میں یا ’ا‘ خفیف اور آ اوسط میں ہے ۔ اسی لئے میرے نزدیک ’اِ نصف‘ کو زیر معروف ۔ ’اِ اوسط‘ کو زیر

مجہول ۔ ' ا ' خفیف کو پیش معروف ۔ آ اوسط ' کو پیش مجہول کہنا موزوں ترین ہے ۔ انہیں کے وزن پر ہم آ کو زبر معروف اور ' آے اوسط ' کو زبر مجہول کہیں گے جن مصوتوں کے جوڑوں کو نصف اور اوسط کہا گیا ہے ان میں نوعیت کا فرق ہے مقدار کا نہیں ۔ ان کا طول برابر ہے اس لئے ایک کو نصف اور دوسرے کو اوسط کہنا صحیح نہیں :

بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط میں ان تینوں مصوتوں کے لئے کوئی علامت نہیں ۔ اسی رسم الخط کا ایک دوسرا اسلوب امریکی چارٹ ہے ۔ اس میں ان تینوں کے لئے علامات ملتی ہیں جو یہ ہیں :

زیر مجہول e — زبر مجہول $æ$ — پیش مجہول Ω —

۲۔ ان میں سے زیر مجہول کے علاوہ باقی بارہ مصوتے غنائی شکل میں بھی ملتے ہیں ۔ غیر غنائی آوازوں کو ادا کرتے وقت آواز پیدا کرنے والی ہوا صرف منہ سے خارج ہوتی ہے ۔ حلق سے ناک میں جانے والا راستہ بند ہوجاتا ہے لیکن غنائی مصوتوں کو ادا کرتے وقت ہوا بہ یک وقت منہ اور ناک دونوں سے خارج ہوتی ہے ۔ غنائی مصوتوں کی کچھ مثالیں سانس ، گنوار ، اونٹ ، پنچ ، سینگ وغیرہ ہیں ۔ صوتیاتی تحریر میں غنائی مصوتوں کے اوپر ایک مد کا نشان ~ بنادیا جاتا ہے اور بس ۔ پرتگالی رسم الخط میں بھی یہی علامت اختیار کی گئی ہے ۔ اردو کے رومن خط میں بھی یہی نشان استعمال کرنا چاہئے ۔

اردو میں مصوتی غنائیت کی دو شکلیں ملتی ہیں خالص اور مخلوط ۔ آخرالذکر میں مصوتے کے ساتھ بہت خفیف سی غنائی مصمتے (حرف صحیح) کی جھلک بھی آجاتی ہے ۔ خفیف اور طویل دونوں قسم کے مصوتوں کے ساتھ مخلوط غنائیت کی مثالیں درج کی جاتی ہیں :

خفیف غنائی مصوتہ ۔ سنبھل ۔ (سمبھل) ۔ بندھا ۔ ڈھنڈھورا ۔ منجیرہ ۔ منگیتر

طویل غنائی مصوتہ ۔ تانبا (تامبا) ۔ ایندھن ۔ مینڈک ۔ گونجا ۔ آنگن

مخلوط غنائیت محض voiced stops & voiced affricates (1) یعنی ب ۔ بھ ۔ د ۔ دھ ڈ ۔ ڈھ ۔ گ ۔ گھ ۔ ج ۔ جھ ۔ سے پہلے آتی ہے جب کہ خالص غنائیت بقیہ تمام حروف کے ماقبل آسکتی ہے ۔ اس لئے ان دونوں قسم کی غنائیتوں کے لئے ہم ایک ہی علامت ~ اختیار کر سکتے ہیں ، کیونکہ ب ۔ د ۔ ڈ ۔ گ ۔ ج وغیرہ کے پہلے ہم خود بخود مخلوط غنائی مصوتہ ادا کرنے کے عادی ہیں ۔ غنائیت کی یہ دونوں قسمیں ایک ہی صوتیہ (Phoneme) کے ہم صوت ہیں ۔ ایک صوتیے کے لئے ابجد کی ایک علامت کوئی برا اصول بھی نہیں ۔

---

(۱) اردو میں voiced کیلئے جلی ، voiceless کیلئے خفی ، stop کیلئے مسدود ، fricative کیلئے جھدی اور affricate کیلئے لس جھدی کی اصطلاحوں کی سفارش کرتا ہوں ۔

۳—اردو میں تین غنائی مصمتے ھیں - م-ن-ں-گ ڠ ن کے ادا کے لئے نوک زبان اوپری مسوڑھے یا اس سے قدرے پیچھے کے حصے کو چھوتی ھے۔ ںگ کے تلفظ میں زبان کا پچھلا حصہ بلند ہوکر لرم تالوکو چھوتا ہے۔ یہ آواز صرف ک-کھ-گ-گھ سے پہلے آتی ھے۔ اس مصمتے کی اصل آواز ؛انگ؛ میں گ سے پہلے ظاھر ھوتی ھے۔ اردو رسم‌الخط میں اس کے لئے کوئی علامت نہ ھونےکی وجہ سے ھم اسے گ کے اختلاط کے ساتھ لکھنے پر مجبور ھیں - ذیل کے الفاظ ملاحظہ ھوں :

الف—ڈنکا — پھنکی — ننکا -
ب—منکا -- تنکا — سنکی — بھنگا (ایک کیڑا)
الف کے الفاظ میں ںگ ھے اور ب کے الفاظ میں ن-ںگ کے لئے صوتیاتی اصطلاح ŋ ھے۔

۴- اردو میں دس منفوس آواز یں مفرد ھیں-
پھ — بھ — تھ — دھ — ڈھ — کھ — گھ -

ان آوازوں کو دوھری یا مرکب سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ ان میں پہلی آواز اور ھ یکجان ھوکر ایک ھی جھٹکے میں ادا ھوتی ھیں - ان کے مقابلے میں کچھ آوازوں میں ھ اس طرح مد غم نہیں ھوپاتی - انہیں مفرد آواز کا مرتبہ نہیں دیا جاسکتا - اس قسم کی آوازیں یہ ھیں :

مھ - نھ - لھ - رھ - ڑھ -

گو مفرد آواز کے لئے دو حروف استعمال کرنا بے اصولی ھے لیکن ھم رواج، کفایت اور سہولت کے پیش نظر پھ-بھ وغیرہ کو رومن میں h کے شمول کے ساتھ ادا کریں گے -

۵- عربی کی مخصوص آوازیں ھندوستانی تلفظ میں دوسری آوازوں کے ساتھ ھم صوت ھیں رومن یا صوتی رسم‌الخط میں انہیں ایک ھی نشان سے ظاھر کرنا چاھئیے مثلاً ز- ذ- ض- ظ کے لئے محض ایک حرف Z کافی ھے- اس آواز کے لئے اردو میں بھی مختلف حروف باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں - ان کی تائید میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ھیں :

(۱) انہیں ترک کرنے سے مختلف المعنی لیکن متحدالصوت الفاظ میں التباس ھوگا، مثلاً علم (جھنڈا) اور الم میں کوئی فرق نہیں رھے گا - جواباً عرض ھے کہ آخر تقریر میں یہ التباس کیوں نہیں ھوتا - ظاھر ھے کہ سیاق وسباق سے ھم صحیح مفہوم سمجھ لیتے ھیں - دوسرے یہ کہ اردو میں اب بھی ایسے کئی الفاظ ھیں جن کے کئی معنی ھیں، مثلاً بار کے معنی پھل، رسائی، بوجھ - دست کے معنی ھاتھ اور فضلہ - میل کے معنی گندگی اور التفات - مس کے معنی مونچھوں کا رواں اور چھونا - مخصوص عربی حروف کے ترک کردینے پر ایسے

کچھ اور الفاظ کا اضافہ ہوجائے گا ، لیکن جس طرح بولنے میں موقع و محل ہماری رہبری کرتا ہے اسی طرح تحریر میں بھی وہ ہمیں گمراہی سے بچائے گا -

(۲) دوسرا اعتراض عقیدے کی بنا پر ہے - مثلاً خدا کا ایک نام علیم (جاننے والا) ہے- اسے الیم (درد مند) کہنا گستاخی ہے- اس کے جواب میں عرض ہے کہ خدا نیت دیکھتا ہے رسم الخط نہیں - تقریر میں ہم ان دونوں کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں کرتے اور پھر بھی گستاخی یا کفر کے ملزم قرار نہیں دئے جاتے - اسی کی عکاسی تحریر میں ہوگی - عربی اور فارسی میں آپ ان اصوات کو ضرور مروجہ ڈھنگ سے لکھئے لیکن ہندوپاک میں ان موہوم و معدوم آوازوں کا اختلافی اظہار محض لکیر کا فقیر ہونا ہے- ایک آواز کو مختلف آوازیں سمجھنا خود فریبی ہے- اگر مزاج اسی قدر سر گشتۂ خمار رسوم وقیود ہے تو اصلاح رسم الخط کا نام لیکر گناہ کا ارتکاب نہ کیجئے - رسم الخط ثانوی چیز ہے- صوتیات کی مبادیات اور اپنے واقعی تلفظ کی طرف سے اپنی آنکھیں موند کر کتابت کی بوالعجبیوں پر اڑے رہنا ، عقیدے کو بھلے ہی بالیدہ کرے، سائنٹفک نقطۂ نظر کو جنم نہیں دے سکتا -

جس طرح بعض مصمتوں کا طول ظاہر کرنے کے لئے ان کے آگے دو نقطے مثلاً : *i* لگا دئے جاتے ہیں اسی طرح تشدید ظاہر کرنے کیلئے مصمتے کے آگے (:) لگانا کافی ہے کیونکہ تشدید دوہرا مصمتہ نہیں بلکہ ایک طویل مصمتہ ہے- دستی تحریر میں اگر حرف کے آگے نقطے لگانے میں دقت محسوس ہو تو حسب رواج تشدید کیلئے دو حروف ہی لکھے جاسکتے ہیں - ای اور او کے لئے آگے نقطے لگانے کی بجائے اوپر چھوٹا سا خط کھینچا جاسکتا ہے- ای کیلئے : *ī* یا *i*

اردو کو رومن میں لکھتے وقت ہمیں کسی بھی موقع پر بڑے (Capital) حروف کا استعمال مخصوص کرنے کی ضرورت نہیں -

اب ہم صوتیاتی ترتیب کے ساتھ اردو کی مختلف آوازوں کی فہرست اور ان کا رومن یا بین الاقوامی صوتیاتی املا تحریر کرتے ہیں :

مصمتے (حروف صحیح)

۱	پ	p	۷	د	d
۲	پھ	ph	۸	دھ	dh
۳	ب	b	۹	ٹ	ṭ
۴	بھ	bh	۱۰	ٹھ	ṭh
۵	ت	t	۱۱	ڈ	ḍ
۶	تھ	th	۱۲	ڈھ	ḍh

۱۳	ک	K
۱۴	کھ	Kh
۱۵	گ	g
۱۶	گھ	gh
۱۷	ق	q
۱۸	چ	C
۱۹	چھ	Ch
۲۰	ج	J
۲۱	جھ	Jh
۲۲	م	m
۲۳	ن	n
۲۴	ن گ	ŋ
۲۵	ل	l
۲۶	ر	r
۲۷	ڑ	ṛ
۲۸	ف	f
۲۹	س	S
۳۰	ز	z
۳۱	ش	*S*
۳۲	ژ	ʒ
۳۳	خ	x
۳۴	غ	ɣ (۱)
۳۵	ہ	h
۳۶	و	v
۳۷	ی	Y

تشدید حرف کے آگے [:] یا حرف کو دو بار لکھنا

(ب) مصوتے (حروف علت)

۳۸	اِی	ī یا i:
۳۹	اِ یا زیر معروف	i
۴۰	اِے	e
۴۱	زیر مجہول	E
۴۲	آے	ɛ
۴۳	زبر مجہول	æ
۴۴	زبر معروف	ə
۴۵	آ	a
۴۶	آو	ɘ
۴۷	پیش مجہول	ʊ
۴۸	اُو	O
۴۹	پیش معروف	U
۵۰	اوُ	Ū یا U:

ایک لفظ کے منفصل اجزا کا جوڑ دکھانے کیلئے [—] in-am قرآن qur-an اس رسم الخط میں ۵۰ حروف ہیں - ان میں سے دس منفوس حروف (پھ بھ وغیرہ) پانچ معکوسی حروف (ٹ ٹھ ڈ ڈھ ڑ) دو طویل حروف عات، دوسری آوازوں کی تکرار یا نقطوں کے اضافے سے تشکیل پاتے ہیں - گویا ٹائپ رائٹر میں ۳۳ مصمتوں اور مصوتوں کے نشان، ایک مصوتی غنائیت کا نشان اور کچھ رموز و اوقاف کی علامتیں د کار ہوں گی - فل اسٹاپ کا نقطہ معکوسی

(۱)-I.P.A میں i کے لئے کوئی باقاعدہ علامت نہیں - .I.P.A کی مندرجہ بالا علامت کو غ کے لئے چن لیا گیا ہے -

آوازوں کے لئے۔ colon تشدید اور دو طویل مصوتوں کیلئے، اور dash بعض الفاظ کے دو اجزا کو ملانے کیلئے بروئے کار آئے گی -

مندرجۂ بالا رسم الخط میں ایک علامت بھی ایجاد بندہ نہیں - زیر مجہول ، اور زبر مجہول ، پیش مجہول امریکی چارٹ سے اور باقی تمام علامتیں بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط سے مستعار ھیں - جو بولا جائے گا وھی رسم الخط میں لکھا جائے گا اور جیسا لکھا جائے گا ویسا ھی پڑھا جائے گا - اردو کے کسی بھی لفظ کا تلفظ (عربی تلفظ نہیں فصیح اردو تلفظ) جس صحت کے ساتھ اس رسم الخط میں قلم بند کیا جاسکتا ھے اتنی صحت کے ساتھ ادا کرنا نہ اردو رسم الخط کے بس کا ھے نہ دیوناگری کا - ایسے عالم گیر ، سہل ، مسلم رسم الخط کے ھوتے رومن حروف میں ھمیں کوئی اختراع کرنے کی ضرورت نہیں آخر میں اس رسم الخط میں چند الفاظ کا املا ملاحظہ ہو:

کیا (استفہام) Kya ، کیا (فعل ماضی) Kiya ، نہر næhr

واقعہ vaqEa ، معلیٰ mʌəl:a ، فائل fail

فاعل fa-il ، منہدی mehdi: ، رب العالمین rəb:ul-alimi:n

سوتنتر svətəntr ، سوراجیہ svrajya ، شوال Səuval

صنعت براءت الاستہلال sən-əte bəra-ətul-istEhlal

جمعیت العلما jəm-i: yətul-uləma ، فیاض fəiyaz

سکول Sku:l ، ننگا nəŋga ، ٹھنکا thəŋ ka

مراسلات

صاحب من - السلام علیکم

نمبر ۲ پہنچا - اب تو ہر پرچہ پڑھنے کے قابل ہونے لگا ہے۔ یہ نمبر بھی خوب ہے۔ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے -

''جیسا'' کی بحث تو آپ ختم ہی کر چکے، لیکن اتنا عرض کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ میرے بچپن تک فصحا، عموماً اس موقع پر ''سا'' یا ''سی'' ہی لاتے تھے - اور اس حد تک جوش صاحب کا خیال صحیح ہے۔ پھر بھی یہ نہ تھا کہ ''جیسا'' کا استعمال سرے سے معدوم ہو - آخر سبزواری صاحب نے اس دور سے بھی سندیں ڈھونڈھ نکالی ہیں - میرے دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے درجے کے ادیبوں (خصوصاً اخبار نویسوں) نے ''جیسا'' اور ''جیسی'' کی بھرمار کردی - اور اس لئے صف اول کے بھی بعض ادیبوں کو متاثر ہونا ہی پڑا -

اجازت ہو تو اپنے استفادے کے لئے دو سوال بھی عرض کردوں -

(۱) صفحہ ۶۲، کالم ۲، وسط کے بعد ''خامہ فرسائی'' کیا اپنے صحیح محل پر استعمال ہوا ہے ؟ میں سمجھتا تھا کہ، اس میں ذم و تحقیر کا پہلو شامل رہتا ہے۔

(۲) صفحہ ۷۶ الخ - لفظ ''املا'' کیا مونث ہے ؟

والسلام

عبدالماجد دریابادی

۱۔آپ نے بجا فرمایا - ۲۔اس میں اختلاف ہے - ش-ح-ح

مخدومی تسلیم - ہدیہ، تہنیت قبول ہو - اردو نامہ آپ حضرات جس خلوص اور انہماک سے شائع کر رہے ہیں اور جس اعلیٰ معیار کا یہ علم بردار ہے، اس کے لئے ہم بھارتی اردو دوست بہ صد ادب و احترام مبارکباد پیش کرتے ہیں - اردو املا اور اردو لغت کے موضوعات کے علاوہ حصہ، نظم و نثر ہر آئینہ افادی حیثیت کا حامل رہتا ہے - تازہ شمارہ تو ہمہ آئینہ آفتاب و ماہتاب ہے۔

ادارے کی کتابیں آپ کو بھجوائی جاتی رہی ہیں اور انشاءاللہ بھجوائی جاتی رہیں گی -

وقار خلیل -

مدیر صبا (س)، حیدرآباد دکن

اردو نامہ کراچی

عزیز مکرم - آپ کا رسالہ پہلے شمارے سے بہت بہتر نکلا - کم سے کم ٹائپ کو تو آئندہ ہرگز نہ **چھوڑئیے گا** - میں تو "لتھو" یعنی سنگ پرستی کو بھی کافرانہ ذہنیت کا کرشمہ خیال کرتا **ہوں** - اس طباعت کے قدیم، پس ماندہ ہونے میں تو کسی کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا -

رسالے کے ایک بہت اچھے علمی مقالے میں (خصوصاً آخری حصہ میں) ایسی عبارتیں نظر آئیں **جیسے** کوئی انگریزی میں سوچ کر اردو میں ترجمہ کر رہا ہو - آپ کو مضامین میں تھوڑی بہت **تراش** خراش کر دینی مناسب ہوگی کہ رسالے میں زبان کی صحت و فصاحت کا معیار قائم رہے -

شاعر سے بحث مباحثے کرنا غالباً بد مذاقی کی بات ہوگی - ہاں چھیڑنے کو آپ چاہیں تو **(جوش صاحب)** سے دریافت کیجیئے گا کہ یہ "عزادار" کی اصطلاح کب اور کس طرح بنی - **فارسی میں** غم، سوگ وغیرہ لفظ موجود تھے - "دار" کا لاحقہ ان پر نہ لگایا گیا، یہ کیا **بات ہے**؟ اچھا، وفادار تو مشہور لفظ ہے - جوش صاحب اس کے مقابلے میں "جفادار" تو لکھ **کے دکھائیں** - مطلب یہ ہے کہ زبان میں رواج کا قانون چلتا ہے -

والسلام

سید ہاشمی فرید آبادی - لاہور

تبصرے

جوش
ش - ح - ح
خ - ح - ش

ایضاح سخن بہ توضیح اصلاح سخن

از جناب تمنا عمادی مجیبی پھلواروی
۲۷۶ صفحات قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے،
ملنے کا پتہ: ۶۴ عبدالعزیز لین،
نواب گنج ڈاکخانہ پیل خانہ۔ ڈھاکہ نمبر ۱

بہ سلسلہ تمنا اکیڈمی کی دوسری کتاب ہے جو نظر ثانی اور اضافہ مضامین کے بعد دوبارہ شائع کی گئی ہے۔

حضرت مولانا تمنا عمادی کی کتاب ''ایضاح سخن'' کے سرسری مطالعے سے میں جس تعجب انگیز مسرت سے دو چار ہوا، اس کی شرح نہیں کی جا سکتی۔ یہ فیصلہ کرکے میں بہت اداس اور مایوس تھا کہ اب شعر و ادب اور لسانیات کے مقامات و نکات سے یہ عصر، یک سر خالی اور بے گانہ ہو چکا ہے، اور ع ''آن قدح بشکست و آن ساقی نہ ماند'' کے بعد، زبان و ادب کی وادی پر اس قدر گھپ اندھیرا چھا چکا ہے کہ اس گوشے میں سے اب کوئی کرن پھوٹ نہیں سکے گی۔

لیکن جس وقت اس کتاب کو کہیں کہیں سے پڑھا، میری آنکھیں روشن ہو گئیں اور نہایت خوشی کے ساتھ کہنا پڑا کہ ع ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''۔

میری تمنا ہے کہ حضرت تمنا کے سے ماہر زبان و فن تا دیر تندرست اور زندہ رہیں اور اسی کے دوش بدوش میری یہ آرزو بھی ہے کہ وہ سجادے سے دور ہوکر، پھر ایک بار مسند ادب پر جلوہ افروز ہو جائیں اور ادب اردو کے مطلع کو دوبارہ جگمگادیں:

مت سہل انہیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

جوش

عظمت رفتہ

از ضیاءالدین احمد برنی
تعلیمی، مرکز لاہور، ۵۱۲۔صفحات
قیمت ۱۰ روپے (مجلد و مصور)

یہ ایک یادگار تالیف ہے جس میں نصف صدی کی تقریباً یکصد ممتاز، مقبول یا دلچسپ اور یادگار زمانہ شخصیتوں کا جستہ جستہ احوال سادہ، بے تکلف، قلم بر داشتہ پیرائے میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ ضیاءالدین برنی ہی لکھ سکتے تھے کہ وہ خود اس دور کے باقیات الصالحات میں سے ہیں جو اب افسانہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ شخصیتیں بیشتر سیاسی ہیں، لیکن ان میں کچھ ادیب، کچھ عالم، کچھ صحافی— ذکاءاللہ، شبلی، حالی، نذیراحمد، سیداحمد علامہ اقبال، ڈاکٹر سجاد دہلوی، سی ایف اینڈریوز، خواجہ حسن نظامی، خواجہ کمال الدین

منشی پریم چند ، مجید لاھوری ، فانی ، جگر ، گاما ، پکتھال ، آغا شاعر ، ڈاکٹر داؤد پوتا ، منشی محمدالدین اور چھپتے چھپتے مولوی عبدالحق مرحوم بھی شامل ھوگئے ھیں - ضمیمہ کے طور پر مولانا ظفرعلی خاں کا شذرہ مولوی محمد حسین کے بارے میں اور مولانا حسرت موھانی کا وہ مضمون بھی ہے جس پر انھیں پہلی مرتبہ سزائے قید ھوئی -

کتاب کی دلچسپی کا اندازہ اس مختصر تعارف ھی سے ھوسکتا ہے- بقول ناشر ” یہ ان اشخاص کے حالات ھیں جو ھندوستان کی تاریخ پر اپنا امٹ نشان چھوڑ گئے ھیں - ان صفحات میں آپ کو نیکی ، پاس وضع ، انسان دوستی ، حب الوطنی ، شرافت اور خدمت الناس کے لازوال نمونے ملیں گے ....اس میں بعض بڑی ھستیاں ھیں جو اپنے زمانے میں منفرد تھیں..... کچھ گمنام بھی ھیں مگر تھے سب اپنی اپنی جگہ بر صاحب عظمت - اس کے مطالعہ سے زندگی کی اعلیٰ قدریں اجاگر ھونگی - برصغیر پاکستان اور ھندوستان کی تاریخ لکھنے والوں کو اس سے بڑی مدد ملے گی-“ یہ گردپوش کی عبارت کے اقتباسات تھے جن کی صداقت کبھی مشتبہ بھی ھوتی ہے ، لیکن یہاں گنجائش کلام نہیں رکھتی -

ھند و پاکستان کی آزادی ایک طویل تاریخی دور کا تتمہ تھا جس میں قومی شعور بتدریج ابھرتا رھا - سیاسی پستی کے باوجود اھل ملک کا سر غرور بلند تھا - ھماری محکومی ایک نامنصفی تھی جس نے بہت سی سماجی خرابیوں کے باوجود ھمارے دلوں میں ایک اخلاقی بلندی کا احساس بھی پیدا کیا ، جو مظلوم کو ظالم کے مقابلے میں حاصل ھوتا ہے- اعلیٰ شخصیتوں کا یہ ھجوم جو اس نصف صدی میں نظر آتا ہے ، دراصل اسی اخلاقی بلندی اور اسی احساس کی پیداوار تھا کہ حق ھماری طرف ہے-کوئی قوم جس کے سامنے کوئی اعلیٰ اخلاقی مشن نہ ھو ، خواہ آزاد اور پیٹ بھری ھی سہی ، ایسی شخصیتیں پیدا نہیں کرسکتی - ان کے اٹھ جانے سے جو خلا ھماری قومی زندگی میں نظر آتا ہے شاید محض خیالی نہیں-ھماری نئی نسل کے سامنے اخلاق ، ایثار ، کردار اور کمال کے ان نمونوں کا باقی نہ رھنا بہت بڑی کمی ہے-

اگرچہ برنی صاحب پرانے لکھنے والے ھیں ، مگر ان کی اس کتاب کو کوئی ادبی تالیف ھونے کا دعویٰ نہیں ہے- یہ ان کی جستہ جستہ یادداشتوں پر مشتمل ہے اور جو خاکے پیش کئے گئے ھیں نہ مکمل ھیں نہ ھموار نہ کسی اصول کے تابع ، اور نہ ان کے انداز تحریر میں کوئی انوکھا پن ہے- سیدھے سادے پیرائے میں بڑے خلوص کے ساتھ اپنی جانی بوجھی شخصیتوں کا کچھ احوال اور بعض صورتوں میں صرف شرف ملاقات کا ذکر کردیا گیا ہے - اس کے باوجود جتنے کچھ ذکراذکار اس میں سما گئے ھیں وہ اپنی جگہ دلچسپ بھی ھیں اور تاریخی لحاظ سے مفید اور یادگار بھی - ش - ح - ح

کلمتہ الحقایق

مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، لکچرار جامعہ عثمانیہ - ۱/۱۶ کراؤن سائز، صفحات ۱۱۸، قیمت دو روپے، ناشر ادارۂ ادبیات اردو خیرت آباد، حیدر آباد دکن

یہ قدیم دکنی رسالہ حضرت برہان الدین جانم بیجاپوری کی تصنیف ہے جو پہلی دفعہ زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ اس رسالے کی صحیح تاریخ تصنیف تو متعین نہیں کی جاسکتی لیکن قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ ۹۹۰ھ مطابق ۱۰۸۲ء سے قبل لکھا گیا ہے۔ لائق مرتب نے اس رسالے کے ۶ مخطوطات کا اپنے مقدمے میں ذکر کیا ہے۔ کتب خانۂ خانقاہ عنایت اللہی حیدرآباد دکن کے مخطوطے (جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے نسخۂ مکتوبہ ۱۰۶۸ ہجری کی نقل ہے) کو پیش نظر رکھ کر کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو، کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ کے نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد اسے مرتب کیا گیا ہے اور اختلاف نسخ کو کتاب کے صفحات کے زیریں حصے میں ظاہر کیا ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ ۱۹ صفحات پر محیط ہے۔ ابتدا میں حضرت برہان الدین جانم کے پدر بزرگوار حضرت میراں جی شمس العشاق کے مختصر حالات اور سلسلۂ خلافت کا ذکر کرتے ہوئے اس مرثیے کے چند اشعار دئے گئے ہیں جسے حضرت برہان الدین جانم نے اپنے والد ماجد کی وفات پر لکھا تھا۔ صفحہ ۷ پر شجرۂ خلافت ہے جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے شروع ہو کر سیدامین پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد مذکورۂ بالا مخطوطات کے نسخے جو مرتب کے پیش نظر رہے ہیں، ان کے بارے میں معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔ کلمتہ الحقایق کی اہمیت، لسانی خصوصیات اور اس کے موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں قدیم دکنی الفاظ کی فرہنگ بھی ہے جس سے کتاب کا مفہوم سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ حضرت برہان الدین جانم (۱۵۴۳ــ۱۵۹۱ء) بہت بڑے صوفی، شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کی ایک طویل مثنوی "ارشاد نامہ" مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدر آباد دکن کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ "سکھ سہیلا" ایک ترکیب بند ہے جسے ڈاکٹر حفیظ سید نے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ ان کے علاوہ جانم کی اور کئی منظومات مثلاً بشارت الذکر، منفعت الایمان، وصیت الہادی، نکتۂ واحد، رموز الواصلین اور نسیم الکلام کے مخطوطات مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان کے دو نثری رسالوں معرفت القلوب اور ہشت مسایل کا علم نصیر الدین صاحب ہاشمی کی کتاب "دکن میں اردو" سے ہوتا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" ان کی نثر کا پہلا رسالہ ہے جو مطبوعہ صورت میں پیش ہوا ہے۔ اس کے لئے فاضل مرتب اور ادارۂ ادبیات اردو کی مساعی قابل داد ہیں۔

"کلمۃ الحقائق" تصوف و معرفت کا گنجینہ اور قدیم اردو کا قابل قدر نمونہ ہے۔ اس میں خدا کے بارے میں مریدوں کے مختلف سوالات کے جوابات بڑی وضاحت سے دئے گئے ہیں جن

تعالیٰ، نفس، ایمان، ذکر، مراقبہ اور مشاہدے کے رموزونکات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب اردو میں ہے لیکن بیچ بیچ میں فارسی عبارتیں بھی آگئی ہیں۔ اس کے باوجود تسلسل بیان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اردوئے قدیم کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو کے ساتھ فارسی کا پیوند لگا یا گیا ہے۔ مثلاً :

''وہاں کا مراقبہ و مشاہدہ چیست۔ کسے نہ داند کہ مشغولات دل میں کا اچھے''۔

بعض سوال و جواب شروع سے آخر تک فارسی میں بھی ہیں۔ غرض یہ کتاب قدیم اردو کے اولین کارناموں کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی اشاعت، اردو زبان کے آغاز و ارتقاء پرلسا نیاتی نقطہ نظر سے تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی ممدو معاون ثابت ہوگی۔ خ - ح - ش

:★:

چھوٹی بچت کے لئے !
سینکڑوں یا ہزاروں
روپئے کا انتظار کرنا
ضروری نہیں
صرف ۲ روپئے سے
آپ پوسٹ آفس سیونگ
بینک اکاؤنٹ کھولئے
اور اپنی بچت کو
روپیہ روپیہ
کرکے بڑھائیے
عوام کے لئے بہترین سہولتیں
★ ۵۰ روپئے تک متعلقہ علاقے کے کسی بھی پوسٹ آفس سے نکالے جاسکتے ہیں۔
★ جوائنٹ۔ فکسڈ ڈپازٹ اور دیگر اقسام کے اکاؤنٹ بھی کھولے جاسکتے ہیں
★ مقامی چیک سیونگ بینک میں جمع کرانے کے لئے قبول کئے جاسکتے ہیں۔
★ منافع کی شرح ۲½ سے ۴ فیصد تک ہے جس پر انکم ٹیکس معاف ہے۔
تفصیلات ہر پوسٹ آفس سے حاصل کیجئے۔
پوسٹ آفس سیونگ بینک
بچت اور خوشحالی کے لئے آپ کا معاون

سگریٹ سلگائیے اور لطف اُٹھائیے

WILLS's

Navy Cut

MEDIUM CIGARETTES

سات آنے (۴۴ پیسہ) میں دس سگریٹ

جہاں کہیں مقامی ٹیکس عائد ہو وہاں قیمتوں میں کچھ فرق ہو سکتا ہے۔

AKISTAN TOBACCO COMPANY LIMITED

اہم مطبوعات

	قیمت فی جلد روپے
(۱) چھوٹی صنعتوں کے منصوبے (اردو) نمبر ۱ ، ۲ ، ۳ اور ۴	۱۲ - ۰
(۲) پاکستان بیمہ کی سالانہ کتاب ۱۹۶۱ع	۲ - ۰۰
(۳) حکومت پاکستان کے درجۂ اول کے عہدہ داروں کی سول لسٹ یکم جنوری ۱۹۶۱ع	۱۰ - ۶۲
(۴) پاکستان کی مردم شماری ، ۱۹۶۱ع کا کتابچۂ مردم شماری نمبر (۲) جنس : شہری و دیہی ، مذہبی ، غیر پاکستانی باشندوں کے بارے میں مشرقی پاکستان میں تھانوں اور مغربی پاکستان میں تحصیلوں کی طرف سے فراہم کئے ہوئے اعداد	۱ - ۰۰
(۵) قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ ۱۹۵۹ع	۳ - ۵۰

مینوجر مطبوعات حکومت پاکستان ، بلاک نمبر (۴۴) شاہ راہ عراق ، کراچی
اور مغربی پاکستان کے اجازت یافتہ ایجنٹوں سے مل سکتی ہیں

مسکراہٹ
آپ کے
حُسن کی
زینت ہے
دانت اچھی حالت میں نہ ہوں تو مسکراہٹ
کی ساری لطافت زائل ہو جاتی ہے۔
اپنی مسکراہٹ کو زیادہ لطیف اور
دلکش بنانے کے لئے ہمیشہ
تبت ٹوتھ پیسٹ استعمال کیجئے
یہ دانتوں کو صاف شفاف اور
صحت مند رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
TIBET
TOOTH PASTE
with Chlorophyll
تبت
ٹوتھ پیسٹ
سادہ، پنک، کلوروفل کے ساتھ اور ڈی۔ ۵ ڈینٹل کریم
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ کراچی۔ ڈھاکہ
آرائشِ جمال کی معیاری مصنوعات تیار کرنے والے
united
TP-77/1950

ترقیِ اُردو بورڈ کی جامع، تاریخی و تحقیقی

اُردو لُغَت

(مختصر، جلی نسخہ)

جلد اوّل : الفِ مقصورہ

یہ ترقیٔ اردو بورڈ کی زیر ترتیب عظیم‌الشان تاریخی لغت کے مجمل نسخے کی دوسری قسط ہے۔ پہلی قسط اردو نامہ شمارہ نمبر ۷ میں ہدیۂ ناظرین کی گئی تھی۔ اب یہ سلسلہ ہر اشاعت میں جاری رہے گا، اور اگر پڑھنے والوں نے اسے سراہا اور اس کے کافی قدردان پیدا ہو گئے تو رسالے کو ماہ بماہ کردیا جائے گا، نیز ہر قسط کے صفحات کی تعداد بھی بڑھادی جائیگی۔

ترقیٔ اردو بورڈ کی بڑی لغت تاریخی اصول پر مرتب کی جا رہی ہے، یعنی اس میں قدیم دکھنی دور سے لے کر دور حاضر تک ہر لفظ کی تاریخ (خواہ وہ رائج ہو یا متروک) سند و مثال کے ذریعے واضح کی گئی ہے، اور ہر عہد کی مثالیں مع سنین و حوالہ جات درج کی گئی ہیں۔ موجودہ مختصر ایڈیشن میں قدیم دکھنی زبان کی مثالوں کو عموماً خارج رکھا گیا ہے، اور دوسرے ادوار کی مثالوں میں بھی بہت سی تخفیف کر دی گئی ہے۔

مخففات و علامات کی فہرست پہلی قسط کے ساتھ شائع کی جا چکی ہے اور تدوین لغت کے اصول نمونۂ لغت کے ساتھ شائع کئے گئے تھے، جو شمارہ نمبر ۵ کے ساتھ ضمیمے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ جن اصحاب کے پاس نمونۂ لغت موجود نہ ہو وہ اس ادارے سے مفت طلب فرما سکتے ہیں۔

اسنادو امثلہ میں مصرع اور فقرے کی تمیز اس طرح ہوتی ہے کہ فقرے کے آخر میں ہمیشہ وقفہ (۔) ہوگا اور مصرع کے آخر میں نہ ہوگا۔

شان‌الحق حقی

معتمد مجلس ادارت

لغات اردو

— جی مذ

باپ کو پکارنے کا نام جو بچے عموماً اختیار کرلیتے ہیں۔ مرادف ابّا جان، ابّا میاں

نمناک چشم کرکے لگی کہنے نیک خو
ابا جی تم کو جانے نہیں دینگے ہم کبھو

۱۸۸۳ قلق میرٹھی، ک، ۲۵۸

— حضور مذ

شائستہ گھرانوں میں والد کے لئے مودبانہ کلمہ، (میرے، ہمارے) ذی عزت والد

کوئی نہیں ہے جاں سے گذرنے کے واسطے
ابا حضور جاتے ہیں مرنے کے واسطے

۱۸۹۴ سجاد رائے پوری (ق)

— میاں مذ

ابا جی، ابا جان کی مثل والد کے لئے ادب و محبت کا کلمہ

ادھر جھٹپٹا ہوا ادھر مس نے ابا میاں کی اچکن پہنی، صافہ باندھا اور باہر نکل گئی۔

۱۹۳۶ راشدالخیری، بیلے میں میلہ، ۶۳

اِبا (کس ا) امذ

۱۔ انکار

تو جو کہے وہی کریں ہم کو ابا سے کیا غرض

۱۹۵۱ حسرت موہانی، ک، ۱۰۳

۲۔ نفرت، نا پسندیدگی

اک ہم کہ ہم کو سو میں سے ننانوے میں عار
اک وہ کہ کوئی کام ہو ہرگز ابا نہیں

۱۹۰۹ نظم بے نظیر، ۹۴

۳۔ (کسی بات سے) اختلاف، ناموافقت (کرنا)، تسلیم نہ کرنا، نہ ماننا

دریائے گومتی کو ایسے ملک میں نشان دیا ہے، جس سے جغرافی قیاس ابا کرتا ہے۔

۱۹۱۴ حالی مکتوبات، ۸۳

۴۔ اجتناب، پرہیز (کرنا)، بچنا

وہ تکلف اور آورد سے ابا کرتا تھا۔

۱۹۱۴ شبلی، مقالات، ۲: ۵۸

وہ ایسے لوگوں سے ---- ملنے سے ابا کرتے تھے۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۳۵۰

۵۔ سرتابی، نافرمانی (کرنا)

دولت اور اقبال کرسکتے نہیں ہم سے ابا
آیت استخلاف کی ہے اپنے دعوے پر دلیل

۱۹۳۷ بہارستان، ۳۹

اف کرنا، ہونا

[ع : اِباء (مد : ا ب ی) وزن فِعال]

ابابیل (فت ا، ی مع) امث

ایک چھوٹی سی چڑیا، پرسیاہ، سفید، پرانے گنبدوں، کھنڈر اندھیروں میں مٹی کا گھونسلا بناکر رہتی ہے۔

بال نہیں ... آرزو، ۱۰۵

شام کہانی تھی کہ یہ چہچہاتی، چڑچڑاتی باہ...

محصنات، ۲۱۲

لگاتی ہے۔ چمگادڑ کے بہلنے کے واسطے صورت اور ... ہے، یہ اس کا آبال تھا اس کے اڑ...

شبلی، کلیات، ۴۱

اس کی مدد سے فوج ابابیل نے کیا
لشکر تباہ کعبے پہ اصحاب فیل کا
1822 ذلائل طفر ۱ : ۲

ہیں یا ہر سوئے بینیٔ شیخ کے دوں منخر دوں سے
کہ جیسے آشیاں سے سر نکالے ہیں ابابیلیں
1884 بحر، ۱۰۵

ہم ابابیلوں سے لیکن کس لئے مانگیں مدد
جب کہ تو خود ہے ہماری فتح و نصرت کی دلیل
1934 بہارستان، ۰۴

[ع : جمع اباله یا ابیل (کس اشد ب)
گروہ در گروہ، صف در صف]

آبابیلیا
(فت ا، ی مع) دف، مذ

۱۔ ابابیل سے ملتا جلتا ایک قسم کا کبوتر جو رنگ میں ابابیل سے مشابہ ہوتا ہے۔ پر سیاہ، سینہ سفید

[ار : ابابیل + یا (لاحقہ صفت)]

اباحت
(کس ا، فت ح) امث

جواز، کسی امر کا کرنا نہ کرنا شرعاً یکساں ہو

مفتیوں نے بھی اباحت کا فتویٰ دے دیا تھا۔
1901 حیات جاوید، ۲ : ۳۱۵

اس کی اباحت اور حرمت میں صحابہ کا اختلاف ہے۔
1906 الحقوق، ۱ : ۱۰۹

[ع : اباحة (مد : ب و ح) از باب افعال = مباح اور جائز قرار دینا]

اباحتی
(کس ا، فت ح، ی مع) امذ

۱۔ وہ شخص جو حرام کو مباح اور جائز رکھتا ہو؛ ۲۔ محرمات سے صحبت جائز رکھنے والا؛ ۳۔ فرقۂ اباحیہ کا پیرو جو ہر چیز کو اپنے لئے جائز سمجھتا ہے (رک اباحی)

اباحی
(کس ا، ی مع) امذ

اباحتی، فرقۂ اباحیہ کا پیرو

یہ شخص اباحی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتاتا ہے۔
1901 حیات جاوید، ۲ : ۲۸۷

اباحیت
(کس ا ح، شدی بہ فت) امث

۱۔ فرقۂ اباحیہ کا طریق و عمل
۲۔ حرام اور مردار کو جائز قرار دینا
۳۔ فرقۂ اباحیہ کا مذہب و مسلک

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحیت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔
1869 غالب، خطوط، ۸۰

اباحیہ
(کس ا، ح، شدی بہ فت) امذ

متصوفۂ مبطلہ کا ایک فرقہ جو کہتا ہے کہ ہم میں گناہوں سے اجتناب کی قدرت ہے نہ مامورات کے بجا لانے کی طاقت، اس جہاں میں کوئی کسی چیز

کا مالک نہیں، تمام لوگ اموال و ازواج میں شریک ہیں

فرقۂ اباحیه، مزدکیه اور متبعان اپیکورس طرف دنیاوی لذائذ کے قائل تھے۔
1904 الکلام، ۲: ۲۳

جتنے تھے فرقۂ اباحیه
فعل تھے سب کے غیر مرضیه
1933 نظم طباطبائی، ساقی نامه، ۲۰

اُبارنا (ضم ا، سکن ر) ف

۱۔ باقی رکھنا، جمع کرنا

۲۔ رھائی دینا، چھڑانا، بچانا

تم نے مجھے ابارلیا ھوری بھائی، اب معلوم ھوا که میں سنسار میں اکیلا نہیں ھوں۔
1936 پریم چند، گئودان، ۶۱

[ار : ''اُبرنا'' کا متعدی]

اُباس (ضم ا) امث

[س : اُد'واس उद्वास = بری بو]

اُباسی (ضم ا، ی مع) صف

خمیر اٹھا ھوا، سڑاندا

[س : اُد'واسیت उद्वासित]

اَباطیل (فت اب، کس ط، ی مع) ج مذ

بے اصل، ناحق یا غلط (باتیں)

سینه‌چاکان دل آزاری کلمات اباطیل، صدر نشینی تخت رفعت و عزت سے یوں خاک‌خواری و مذلت پر بٹھائے جاتے ھیں۔
1879 بوستان خیال، ۶: ۱۰۹

اِباق (کس ا) امذ

(فقه) بالغ غلام یا لونڈی کا بھاگ جانا (بھاگنے والا ''آبق'')

مگر ھاں اس وقت مفتی صاحب اباق کا مسئله پیش کریں گے۔
1895 چراغ علی، رسائل، ۱۸۰

[ع : (مد : ا ب ق) وزن فعال]

اَباک (فت ا) صف

مبہوت، خاموش

اس طرح کے لچھن دیکھ کر ہو ہمن اباک ھوا۔
1805 سنگھاسن بتیسی، ۶۳

[س : اواک अवाक = ا + واک]

اُباکنا (ضم ا، سکن ک) ف ل

۱۔ ابکائیاں لینا ۲۔ قے کرنا، الٹی کرنا

[س : اُدوَم ذر उद्वमक]

اُبال (ضم ا) امذ

۱۔ کھد بدا کر اوپر اٹھنا، جوش (دودھ، پانی، وغیرہ کا)

یه جوش عشق ہے کچھ دودھ کا ابال نہیں
1854 صبا، غنچهٔ آرزو، ۱۰۵

تم نے تو ایسی ھنڈیا پکائی تھی که یه واقعه اس کا پہلا ابال ہے۔
1885 محصنات، ۲۱۲

مجبور ھو کے ان کے بہلنے کے واسطے
پانی چڑھادیا ہے، یه اس کا ابال تھا
1914 شبلی، کلیات، ۳۱

۲۔ وفور، ابھار، ہیجان

دل میں برائی کا جوش اٹھتا ہے، لیکن باہمی تعلقات، ذاتی وجاہت، خاندانی شرافت غرض ایسی بہت سی چیزیں مانع آتی ہیں اور اس آبال کو ٹھنڈا کردیتی ہیں۔

۱۹۳۷ فرحت، مضامین، ۵: ۲۰۱

۳۔ جوشش خون، سودا ویت

ان کے خون میں وہی ابال تھا جو آم کی ڈالیوں پربور کی شکل میں نمودار ہورہا تھا۔

۱۹۱۲ یاسمین، مرزا محمد سعید: ۹۵

۴۔ پھدپھداہٹ، پھپھک

آج کیوں آیا اجی ہاسی کڑھی میں یہ ابال

۱۸۹۷ جان صاحب، ۹۷

۵۔ کف، پھین

علی سے عشق جو تھا اوپری، منافق کو
سقر میں پینے کو مالک نے بھی ابال دیا

۱۸۶۶ گلدستۂ امامت، ۲۲

۶۔ غصہ، تاو، تیہا

ان سے طبیعت کا ابال ضبط نہ ہوسکتا تھا۔

۱۹۰۱ حیات جاوید، ۲: ۴۳۷

اف: اٹھنا، آنا، بیٹھنا، لانا، نکلنا

[س: اُدْوَل उद्वल، پ: اُبَل उबल]

— کرنا ف ل

۱۔ جوش میں آنا ۲۔ ابکائی لانا، متلی پیدا کرنا

نہ ہاتھ ڈالے کوئی نعمت فقیری پر
نہ هضم ہوں گے یہ ٹکڑے ابال کرتے ہیں

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۱۲۷

۳۔ ابھرنا، اچھل کر سطح پر آنا (مچھلی کا)

کہیں دریا کے بیچ میں کسی بڑی مچھلی نے ابال کیا ہے تو اس سے حلقہ وار موجیں یعنی مرکز اضطراری پیدا ہوا ہے۔

۱۹۲۷ میر باقر علی، مولا بخش ہاتھی، ۱۱

اُبالا (ضم ا) صف

۱۔ جوش دیا ہوا، کھولایا ہوا

۲۔ بے گھی اور مسالے کا پکا ہوا، بے مزا (سالن، کھانا)

گوارا نا گوارا بھی ہو بد گردیٔ دوراں سے
ابالے پر قناعت کرتے ہیں سب قحط روغن میں

۱۸۴۶ آتش، ۲۴۲

[ا ر: ابال + ا (صفتی)]

— سُبالا (ضم س)

بے گھی اور مسالے کا، بے مزا، پھیکا سیٹھا (کھانا)

بچے کیوں آبالا سُبالا کھائیں۔

۱۹۴۳ دلی کی چند عجیب ہستیاں، ۹

[ار: ابالا + سبالا (تا بع)]

اُبالْنا (ضم ا، سکن ل) ف م

۱۔ جوش دینا، اونٹانا، کھولانا م: دودھ آبالنا

۲۔ کسی چیز کو پانی میں جوش دیکر پکانا
م: چاول آبالنا، انڈا ابالنا

اگر ابالنے یا پکانے میں گوشت سے کسی قسم کی بو آئے تو لکڑی کا چھوٹا سا ٹکڑا لے کر آگ میں جلاؤ۔
۱۹۳۶　　چمنستان مغرب، ۹۳

ٹماٹروں کو آدھ سیر پانی میں آبال لیں
۱۹۳۵　　شاہی دسترخوان، ۵۲

۳۔ (مجازاً) غصہ دلانا، بھڑکانا، جلانا

شہ کہتے تھے اے ظالمو مجھ کو نہ ابالو
غیظ آیا تو کھینچے گا پھر اب جان علی تیغ
۱۸۷۱　　ایمان (واجد علی شاہ)، ۸۸

اُبالی (ضم ا، ی مع) صف مث
"آبالا" (رک) کی تانیث

غذا بھی دے گا تو مونگ کی ابالی دال۔
۱۸۹۱　　فغان بے خبر، ۲۳۵

— بھاتی ہے (کہاوت)
اسی میں خوش ہیں، یہی بہت ہے
(جبکہ مجبوراً کسی چیز پر قناعت کرنی پڑے)

یہ دوسری بات ہے کہ سننے والے کہیں ہمیں تو ابالی ہی بھاتی ہے۔
۱۹۲۵　　اودھ پنچ، ۱۰، ۳: ۳

— سبالی معمولی غذا یا ہنڈیا، سادہ کھانا «مرغن کے بالمقابل»

کھلاتی تھیں اماں زمانے کی نعمت
نہ تھی جانتی میں ابالی سبالی
۱۸۷۵　　انشاء ہادی النسا، ۹۳

اُبانا (ضم ا) ف م
۱۔ آگانا، بونا «آبنا کا متعدی»
۲۔ بے لطف بنانا، اجیرن کرنا «اوبنا (رک) کا متعدی»
[رک: آبنا، اوبنا]

اَباھَن (فت ا، فت ہ) امذ (ہندو)
ہَوَن، یَگیہ، ہَوم، ایک خاص رسم جو کسی دیوتا یا پنڈت کی تعظیم کے لئے ادا کی جاتی ہے، خاص طریقے سے نذر چڑھانا (منتر پڑھ کو آگ میں گھی وغیرہ ڈالتے جاتے ہیں)

پردھان نے ... جتنے دیوتا تھے، ان کو بھی منتروں سے اباھن کر کے بٹھلایا۔
۱۸۰۵　　سنگھاسن بتیسی، ۶۵

[س: آواھَن आवाहन = بلاوا، دعوت]

اُبائی (ضم ا، ی مع) امث
۱۔ آگانے کی اجرت، آبوائی
۲۔ آبانا، آگانا
[ار: بونا > ابونا > ابانا (متعدی) > ابائی (ی مصدری)]

اَبتَث (فت ا، سکن ب، فت ت) امذ
عربی حروف ھجا، ا ب ت ث الخ، جن کی ترتیب (درج ذیل) "ابجد" کی ترتیب سے مختلف ہے (رک: حروف تہجی)

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ء لا ی ے

دفتر، منقبت شاہ نجف کھولتا ہوں
لو میں ابتث سے بھی اب جد کے شرف کھولتا ہوں
۱۹۱۱ ریاض شمیم: ٦ (ق) ١٣

[ع : ابتث = ا + ب + ت + ث]

اِبتِدا (کس ا، سکن ب، کس ت) امث
(نیز امذ : قدیم، شاذ)

۱ - آغاز آفرینش، ازل؛ قدیم ترین زمانہ

دریا تو ابتدا سے ہمارا ہے تم ہو کون
اس کا محق رسول کا پیارا ہے تم ہو کون
۱۸۷۴ انیس ۲: ۱۳٦

خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔
۱۹۵۱ کتاب مقدس (توریت)، ۱

۲ - اوائل، شروع، کسی چیز یا امر کے آغاز کا وقت

ابھی تو عاشقی کا ابتدا ہے
۱۷٦۳ سراج، ۲۸٦

ابتدا میں خط کوں مت منڈوا، خدا کا خوف کر
معصیت ہے سبزۂ خط کوں اگر کرئیے درو
۱۷۳۳ آبرو، د (ق)، ۳

یار مل جائے گا اتنی بھی نہ بے صبری کر
ابتدا عشق کی ہے اے دل صد چاک ہنوز
۱۸۲۴ مصحفی، انتخاب (رامپور)، ۹۹

۳- سرا، سرہ، کسی چیز کے آغاز کی جگہ

گنگا کے کنارے پر ابتدا سے انتہا تلک بیشتر مٹھ مرد، چور، مفسد، راہزن بستے ہیں۔
۱۸۰۱ آرائش محفل، افسوس، ۸۳

میں دیکھ کر یہ طول نہ کیوں ہوں فدائے زلف
جز ابتدا نظر میں نہیں انتہائے زلف
۱۸٦۵ نسیم دہلوی، ۱۷۱

۴- بچپن، طفلی، لڑکپن

رہا ابتدا سے مجھے شوق علم
۱۹۰۰ امیر، محامد خاتم النبیین، ۲

۵- (عروض) مصرع ثانی کا رکن اول
م: "جوناگہ ہوا صبح کا ابتدا" اس مصرع میں "جوناگہ" (فعولن) ابتدا ہے

اف : پڑنا، ڈالنا، کرنا، ہونا

[ع : ابتداء (مد : ب د و) مص وزن اِفتعال]

— **ابتدا میں** مف

اول اول، شروع شروع میں، ابتدائی زمانے میں

ابتدا ابتدا میں ان نیلاموں نے بے ترتیبی سے کثرت پکڑی۔
۱۸۵۸ اسباب بغاوت ہند، ۳۷

— **بگڑنا** ف ل

۱- بچپن کی تربیت کا برا ہونا، آٹھان خراب ہونا

۲- بسم اللہ غلط ہونا، آغاز خراب ہونا

انجام بخیر ابتدا بگڑی ہے
۱۸۷۴ انیس، رباعیات، ۲۲۱

ـــ ڈالنا ف م

ڈول ڈالنا، بنیاد رکھنا، آغاز کرنا

کردیا خو گر جفا تونے
خوب ڈالی تھی ابتدا تونے

۱۹۱۴ حالی، ۱۳۱

ابتداءً (کس ا، سکن ب، کس ت) مف

۱۔ شروع شروع میں، اول اول

سنا ہے کہ ابتداءً نواب صاحب، ایک صاحب "بیمار" تخلص کو اپنا کلام دکھاتے تھے

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۲

۲۔ پہلی مرتبہ، اولاً، پہلے پہل

حق شفع --- ابتداءً ہندوستان میں مسلمانوں نے جاری کیا۔

۱۸۹۳ شرح قانون شہادت، ۵۹

ابتدائی (کس ا، سکن ب، کس ت) صف

۱۔ پہلا، اولین، تمہیدی، سرسری

اس وقت جو کام ہو رہا ہے وہ بالکل ابتدائی ہے۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۷

۲۔ آغاز کا، شروع شروع کا

ایک سن رسیدہ بزرگ ابتدائی تبلیغ رسالت کی دشواریاں برداشت کئے ہوئے اور نیک نفس صحابی تھے۔

۱۹۲۲ شررؔ، فلپانا، ۹

۳۔ تعلیم کی بنیاد، یا مکتبوں کے ابتدائی درس سے متعلق؛ بچوں کی تعلیم یا ادنیٰ جماعتوں سے متعلق؛ پرائمری، تحتانی (ثانوی کے با المقابل)، آسان، سہل، سادہ م: تعلیم۔ جماعت۔ مدرسہ (مدارس) ۔ نصاب

پیرس کے قریب تورس کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں سے میٹریکیولیشن کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۲۴ انقلاب الامم، ۲

۴۔ قدیمی، اصلی

یہ ابتدائی چٹانوں کے ٹکڑوں --- میں پایا جاتا ہے۔

۱۹۰۶ تربیت الصحرا، ۳۲

۵۔ اصولی، بنیادی م: ابتدائی مسائل، ابتدائی شرائط

ـــ عدالت ست

۱۔ ماتحت عدالت، پہلی کچہری «عدالت اپیل کے مقابلے میں»

اگر ابتدائی عدالت میں کسی دستاویز کے شہادت میں ادخال کی بابت اعتراض نہ کیا جاوے۔

۱۸۹۳ شرح قانون شہادت، ۲۷

۲۔ (مجازاً) ماتحت حاکم جس کے فیصلے کے خلاف اپیل کی جائے

فوجداری کی اپیلوں میں عدالت اپیل کا فرض ہے کہ وہ روئداد مسل پر ابتدائی عدالت کی غور کرے۔

۱۸۹۳ شرح قانون شہادت، ۱۸

مَدارِس / مدرسہ مذ

تحتانی مدرسے / مدرسہ، جہاں تین یا چار جماعتیں ہوتی ہیں اور جہاں بچے معمولی نوشت وخوانداورعٖ،وماً کچھ حساب، جغرافیہ وغیرہ سیکھتے ہیں: ادنیٰ مدرسے یامکتب

ابتذال (کسر ا، سکن ب، کسر ت) امذ

۱۔ کمینہ پن، اخلاقی پستی

خوشامد، ابتذال اور دنائت کی باتیں مسلمان سے ہو نہیں سکتیں۔

۱۸۸۸ ابن الوقت ۲۸۷

۲۔ کثرتِ استعمال، پامالی، عمومیت

رفتہ رفتہ اس کے (قصیدے کے) ابتذال کی یہ نوبت پہنچی کہ ادنیٰ ادنیٰ بنیوں اور کھچڑی فروشوں کی شان میں کہے جانے لگے۔

۱۹۲۷ شاد، فکر بلیغ، ۱۰۴

۳۔ (ادب) شاعری کا رکیک، عامیانہ انداز یا شعر میں فرسودہ و پامال مضامین لانا

اس ابتذال سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ جب تک متقدمین کے کلام پر عبور نہ ہو شعر نہ کہے۔

۱۹۳۳ نظم طباطبائی، مقدمہ د، ی

ابتذال اور سوقیت لکھنؤ والوں کے کلام تک محدود نہیں۔

۱۹۵۰ چھان بین، ۱۰۶

دامنِ شعرِ عشق پر حسرت
داغ اہمال و ابتذال نہیں

۱۹۵۱ حسرت موہانی، ک، ۲۷۱

[ع (مد: ب ذ ل) مص وزن افتعال = کسی چیز کا بکثرت استعمال]

اَبتَر (فت ا، سکن ب، فت ت) صف

۱۔ منتشر، پراگندہ، تتر بتر، الٹ پلٹ، بے ربط و بے قاعدہ، نا مرتب

وحشت سے حواس خمسہ ششدر
چاروں ورق عناصر ابتر

۱۹۲۵ شوق، ترانہ، ۱۸

بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

۱۹۳۶ ضرب کلیم، ۹۱

۲۔ خوار، زبوں، خستہ، خراب، بری حالت، بگڑی ہوئی شکل میں

تجھ بن اے نور بخش محفل دل
حال مجلس تمام ابتر ہے

۱۷۰۷ ولی، ۲۶

وہ ریگ رواں کا گرد لشکر
یعنی تاج الملوک ابتر

۱۸۳۸ گلزار نسیم، ۵

ہم صَلِّ لربک پڑھتے ہیں
پروان اسی سے چڑھتے ہیں
کیوں کر نہ عدو سب ابتر ہوں
ہم خیر کثیر کوثر ہیں

۱۹۳۷ بہارستان، ۳۷

هم زمانے کو کیا کہیں ابتر
هم هی بدتر ملے زمانے کو

۱۹۳۲ روح ادب، ۶۹

۳. بد شعار، بد چلن، آوارہ «عموماً لڑکے کے لئے»

آنکھ سے نکلے پہ آنسو کا خدا حافظ یقیں
گھر سے جو باهر گیا لڑکا سو ابتر هو گیا

۱۷۵۵ یقیں، ۹

یارو مجھ سے تو لا ولد بہتر
میرا بیٹا اور اس قدر ابتر

۱۷۸۰ سودا، ۳۸۵

الٰہی برپا کرے نہ طوفاں کہ طفل ابتر هوا هے بانکا

۱۸۳۸ نصیر، چمنستان سخن، ۸

کیسا بیٹے کو ابتر کر رکھا هے

۱۸۴۵ نغمۂ عندلیب، ۶۱

۴. غلط، فاسد، باطل، غیر منطقی، غیر معقول

تری تقریر میں دور تسلسل لازم آتا هے
جو هے بالاتفاق اهل خرد میں باطل و ابتر

۱۹۳۵ صحیفۂ ولا، ۵۶

۵. (گنجفہ) بے میر کی بازی، ملا دینے کے قابل «جب کہ بانٹ میں میر کسی کے حصے میں نہ آئے اور اس بنا پر پتے رلا ملا دئے جائیں»

هے جدائی کا گنجفہ بے میر
اس سبب دل کی بازی ابتر هے

۱۷۶۳ سراج، ۳۵۲

دفتر عالم بجائے گنجفہ هے آپ کو
دیجئے ترتیب دم میں دم میں ابتر کیجئے

۱۸۳۸ ناسخ، ۲: ۱۷۱

الف: کرنا، هونا

۶. (عروض) وہ رکن جس میں بتر (زحاف) واقع هوا هو۔ م: فع (فعولن سے)

۷. سانپ کی ایک قسم جس کی دم چھوٹی هوتی هے

اب نام سانپوں کے جس قدر یاد آتے هیں حوالۂ قلم کئے جاتے هیں۔۔۔ ابتر، ناسر، این۔۔۔ (الخ)

۱۹۱۳ تریاق مسموم: سوزان، (اشاعت۸)، ۳

[ع: صفت مشبہ (مذ) = دم کٹا (مد: ب ت ر)]

ابتری (فت ا، سکن ب، فت ت) امث

۱. بے ترتیبی، بد نظمی، انتشار

انسان ان کو ایک پریشانی اور ابتری کی حالت میں رهنے دے۔

۱۸۹۸ سر سید، تہذیب، ۲: ۳۹۳

اگر میں بھی چلا جاؤں تو وهاں کے کارخانے میں ابتری آجائے۔

۱۹۱۵ حور عین، ۱۷

انیسویں صدی میں ابتری اور طوائف الملوکی ملک بھر میں پھیلی هوئی تھی۔

۱۹۳۵ چند هم عصر، ۲۱۲

۲. (گنجفہ) گڈمڈ، غلط ملط (هوجانا، هونا)

بازیٔ آسماں نے کھوئے حواس خمسہ
پتے سے گنجفے میں کیا ابتری ہوئی ہے
۱۸۸۴　　قدر بلگرامی، د، ۳۰۱

۳۔ پتوں کی بانٹ میں بھول چوک، غلط تقسیم

انسان نہ ہو پریشاں کیوں بدقماشیوں سے
عنصر کا گنجفہ ہے اک دست ابتری کا
۱۹۲۷　　شاد

۴۔ زوال، تنزل

جو ماہ سپہر برتری تھا
سو ماہیٔ بحر ابتری تھا
۱۸۳۸　　گلزار نسیم، ۲۵

۵۔ برہمی، بے قاعدگی، بگڑا قرینہ، بگڑے طور

سیہ دل کی صحبت، اثر کیوں نہ ہو
سکھائی تجھے زلف نے ابتری
۱۷۳۱　　دیوان آبرو (ق)، ۱۵۲

دفتر میں دوئی قید کوئی بوریا نشیں
وہ ابتری ہے کوئی کہیں ہے کوئی کہیں
۱۹۵۲　　سروذ و خروش، ۵۳

اف۔ پڑنا، دینا، کرنا، ہونا

ابتسام
(کس ا، سکن ب، کس ت) امذ

مسکراہٹ، «اظہار مسرت یا خوشنودی کے طور پر»؛ شگفتگی، کھل پڑنا (ہونٹوں کا)؛ (مجازاً) کھل اٹھنا (پھول کا)

زنجیر پا ہے اس کی تری زلف غالباً
مدت ہوئی نسیم نہیں کرتی ابتسام
۱۸۱۰　　میر، ک، ۱۱۸۶

غنچۂ تصویر کو بھی مثل گلہائے چمن
ہے نسیم لطف سے تیری ہوائے ابتسام
۱۸۵۴　　ذوق، ۲۷۵

فنـ کرنا

[ع (مد: ب س م) وزن اِفتعال]

اِبْتغا
(کس ا، سکن ب، کس ت) امذ، شاذ

طلب، خواہش

ولی ہے مست قدح راز دار وحدت کا
نہ حاجت اس کو صراحی نہ ابتغائے قدح
۱۷۰۷　　ولی، ضمیمہ ک، ۵

[ع: ابتغا (مد: ب غ ی) وزن افتعال]

اِبْتلا
(کس ا، سکن ب، کس ت) امذ، نیز مث

۱۔ آزمائش، امتحان، جانچ

خدا کسی سے کسی دل کو آشنا نہ کرے
یہ ابتلا ہے بری طرح کا خدا نہ کرے
۱۷۹۰　　دیوان قائم (ق)، ۱۲۴

اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے فنا و بقا
بنا ہے عالم اسباب ابتلا کے لئے
۱۹۳۲　　نظم بے نظیر، ۱۴۹

۲۔ مبتلا ہونا، پھنس جانا «کسی بلا، مرض وغیرہ میں»

بس بدیہی بات یہ ہے کہ تکلیفات میں ابتلا مفاد عام کے منافی ہے۔
۱۹۳۲　　اودھ پنچ، ۱۷، ۹:

۳۔ (مجازاً) بلا، مصیبت، افتاد

آشفتہ کوہ و دشت نہیں مدت پھرا ہوں میں
آوارہ گرد بادیۂ ابتلا ہوں میں
۱۸۱۰ میر، ک، ۱۳۶۶

کس کو اس ابتلا کی خبر تھی کہ ایک دن
علم پر ہمارے ہی علما ڈھائیں گے ستم
۱۹۳۷ بہارستان، ۱۹۰

اف (ـ میں) پڑنا، ڈالنا

[ع : ابتلاء (مد : ب ل و) وزن اِفتعال]

ابتہاج (کس ا، سکن ب، کس ت) امذ

مسرت، خوشی، انبساط

جب نہ رہے گا امتزاج روح کرنے کی ابتہاج
دیکھیں گے سوئے آسماں آتش و باد و آب و خاک
۱۸۱۷ انشاء، ک، ۲۳۰

فرطِ ابتہاج سے بول اٹھے کہ اے حضرت
ہم بھی ہیں۔
۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۱ : ۱۹

مضموں وہ جس سے روح کو غمگیں کی ابتہاج
الفاظ جن سے غنچۂ خاطر کو اہتزاز
۱۸۸۶ سخن بے مثال، ۲۶۲

[ع : (مد : ب ہ ج)=خوش ہونا، وزن افتعال]

اُبٹن (ضم ا، سکن ب، فت ٹ) امذ

اُبٹنا، بٹنا

ہلدی، بھنے ہوئے جو، کھلی، ناگرموتھا، لیزبات، بالچھڑ وغیرہ کا برادہ، تیل میں گوندھا ہوا جسکی لیزی سی بنا کر

جسم اور منہ پر ملا جاتا ہے، (خصوصاً دولھا دلہن کے) جلد میں نرمی، صفائی، خوشبو پیدا کرنے اور رنگ نکھارنے کے لئے

ملا ابٹن لگایا منہ پہ غازہ
کیا رخسار جوں گل برگ تازہ
۱۷۹۷ عشق نامہ، ۱۰۷

وہ ابٹن، مسی، کاجل، سیندور سے بسی ہوئی دلہن
۱۹۵۴ شاید کہ بہار آئی، ۱۰۳

شادی کا ترانہ گاؤ ابٹن لاؤ
مانجھے بیٹھی ہے رات جہ گو یا رو
۱۹۵۵ سموم و صبا، ۰۰۰

اف : لگانا، ملنا

[پ : ابٹن، س : اُدْ وَرْتَن उद्वर्तन = ملنا، رگڑنا]

اُبٹنا (ضم ا، فت ب، سکن ٹ) امذ

اُبٹنا (قدیم، شاذ) ابٹن، بٹنا

آبٹن (رک)

بٹنا نکوڑا کہنا بھی کچھ لفظ ہے بھلا
ہم تو یہی کہیں گے اجی اُبٹنے کی باس
۱۸۱۷ انشا، ۱۹۶

حمامی باہر چلے گئے، خواصوں نے پہلے
ابٹنا ملا۔
۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۳ : ۱۲۸

بہنیں ملیدے کے سات نوالے کھلاتی اور
اس کے ہاتھ پر ابٹنا رکھتی ہیں تاکہ اس کا
بھی نیگ ملے
۱۹۰۵ رسوم دہلی، (سید احمد دہلوی)، ۰۰

اف : کرنا، کھیلنا، لگانا، ملنا

—کھیلنا ف ل

شادی کی ایک رسم:

"دولھا دلہن کو مائیوں بٹھانے کے بعد نیز ساچق کے دن، اندر عورتوں میں، باہر لڑکے بالوں اور مردوں میں اشنا کھیلا جاتا ہے۔ دلہن کے رشتہ دار دلہن کے ہاں، دولھا کے رشتہ دار دولھا کے ہاں اشنا کھیلتے ہیں۔ سالے، بہنوئی، نندیں، بھاوجیں سب مل کر اودھم مچاتے ہیں۔ کسی کے منہ کو کسی کے سر کو، کسی کی آنکھوں کو، کہیں زبردستی کہیں خوشی سے اشنا ملتے ہیں۔ عورتیں عورتوں کی، مرد مردوں کی خوب گت بناتے ہیں۔ بڑے بڑے لگنوں میں اشنا گھولا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو خوب لتھیڑتا ہے۔ اہل قلعہ میں دولھا دلہن والوں کے ہاں اور دلہن والے دولھا والوں کے ہاں اشنا کھیلنے جایا کرتے تھے۔"

(رسوم دھلی، ۱۹۱۹ع)

اَبجَد
(فت ا، سکن ب، فت ج) امث۔

۱. حروف تہجی الف، با، تا وغیرہ کسی زبان کے بسیط یا مفرد حروف

گزرا مجاز سے تو حقیقت کھلی مجھے
قرآں کا سامنا تھا جو ابجد تمام کی

آتش، ۷۸
۱۸۴۶

ترے عارض کو میں آئینۂ نور خدا سمجھوں
کہ فہم سر وحدت ہے الف ایماں کی ابجد کا

محسن، ۷۱
۱۹۰۰

۲. (مجازاً) کسی علم، فن یا صناعت کے مبادیات، ابتدائی مسائل

صورت کے خط و خال سے باطن کی سیر کر
ابجد یہی ہے علم معانی کے واسطے

کلیات منیر، ۳۱۶
۱۸۶۹

علم انسان کی ابجد یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں جانے

رویائے صادقہ، ۱۰۵
۱۸۹۹

۳. قاعدۂ جمل، کسی لفظ یا الفاظ کے حروف کے مقررہ اعداد کو جوڑ کر کسی واقعے کا سنہ نکالنے کا قاعدہ

گر ہندسہ داں ہے تو سمجھ لے اعداد
کتنے ہیں احد کے بحساب ابجد

سودا، ۳۰۲
۱۷۸۰

[ع : ا + ب + ج + د]

—خواں
—داں صف۔ **الف بے تے جاننے والا، حرف شناس**

رمال، نجومی، گھڑیالی، مُلّا، بمّھن، پنڈت، عاقل
کیا بید، سہندس، ابجد خواں، کیا عالم فاضل، کیا جاہل

نظیر، ۸۲
۱۸۳۰

—کا قفل مذ

ایک قسم کا بغیر کنجی کا تالا جس میں عموماً کئی گھومنے والے چھلے برابر برابر لگے ہوتے ہیں، جس میں ہر ایک پر کئی حروف کندہ ہوتے ہیں، چھلوں کو گھماکر مقررہ حروف

کو صحیح ترتیب سے جوڑا جائے تو تالا کھل جاتا ہے، حروف کی مقررہ ترتیب جانے بغیر تالا نہیں کھولا جاسکتا

کیا ہوا در پہ ترے گرچہ ہے ابجد کا قفل
کھول دیتے ہیں سکندر کی بھی یاں سد کا قفل
۱۸۱۷ انشا، ک، ۸۲

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا
۱۸۶۹ غالب، د، ۱۵۶

ــ کے اعداد مذ

ابجد سے ضظغ تک آٹھ کلموں کے حروف کی بالترتیب عددی قیمتیں جو حساب جمل کے لئے مقرر کرلی گئی ہیں۔ حسب ذیل:

	۱	۲	۳	۴
ابجد	(ا	ب	ج	د)
	۵	۶	۷	
ہوز	(ہ	و	ز)	
	۸	۹	۱۰	
حطی	(ح	ط	ی)	
	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰
کلمن	(ک	ل	م	ن)
	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰
سعفص	(س	ع	ف	ص)
	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰
قرشت	(ق	ر	ش	ت)
	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	
ثخذ	(ث	خ	ذ)	
	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰	
ضظغ	(ض	ظ	غ)	

اَبُجْھ ـ (فت ا، ضم ب، سکن جھ) صف

ناسمجھ، نادان، جسے شعور نہ ہو، گاودی، کوڑھ مغز

[پ: آبجھ، س: آب دھ دی अबुद्धि
ا (نفی) + بدھی = سمجھ]

اُبَچ (ضم ا، فت ب) امث

رک: ابچ

وہ ابچیں وہ پلٹیں سنا مطربا
کہ ہر دانہ ہووے در اشک کا
۱۸۸۷ واجدعلی شاہ، حزن اختر، ۱۰۵

اَبْچَھرا (فت ا، سکن ب، فت چھ) امث

رک: اپچھرا

اندر کی ابچھرا اس کے حسن کے آگے گرد۔
۱۸۰۱ آرائش محفل (افسوس)، ۲۹۳

اَبْحار (فت ا، سکن ب) امذ

بہت سے دریا، بڑے دریا، سمندر

تو نم فیض نہ چھڑکے تو میاہ الابحار
اڑ چلیں ابخرۂ ارض سے مثل زیبق
۱۸۱۷ انشا، ک، ۲۲۰

[ع، ج، بر وزن اَفعال، واحد بحر = دریا ـ

ابخرات (فت ا، سکن ب، فت خ)

نہ قوم کی تمھیں الفت نہ قوم کا ہے وجود
فقط یہ پولٹیکل ابخرات کا ہے صعود
١٩٢١ اکبر، ک، ۲: ۳١٠

[رک : ابخرہ]

ابخرہ (فت ا، سکن ب، کس خ، فت ر) امذ

١. بخارات، بھاپیں

سوئے دماغ ابخرۂ دل کا یوں صعود
سجدے سے جیسے رکعت اول صف نماز
١٨٥١ مومن، د، ١٨٢

وجہ یہ ہے کہ ابخرۂ مائیہ کی بڑی کثرت ہوجائے اور بارش لگاتار برسا کرے۔
١٨٩٠ سیر کہسار، ۲: ۲١٧

٢. گرم پانی کے بھبکے، گرمی کے جھونکے

تونم فیض نہ چھوڑ کے تو میاہ الابحار
اڑ چلیں ابخرۂ ارض سے مثل زیبق
١٨١٧ انشا، ک، ۲۲٠

عشق پلاؤ کا ابخرہ ہے بھوک میں عشق کہاں۔
١٩٢٣ اودھ پنچ، ٩ : ۲٠، ۳

[ع (مد : ب خ ر) ج بروزن افعلہ، واحد = بخار]

ابخرے (فت ا، سکن ب، فت خ، ے) مع بکس) امذ

١. بھبکے، بخارات، جو پانی یا نم سطح سے گرمی کے باعث اٹھیں

ابخرے میں اٹھا کے پانی سے
چھادوں جب چاھوں بادلوں کا دھواں
١٩٣٥ فلسفۂ اخلاق، ١

میلا پانی سڑکوں پر پھینکا جاتا ہے، اس کے ابخرے آنکھوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔
١٩٥٥ حسن نظامی، سفرنامہ، ۳١

٢. (طب یونانی) ریاح جو معدے سے اٹھتی اور بلغم کے مستحیل ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔

ذرا پاؤں گرمائیں اور دماغ کے ابخرے کم ہوں تو تسکین ہو۔
١٨٨١ فسانۂ آزاد، ١: ١٨۳

اف : اٹھنا، چڑھنا، نکلنا

[رک : ابخرہ]

۔ اٹھنا (محاورہ) بھبکے نکلنا، گرمی پیدا ہونا، غصہ آنا

ابخرے اٹھتے ہیں کیا کیا اے قلق حمام میں
یار پر میل طبیعت دیکھ کر دلاک کا
١٨٧۳ دیوان قلق، ۲۲

اَبخل (فت ا، سکن ب، فت خ) صف

١. ازحد بخیل، انتہا کا کنجوس، مکھی چوس

جو ابخل ہے جہاں میں اور سادہ
نہیں کوئی لئیم اس سے زیادہ
١٨٥٥ ریاض المسلمین، ۳

٢. (عوام) ہونق، سڑ بلا

م : ڈھیلے پاجامے میں ابخل معلوم ہوتے ہیں۔

[ع : اسم تفضیل (مد : ب خ ل).
وزن اَفْعَل]

ابد (فت ا، ب)

(الف) بطور ظرف زماں

ہمیشہ، مدام، غیر متناہی مدت (کے لئے) دوام (تک)

دیکھ تجھ شاہ بلند اختر کو بولیں نیک و بد
آسماں جا ہا رہے تیری یہ شوکت تا ابد

۱۷۸۰ سودا، ک، ۳۲۶

مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

۱۹۳۶ ضرب کلیم، ۶۳

(ب) اسم

۱۔ زمانہ، جس کی انتہا نہ ہو، ہمیشگی (عموماً ازل کے ساتھ یا ازل کے جواب میں)

اس فلک سیر کا میدان مقرر ہے گا
تگ و پو کے لئے اثنائے ابد اور ازل

۱۸۱۰ میر، ک، ۱۱۸۲

جسے کہتے ہیں بحر عشق اس کے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اس کنارے کا

۱۸۵۴ ذوق، د، ۷۳

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

۱۹۳۵ بال جبریل، ۱۲۲

۲۔ (مجازاً) دنیا کی آخری حد، روز قیامت

کچھ صبح ازل کی نہ خبر شام ابد کی
بیخود ہوں تہ سایۂ دامان محمد

۱۹۲۵ نشاط روح، ۱۱۶

۳۔ (تصوف) مرتبۂ ذات باری تعالیٰ

ہر گام پر سرور ابد کی تجلیاں
عالم تمام عالم ایمن ہے آج کل

۱۹۳۶ طیور آوارہ، ۵۰

[ع (مد : ا ب د) = زمانہ جس کا تجزیہ نہ کیا جا سکے]

— الآباد (ضم - نیز فت د)

(الف) اسم : **دوام، ہمیشگی، غیر منقطع مدت، جاودانی زمانہ**

وہ ابدالآباد کی ٹھارہے، یہاں تے وہاں جانے کیا بار ہے۔

۱۶۳۴ سب رس، ۱۳۵

(ب) بطور ظرف : **مدام، ہمیشہ ہمیشہ (کے لئے)**

زمانے کی گردشوں کے بعد بھی غیر مبدل اور بے نقص رہی ہیں اور ابد الآباد تک ایسی ہی رہیں گی۔

۱۸۷۰ خطبات احمدیہ، ۶۸۵

کیوں کر مان لیں کہ ایسا شخص جہنمی ہو ابد الآباد کے لئے مستوجب عذاب الہی

۱۸۹۹ رویائے صادقہ، ۲۹

سال گذشتہ کی ہولناک خونریزی کو جو ابدالآباد تک یاد رہے گی، ہم کارتوس کی زہر آلودگی سے زیادہ تحقیق نہیں کرسکتے۔

۱۹۲۲ افسانۂ غدر، ۱۴۲

[ع : مرکب اضافی = (ابدوں کا ابد) لت د کی صورت میں ظرفی حالت]

ـــالدھر صف ۔ (رک) ابدالآباد

بہ چشمۂ فیض ابدالدھر عیاں ہے
اک اس کی زکات آب حیات دو جہاں ہے

۱۸۷۵ دبیر،دفترماتم، ۲ : ۱۵

[ع : ابد + الدھر (زمانہ) = تا قیام زمانہ]

اَبَداً (فت ا، ب) مف

۱۔ ہمیشہ کے لئے، ابد تک، (نفی میں)، ہرگز

جو کسی سے نہ دبی ہے نہ دبے گی ابداً
ہو مبارک یہ مری فطرت آزاد مجھے

۱۹۳۷ بہارستان، ۴۴۲

۲۔ کلیۃً، قطعاً ۔ م : ابداً میری مرضی کے خلاف ہے

مؤبداً (ضم م، فت ؤ، شد ب بہ فت)

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، غیر منقطع مدت تک، مسلسل

رئیس حال کو خدا بدولت و اقبال ابداً مؤبداً سلامت رکھے۔

۱۸۶۹ غالب،خطوط، ۴۴۰

[ع : ابداً + موبداً، اسم مفعول (مد : ابد)]

اِبدا (کس ا، سکن ب) امذ

۱۔ پیدا کرنا، وجود میں لانا

مبدٔ ماخوذ ہے ابدا سے اور ابدا کہتے ہیں ابتدا کرنے کو اور نیا پیدا کرنے کو۔

۱۹۰۶ الحقوق، ا : ۵۴

۲۔ ظاہر کرنا، نمایاں کرنا

[ع : ابداء، مصدر (ب د یا ب د و) وزن افعال]

آبداً اَبَد (فت ا، سکن ب، فت ا، ب)

مف (عو)

ہمیشہ ہمیشہ، قیامت تک، م : ابداً ابد سلامت رہو

[ع : ابدالآباد یا ابدا ابداً کا بگاڑ]

اِبداع (کس ا، سکن ب) امذ

اختراع، ایجاد، بے مثال نئی چیز کی تخلیق

بیٹھ کر مکتب ابداع میں تونے کھولے
دفعۃً نسخۂ افلاک کے جوں سات ورق

۱۸۱۷ انشا، ۲۱۹

نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔

۱۸۹۷ یادگار غالب، ۱۱۴

آرٹ کی تکمیل بغیر قوت ابداع و اختراع ہو ہی نہیں سکتی۔

۱۹۵۰ چھان بین، ۸۰

[ع (مد : ب د ع) بر وزن افعال = بے مثال تخلیق]

اَبدال (فت ا، سکن ب) امذ

۱۔ اہل تصوف کے نزدیک اولیاءاللہ کے دس طبقات میں سے پانچواں طبقہ

جس کے ارکان کی معینہ تعداد چالیس بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی گزر جائے تو کسی اور ولی کو ابدال کے درجے پر مامور کر دیا جاتا ہے۔

غوث و قطب و اولیا، اوتاد و ابدال، اتقیا
غوث الاعظم اور معین الدین، حسن سنجر کے سات
۱۷۶۳　　سراج، د، ۵۷۸

تا وجود پاک سے ابدال اور اوتاد کے
انتظام اهل عالم هو وے عالم میں تمام
۱۸۵۴　　ذوق، د، ۲۰۵

سب ہے بڑھ کر ہے انہی کو دشمنی اسلام سے
آج ہے جن کا شمار اقطاب اور ابدال میں
۱۹۳۷　　بہارستان، ۲۳۶

۲۔ فرد واحد من جملہ گروہ ابدال

ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
۱۸۳۰　　نظیر، ک، ۲: ۴۴

۳۔ افغانوں کے ایک جرگے کا مورث اعلیٰ

بارک زئی، اور پوپل زئی دو اس کی بڑی شاخیں ہیں۔ احمد شاہ (۱۷۲۳ع-۱۷۷۲ع) اس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ابدالی کہلاتا تھا۔

[ع : ج بر وزن افعال، واحد بدیل، (مذ : ب د ل) = شریف، قائم مقام؛ بقول امام راغب اصفہانی ان کی برائیاں نیکیوں میں بدل دی گئی ہیں، اسلئے ابدال کہلاتے ہیں]

أبْدان (فت ا، سکن ب) امذ

اجسام، بدن (کی جمع)

کتب ادیان و ابدان غیر مروّجہ ہر زبان، بصرف زر خطیر چھپوائیں۔
۱۸۶۷　　سرور، انشائے سرور، ۴

[ع : ج بر وزن إفعال، واحد بدن]

اُبْدَجْ (ضم ا، سکن ب، فت د) امذ

کیڑے مکوڑے جو برسات کا پانی پڑتے ہی وجود میں آجاتے ہیں۔

(اصطلاحات پیشہ وراں۔ کاشتکاری، ۱۹۳۹ء)

[س : اُتْ پِدی ~~ـ~~ ر = اگنا، وجود میں آنا]

أبْدَح (فت ا، سکن ب، فت د) امذ

علم رمل کے ایک دائرے کا نام جس کی ترتیب اس طور پر ہے:

(۱) فرد آتش کی قیمت الف کے مساوی ۱ مقرر ہے۔
(۲) " باد " ب " ۲ "
(۳) " آب " د " ۴ "
(۴) " خاک " ح " ۸ "

اس حساب سے اس کی سولہ شکلیں ہیں۔

جا پڑا دائرۂ ابدح ترکیب پہ دھیان
قرعہ تاریخ کا جب رمل میں میں نے پھینکا
۱۸۲۶　　بیاض سحر، ۳۸۸

[ع : ا ب د ح کا مجموعہ]

ابدھوت (فت ا، سکن ب، و مع) امذ

۱۔ جوگی جس نے دنیا کو تیاگ دیا ہو، سادھو، بیراگی، سنیاسی

جو وہ موا نگوڑا بھوت، مچھندر کا پوت، ابدھوت دے گیا ہے ہاتھ مروڑوا کے چھنوالوں گی۔

۱۸۰۳ رانی کیتکی، ۳۳

۲۔ ہندو فقیروں کا ایک گروہ جو واجب الوجود کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا اور جملہ مذہبی تقریبات (سنسکاروں) کا منکر ہے۔

۳۔ شیوجی کا پجاری، جو نشہ پیتا ہو

(فیلن، قانونی ڈکشنری)

۴۔ پجاری، پرستار

جتنے ہیں ناسوت کے ابد ھوت بھاگیں ہوکے بھوت
ایک چٹکی بھر جو کر بیٹھے بھبوت اپنا مدر

۱۸۱۷ انشاء، ک، ۴۸

[س: آودھوت अवधूत ، ہند: ابدھو (آو + دھو = جھاڑنا) = جس نے انسانی خواہشوں کو دور کر دیا ہو]

ابدی (فت ا، ب) صف

جاودانی، سرمدی، غیر فانی، جس کی حد اور انتہا نہ ہو

عمر ابدی ہے مجھ کو درکار
دے آب حیات وصل یک بار

۱۷۶۳ سراج، ۱۱۶

مذہب خدا ازلی بھی ہے اور ابدی بھی

۱۹۰۱ حیات جاوید، ۲: ۲۴۷

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے

۱۹۳۶ ضرب کلیم، ۱۱۷

ابدیّت (فت ا،ب، کس د،شد ی بہ فت) امث

بقائے دوام، ہمیشگی، سرمدیت

جس کو گلدستۂ باغ آبدیت کہئے
خندۂ صبح بہار احدیت کہئے

۱۹۰۵ محسن، ک، ۳۶

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

۱۹۳۶ ضرب کلیم، ۱۱۵

یاں چھپی دھوپ ہے گلابی سایا
رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا

۱۹۵۵ سموم و صبا، ۲۸۹

[ع: ابدیة: ابد+ی (نسبت)+ ة (مصدری)]

ابر (فت ا، سکن ب) امذ

۱۔ بادل، گھٹا، بدلی

ابر دریا بار کو برسادے دشت یاس پر
خشک رکھے مزرع امید ہر پیر و جواں

۱۷۸۰ سودا، ک، ۲۳۸

حضور حق سے چلا لے کے لولوئے لالا
وہ ابر جس سے رگ گل ہے مثل تار نفس

۱۹۳۵ بال جبریل، ۲۰۰

داھنی طرف سے : نسیم امروھوی (نائب مدیر لغت) ممتاز حسن (صدر) شان‌الحق حقی (سکریٹری ترقی اردو بورڈ) اور جمیل‌الدین عالی (سکریٹری انجمن ترقی اردو)

انگریزی کی مشہور یوریشی مصنفہ ڈاکٹر ھین سوین Dr. Han Suyin بورڈ کے دفتر میں -
داھنی طرف سے : مسرت جہاں تیموری ، بشیر احمد خاں ، مصنفہ موصوفہ
شان‌الحق حقی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری

NB. 85/1034

اُردو نامہ

شمارہ نہم

ترقیٔ اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

اُردو نامہ

شمارہ ۹۔ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۲ع

مضامین

سر ورق : مرزا ہادی رسوا (ملاحظہ ہو ''نادرات'')

ابوالمسعود فصیحی سینیجر اردو نامہ نے ترقیٔ اردو بورڈ کی جانب سے شایع کیا۔

نگران

جناب ممتاز حسن

جوش ملیح آبادی — شان الحق حقی

خواجہ حمید الدین شاہد

ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی

چندہ سالانہ چار روپے — فی پرچہ ایک روپیہ

اردو منزل۔ جمشید روڈ۔ کراچی۔۵

(مغربی پاکستان)

مطبوعہ ریپبلکا، صدر، کراچی

اردو نامہ

زبان ایک زندہ یا نامی پیکر ھے، جس میں تغیر اور افزائش کا عمل برابر ھوتا رھتا ھے۔ لہجہ، تلفظ، محاورہ عام حالات میں بھی قابل تغئیر چیزیں ھیں۔ بیرونی اثرات وعوامل اس تغیر میں اور بھی اضافہ کرسکتے ھیں۔ بعض نئے الفاظ داخل اور بعض پرانے الفاظ ترک ھوتے رھتے ھیں۔ اظہار کے نئے پیرائے، نئے محاورے اور نئی اصطلاحیں ضرورت کے تقاضے سے خود بخود وضع ھونی رھتی ھیں۔ سماجی تبدیلیاں اور سیاسی انقلاب زبان کے حق میں بڑے دور رس نتائج کے حامل ھوتے ھیں۔ مختلف قوموں، گروھوں یا تہذیبوں کے اختلاط سے جو ذھنی و سماجی نتائج پیدا ھوتے ھیں، زبان ان کی پوری عکاسی کرتی ھے۔ نئے حالات اور نئے خیالات کے ساتھ نئے الفاظ خود بخود وجود میں آتے رھتے ھیں۔

لسانیات کے طالب علم کی حیثیت سے ھم ان تبدیلیوں کا صرف ایک معروضی جائزہ ھی لے سکتے ھیں، جس میں جذبات اور ذھنی تعصبات کو دخل نہ ھونا چاھئے۔ عین اس طرح جیسے کہ تاریخ کے طالب علم پر واقعات کی رفتار کو معروضی طور پر دیکھنا اور ان سے بلا تعصب نتائج اخذ کرنا یا بے لاگ حکم لگانا واجب ھوتا ھے۔ لیکن من حیث القوم ھم جذبات سے بیگانہ نہیں ھوسکتے۔ نہ اپنے قومی نصب العین سے دستبردار ھوسکتے ھیں۔ قوم اپنے حالات کی محض تماشائی نہیں بلکہ اُن سے دست و گریباں ھوتی ھے۔ لہذا زبان کے معاملے میں ھمارا قومی طرز عمل یا طرز فکر صرف مکتبی نہیں ھوسکتا۔

مثال کے طور پر یہ بات کہ برطانوی اقتدار کے سبب اردو میں بےشمار انگریزی لفظ درآئے، ایک تاریخی حقیقت ھے۔ لیکن ھم اس تلخ احساس کو فراموش نہیں کرسکتے کہ اس افزائش کے ساتھ اردو کے اپنے بہت سے الفاظ نامرادانہ تلف ھوئے۔ قومی شخصیت میں مشاھدے اور تفکر کے ساتھ تدبر بھی شامل ھوتا ھے۔ لہذا ھمیں اپنے لسانی مسئلے کو اپنے مخصوص قومی نقطہٴ نظر سے دیکھنا ھے نہ کہ صرف طالب علمانہ نظر سے۔ البتہ حقائق کا صحیح شعور اور ذھنی و جذباتی توازن ضروری ھے۔

یہ بات اس لئے لکھی گئی ھے کہ ان اوراق میں اردو کے مسائل کی طرف ارباب فکر کو توجہ دلائی جاتی رھتی ھے، اور ضروری نہیں کہ ھر بات ھر شخص کے مطلب کی ھو یا ھر شخص کے دل کو لگے۔ لہذا اختلاف رائے اور اس کے ساتھ بعض اوقات غلط فہمیوں کا پیدا ھونا بعید از قیاس تھا نہ بعید از حقیقت ھے۔ مناسب معلوم ھوا کہ ھم اس بارے میں اپنے طرز فکر کی وضاحت کردیں۔

اردو کی ترقی کی پہلی تدبیر یہ ھے کہ ھم اس کے مسائل کا صحیح ادراک اور ان کی بابت صحیح طرز فکر پیدا کریں۔ یہاں نہ کوری جذباتیت سے کام چل سکتا ھے نہ کوری افادیت اندیشی سے۔ اس سلسلے میں افراط و تفریط

کی بنا پر بڑی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں، اور ذہنی تعصبات کوری جدت یا کوری تقلید پسندی نے بہت خلط مبحث پیدا کردیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک عجیب مشاہدہ یہ ہے کہ ہمارے بار بار صراحت کرنے کے باوجود آج تک بعض اصحاب بھی کہتے ہیں کہ بورڈ یا اس کے بعض ارکان اردو رسم الخط اور اس کی جگہ رومن کو نافذ کرنے کے حامی ہیں۔ ان اصحاب سے ہماری درخواست ہے کہ "اردونامہ" میں اس مسئلے پر جو کچھ چھپ چکا ہے اس پر نظر ڈال کر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ اس میں اردو رسم الخط کی مخالفت کہاں کی گئی ہے؟ اور اس کی ضرورت یا محاسن پر کہاں پردہ ڈالا گیا ہے؟

البتہ ہم نے حقائق سے چشم پوشی نہیں کی۔ یہ واقعہ ہے کہ انگریزی زبان اور رومن رسم الخط ہمارے نصاب تعلیم میں ایک غیرمعینہ مدت تک کے لئے شامل ہیں اور فی الحال سرکاری طور پر نافذ۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ رومن ایک بین الاقوامی رسم الخط ہے جس کی حرف شناسی ہر پڑھے لکھے آدمی کے لئے مفید بلکہ ضروری ہے۔ پاکستان میں ایسے بھی بہت لوگ ہیں جو اردو تو جانتے ہیں مگر اس کا رسم الخط نہیں جانتے۔ لہذا اردو الفاظ اور ناموں کو رومن حروف میں لکھنے کا ایک ضابطہ متعین ہو جانا زبان کے لئے ہر صورت سے مفید ہی ہوسکتا ہے نہ کہ مضر۔

لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لازم بھی ہے کہ رومن اردو رسم الخط کی جگہ نہ لے گی۔ تعلیم کی ابتدا اردو زبان اور اردو رسم الخط سے ہوگی، اور وہ کاروباری ادارے جو فی الحال اردو ٹائپ رائٹر، زود نویس وغیرہ مہیا نہ ہونے کی بنا پر رومن سے کام لیں، وہ ان سہولتوں کے مہیا ہوجانے کے بعد رفتہ رفتہ اردو رسم الخط ہی استعمال کریں گے۔ ایسے اداروں کے لئے ہم انگریزی کی جگہ جلد از جلد اردو زبان کا استعمال ضروری خیال کرتے ہیں، خواہ فی الحال رومن حروف ہی میں سہی۔ ورنہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ نہ نولاکھ ٹائپ رائٹر اردو کے لئے مہیا ہوں گے نہ کاروباری مراسلت اردو میں ہوسکے گی۔ زبان زندگی سے دور تر ہوتی جائے گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری زبان صرف شعر و شاعری کی زبان بن کر رہ جائے اور رفتہ رفتہ اس اجنبیت کے درجے کو پہنچ جائے جو فارسی و عربی کو حاصل ہوچکا ہے۔ پھر ہم پاکستان میں صرف ٹوٹی پھوٹی انگریزی ہی بولتے ہوئے رہ جائیں گے، اور یہ نوبت در اصل پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔

ترقی وسائل سے کام لینے کا نام ہے۔ پوری تاریخ تہذیب اس کلیے کی شاہد ہے اور یہ بالکل منطقی بات ہے کہ جس زبان کو اشاعت و ترویج کے زیادہ اور بہتر وسائل ہوں گے وہی زیادہ ترقی کریگی۔ اس سلسلے میں رومن کے نقائص کا سوال اٹھانا بالکل بے محل ہے، کیونکہ اسے کلی طور پر اختیار کرلینا کسی کا مقصود نہیں۔ ہمارے الفاظ اور ہمارے نام اس میں اب بھی لکھے اور پڑھے جاتے ہیں حالانکہ رومن املا کا کوئی ضابطہ ابھی تک متعین نہیں ہے۔ احمد کو احمڈ یا سید کو سیڈ کوئی نہیں پڑتا۔ اور پھر طریق املا وضع کرنے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ یہ

امکان کم ہو جائے — در اصل رسم الخط کوئی بھی سہی ، کبھی تلفظ کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتا ۔ حروف و الفاظ ذہن کے لئے صرف اشارے کا کام کرتے ہیں ۔ زبان پہلے سیکھی جاتی ہے ، اور پھر لکھی یا پڑھی جا سکتی ہے —

یہ تذکرہ محض جملۂ معترضہ کے طور پر چھڑ گیا ، لیکن در اصل یہی ایک مسئلہ نہیں جو اردو کو در پیش ہے ، نہ ہم رومن کے جزوی استعمال کو کوئی مسئلہ سمجھتے ہیں ۔ یہ تو ہوتا ہی آرہا ہے ۔ البتہ اسکی املامیں باضابطگی پیدا کرنا ایک علمی اور عملی ضرورت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ۔

اردو ایک لحاظ سے بڑی قدیم بولی ہے ۔ اسے کمسن کہنا درست نہیں ۔ در اصل کوئی بھی چلتی ہوئی بولی کمسن نہیں کہلا سکتی ۔ سب زبانوں کی عمریں برابر ہیں ، سوائے ان کے جو بیچ میں ختم ہوگئیں ۔ اردو کی اساس جس زبان پر ہے اس کی قدامت کا کھوج لگانا محال ہے ۔ البتہ اپنے جدید روپ میں یہ اپنے ماضی سے بہت مختلف اور دوسری ہم اصل بولیوں سے ممیز و ممتاز ہے ۔ اپنے جنم سے اب تک شاید یہ اور بھی انقلابات سے گزری ہوگی ، لیکن اس کی معلومہ تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب ان زبانوں سے دو چار ہونا تھا جو مسلمان اپنے ساتھ لائے ۔ یعنی عربی ، فارسی اور ترکی ۔ ان زبانوں کی آمیزش ایک نسبتاً جدید تاریخی عمل ہے ، جس نے بڑے دور رس نتائج پیدا کئے — ایک نئی لغت اور نیا محاورہ وجود میں آیا ، نئی اصوات داخل ہوئیں ، ترکیب کے نئے سانچے وضع ہوئے ، اور زبان کا مزاج ہی کچھ سے کچھ ہوگیا — در اصل یہی نئے عناصر اردو کا مابہ الامتیاز ہیں اور ان میں اس کا کوئی شریک نہیں — اس کی قدیم اساس کے باوجود اسی بناء پر ہم اسے ایک نئی زبان کہتے ہیں —

اس نظر سے دیکھئے تو اردو نہ صرف ایک نئی زبان ہے بلکہ بڑی حد تک نا پختہ بھی ہے — ترقی کا جو عمل مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا تھا ، اس میں اولاً اس بنا پر رکاوٹ رہی کہ یہ دربار کی زبان تھی نہ مکتب کی نہ مذہب کی ۔ صرف بازاروں یا گھروں میں پھل پھول سکتی تھی — رفتہ رفتہ اس کو صوفیوں کے حلقے میں بارملا اور پھر ادب تک پہنچی — یہی در اصل اس کی زندگی کا سب سے بڑا بھروسا تھا — آخر اس نے عدالت، اور کچہری میں بھی دخل حاصل کرلیا ۔ مگر بہت جلد انگریزی کا سیلاب اس طرح امڈا کہ اردو کو اپنی بقا ہی کے لالے پڑ گئے ۔ زبان قوموں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے ۔ جدید انقلاب آفریں دور میں جتنی کچھ ترقی دنیا میں ہوئی ، اردو اس سے کم و بیش بیگانہ رہی ہے ۔ اس میں ترقی کی بڑی صلاحیتیں تھیں لیکن ہوا یہ کہ اس کی تشکیل اور نشو و نما ہی ادھوری رہ گئی ۔

فارسی، عربی اور ترکی سے اس نے کیا کیا حاصل کیا تھا ، اس کی تفصیل طولانی ہے ۔ زبان میں نئی اصوات داخل ہوئیں ۔ یہ بہت

بڑی تبدیلی تھی - اردو ابجد میں چودہ حروف ایسے ہیں جو ان نئی آوازوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ نئے الفاظ جن میں یہ حروف موجود ہیں، اردو لغت کا بہت بڑا عنصر اور اس کا جزولازم ہیں۔ بہت سے نئے اسمأ صوت یا حکائی الفاظ پیدا ہوئے - غڑاپ، غٹرغوں غرفش، غائیں غائیں، زنّاٹا، غرّاٹا، غٹ غٹ، تڑاق پڑاق وغیرہ - اسی طرح بیشمار نئے مرکبات بنے ان میں خصوصیت کے ساتھ وہ مرکبات لائق ذکر ہیں جن میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کو بلا امتیاز ایک دوسرے کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ ان کا سلسلہ بہت دراز ہے۔ کھٹکے دار، چٹخارے دار، بھڑک دار، اگالدان، پیک دان، چوہے دان، کباڑخانہ، بھنگڑخانہ، فوق البھڑک، گاڑی بان، میل خورا، جوتے خور، دھڑے بندی کی طرح بے شمار اسمأ اور بخشنا، نوازنا، انگیزنا، بدلنا، قبولنا وغیرہ کی طرح کے مصادر خاص اردو کا سرمایہ اور اس کا امتیازی نشان ہیں۔

نئے محاورات جو وجود میں آئے ان کا شمار ممکن نہیں۔ ہر لفظ ہندی مصادر کے ساتھ مل کر نیا محاورہ بن جاتا ہے۔ جہاں تک قواعد کا تعلق ہے جمع، تانیث، اضافت وغیرہ کے بہت سے قاعدے جو عربی یا فارسی میں مستعمل ہیں، اردو میں بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ وہ سرمایہ ہے جو اردو نے خود اپنی سعی سے حاصل کیا۔ یہ ایک دو دن کی کمائی نہیں - کئی صدی کا حاصل تھا۔

لیکن اردو نے ایک علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے ذرا کچھ صورت نکالی تھی کہ اہل زبان نے محض عربی دانی و فارسی دانی کے زعم میں اس پر بہت سی ناواجب بندشیں عائد کردیں۔ یہ ایک رجعت پسندی تھی جس نے اردو کی نشو و نما کو عین عنفوان شباب میں روک دیا۔ ایک مستقل زبان کی حیثیت سے اس کی تشکیل ناقص اور انفرادیت مبہم رہ گئی۔

عربی و فارسی سے اردو نے جتنا کچھ اکتساب کیا اس کا پورے طور پر احاطہ کرنا قریب المحال ہے۔ لیکن مثال کے طور پر واو عطف اور کسرۂ اضافت کو لیجئے۔ یہ بلا شبہ زبان میں بڑا مفید اضافہ تھا جسکے بغیر اردو کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہم نے ان پر یہ قدغن لگادی کہ یہ صرف فارسی، عربی (یا ترکی) الفاظ کے ساتھ استعمال ہو سکتے ہیں - یہ ایک نئی قسم کی چھوت چھات تھی جو مسلمانوں نے سیکھی اور اردو کے ساتھ برتی۔ اس کے لئے ہم اپنے اساتذۂ متاخرین کو سند بناتے ہیں اور اس کے خلاف جو سندیں ملتی ہیں انہیں نظرانداز کردیتے ہیں۔ طے یہ کرنا ہے کہ واو عطف اور کسرۂ اضافت اردو میں موجود ہیں یا نہیں اگر ہیں تو انہیں عام کیوں نہ کیا جائے؟ لب سڑک اور زیر جھروکہ (یا جھروکا) میں کیا قباحت ہے کہ انہیں ساقط الاعتبار گردانا جائے؟ اسی طرح لاچار، لاپتہ، لاپرواکے ہوتے حرف "لا" کو اجنبی کلمہ کیوں سمجھا جائے اور اس کا جوڑ دوسرے اردو الفاظ کے ساتھ کیوں نا واجب ہو۔

ظاہر ہے کہ ان بندشوں کو برتنا عوام الناس کے لئے نہ پہلے ممکن تھا نہ آئندہ ہوگا۔ آیا اردو صرف انہی لوگوں کے برتنے کے لئے ہے

جو عربی و فارسی کے منتھی ہوں ؟ اس صورت میں زبان کی اشاعت اور اسکی بقا کیونکر ممکن ہے ؟ یہ مسئلے محبان اردو کی توجہ کے لائق ہیں۔ ان اوراق میں آئندہ بھی اس بحث کو جاری رکھا جائے گا۔

انگریزی زبان کی ٹلار لغت ، آکسفورڈ یا نیو انگلش ڈکشنری کی تدوین میں ہزاروں افراد نے بلا معاوضہ کھلے دل سے مدد کی تھی۔ ان میں عالموں ، استادوں ، پادریوں کے ساتھ ساتھ جیلخانے کے قیدیوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ولیم مائنر Minor ایک قتل کی پاداش میں براڈمور کے قید خانے میں (جو فاترالعقل مجرموں کے لئے مخصوص تھا) عمر قید گزار رہے تھے۔ انھوں نے سنا کہ سر جیمز مرے نے آکسفورڈ ڈکشنری کی تدوین کے سلسلے میں عام تعاون کی درخواست کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی محنت سے ۸ ہزار الفاظ کی سندیں قدیم ادب سے تلاش کرکے سر جیمز کو بھجوائیں — یہ سندیں لغت کی تکمیل کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ سر جیمز اس امداد سے اتنے متاثر ہوئے کہ بارھا خود جیلخانے جا کر اپنے معاون سے ملاقات کی —

اس بورڈ نے بھی اپنی لغت کی تدوین کے سلسلے میں اہل اصحاب سے تعاون کی درخواست کی تھی ، اور کام میں باقاعدگی پیدا کرنے کے خیال سے معاونین کے لئے کچھ اعزاز یہ بھی مقرر کر دیا تھا — ہم اب تک کم و بیش ۲۰۰ اصحاب سے اخذ اسناد کے سلسلے میں مدد لے چکے ہیں — ان میں چند اصحاب ایسے بھی تھے جنھوں نے اعزاز یہ قبول نہیں کیا۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

ش ح ح

چند محفوظ مضامین جو آئندہ ہدیۂ ناظرین کئے جائیں گے

	مضمون	مصنف
۱ــ	بابر کے اردو فارسی ترکی اشعار	ڈاکٹر محمد صابر
۲ــ	اردو میں ترکی منگولی عناصر	ڈاکٹر محمد صابر
۳ــ	شیخ سعدیؒ ہندی کا مدفن	سید مبارزالدین رفعت
۴ــ	لہجی اور تلفظ	سہیل بخاری
۵ــ	'' بستان حکمت ،، تاریخی اور تنقیدی جائزہ	راج انیل پرشاد
۶ــ	سر سید رح کے سماجی تصورات	ڈاکٹر سیدہ جعفر
۷ــ	سر گزشت حاتم پر ایک نظر	سید ابوالخیر کشفی
۸ــ	دلمیر۔ ایک علاقائی اور دیہاتی زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر	قیصر مراد آبادی
۹ــ	زبان کے میکانکی پہلو	عین الحق فرید کوٹی
۱۰ــ	چڑھتا سورج (طویل افسانہ)	ابوالفضل صدیقی
۱۱ــ	اردو نثر کا ارتقا	جمیل نقوی

غالب اور معاصرینِ غالب

"ریاض الفردوس" میں

تحسین سروری

شاہ جہاں پور کے رہنے والے ایک شخص تھے، جن کا نام تھا محمد حسین وہ ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ شروع میں انہوں نے اس وقت کے مروّجہ فارسی و عربی نصاب کی تکمیل کی، پھر رفتہ رفتہ صرف ونحو، مختصرات وفقہ واصول کی کتابیں شاہ جہاں پور کے علماء سے پڑھیں۔ اس کے بعد رام پور گئے اور وہاں کے نامی گرامی اساتذہ فن کی دوسال تک شاگردی میں رہے اور مختلف علوم وفنون میں استعداد بہم پہنچائی۔ وہاں سے چل کر دہلی گئے، دہلی میں بھی کسب علم میں مشغول رہے، پھر لکھنؤ جاکر ایک سال تک قیام کیا۔ یہاں بھی وہ علم کی تحصیل میں منہمک رہے۔ اب جو حدیث وفقہ، مطولات حکمت وکلام میں درک حاصل کرنے کا خیال آیا تو پھر دہلی کی راہ لی، جہاں وہ ایک سال رہے، اس کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے۔

محمد حسین کے بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوچکا تھا، جس کی وجہ سے ان کا گھر تقسیم جائیداد کے جھگڑوں اور معاشی بدحالی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لہذا انہیں طالب علمانہ زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ہی تلاش معاش میں گھر سے نکلنا پڑا۔ مختلف شہر و دیار سے ہوتے ہوئے ضلع محمدی متعلقہ اودھ میں پہنچے، جبکہ وہ ضلع انتزاع میں پڑ کر حاکم لکھنؤ کے قبضے سے نکل گیا تھا اور وہاں انگریزی عملداری چل رہی تھی۔ یہاں انہیں کلکٹری میں نائب سر رشتہ داری پر چھ ماہ کے لئے منصرمانہ ملازمت مل گئی۔ جب یہ چھ ماہ گذر گئے تو ۱۲۷۳ھ میں آگرہ پہنچے، وہاں چند ہی روز قیام کیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا۔ ان حالات میں گھر سے باہر رہنا مناسب نہ جان کر بہ ہزار دقت و دشواری شاہ جہاں پور واپس ہوئے اور حالات کے اعتدال پر آنے کا انتظار کرتے رہے۔ اس دوران میں عسرت و تنگدستی نے برا حال کردیا۔ چونکہ وقت گذرتا نہ تھا اس لئے انہوں نے رفع وحشت کے خیال سے ایک کتاب کی تالیف کا کام شروع کیا، جس کی تکمیل تین چار سال بعد ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں ہوئی اور اس کا نام "ریاض الفردوس" رکھا۔

ایام غدر میں محمد حسین کا بھی بہت کچھ مال و اسباب لٹ گیا، چونکہ انہوں نے

باغیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا، لہذا انگریزی عملداری کے بعد ان کی جائیداد اراضی واملاک قرقی و ضبطی سے محفوظ رہے۔ اسی طرح کچھ دن وہ گھر پر رہے، پھر باندا میں روزگار کی تلاش میں وارد ہوئے، جہاں انہیں بہت جلد حاکم باندا کی پیشی میں ملازمت مل گئی۔ یہاں چند ہی روز رہے تھے کہ شاہ جہاں پور سے ان کی والدہ کے علیل ہونے کی اطلاع آئی لیکن نئی ملازمت ہونے کی وجہ سے رخصت نہ ملتی تھی، ناچار استعفا دے کر شاہ جہاں پور چلے گئے۔ ان کی والدہ چند روزہ علالت کے بعد رحلت کرگئیں۔ محمد حسین سوچ ہی رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیئے، ان کے ایک عنایت فرمانے انہیں خط لکھ کر حیدرآباد (دکن) آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ حیدر آباد پہنچ گئے، لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ مختلف عوارض نے انہیں آگھیرا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس ملازمت کے لئے بلائے گئے تھے، اس کو اختیار کرنے ہی نہ پائے۔ چار پانچ ماہ رہ کر وہاں سے لوٹے۔ جب وہ بھوپال پہنچے ہیں تو برسات نے راستہ روک دیا اور ساتھ ہی بیماری نے بھی زور دکھایا۔ اب یہی مناسب سمجھا کہ برسات کے گذرنے اور بیماری کے رفع ہونے تک بھوپال میں قیام کرنا چاہیئے۔ جب برسات ختم ہوئی اور سردیوں کا موسم شروع ہوگیا، وہ بھوپال سے چل پڑے اور اندور پہنچے۔ یہاں تقدیر نے یاوری کی اور ایک مدرسہ میں معلمی کی خدمت مل گئی۔

یہ تمام حالات ۱۲۸۱ھ تک کے ہیں جو "ریاض الفردوس" کے آخر میں خود محمد حسین نے تحریر کئے ہیں، اس کے بعد کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔

"ریاض الفردوس" تین حصوں میں منقسم تھی، ایک حصہ عربی کا ہے، اس کے بعد دو حصے فارسی اور اردو کے ہیں۔ ہر حصے کے دو باب ہیں، ایک نظم کے لئے اور ایک نثر کے لئے اور پھر ہر باب میں کئی کئی فصلیں ہیں۔ اس کتاب کے تینوں حصوں کو الگ الگ کتاب کی شکل میں مطبع منشی نولکشور نے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ع میں چھاپا تھا۔ آخری حصے کے آخری صفحات پر عربی، فارسی اور اردو میں علمائے گرامی اور شعرائے نامی کے تقاریظ اور تاریخی قطعات درج ہیں جو تکمیل کتاب کے سنہ کو ظاہر کرتے ہیں (۱۲۷۶ھ)۔

یہ کتاب گویا ایک رنگا رنگ گلدستہ ہے، جس میں ہر مذاق اور تقریباً ہر قسم کی منظومات اور نثر کے نمونے جمع کئے گئے ہیں، نظم اور نثر کی شاید ہی کوئی ایسی صنف ہوگی جو ریاض الفردوس میں نہیں۔ اسی میں غالب اور معاصرین غالب کی بعض ایسی تحریریں اور اشعار ملتے ہیں جو شاید اب تک عام نظروں سے اوجھل رہے ہیں، اور بعض کے متعلق میرا خیال ہے کہ سوائے ریاض الفردوس کے کسی اور کتاب سے دستیاب ہونا ممکن نہیں۔ اس کتاب سے معاصرین غالب کے جن اصحاب کو میں نے الگ کرلیا ہے، اس سے میری مراد وہ تمام دانشور اور اہل کمال نہیں جو غالب کے ہم عمر یا ہم عہد ہیں، بلکہ صرف وہ برگزیدہ اصحاب علم و فن ہیں جو غالب کے دوست، شاگرد اور عزیز تھے۔ یا کسی نہ کسی طرح غالب کے سلسلے میں ان کا نام آتا رہتا ہے۔ وہ اصحاب علم و فن یہ ہیں: مولوی امان بخش صہبائی، حکیم

مومن خاں، مفتی صدرالدین خان آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، شیخ ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، نواب الہی بخش معروف، نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں اور میرزا زین العابدین عارف۔

فارسی کے حصہ نظم میں غالب کی دو غزلیں، ایک قصیدہ اور دو رباعیاں ہیں، اور پنج آہنگ کا آہنگ سوم (اشعار مکتوبی کہ درمکاتبات بکار آید و اقسام نثر را آرائش دھد) تقریباً پورے کا پورا نقل کیا گیا ہے۔ پہلی غزل کا مطلع ہے:

اے بخلا و ملا خوئے تو ھنگامہ زا
با ھمہ در گفتگو با ھمہ با ماجرا

اور دوسری غزل کا یہ مطلع ہے:

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

قصیدہ مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی مدح میں ہے:

زاں نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گر باشد ھمیں امروز من فردائے من

یہ سب منظومات غالب کی کلیات فارسی میں موجود ہیں، اس لئے ان کا یہاں نقل کرنا چنداں ضروری نہیں البتہ مولوی امام بخش صہبائی کی غزل نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، اس لئے کہ ان کی کلیات طبع ہونے کے باوجود کمیاب ہے:

ھم چو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم
پیرم خورشید گشتم پاسباں کم ساختم
مردم بد در چشم مردم عالمے تاریک شد
من مگر شمع چو گشتم بزم برھم ساختم
رنج و راحت ھر دو بے دردسر منت نبود
بے نمک ھردم بزخم و سلے بمرھم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار دوست
جلوہ در ھر رنگ دیدم گرد بے خم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباد
می ز خون دل کشیدم خویش را جم ساختم

حکیم مومن خاں مومن دھلوی فارسی کے ماہر اور اپنے زمانے کے نامور شعرائے اردو میں شمار ہوتے تھے، گاہے گاہے فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، لیکن ان کا فارسی کلام نایاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں وہ ایک ایسے طرز خاص کے موجد ہوئے ہیں اور اردو شاعری میں انہوں نے ایسی شہرت پائی کہ ان کی فارسی دانی اور فارسی غزل سرائی کا چرچا ہی نہ ہوا۔ ریاض الفردوس میں ان کی بھی ایک فارسی غزل موجود ہے، جسے تبرکاً پیش کرتا ہوں:

اے مرگ ترا جان شدہ مشتاق تو امشب
سوئے تو خود آید تو نہ آئی اگر امشب
بسیار دراز ست ازاں زلف درازش
یا رب شبہ(؟) است اینکہ ندارد سحر امشب
چوں آمدی اے یاد وطن در شب غربت
اے روز تو خوش باد کہ [illegible] امشب
ھمدم خبرے دادہ دل از رفتن جانم
از من نتواں بود چنیں بے خبر امشب
در ظلمت شب راہ بجائی نتواں برد
مومن چکند چوں نرسد مرگ در امشب

مفتی صدرالدین خاں آزردہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، لیکن دراصل ان کی شہرت [illegible] ان کی شاعری سے

زیادہ ان کے علم و فضل کو دخل ہے۔ جب هم المفس بزم غالب میں بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ عجیب جامع کمالات اور محبوب شخصیت کے حامل انسان دکھائی دیتے ہیں۔ اب تک ان کا جو کلام هم تک پہنچا ہے، وہ اس قابل ہے کہ هم اس سے لطف اندوز ہوں اور ان کی طبع وقاد کی داد دیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو جو ریاض الفردوس میں مندرج ہے:

خواهم دم دعا بدعا نا گریستن
شد بسکه بے اثر بدعا ها گریستن
سوز دلم نمود دو بالا گریستن
ایں درد را نگشته مداوا گریستن
دل قطره قطره خوں شده از چشم برچکید
تا راج داد مشعله ما را گریستن
پیش به ضبط گریه بکوشم زرشک غیر
بر رحم تا نیاورد او را گریستن
جز چوں تو سنگدلی نتواند شد از دگر
نگریستن بحال من ناگریستن
از اشک ریزی مژه خالی نشد الم
خواهم چو زخم از همه اجزا گریستن
آزرده غیر آمده، عرفی و "طالبا"
از تو قصیده خواندن و زینها گریستن

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی بھی ایک فارسی غزل اس کتاب میں موجود ہے۔ شیفتہ فارسی میں "حسرتی" تخلص کرتے تھے، غالب کے دوست اور فارسی میں ان کے شاگرد تھے۔ اردو کلام مومن خاں کو دکھاتا تھا۔ مدت ہوئی ان کا کلیات شایع ہوا تھا۔ دیوان اردو الگ بھی چھپ چکا ہے۔ ان کے پایہٴ علم اور شعر فہمی و سخن سنجی کے غالب بہت معترف تھے۔ وہ اپنا تازہ کلام نواب شیفتہ کو سنا کر مطمئن ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

غالب ز حسرتی چه سرایم که در غزل
چوں او تلاش معنیٔ ومضموں نکرده کس

شیفتہ کا فارسی کلام چونکہ اس وقت کم دستیاب ہوتا ہے، اس لئے ان کی غزل ضیافت طبع ناظرین کے لئے پیش کی جاتی ہے:

بوئے توبه ز نفحهٴ گل عندلیب را
کوئے تو خوشتر از وطن خود غریب را
باحسنش ایں جنوں که تو بینی تحمل است
ناصح! ملامتے مکن ایں ناشکیب را
بر حال خستگان تو جائے ترحم است
رنجور میکنی به نگاهے طبیب را
اے طفل شوخ ایں خم و پیچ سلاسل است
زود آبه بند بند در آرد ادیب را
باد آورد بوجدو جرس آورد به رقص
جان خروس طالع شورش نصیب را
ایں مایه کیں به مدعیانم نداده اند
هرگز عدوئے خویش نخوانم حبیب را
لطفش به بزم دلکش او حسرتی کشد
چوں بوئے گل بباغ برد عندلیب را

یہ تو تھا فارسی کا حصہٴ نظم، اب نثر کا حصہ شروع ہوتا ہے، جس میں نثر کی مختلف اصناف موجود ہے۔ اس میں پہلی فصل جس میں مکاتیب، دیباچے، تقاریظ وغیرہ کے نمونے پائے جاتے ہیں، کافی دلچسپ ہے۔ اس میں حسب ذیل مکاتیب اور دیگر موضوعات پر نثر کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں، انھیں میں

میرے عنوانِ مضمون کے لئے بھی کام کی چیزیں ملتی ھیں :

۱- رقعہٴ غالب بنام عبداللہ خاں صدرالصدور میرٹھ ۔
۲- رقعہٴ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بنام مرزا غالب ۔
۳- رقعہٴ حکیم مومن خاں بنام شیخ اکرم۔
۴- رقعہٴ مفتی صدرالدین آزردہ بنام نامعلوم۔
۵- دیباچہٴ دیوان ریختہ غالب
۶- تقریب مولوی امام بخش صہبائی بر نسخہٴ آثارالصنادید ۔
۷- عبارت مرزا غالب در صنعت مقطع الحروف

ان میں شروع کے چار رقعے غیر مطبوعہ نہیں تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ھے کہ غیر مشتہر ھیں، بلکہ گمان غالب ھے کہ مومن خاں اور مفتی آزردہ کے رقعات کا وجود سوائے ریاض الفردوس کے کہیں اور نہ ھو۔ اسی طرح شیفتہ کے رقعہ کے متعلق بھی کہا جاسکتا ھے۔ مجھے علم نہیں کہ ان کے کلیات میں یہ رقعہ نقل ھوا یا نہیں۔ غالب کے فارسی کلیات نثر کا میرے پاس جو نسخہ ھے، وہ مطبع منشی نولکشور کا شایع کردہ ھے، جو سنہ ۱۸۸۸ع میں چوتھی بار چھپا تھا۔ اس میں عبداللہ خاں کے نام ایک رقعہ ضرور ھے، لیکن ریاض الفردوس میں جو رقعہ نقل کیا گیا ھے وہ اس سے الگ ھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ھے، ان کا یہ رقعہ ان کے کسی اور مجموعے میں ملتا ھے اور نہ اس کا کہیں ذکر آتا ھے۔ اگر واقعی ریاض الفردوس کے علاوہ یہ رقعہ کسی اور جگہ نقل نہیں ھوا تو اس رقعہ کو غالب کا ایک نیا رقعہ سمجھنا چاھیئے۔

شیفتہ کا جو رقعہ غالب کا موسومہ ھے، اس کی کافی اھمیت ھے۔ معاصرین غالب میں مفتی آزردہ اور حکیم مومن خاں کے رقعے خواہ کسی کے نام ھوں، کم اھمیت کے حامل نہیں۔ ان رقعات کے بعد کی تین تحریریں اھم ھونے کے باوجود اس لئے ناقابل نقل ھیں کہ یہ بار بار ھماری نظر سے گذرتی رھی ھیں۔ اب شروع کے چار رقعات ملاحظہ کے لئے پیش کرتا ھوں :

رقعہٴ مرزا اسداللہ خاں دھلوی بہ نواب عبداللہ خاں صدر الصدور میرٹھ

"قبلہٴ حاجات! چہ مہین نوازش است، گمنامان را بنامہٴ نامور ساختن و چہ سترگ بخشش است خستگاں زخم بیکسی را بفرستادن جاں داروئے لطف نواختن، انصاف بالاہے طاعت اگر تافتن مہر بخرابہ جلو گذشتن باد بہار از خاک و بہا درنظر نبودی، ھر آئینہ ولایے این عنایت در حوصلہ از من نگنجیدی و نیروے اندیشہ بار گراں ما یکے ایں نوازش بر نیافتی، فرمان رفتہ است کہ غالب آشفتہ نوا نثرے و نظمے در ھم با فد وفرستادن آں منت بر خویش نہد، سخنور نوازا! من وخدا کہ عناں تابی اندیشہ از وادیٴ نثر صد مرحلہ دوارم انگندہ است، چہ ھمہ دراں می کوشم کہ در ورقے کہ بہ احباب رقم گردد بنشستن پرواز گفتن یابدو نگارش ھنجار گذارش پذیردو پیدا ست کہ ایں چنیں نثر را در آغاز مسوّدہ نباشد وبفرجام فراھم نتواں داشت۔ دوستانِ بنگالہ

کہ علی‌الرغم دہلویاں، غالب را به شیریں زبانی و ستوده بیانی پذیرفته اند، ترا دیده رگ کلکش را صفحه صفحه‌و ورق ورق از هم میبر بایند، لاجرم انچه نزد آن جماعه فراهم است، نامه نگار را نقشے ازاں کارگاه در نظر نیست، اما دریں روز ها که از انتخاب دیوان ریخته فراغت است و بهم داده، وخارخار ذوق گرد آوردن اشعار پارسی در جیب دل افتاده است، سطرے چند به دیباچگی دیوان ریخته رقم شده وصفحه چند به آرائش عنوان مجموعهٔ پارسی در گرد رقم گشتن است، تا بفرمان پذیری نام آورده باشم، قطعه از دیباچهٔ ناتمام انشا میکنم۔"

رقعهٔ نواب‌مصطفی‌خاں شیفته دهلوی

به میرزا اسدالله خاں غالب‌دهلوی

اے از نفس خامهٔ مشکیں رقم تو
نسریں کده در جیب و بغل‌باد صبا را

"به ورود والا نامهٔ ولا آمود با نثر نسری نثار و اشعار شعری شعار اندازهٔ اعتبار خویش بر گرفتم و حد مرتبه نظم و نثر دانستم، آن سینه را بیک ایمن نور انباشت و ایں دل را بیک سحر فروغ شید آگیں ساخت، آن به نمود شوق نمود و ایں مستی دانش افزود براں سرم که پارهٔ از دو وصف همایوں نظم‌وخجسته نثر رقم کنم که عرصهٔ سخن فراخ است وطبع من چالاک، یک دو سه جولان شوخ را وقت است ولے ترسم که یکیش اغراق گوید و دیگریش غلو خواند و نداند که اگر مهر را مهر و ماه را ماه گفته شود چه غلو و کدام اغراق تواند بود، گل را رنگے و بوئے هست و مل را ذوقے و اثرے انگر انچه در ان است بر لب آید چرا شگفت نماید، بالجمله از طرز مشاعرانه میگریزم که چنیں نیرنگیٔ احتمال ها با اوست و سخن ساده‌و بیرنگ میگزارم که دُربار خامه راستاں بُد، تحسین بنام او تو شیح یافته هان و هان ارج و جاهی در بارگاه مبدٔ فیاض نصیب بخت بلند حضرت هست که نه همیں یکره که صدره دیده‌ام تشریف تان دیگر ست و تشریف دیگراں دیگر، عرفی و طالب را دریں زمین نظمی ست و هم شما را نظمی ایں دیگر ست و آں دیگر سیرابی معنی در سخن عربی مسلم ست، ولے لفظ شگفته گو شادابیٔ الفاظ در گفتار طالب بجاست، اماّ معانے تازه کجا هما نا چنیں نغز گویٔ و نادره سنجی در بخشش صاحب افتاد است و بس، خوش گفته آنکه گفته :

کم افتد چنیں نکته پرداز کم
که نازند از و لفظ و معنی بهم

نازم برم گیری و نفس با اثر که افسرده طبع مرا گرم گفتار ساخت تا ایں شورش انگیز سخن از دیده بدل رفت دل چناں نعل در آتش گشت که نادیده هنگامه گریستن بلند آوازه نکرد و مژه راه ورسم ابر بهاری تازه نکرد، از بیقراری نه نشست و از بیتابی بر نخاست، بے خبراں چشمک میزنند، میدانم درمجلس اعجاز دم از افسون باطل‌زدن نه روا ست، اما چکنم چکیده دل است و ترا دیدهٔ جگر نهفتنش نیز نوعے از جفاست‌لاجرم عناں اب رہا میکنم ولب به تکلم آشنا میکنم :"

رقعہ مومن خان دهلوی به شیخ کرم علی

بناز میگزرد تا حکایتے کنمش
کند ز من گله تا شکایتے کنمش

مہربانی‌نامہ بمضمون عتاب مشحون رسید، مورث تعجب و حیرت گردید۔ آزرده دلی را انگشت بلب زدن صد طعن برائے خود ترا شیدن است و شکوه گذاری بحرف در آوردن خجلت جور وستم کشیدن۔ همانا و نظر بر ینکه پیشتر ازیں صد صفت جاهلی نکو هیده اطوار بلب آورده اند و بهزار دروغ راستی نمابا همچو من مخلص تزویر و فریب ها بکار برده آید، هر چند لائق جواب نیست بلکه کاتب هم سزائے خطاب، لے اما از ولوله خار خار خاطر محزوں ناچارم و حرفیکه بخیال آوردنش ننگ و عار من لا جرم بزبان خامه می آرم نوشته اند، قسمیکه شود خود را در ینجا رسانند معلوم نه شد که چرا آیم، کار من آنجا چیست و میزبان شفیق جزآں مہربان که نا خوانده هم اگر فرصت دهد حاضر کردم کیست، بارے باید نوشت که منع توقف و تامل چرا است و کدام کا بایں ناکاره بے دست و پا اگر رابط به خانه فراموشی دارد، ظاهر ست که ترک جهاں آباد نکرده‌ام و اگر مطلب از خرابه سردهنه میدانند که بدشت و صحرا نه پرورده ام، شهرستانی به بادیه خانه نه سازد و مرغ چمن در بیابان خزاں زده طرح آشیانی میندازد و طمع خوشنودی خدا و نیک نامی دنیا بفریب مرقومته الصدر با ما ست، حسب مقام شعر خودم بیاد آمد چشم دارم که پسندافتد، حذرکنم دم ناصح فسون پرویز ست، خطا شنیدن حرف صواب آمیز ست، خدارا به جهنم افتادن مومن باعث شادی و سرور نبود۔ کسے بذلت و خواری‌بقریه ودیه در دنیامشهور نکرد و دو سه ماه که به نادانی و ساده‌دلی مرتکب جز همه به نا اهلاں ساختن گردیدم، از هیچکس جز ملامت و نفرین نشنیدم، اکنوں که فارغ البال و خوشحالم خدا نکرده به مصیبت خود را گرفتار نمایم و به مجلس از عقل هزار فرسخ دور افتادگان در آیم، مصرع :

مرجرت المحرب حلت بالله آیه مثنیٰ
و ثلاث و رباع

خوانده ام و معنی آں از اساتذه به تحقیق رسانیده، اگر از حرام توبه کرده ام، حلال نگذاشته ام و اگر پایے از هرزه گردی برداشته ام، دست از ازدواج بر نداشته‌ام و چوں از جهلا یے نابکار رنجها کشیده‌اموبه‌پیوستن وها۔۔۔ بد اطوار مصیبت ها دیده ام، سرآں دارم که با همچو عالی خاندانی فلک شکوهی و صلت نمایم و چشم تماشا طلب بدیدار خوش نسبتی زمره گوهری کشایم، ورنه از دو سه جا پیغام تناکح و مژده از وصال بر خوردن درمیان اگر انصاف باشد ازیں نسبت که من دخترش را به عقد آورده ام، تا روز جزاجز فخر و مباهات سخنے بر زبان نیارد و ایں هرزه درائے و ژاژ خائیے خود یک باره در گذارد۔ هیهات هیهات که بایں علوشان بامشتے خاشاک منشے ساختم و به چندیں آسمان پایگی بکف خاکے پرداختم :

نکوئی بابداں کردن چناں ست
که بدکردن بجای نیک مرداں

نظر بکارے که در پیش ست، ازحق چشم نپوشند و بآں حق ناشناس باطل پسند ایں قدرها بخوشند روز جزا جواب‌چیست و شفیع فعل مومن

بے گناہ کیست؟ طعن نسبت والدہ مکرمہ معظمہ نمودن زبان بخدمت حضرت مریم و فاطمہ علیہما السلام کشودن ست۔ عظیم اللہ بیگ کہ پایۂ افتخارش جز منصب کمیدانی ہیچ نیست، باچنیں محتشمہ بلند قدر شکوہ بر زبان آرد و بایں سوء ادب توقع آمرزش وبخشائش جرم و معاصی دارد، هر چند خاک کشتہ ایم، اما بہ همسریٔ چرخ فرق فرو نیاریم، و اگر بے سر و سامانیم اما سرو برگ لجاجت وابرام سفلگاں نداریم، سعد قلی خاں بہادر یکے از غلامان خاندان ماست کہ ثروت بیگم شمرد کہ مسجود ایں کمترین بے مردین ست داشت و نام خود بہ صحیفۂ تاریخ عالم شاهی و سیر المتاخرین بہم نسبی نجف خاں و نجیب خاں گذاشت از قصیدہ:

> گریکیک (کذا) از آبا شمرم تابہ گیومرث
> کس نیست کہ تا چرخ نیفزاشت علم را
> آں پایۂ اکلیل فزایاں کہ نمودند
> مسجود شہاں نقش کف پائے خدم را

چشم از الطاف آں دارم کہ باز چنیں حرف نازیبا بقلم نیارند و بطور من وگذارند تکلیف آمدن آنجا ندهند و ایں گفتگوئے ناشائستہ درمیان نہ نہند رسیدنم، کجا سخن دریں ست کہ آمدن و بانی کہ بعد چندیں بے ادبی و گستاخی عفو جرائم و سئیات روانی خطے اسمے غلام رسول بیگ فرستادن ملایم عالی فهمان نیفتاد کہ رسیدن صورت نداشت، ناچار خادم شما اگرچوں نامۂ اوّلیں چاک نزد بر طاق سہو ونسیاں گذاشت زیادہ ازیں ننگ و عار باعث شکستن قلم و مانع تحریر و رقم گشت، والسلام!"

رقعہ مفتی محمد صدرالدین خاں آزردہ دهلوی

رهین منت بخت بیدارم کہ من بہ هیچ در حساب را کہ چو حرف باطل بہ غلط هم بر زبان گوهر فشاں نمی گذاشت، از روستایٔ بے اعتباری بر آوردہ روشناس شہرستان صحبت خطاب گردانیدہ و از نشیب گاہ فراموشی بالا دادہ برفراز والا پایگی یاد آوری رسانید، یاوری طالع را گذرے بسر وقت بے دلاں افتاد کہ دور گردان بزم دل فروز را کہ چوں غبار شکست در کنار آں راہ نتوا نستندے یافت از رہ سیرے وادیٔ بے آرامشی رهانیدہ از نزدیکی بساط حضور گزیدہ سامانی فراهم داد، کارواں نسیم مصر در بیت الحزن بار اقامت بر کشاد و ساربان زمام ناقۂ لیلیٰ را بکف اختیار قیس شکستہ پاواو قطرہ ام دریا باسم کیمیاء خزفم گوهر خار خشکم گل ترشامم رو کش روز بامدادم رشک نوروز دردم و اگر دم توتیہ خوشہ ام خرمنے سبزہ ام سمنے یاسم امید خزانم بہار جاوید گردید بہ نسیم را بلندی طالعم را ارجمندی شبم را سحر نقشم را اثر سر افکندگیم را سرفرازی شکستہ خاطرم را دلنوازی پدیدید آمد همانا همایوں فال طایر سایۂ اقبال بگسترد کہ خطاب سلیمان را بہ مور ناتواں رسانید و زبان حال راشکرف کشائیش روا آوردہ و پیشگاہ سینہ بوالعجب انشراحے فرو گرفت خاطر پریشاں را پیرایۂ فزونی جمعیت و مایہ تنومندی آرامش حاصل شد نسیم الطاف قدیم بتازگی و زید، گلشن عاطفت از سر نوشگفتٔ چوں از دور افتادن از یاد رفتہ و فراموشان از طاق دل افتادہ پرس وجوئے ساماں بود خاطر حسرت اندوز بگوناگون کامرانی هائے بر آمود و بدیع انبساطے روزی روزگار اخلاص سرشت گردید:

نیافت صبحدم آغوش دوست از بر دوست
تمتعے که دل از ذکر ایں پیام گرفت

ازاں بار که بار فصل خصومات را بر گردن گرفته انفاس گرامی را بنا بایست داده ام نقوش سخن گزاری و نکته سرای ازساحت ضمیرم یک قلم سترده وتار عنکبوت چسان (کذا) بر زوایائے سرادقات آن یکسر شنیده آمد و راس المال متخیلات آن که در خزانۂ خیال داشت بتاراج اختلاط --- از پست منشان کسب فطرت که حفظ ضوابط معموله عدالت راعرش المعرفته بالغ جزوئے و سدرۃ المنتهائے دانش پژوهی شمرده اند داده و افزونی تعلق فراوانی شغلهائے دیگر ضمیمه آنست دوست مایه آسودگی چندانی بدست نیارستم آورد که سختیٔ آئین سخن طرازی و نکته سنجی را بکار جرم مگر چوں آهنگ ایں صناعت را با گوهرم سرشته ازگاه پسیج آن تارو پود نسیج ایں علائق را از هم گسلاند و هرگاه به مهین هدیه نوزادگاں طبع از احیائے نورانی بر فراز اعتبار منزل میگیرد همچو بلبلے که بوستان سرای بلبل دیگر در چمن بخروش آید و آهنگ ناله ساز دهد، بے اختیار نوائے جاں خراش از خاطر بزبان سر بر میزند و بسر جوش شوق بے خودی جوش بے هنگام تاز از جامیرود هر چند از آشوب درونی بیراهه میروم و سخن بآئینے که باید نگذارده ام و گزیں کارے بسزا بر نساخته ام اما فروهیده فرهنگان انصاف گوهر سخن سرایان دیده در آں مرسلۃ الصدر روح و رواں توانند فهمید ۔ اکنون از حال عمر بزرگوار می نویسم، شفائے ایشان از نادره حکمت داد از جان آفریں است و مایه حیرت دیده وران دوربیں بکار ساز حقیقی روئے نیاز آوردند و جلائیل نعم الهی را دریافتند شرح آن بکالبد گفتار در نگنجد ۔ فی الجمله سرنوشت آسمانی طیلسان صحت بردوش گرفته رو بحصار آورده اند و در حصار حراست علی الاطلاق منزل گرفته والسلام ۔

حصهٔ فارسی کے بعد حصهٔ اردو پر نظر ڈالتے هیں تو، اس میں بهی غالب اور معاصرین غالب کی چند منظومات مل جاتی هیں ۔ غالب کے مشهور قصیدے "ساز یک ذره نهیں فیض چمن سے بیکار" کے (۲۰) اشعار هیں، آخر میں چکنی ڈلی والا قطعه اور ایک رباعی درج هیں جو ان کے دیوان میں موجود هیں ۔

استاد ذوق کا ایک قصیده بمدح بهادر شاه ظفر اور ایک غزل هے :

مصحف رخ ترا اے سایهٔ رب العزت
کهول دے معنی اتممت علیکم نعمت

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبهو کرتے
مسیح و خضر بهی مرنے کی آرزو کرتے

بهادر شاه ظفر کا ایک مستزاد اور ایک غزل مندرج هے :

میں هوں عاشق ،مجهے غم کهانے سے انکار نهیں
که هے غم میری غذا
تو هے معشوق تجهے غم سے سروکار نهیں
کهائے غم تیری بلا

آیا نه اگر نامه و پیغام کسی کا
آخر هے کوئی روز میں یهاں کام کسی کا

نواب الهی بخش خاں معروف کی غزل کے ۶ شعر هیں، جس کا مطلع یه هے :

ڈبو دیا مجهے، اس چشم ترکو کیا کوسوں
جلا دیا مجهے، سوز جگر کو کیا کوسوں

استاد مومن خاں کی غزل ''وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' اس کے بعد نواب شیفتہ، مفتی آزردہ، نواب ضیاءالدین خاں نیر اور زین العابدین عارف کی بھی ایک ایک غزل ہے جنھیں ان کی کمیابی کے باعث یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں :

غزل نواب مصطفیٰ خاں ''شیفتہ''

بے اشک لالہ گوں بھی مری ابرو نہیں
گریہ میں رنگ کیا ہو کہ دل میں لہو نہیں

پھر بھی کہو گے، چھیڑنے کی اپنی خو نہیں
عطر سہاگ ملتی ہو وہ جس میں بو نہیں

کیا ہوش انتظار میں ہر سمت دوڑیے
بدنامیوں سے ہائے گزار ایک سو نہیں

شکر ستم ہی راس نہ آیا ہمیں کہ اب
کہتے ہیں وہ کہ لائق الطاف تو نہیں

ہر جائی اپنے وحشی کو کس منہ سے کہتے ہو
کیا آپ کا نشان قدم کو بکو نہیں

نیرنگیوں نے تیری یہ حالت تغیر کی
امید زندگی کی کبھو ہے کبھو نہیں

کیا ہوسکے کسی سے علاج اپنا شیفتہ
اس گل پہ غش ہیں جس میں محبت کی بو نہیں

غزل، مفتی محمد صدرالدین خاں ''آزردہ''

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

جانے ہے دل فلک کا مری شخ کمانیاں
ان ناتوانیوں کو پہنچتی تواں نہیں

قاتل کی چشم تر نہ ہو یہ ضبط آہ دیکھ
جوں شمع سر کٹا پہ اٹھا یاں دھواں نہیں

اے بلبلان شعلہ دم اک نالہ اور بھی
گم کردہ راہ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں

اٹھ کر سحر کو سجدۂ مستانہ کے سوا
طاعت قبول خاطر پیر مغاں نہیں

اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ ورنہ کب
واں خندہ زیر لب ادھر اشک نہاں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدہ میں کل
وہ صاف تر کہ سینۂ پیر مغاں نہیں

غزل، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیو لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے غصے نے ایک دم میں کیا
مردۂ صد ہزار سال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنیٔ باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع بد سے نیّر رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

غزل نواب زین العابدین خاں عارف

تا ایک وضع پر رہوں دائم عذاب میں
ضد ہے مری زمانہ نہیں انقلاب میں

غصے میں ان کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا لطف ہم نے شب کو اٹھائے عتاب میں

شوخی ہے ان کا شیوہ تو کھلتا نہیں ہے راز
گو وہ کسی کے واسطے ہوں اضطراب میں

مولف ریاض انفردوس نے اردو فارسی کے جن اهل کمال کی نظم و نثر کو اپنی تالیف میں جگہ دی ہے، ان کا تذکرہ بھی لکھا ہے۔ هر شاعر کےلئے اس نے چند رسمی جملے تحریر کردیئے هیں۔ اس دلچسپ باب کا نمونہ پیش کرتے ہوئے میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

تذکرہ شعرائے فارسی

مومن خاں مومن دهلوی : وے از شعرائے ریختہ گویان بودہ، گاهے بہ فکر فارسی هم می پرداخت، ازوست :

هم تاب وصل نیست من بے نصیب را
خود دشمن خودم نشناسم رقیب را

مولوی امام بخش صہبائی دهلوی : وے شاگرد عبداللہ خاں علوی و از اکابر فارسی‌دانان شاہجہان‌آبادست، ازوست :

یارب آن کن بہ جنون دل دیوانۂ ما
کہ شود بال پری نالۂ مستانۂ ما

مرزا اسداللہ خاں غالب دهلوی : وے در فن شعر از معاصر ان گوئے سبقت ربودہ ازوست :

در بغل دشنہ نہان ساختہ غالب امروز
مگزارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

مفتی صدرالدین خاں آزردہ دهلوی : وے از علماء با وقار آنجاست، منہ :

شکر اللہ کہ چو بہ طوف حرم آوردند
روے دل جز طرف خانۂ خمار نبود

نواب مصطفیٰ خاں حسرتی : وے از روسائے منصب داران دهلی، شاگرد مومن‌خاں است، منہ :

خوش است با تو بزمے بہ نہفتہ ساز کردن
در خانہ بند کردن، سر شیشہ باز کردن

نواب‌ضیاء الدین‌خاں نیر دهلوی : وی شاگرد غالب و از جاگیر داران آنجاست، ازوست :

شکستہ طرف کلاہ و کشودہ بند قبا
چہ بیخودانہ بت میگسار می آید

تذکرۂ شعرائے اردو

آزردہ تخلص مفتی محمد صدرالدین خاں صدر الصدور دهلی، فاضل جید و عالم متبحر ہے، منہ :

مرکر بھی همارا دل بیتاب نہ ٹھرا
کشتہ بھی هوا تو بھی یہ سیماب نہ ٹھرا

ذوق، تخلص شیخ محمد ابراهیم دهلوی المخاطب بہ خاقانیٔ هند، شاعر بے مثل ہے، منہ :

هم هیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا هم سے گنہ گاروں کا

شیفتہ تخلص نواب مصطفیٰ خاں دهلوی شاگرد مومن خاں کا، شعرائے ممتاز سے ہے، منہ :

اللہ رے کافر کی نزاکت کہ اڑا رنگ
هم نے جو لئے رات کو تصویر کے بوسے

ظفر، تخلص سراج الدین محمد بہادر شاہ، شاگرد محمد ابراهیم ذوق دهلوی کا ہے، منہ :

ضبط فریاد کروں، گریہ کو روکوں، لیکن
دل بیتاب کو تھاموں، یہ نہیں ہو سکتا

غالب، تخلص مرزا اسداللہ خاں معروف بہ
مرزا نوشہ اکبر آبادی مولد، دہلوی
مسکن، شعرائے نامدار سے ہے، منہ :

بوئے گل نالۂ دل، دود چراغ محفل
جوتری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

معروف، تخلص الہی بخش خاں، حالت ثروت
میں تارک دنیا ہوگیا، منہ :

کی وصیت یہ کچھ ارمان بھرے آہ کہ رات
سارے گھر کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

مومن، تخلص مومن خاں شعرائے نامدار
دہلی سے زمرۂ اساتذہ میں معدود ہے، منہ :
اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

نیر، تخلص نواب ضیاء الدین احمد خاں
دہلوی، شاگرد مرزا اسداللہ خاں غالب کا ہے، منہ :
آنکھوں میں بوالہوس کی کھٹکتا ہوں رات دن
احسان ہے یہ مجھ پہ مرے جسم زار کا

مولانا روم اور علامہ اقبال

ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری

اردو زبان میں مولانائے روم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں کوئی چار سو سال سے کی جارھی ھیں۔ سب سے پہلے دکن کے شاعروں نے ان کے بیان کئے ھوئے وضاحتی قصوں کو طویل مثنویوں کی شکل میں منظوم کیا ھے۔ اور گجرات کے مشہور اردو شاعر خوب محمد چشتی نے تو اپنی پوری مثنوی خوب ترنگ انہی کے انداز میں قلمبندکی ھے۔ اور اس میں مثال کے طور پر ویسے ھی دلچسپ مقامی اور دیسی قصے لکھے ھیں جیسے کہ مولانائے روم نے اپنی مثنوی میں جگہ جگہ اپنے افکار و تصورات کی وضاحت کے لئے بیان کئے تھے۔ یہ اردو مثنوی خوب ترنگ آج سے چارسو سال قبل سنہ ۹۸۶ھ میں بمقام احمد آباد لکھی گئی تھی۔

اس کے بعد بیجاپور اور گولکنڈے کے شاعروں نے بھی اپنی مذھبی مثنویوں میں مولانائے روم کے اتباع کی کوشش کی ھے اور سنہ ۱۲۴۴ھ میں تو شاہ مستعان مدراسی نے مثنوی رومی کے جملہ ساتوں دفاترکا اردو ترجمہ مثنوی ھی کی شکل میں کیا تھا جو بعد کو سنہ ۱۹۰۰ع میں مطبع کریمی بمبئی سے کئی جلدوں میں شایع ھوا ھے۔ لیکن یہ ترجمہ صرف ان منتخب حصوں کا ھے جن کو مدراس کے اس بزرگ شاعر نے اپنے ذوق کے مطابق چن لیا تھا۔

اردو زبان میں مثنوی رومی کی کئی شرحیں لکھی گئی ھیں، جن میں سے بعض کئی کئی جلدوں میں چھپ بھی چکی ھیں۔ ظاھر ھے کہ رومی کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ تمام کوششیں اس امر کا واضح ثبوت ھیں کہ اردو بولنے والوں پر فارسی کے اس حکیم شاعر کا کتنا اثر تھا۔ اورمثنوی معنوی کس قدر ومنزلت سے دیکھی اور پڑھی جاتی تھی مگر رومی کے ان تمام قدر دانوں اور شیدائیوں میں کوئی شاعر یا ادیب اس معیار تک نہیں پہنچ سکا تھا جو رومی کے اعلیٰ تصور عرفان اور فلسفیانہ مسائل کی اسی شاعرانہ انداز میں تشریح و توضیح کرسکتا جو مولانا رومی کا حق تھا۔

یہ کام گویا علامہ اقبال کی قسمت میں لکھا تھا۔ فطرت کی جانب سے انہیں وھی سوز اور تڑپ ودیعت کی گئی تھی جو رومی کو غالباً شمس تبریز کے فیض نظر سے حاصل ھوئی تھی۔ علامہ اقبال کے اس فطری رجحان کو ان کی تعلیم و تربیت اور خاص کر یورپ

فلسفیوں کے مطالعے اور تحقیق و جستجو نے اور زیادہ قوی بنادیا تھا۔ اپنی تعلیمی نشوونما اور ذہنی ارتقا کے بعد جب وہ اس شعر کی حقیقت سمجھنے کی طرف رجوع ہوئے کہ

مثنوی، مولوی، معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

تو انہوں نے محسوس کیا کہ زبان پہلوی میں قرآن کے مطالب و معانی کو فلسفہ و عرفان کے رنگ میں سمجھانے کا جس عمدہ پیرائے میں رومی نے اہتمام کیا ہے اسی طرح انہیں اردو زبان میں کرنا چاہئے۔ پھر اس سعی میں وہ صرف اردو زبان تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے تنگنائے اردو کو جلد محسوس کرلیا اور آخر کار فارسی زبان کا سہارا ڈھونڈھا۔ لیکن جو کچھ انہوں نے رومی کے رنگ میں لکھا خواہ وہ اردو میں ہو یا فارسی میں اس وجہ سے بہت اہم ہے کہ وہ بعض مقامات اور منازل میں رومی سے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رومی جس سماج اور ماحول کی پیداوار تھے اور جس سماج اور ماحول کو مخاطب کر رہے تھے، وہ اقبال کے عہد میں تقویم پارینہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور ایک لحاظ سے تو دقیانوسی بن چکا تھا۔ اقبال کو ایک ایسے زمانے سے سابقہ تھا جو یورپ کی سامراجیت کو اپنے انتہائی عروج پر دیکھ رہا تھا اور جس کو مارکس اور لینن کے بڑھتے ہوئے سائے رفتہ رفتہ اپنے دامن میں سمیٹنے لگے تھے۔ ایک تہذیب دم توڑ رہی تھی اور دوسری تہذیب کا آفتاب طلوع ہونے لگا تھا۔ انقلاب کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور آزادیٔ اقوام کے تصور اور عملی اقدام کے چرچے جگہ جگہ شروع ہو چکے تھے۔

اقبال نے رومی کے جیسے کشف سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ سیاہ فام افریقی قومیں ایک روز اقصائے عالم کی قسمتوں کے فیصلے کی مالک بنیں گی اور تہذیب مغرب ایک نہ ایک دن اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لے گی۔ ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے بلند تحقیق اور اعلیٰ ساز شاعری سے بالکل اسی طرح کام لیا جس طرح رومی نے اپنے زمانے میں لیا تھا۔ رومی نے عجم کی فلسفہ پرستی اور مادیت نوازی کا جس انداز میں علاج ڈھونڈھا تھا، اقبال نے اسی انداز میں اپنے دور کی انقلاب آفرینی اور لادینی مزاج کا مداوا معلوم کرنے کی سعی کی۔

ایک طرف تو انہوں نے مشرق اور اقوام مشرق کی بیداری کے گیت گائے اور دوسری طرف مشرقی اقوام میں مسلمان ان کو سب سے زیادہ پس ماندہ نظر آئے، تو انہوں نے ان کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لئے تلخ نوائی سے بھی کام لیا۔ اس وقت صوفی خانقاہوں میں مست تھے اور بے خودی کے دامن ہی کو گوشۂ عافیت اور متاع الستغنا سمجھنے لگے تھے۔ اقبال نے سب سے پہلے انہی کو للکارنے اور برسرکار لانے کی طرف توجہ کی اور خانقاہیت کے خلاف آواز بلند کی۔ خواجہ حسن نظامی پہلے صوفی تھے جنہوں نے اقبال کو سمجھا اور ان کے تصور تصوف کی تمیز میں حصہ لیا۔

علامہ اقبال نے خودی کو زندہ کرنے اور اسکو تمام مقاصد دینی و دنیوی کا آلہ کار بنانے کی تبلیغ شروع کی۔ صوفی یہ سمجھتے تھے کہ خودی کو ترک کرنے ہی سے خدا ملتا ہے۔ اس لئے

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

جیسے تصورات کے تحت ان کی خانقا ہوں میں سماع اور ان کے فقرا میں بھنگ اور چرس کی عادتیں جاری وساری ہوگئی تھیں۔ رہبانیت جس کی اسلام نے ممانعت کی تھی، ان صوفیوں نے اپنے انداز میں جاری کر رکھی اور اس کے جواز کے لئے رومی اور ابن عربی کے اقوال و اشعار کی تاویلیں کرنے لگے تھے۔ اقبال نے ان سب کو بے نقاب کیا اور کہا کہ:

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

یہ تو ذرا نرم آواز ہے۔ اقبال نے تو یہاں تک للکارا کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پھر مرد مومن کا اقبال نے ایک اعلیٰ تصور پیش کیا اور سمجھایا کہ:

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسی خیال کو انہوں نے اپنی ایک نظم میں اس طرح پھیلا کر بیان کیا ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریل امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال کے ایک مجموعۂ کلام بال جبریل میں ایک طویل نظم ایسی بھی ہے جس میں انہوں نے خود کو مرید ہندی اور مولانا رومی کو اپنا پیر و مرشد ظاہر کیا ہے۔ اور ان کو ”امام عاشقان دردمند“ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اس نظم میں اپنے اور اپنے دور کے شکوک و شبہات پیش کرکے رومی سے ان کے جواب مانگے ہیں جو حسن اتفاق سے اقبال کو مثنوی مولوی معنوی ہی میں مل گئے ہیں۔ یہ ایک بہت دلچسپ اور سبق آموز مکالمہ ہے۔ ایک جگہ علامہ سوال کرتے ہیں:

دور حاضر مست چنگ و بے سرور
بے ثبات و بے یقین و بے حضور
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا
دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا

آہ یورپ با فروغ و تابناک
نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

اس کا جواب مولانا رومی نے دیا کہ:

بر سماع راست ہر کس چیر نیست
طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

پھر اقبال پوچھتے ہیں کہ:

پڑھ لئے ہم نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک دردو کرب

رومی جواب دیتے ہیں کہ:

دست ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے ما در آ کہ تیمارت کند

غرض اقبال اسی طرح مختلف سوالات کرتے ہیں کہ اہل مشرق، یورپ والوں سے کیوں مسحور ہیں۔ کالجوں کے طالب علم ساحر فرنگ کے چنگل میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں؟ مغربی عورتیں حور جنت سے کیوں زیادہ حسین نظر آتی ہیں؟ آدم کا بھید اور غایت آدم کیا ہے؟ قومیں کس بیماری سے مرتی ہیں؟ جبر وقدر کا مسئلہ کیا ہے؟ سینے میں دل کس طرح بیدار ہوتا ہے؟ آب و گل کیونکر قابو میں آتے ہیں؟ قیامت پریقین کیوں نہیں آتا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس نظم میں اقبال رومی کو جگہ جگہ ایسے القاب وآداب سے مخاطب کرتے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے خاص معتقد اور گرویدہ تھے۔ کہیں وہ مولانا کو "شریک مستیٔ خاصان بدر" کہتے ہیں اور کہیں لکھتے ہیں کہ:

تجھ پہ روشن ہے ضمیر کائنات

وہ ایک جگہ سوال کرتے ہیں کہ آج کل کا تقاضا ہے انجمن سازی اور جلوہ آرائی اور بےخلوت نہیں سوز سخن، تو رومی جواب دیتے ہیں کہ:

خلوت از اغیار باید نے ز یار
پوستیں بہر دے آمد نے بہار

آخر میں پوچھتے ہیں کہ:

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز
اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

تو رومی جواب دیتے ہیں کہ:

کار مرداں روشنی و گرمی است
کار دو ناں حیلہ و بے شرمی است

اس تمام نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال رومی کو دور حاضر کے مسائل کے لئے بھی ایک دانائے راز اور طبیب حاذق سمجھتے تھے۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے بعض منازل و مواقع پر انہوں نے رومی کے رنگ میں مزید اضافہ کیا ہے اور ایسے ہی مواقع پر ان کی انفرادیت اور خاص شخصیت کا احساس ہوتا ہے اور خود اقبال ہی کے یہ مصرع یاد آتے ہیں کہ:

سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

نہ معلوم اقبال جیسا دانائے راز پھر کب پیدا ہو۔

-:-:-

اردو زبان پر ایک تاریخی نظر!

س۔ م۔ فیضان دانش

یہ اصول کہ زبان کی تخلیق اور ترویج و ترقی، ہمیشہ یا اکثر لوگوں کی بول چال اور تمدن و معاشرت پر منحصر ہوا کرتی ہے بالکل سطحی اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اگرچہ زبان کی آفرینش اور تاریخ کے اعتبار سے یہی اصول مدت تک علم اللسان کا بہت اہم اور مرکزی موضوع رہا مگر جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ اس محدود نظریئے کے لحاظ سے، زبان کی تاثیر و نفوذ اور اس کے ارتقاء کی منازل کا پتہ لگانے میں بہت خلل واقع ہو سکتا ہے، اور ہر وہ فرقہ جو اپنی وطنی یا مذہبی زبان کی ترقی میں کوشاں ہے ہمیشہ اپنی زبان کا تاریخی کھوج لگاتے وقت اس نتیجے پر پہنچے گا کہ زبان کی بنیاد کو تعلیم و اخلاق کے باہر تلاش کرے۔

ممکن ہے کہ مذکورہ حقیقت، ضوابط مسلمہ کے کانوں کے لئے ناآشنا ہو مگر یہ لازمی اور حقیقی امر ہے کہ زبان ہمیشہ اہل زبان کی کوشش اور سیاسی ماحول کی پوری پوری تابع ہوا کرتی ہے۔ زبان کی خفیف سے خفیف ترقی بھی ہمیشہ اسی پہلو سے ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔

پس زبان کے خصائص، وسعت اثر اور تعدیہ وغیرہ، جس قدر ملکی و سیاسی انقلابات سے وابستہ ہیں اتنا کسی اور چیز سے نہیں، اور صرف اسی وابستگی سے زبان کی نوعی تاریخ کا پتہ لگ سکتا ہے، بعینہٖ جس طرح فوجی استیلا کے بعد ملک میں جا بجا کشت و خون، ہنگامے اور طرح طرح کی بدانتظامیاں ہوتی رہتی ہیں، اور ایک عرصہ تک ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پھر کچھ کچھ امن قائم ہونے لگتا ہے، فساد کا استیصال کامل کیا جاتا ہے اور او نیائے حکومت اپنی قومیت و تمدن کو نمایاں کرنا شروع کرتے ہیں، قوانین بنائے جاتے ہیں، عدالتیں قائم کی جاتی ہیں، مختلف محکمے ترتیب پاتے ہیں، رفتہ رفتہ ایک مضبوط اور با امن حکومت کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور ہر قسم کی انفرادی و اجتماعی ترقیاں وقوع میں آنے لگتی ہیں، پھر مزید ترقی شروع ہوتی ہے اور حکومت انحصار و آمیزش غیر سے مستغنی ہو کر اپنے ذرائع سے آگے بڑھتی اور دوسرے قطعات ارض پر تسخیر و قبضہ کی غرض سے نظر ڈالتی ہے، بالکل اسی طرح زبان بھی صورت پکڑتی اور حکومت کے نظام و مدارج کے دوش بدوش رہتی ہے۔ زبان کی مملکت میں بھی عظیم الشان تغیر و تبدل ہوتے رہتے ہیں، اس کا میدان جنگ، خاموش مجالس میں ہے، اس کا امن اور اس کی تہذیب و تمدن، اپنا وجود مستقل رکھتے ہیں، طرح طرح کے اثرات کام کرتے ہیں، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کی حکومت بھی مستحکم ہو جاتی ہے اور قوانین بننے لگتے ہیں، مختلف صیغے وجود میں آتے ہیں، ادبیت و علمیت کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور پھر یہ نوبت پہنچتی ہے کہ زبان میں قومیت کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اور

اپنی ترقی کے لئے دوسری زبانوں کی ملکتیں بھی، اس کی نظر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

پس اقوام کی طرح السنہ بھی اپنے تنازع للبقا کے کل دور اور اپنی جہد للحیوٰۃ کے جملہ منازل کو نہایت کشمکش کے ساتھ طے کرتی ہیں، اس کے بعد نتھرتی اور صاف ہوتی ہیں اور پھر اپنی قومیت کو متعین کرکے اپنے خصائص، حدود اور اپنے خط و خال مقرر کرتی ہیں، اور تب اس قابل ہوتی ہیں کہ اہل زبان کو حرکت و حیات کا ذائقہ چکھائیں۔

(ملاحظہ ہو "اردو کی قومیت" مصنفہ سید ندیم الحسن تاثیر صفحہ ۳۳-۳۴-۳۵ طبع دکن ۱۳۶۱ھ)

اردو کی ابتدا اور ارتقار کی تاریخ اکثر دوسری زبانوں کی تاریخ سے اس قدر مختلف اور اس کی ساخت دوسری زبانوں کی ساخت سے اتنی علیٰحدہ ہے کہ چند بندھے ٹکے اصول و قواعد اور مقررہ لسانی ضوابط اس کے ارتقار کی پوری تاریخ کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ گو یہ بات دنیا کی اکثر زبانوں کے لئے صحیح ہے لیکن اردو کی ہیئت ترکیبی میں جن عناصر نے کام کیا ہے ان سب کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے متعلق خود اردو کے جاننے والوں میں غلط اندیشیاں ہیں اور اس کے نہ جاننے والے تو نہ جانے کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور کتنی غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں۔ اس وقت دنیا کی کسی زبان کے سامنے وہ مسائل نہیں ہیں جو اردو کے سامنے ہیں۔ کہیں کسی زبان سے اس بنا پر مخالفت نہیں کی جا رہی کہ وہ ارتقائے تمدن کے ایک خاص دور میں پیدا ہوئی اور گو اس کی آبیاری میں ہر طبقے اور فرقے نے حصہ لیا تھا لیکن اس مخصوص دور تمدن سے نفرت پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ تہذیبی سرمایہ بھی تباہی کی زد پر ہے جو اپنی پیدائش اور ترقی میں صرف تاریخی طاقتوں کا مرہون منت ہے جیسے دین، مذہب یا کسی دوسری ایسی طاقت نے سہارا نہیں دیا۔

(ملاحظہ ہو سید احتشام حسین صاحب کا مضمون "اردو کا لسانیاتی مطالعہ" "ماہِ نو" اپریل ۱۹۴۸ء۔ کراچی)

فلسفۂ لسانیہ کے لحاظ سے کسی زبان کی قومیت کا کھوج لگانے اور اسے متعین کرنے کے لئے ایک حد تک اس کی سرزمین، اس کا جغرافیہ اور اس کی وطنیت کا پتہ لگانا بھی بہت ضروری ہوتا ہے، اس لئے کہ جب تک اس کے ارتقائی مدارج تک بھی نقوش قدم کا پتہ نہ لگے گا، اور یہ نہ معلوم ہوگا کہ کس کس سرزمین سے اس کا تعلق رہا ہے، اس وقت تک اس کی صحیح قومیت کا سنگ بنیاد نہیں رکھا جا سکتا۔

خوش قسمتی سے اردو کا ارض اللسان کچھ بہت عمیق و دقیق نہیں ہے، حالانکہ اس کی ہیئت ترکیبی مقتضی اس کی تھی کہ اس کی بنیاد و حقیقت کا پتہ لگانے میں علم اللسان کے ہر قسم کے قیاسات و قرائن اپنا اپنا زور لگائیں مگر چونکہ باوجود اس کی موجودہ شان و شوکت کے اس کی لسانی عمر ڈیڑھ سو برس سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی، نیز اگرچہ وہ اپنی حیثیت حالیہ میں ایک درجن سے زیادہ مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے، مگر اس کے دور قدیم میں اس کی یہ حالت نہ تھی۔ پس ان اعتبارات سے اس کے مجموعۂ السنہ ہونے کی بنا پر، اس کے ارض اللسان کا پتہ لگانے میں جن دشواریوں اور پیچیدگیوں کا احتمال ہو سکتا تھا، وہ بہت کچھ کم ہو گئی ہیں۔

اردو کے آبائے اولیں کا وطن وسط ایشیا تھا جس زبان کا عنصر بہ مقابلہ دیگر زبانوں کے، اس میں زیادہ شریک ہے اور جس صندل کی زمین میں اس کا خط نکالا گیا ہے، وہ وہی ہے جس کی بنیاد کا وسط ایشیا میں پتہ چلتا ہے اور جو نہ صرف اردو بلکہ یورپ و ایشیا کی اکثر زبانوں کا گہوارہ ہے، یعنی آریہ زبان جس کو بجا طور پر "ام الالسنہ" کا نام دیا جا سکتا ہے، وسط ایشیا سے اٹھ کر شمالی ایران، افغانستان، سندھ اور جنوبی کشمیر ہوتے ہوئے آریہ لوگ راجپوتانے کے صحرا میں داخل ہوئے۔ کچھ جنوبی ہند میں بمبئی کی طرف پہنچے، کچھ ہمالیہ کے دامن میں بس گئے، بعض گنگا و جمنا کی وادیوں میں جا پہنچے اور کچھ اس سے بھی تجاوز کرکے

بہار اور بنگال تک گئے۔ بس آریوں کی ہندوستان میں پہلی آمد کی مہمل انتہا یہی ہوئی، اور چونکہ یہ پہلی دفعہ تھی اس لئے ہندوستان کے قدیم باشندوں سے کشمکش، ان میں میل جول، لڑائی بھڑائی، شادی بیاہ، یہ سب مرحلے نہایت کشاکش کے ساتھ طے ہوئے زبان آریہ کو بھی حسب استعداد اس تنازع میں حصہ ملا مگر چونکہ اس زمانہ میں ہندی زبان کوئی معقول زبان نہ تھی، اور حروف و تہجی وغیرہ کے لحاظ سے کوئی لسانیت اس کے لئے مخصوص نہ تھی، اس لئے باہر سے آئی ہوئی زبان سے اس کا جو تصادم ہوا وہ کوئی خاص لسانیت متشکل کرنے میں ناکام رہا۔

آریوں کی پہلی آمد میں، دکن اور برما، یعنی جنوبی اور مشرقی ہند کا بڑا حصہ، آمیزش اور کشاکش سے محفوظ رہا تھا، مگر دوسری آمد میں اگرچہ پہلے کا سا شاید تنازع نہیں ہوا لیکن اس مرتبہ جنوبی اور مشرقی ہند بھی پاک نہ رہ سکا، اور آریہ لوگ اگرچہ قلیل تعداد میں تو پہنچے، مگر وہاں بھی پہنچ ہی گئے۔

ابھی تک اُردو کے خواب کا بھی خیال نہ تھا، مگر وہ زبان جس کے مواد سے اُردو کی تعمیر ہونے والی تھی، اپنا جغرافیہ طے کر چکی تھی اور اس میں وسط ایشیا، ایران، افغانستان اور سندھ و ہند کی سرزمینیں شامل تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس دورے میں آریوں کو تمام سرزمینوں پر کسی پُر اثر اور اہم لسانی کشمکش کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، اور اس بنا پر اردو کا ابتدائی ارض اللسان، بہت مختصر ہے۔ جہاں تک آریہ زبانوں کا تعلق ہے، یہ اردو کے ارض اللسان کا پہلا دور تھا۔

دوسرے دور کی بنائیں اس زمانے میں شروع ہوتی ہیں جب محمد ابن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا، السنہ سامیہ کا سایہ سرزمین ہند پر پڑا اور عربی زبان نے خاص کر ہندوستان کی فضائے لسانی میں کسی قدر تغیر پیدا کیا، اس وقت عربی کا جغرافیہ اس کی ہئیت لسانیہ اور تربیت کی رو سے، ایشیا کے بہت بڑے حصہ پر چھایا ہوا تھا، مگر فی نفسہا اس کی اہمیت اور وسعت اس قدر قوی اور مکمل تھی کہ وہ جن سرزمینوں پر سے گزر کر ہندوستان تک پہنچی، وہاں کے اثرات لسانی سے بہت ہی کم متاثر و متغیر ہوئی تھی، اور ہندوستان تک تقریباً اصلی عربی صورت میں پہنچی۔ اردو کے ارض اللسان کا یہ دوسرا دور بھی، پہلے دور کی طرح تیسرے اور چوتھے دوروں کے مقابلے میں بہت معمولی اور خفیف تھا، گو اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اس کا جغرافیہ بہت وسیع ہو گیا۔

تیسرا دور، اردو کے ارض اللسان کا، اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب افغانستان کے لوگ، ہندوستان میں آنا شروع ہوئے فی الحال ہم کو اس سے بحث نہیں کہ زبان اردو میں اس وقت کیا کیا تغیرات ہو رہے تھے، ہم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کی وسعت ارضی کن کن ممالک تک اپنا نقش قدم پہنچا چکی تھی۔

دراصل یہی تیسرا دور تھا کہ جس میں خود اردو وجود میں آگئی۔ اردو کی تاریخ میں اس موقع پر یہ دلچسپ حقیقت ہویدا ہوتی ہے کہ جن دو ستونوں پر اُردو کی عمارت قائم کی گئی، وہ دونوں ایک ہی مقام سے ہندوستان پہنچے تھے یعنی "وسط ایشیا" [illegible] اس کا پہلا ستون، یعنی "السنۂ آریہ" پہلے ہندوستان میں پہنچا اور دوسرا ستون "السنۂ سامیہ" کا متعدد صدیوں کے فصل سے، عین اسی مقام سے ہندوستان میں آیا، جہاں ان دونوں کی امداد سے اُردو کی بنیادِ عمارت قائم کی گئی۔

بہرحال یہ تیسرا دور اُردو کے ارض اللسان کی انتہائی وسعت کا زمانہ تھا۔ جو زبانیں اس دور میں ہندوستان آئیں، وہ کرۂ ارض کا ایک عظیم حصہ طے کر کے آئی تھیں، اور فلسفۂ لسانیہ کے مختلف دوروں اور منزلوں سے گزر [illegible] خوب صاف ہو گئی اور منجھ گئی تھیں۔ انہوں نے آریہ زبانوں کے ساتھ مل کر اردو کو نہایت آب و تاب سے [illegible] میں جو حسن و جمال، فصاحت و بلاغت، لطافت و نزاکت اور اوصاف لسانی تھے، وہ سب [illegible]

اور یہی دور تھا جس میں اس کی نشوونما ہونے کے علاوہ، کچھ دنوں اسے حربی و سیاسی سرپرستی سے بھی متمتع ہونے کا موقع ملا۔

چوتھا اور آخری دور، اُردو کے ارض اللسان کا، جنوبی ہند کے سواحل سے تعلق رکھتا ہے اور یہ دور اگر اس اعتبار سے اردو کو بدقسمت ٹھہراتا ہے کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی سرپرستی سے محروم ہوگئی، تو اس لحاظ سے اس کی عظمت و رفعت کو کہیں بلند کر دیتا ہے کہ اس دور میں اس کے جغرافیہ نے تمام یورپ کو عموماً اور فرانس و انگلستان کو خصوصاً احاطہ کر لیا، اس دور میں اردو کو ان زبانوں سے استفادہ کا موقع ملا، جو اس کی ہزاروں برس اور ہزاروں میل کی بچھڑی ہوئی بہنیں تھیں، اور تقریباً تمام یورپ کی سیر کئے ہوئے اور وہاں کے اثرات لسانی اپنے میں لئے ہوئے تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کا ارض اللسان، تمام ایشیا و یورپ سے متعلق ہوگیا، یعنی تیسرے دور نے اگر اس کو عرب و عجم، روم، شام، فارس، ترکستان، افغانستان، تک پہنچا دیا تھا تو اس چوتھے دور نے انگلستان، فرانس، جرمنی، اطالیہ، پرتگال، ہالینڈ، اور ڈنمارک کو بھی اس کے ارض اللسان میں داخل کر دیا۔

پس جو زبان کہ یورپ و ایشیا کے فصیح ترین رقبوں سے مستفید ہوئی ہو، اور جس کا ارض اللسان اتنا وسیع ہو کہ دنیا کی کوئی زبان اس لحاظ سے، اس کا مقابلہ نہ کر سکتی ہو اور جو اسی بنا پر لامحالہ بندرہ بیس فصیح و وسیع زبانوں کا نہایت مفید مجموعہ و مرکب ہو، کہ یہ بھی اپنی قسم کی ایک بے نظیر خصوصیت ہے، اور بایں ہمہ جس کی عمر ہنوز وہ ہو جسے عالم طفلی کہنا چاہیئے۔ اور جو باوصف ان تمام خصائص علم اللسان کے، کسی مستحکم، حربی یا سیاسی سرپرستی کی شرمندۂ احسان نہ ہو، اس کی قومیت لسانی اور قوت ارتقاء کے بارے میں جسے شک ہو، وہ مذہب لسانیین کی رو سے یقیناً لا مذہب سمجھا جائے گا۔

(ماخوذ از "اُردو کی قومیت" ص ۴۶ تا ۵۳)

بیشتر اس کے کہ میں اردو کی ابتدا کے نظریاتِ مختلف پیش کروں، ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ریختہ، ہندی، ہندوی، زبانِ ہند، زبانِ ہندوستان، زبان دہلوی، زبانِ دہلی، ہندوستانی اور اُردو ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں — یا یہ الگ الگ زبانیں ہیں، تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ زبانِ اردو ہی کے مختلف نام ہیں جو وقتاً فوقتاً اس کو ملتے رہے[1]۔

اور یہ ہیں وہ اسناد جو اس کے بارے میں پیش کی جا سکتی ہیں:

ریختہ:

قدمائے نظم اُردو کو ریختہ کہا کرتے تھے۔ اور علمائے فارس ریختہ اس کلام کو کہتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر بنا ہو۔ لیکن اس کے لغوی معنی گری پڑی چیز کے ہیں۔ خواجہ جمال خجندی کا شعر ہے ؎

خونم چو شود ریختہ مستی کند آں چشم — از ریختہ ذوق است و طرب در سرِ هندو

ولی دکنی فرماتے ہیں ؎

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو — رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

ہندی:

ہندو مصنف بھی اُردو کو ہندی کہا کرتے تھے۔ شاہ عالم کے عہد میں ایک صاحب منشی منوہر لال دہلوی نے ایک کتاب تالیف کی جس میں مختلف شعرا کے اشعار جمع کئے۔ دیباچۂ کتاب میں لکھتے ہیں:

"از آنجا کہ ریاحین اشعار ہندی کہ خالی زآب و رنگ لطافت نیست"[2]

---

[1] قابل مقالہ نگار نے دکنی زبان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ [2] سنہ ۱۰۰۰ھ کے دکنی مصنفین نے بھی اُردو یا دکنی کو ہندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ (ادارہ)

زبانِ دہلوی:

شیخ باجن ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں جن کی تاریخ وفات ۹۱۲ھ ہے۔ وہ اپنی ایک نظم کے عنوان میں لکھتے ہیں:

"صفت دنیا بہ زبان دہلوی گفتہ"

زبانِ دہلی:

داغ دہلوی کا شعر ہے:

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور ورنہ قرآں بھی اُترتا بزبانِ دہلی

زبانِ ہندوستان:

ملا وجہی اپنی کتاب "سب رس" (تصنیف ۱۰۴۵ھ) میں لکھتے ہیں:

"آغازِ داستانِ زبانِ ہندوستان"

ہندوی:

میر اثر مثنوی "خواب وخیال" (تصنیف ۱۱۵۳ھ) میں لکھتے ہیں:-

فارسی سو میں ہندوی سو ہیں باقی اشعار مثنوی سو ہیں

ہندوستانی:

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور مغربی مصنفین میں جان جوشوا کیٹلر سے گراہم بیلی تک اردو کے لئے ہمیشہ لفظ ہندوستانی استعمال کیا جاتا رہا۔ فرانس کے ایک بہت بڑے محقق و ماہر ڈاکٹر ڈُنی بان نے ہندوستان میں دورہ کرکے پوری تحقیقات کے بعد لکھا ہے:-

"کہ جو سیاح ہندوستان میں اس غرض سے آئیں کہ وہ اس ملک کے باشندوں سے انہیں کی زبان میں بات چیت کریں تو ان کو تقریباً دوسو چالیس زبانیں سیکھنی پڑیں گی۔ لیکن ہندوستانی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ملک کے کم وبیش ہر حصے میں سمجھی جا سکتی ہے۔ آج بھی کسی دوسرے ملک کا آدمی جب ہندوستان میں داخل ہوتا ہے تو عام بول چال والی زبان کو ہندوستانی ہی کہتا ہے۔"

اُردو:

میر امن "باغ و بہار" کے مقدمے سے پہلے ایک عرضی میں لکھتے ہیں:-

سو اردو کی آراستہ کر زبان کیا میں نے بنگالہ ہندوستان

(ملاحظہ ہو "باغ و بہار" میں "عرضی میر امن دلی والے کی" ۱۸۵۱ء طبع لندن)

اُردو کی قطعی اور صحیح صحیح پیدائش کے متعلق کوئی بھی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم ان مختلف نظریوں کی چھان پھٹک کریں جو مشرق و مغرب کے ماہرین لسانیات نے پیش کئے ہیں۔ ہر چند کہ ان متضاد نظریات میں کسی ایک صحیح نظریے کا انتخاب ایک حوصلہ شکن کام دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس نہج پر چل کر ہم ایک ایسے نظریے کو ڈھونڈ جائیں گے جو ہمیں اردو کی پیدائش کے متعلق اگر مفصل نہیں تو کم از کم اتنا مواد ضرور فراہم کردے گا جس سے ہم مطمئن ہو سکیں۔

اردو کی پیدائش کے بارے میں یوں تو بہت سے نظریات پیش کئے جاتے ہیں لیکن میں اپنا دائرۂ بحث قرین قیاس نظریات تک ہی محدود رکھوں گا۔ اس ضمن میں ایک عام نظریہ تو یہی ہے کہ اردو کا آغاز مغلوں کے لشکری بازار سے ہوا۔ اس قیاس کی بنا لفظ اردو ہی ہے۔ اس نظریے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور لشکر گاہ کے معنی میں مستعمل ہے۔

یک شمہ بہ ایوان تو خورشید منور یک خیمہ در اُردوئے تو گردون معلیٰ

اگر ہم امیر علاؤالدین جوینی کی "تاریخ جہاں کشا" اور وزیر رشید الدین فضل اللہ کی "جامع التواریخ" کا مطالعہ کریں تو ہم پر یہ امر منکشف ہو جائے گا کہ زمانۂ چنگیز خاں میں شاہزادوں کی فرودگاہوں اور لشکر گاہوں کے لئے لفظ اُردو استعمال ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کا مستقر حکومت بھی اردو کہلاتا تھا۔ تاریخ جہانکشا جلد اول ص۲۱ اور جامع التواریخ جلد دوم ص ۸ سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ قراقرم کا قدیم نام اردو بالیغ تھا۔ جوجی خان ابن چنگیز خاں کے عہد میں دوران مہم شاہزادے زریں خیموں میں قیام کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی لشکر گاہوں کو "اردوئے مطلا" کہا جاتا تھا۔ اور وہ خود خوانین اُردوئے مطلا کے لقب سے شہرت پا گئے تھے (وضاحت کے لئے دیکھئے غیاث الدین خوندکی حبیب السیر جلد سوم جزو اول ص۳۱ طبع بمبئی ۱۲۷۳ھ)

سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں قاضی منہاج الدین جوزجانی نے مشہور تاریخ "طبقات ناصری" کے نام سے تصنیف کی جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل ہند مغلوں کی لشکر گاہوں کو اُردو کہا کرتے تھے۔

(ملاحظہ ہو طبقات ناصری ص۲۷ طبع کلکتہ)

شمس الدین عفیف نے اپنی مشہور کتاب تاریخ فیروز شاہی ۸۰۱ھ میں تصنیف کی۔ اس کے اس ایڈیشن میں جو کلکتہ میں طبع ہوا ص۵۳ پر لکھی ہوئی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فیروز شاہی لشکر کے لئے لفظ اردو استعمال ہوتا تھا۔

بابر نامہ طبع قازان ص۱۱۱ سے بھی یہی واضح ہے کہ شہنشاہ اکبر نے دہلی اور آگرہ کی فتح کے بعد جو فتح نامے جاری کئے ان میں اپنے لشکر کو اردوئے نصرت شعار کا لقب دیا تھا۔

محمد شریف معتمد خاں کی کتاب "اقبال نامۂ جہانگیری" جلد دوم ص۲۸ طبع کانپور اور طبقات اکبری ص۲۱۵ پر یہ رقم ہے کہ وہ مورخین جو عہد اکبر اور عہد جہانگیر سے تعلق رکھتے تھے، شاہی لشکر اور شاہی فرودگاہ کے لئے لفظ اردو استعمال کرتے تھے۔

بابری اور جہانگیری عہد میں مضروب سکوں پر دار الضرب کا نام اُردو مسکوک ہوا ہے۔ وائٹ ہیڈ کی تحقیق کے مطابق ۹۳۷ھ میں مضروب ہونے والے ایک سکے پر "ضرب اُردو" نقش ہے۔ (ملاحظہ ہو سکہ جات مغلیہ ص۲ از وائٹ ہیڈ مسماتک سپلمنٹ حصہ اول مضمون چہارم) مشمولہ رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۱۰ء نیز ملاحظہ ہو ایشیا کا ادبی اور تاریخی اٹلس از جے۔ ڈی بارتھلومیو ص۱۲۱ تا ص۱۲۵۔ طبع لندن)

ملا نظام الدین احمد بخشی کی کتاب "طبقات اکبری" ص۲۲۶، ص۳۱۰ (طبع لکھنؤ ۱۸۷۵ء) سے واضح ہے کہ اکبری عہد میں شاہی لشکر اور دار الحکومت کی لشکر گاہ کو اردوئے معلیٰ کہا کرتے تھے اور اس کا بازار اُردو بازار کہلاتا تھا۔

دریائے لطافت (طبع لکھنؤ ۱۹۲۰ء) میں سید انشاء اللہ خاں انشاؔ لکھتے ہیں کہ اردو عام طور پر مغلیہ اردو یعنی لشکرگاہوں میں بولی جاتی تھی۔ جس کے باعث اس کا نام زبان اردو یعنی اہل لشکر کی زبان شہرت پاگیا اور بعد میں کثرتِ استعمال سے لفظِ "زبان" حذف ہو گیا اور لوگ عام طور پر اردو کہنے لگے۔

خلاصۂ مندرجۂ بالا بیانات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ جس زبان کو ہم اس وقت اُردو کا نام دیتے ہیں، شروع شروع میں وہ ایک لشکری بولی تھی۔ لیکن تحقیق نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ وہ مسئلہ جواب غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اس نظریے کے حامی یہ کہنے میں کہاں تک درست ہیں کہ یہ ایک لشکری بولی تھی یہ گروہ اپنی دلیل کو منوانے کے لئے اولاً تو ترکی زبان کے لفظ اردو جس کے معنی لشکرگاہ کے ہیں پیش کرتا ہے۔ ثانیاً اُن کا یہ قول ہے کہ اردو ایک مخلوط بولی ہے، جو ایک طرف تو دیسی بھاشاؤں اور دوسری طرف مسلمانوں کی زبانوں (ترکی، عربی اور فارسی) کی آمیزش کا نتیجہ ہے دعوے کو وزن دار کرنے کے لئے ان کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ مغلوں کے لشکروں کی نوعیت بھی اسی قسم کی تھی کہ ان میں مختلف قوموں اور گروہوں کے لوگ شامل تھے اور لشکر میں اپنی اپنی بھاشا کے علاوہ آپس میں اظہارِ خیال کے لئے وہ ایک ایسی زبان استعمال کرتے تھے جسے سب لوگ سمجھ سکیں۔ یہی تھی وہ لشکری زبان جو بعد میں اردو کہلائی۔

تحقیق کی زد پر آکر یہ دعویٰ اس طرح ٹوٹتا ہے کہ جس بنا پر یعنی لفظ اردو پر یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے، اس کی تصدیق تاریخ سے بالکل نہیں ہوتی۔ دراصل اُردو کو یہ نام مغلوں کے زمانے میں نہیں ملا تھا، بلکہ اس کا استعمال ہمیں سب سے پہلے اٹھارویں صدی عیسوی کے کہیں وسط میں جاکر ملتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے زبانِ اُردوئے معلّیٰ کی ترکیب استعمال کی، وہ میر تقی میرؔ ہے بعد ازاں محمد قیام الدین قائمؔ اپنے تذکرے "مخزنِ نکات" میں "محاورۂ اردوئے معلّیٰ" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کے فرزند میر کلو عرشؔ نے بھی اُردوئے معلّیٰ کی ترکیب استعمال کی ہے ؎

ہم ہیں اُردوئے معلّیٰ کے زباں داں اے عرشؔ　　　مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اُس وقت تک لفظِ اردو، زبان اُردو کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ تراکیب کے ساتھ مستعمل تھا۔ مثلاً زبان اردوئے معلّیٰ اور محاورۂ اُردوئے معلّیٰ وغیرہ۔

یہ ترکیبیں اٹھارویں صدی عیسوی کے آخیر تک استعمال ہوتی رہیں۔ اُردو شعرا میں مصحفیؔ پہلے شخص ہیں جن کے یہاں اردو کا لفظ اس اکہری شکل میں ملتا ہے ؎

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میرؔ و مرزاؔ کی　　　کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفیؔ اُردو ہماری ہے

جان گلکرسٹ کی تحقیق کے مطابق مذکورۂ بالا شعر سنہ ۱۷۹۱ء میں کہا گیا ہے۔ خود موصوف کے یہاں بھی لفظ اُردو اس اکہری شکل میں کئی جگہ ملتا ہے۔

دوسری دلیل، کہ "اُردو ایک ملی جلی بولی ہے اور لشکر میں مختلف گروہوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے" تحقیق کے سامنے دم توڑ دیتی ہے۔ اوّل تو یہی کہنا کہ اس کا تعلق صرف لشکر تک محدود تھا ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ دوم زبانوں کے بننے کا ہرگز یہ نظام نہیں، لسانی انقلابات یونہی وقوع پذیر نہیں ہو جایا کرتے اور ان کا دائرۂ عمل ہرگز کسی خاص گروہ یا کسی خاص مقام تک محدود نہیں رہا کرتا۔ چلئے اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اُردو بعض گروہوں کے میل ملاپ کا نتیجہ ہے تو اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ میل جول صدیوں تک جاری رہا ہوگا۔

تب کہیں اس نے ایک زبان کی شکل اختیار کی ہوگی، اور یہ خیال بھی کہ دیسی اور بدیسی بھاشاؤں کا ملاپ دورِ مغلیہ میں شروع ہوا، عدم علمیت کی دلیل ہے۔

اب میں مورخین و ماہرین لسانیات کے ان بیانات کی طرف آتا ہوں جو اردو سے متعلق ہیں۔ میر امّن دہلوی نے "باغ و بہار" (تالیف ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۱ء) کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال و جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔"
(مقدمہ "باغ و بہار" ص۷ طبع لندن ۱۸۵۱ء)

ظہیر الانشا کے مصنف کا قول ہے:

"ہرگاہ سریر سلطنت از جہانگیر متجاوز شدہ نوبت شاہجہاں بادشاہ رسید۔ اینجا کہ بسبب مصاحبت و معاشرت علمائے دین فی الجملہ خودداری تشرع غالب بود۔ این زبان ریختہ معجون مرکب بسبب آمد و رفت تاجران ہر دیار در بازار بضرورت خرید و فروخت و معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شد تا زبان یکے بفہم دیگرے درآید۔"
(منقول از جلوۂ خضر)

امام بخش صہبائی "رسالہ قواعد اردو" میں فرماتے ہیں:
"شاہجہاں آباد تیمور یہ خاندان کے شاہجہاں نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرت استعمال کے سبب تبدل و تغیر واقع ہوا۔ اور اس خلا ملا سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔"
(ماخوذ از خزینۃ العلوم)

آثار الصنادید (تالیف ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۴ء) کے آخیر پر سر سید احمد خاں صاحب رقم کرتے ہیں۔ "اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر و تبدیلی نہیں ہوئی تھی مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کرتے تھے۔ پھر جب امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں کے ہی زمانے سے یعنی حضرت مسیح کی تیرھویں صدی میں فارسی میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کئے تھے اور کچھ پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہی تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جاوے۔

"جب کہ شاہجہاں بادشاہ نے (۱۰۵۸ھ م ۱۶۴۸ء) میں شہر شاہجہاں آباد، آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بسبب کثرتِ استعمال کے تغیر و تبدیلی ہو گئی۔ غرضیکہ لشکر بادشاہی اور اردوئے معلی میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی اور اسی سبب سے زبان کا نام اردوئے معلی ہوا پھر کثرتِ استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی ہوتی گئی یہاں تک کہ تخمیناً (۱۱۰۰ھ م ۱۶۸۸ء) میں، یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔"

(ملاحظہ ہو آثار الصنادید حصہ سوم ص۱۰۴ و ص۱۰۵ طبع کانپور ۱۹۰۴ء)

مولوی عبدالغفور خاں نساخ اپنے رسالے "تحقیقِ زبانِ ریختہ" (تالیف ۱۲۷۵ھ) میں لکھتے ہیں "زبان اردو بوذرقہ شہرِ دہلی کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں قدیم الایام سے برابر زبانِ ہندی مروّج تھی۔ ہر شخص اسی زبان میں کلام کرتا تھا۔ جب ۵۸۸ھ میں سلطان معزالدین مشہور بہ شہاب الدین محمد غوری نے ملکِ ہند پر چڑھائی کی، اہلِ ہند کو شکست دی، رائے پتھورا کا کام تمام کیا، تمام ملکِ ہند سلاطین غور کے قبضۂ اختیار میں آیا، رفتہ رفتہ زبانِ قدیم میں لفظ فارسی، عربی، ترکی ملتا گیا۔ جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو باشندگانِ دہلی پر یہ ایک تازہ ظلم کیا کہ ان کو شہر میں رہنے نہ دیا۔ دیو گیر معروف بہ دولت آباد میں بھیج دیا اور پھر قبل اپنی سلطنت کے زوال کے ان لوگوں کو دہلی میں بلالیا۔ اس نقل و حرکت کے باعث بہت سے الفاظ دکنی بھی زبانِ دہلی میں مل گئے۔ یہی انداز گفتگو آخر عہد جہانگیر بادشاہ تک رہا لیکن شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۵۸ء میں شاہجہاں آباد آباد کیا تو شاہجہاں آباد میں اطراف و جوانب سے عالم، ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ مجتمع ہوئے، قدیم ہندی متروک ہونے لگی، محاورے میں فرق ہونے لگا، زبان اردو کی ترقی شروع ہوئی۔" (دیکھئے رسالہ تحقیق زبان ریختہ ص ۳۰ طبع لکھنؤ ۱۸۹۵ء)

مسٹر بیمس اپنی گرامر (جدید ہندوستانی آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد) میں لکھتے ہیں کہ "فتح ہندوستان کے بعد عرصۂ دراز تک مسلمانوں نے فارسی کو اور ہندوؤں نے ہندی کو محفوظ رکھا۔ مسلمان مدت تک فصیح ہندی بولنے کے عادی تھے اور انہوں نے ہندی میں فارسی الفاظ کو نہیں ملایا تھا۔ اکبر (۹۶۳ھ۔ ۱۵۵۶ء) کے زمانے میں جب راجہ ٹوڈرمل نے طریقِ مالگذاری کو رواج دیا تو ہندو فارسی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس زمانے سے ہندی میں فارسی الفاظ کی آمیزش شروع ہوئی اور اس طرح یہ ایک جدید زبان اردو کی بنیاد پڑی۔" (ملاحظہ ہو مذکورہ بالا گرامر کا صفحہ ۱۵ طبع لندن ۱۸۷۲ء)

اردو کے مشہور سرپرست ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ہندوستانی فلالوجی (ہندوستانی لسانیات) میں ایک مسلمان مورخ کی سند پر لکھا ہے کہ "جب تیمور (۸۰۰ھ۔ ۱۳۹۸ء) نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت سے اردو کی بنیاد قائم ہوئی۔" (دیکھئے ہندوستانی فلالوجی مولفہ ڈاکٹر گلکرسٹ طبع لندن ۱۸۱۰ء)

مشہور مستشرق کولبروک کی رائے میں "پندرھویں صدی عیسوی کے آخیر ایام سے برج بھاشا میں تغیر شروع ہوا، اور اس نے ترقی پاکر ایک جدید زبان (اردو) کی صورت اختیار کرلی۔" (ملاحظہ ہو ایشیاٹک ریسرچز جلد ہفتم ص ۲۲۱)

ڈاکٹر ونیٹرنز (جس نے جرمن زبان میں "تاریخ ادبیات ہندوستان" لکھی ہے) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "بارھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے ہندوستان پر تسلط حاصل کیا تو عربی و فارسی الفاظ برج بھاشا میں ملنے لگے اور اس تغیر کے بعد سولھویں صدی عیسوی تک ایک نئی زبان (اردو) پیدا ہوگئی۔" (دیکھئے تاریخ ادبیات ہندوستان ص ۱۳۹ طبع لیپزگ ۱۹۰۸ء)

ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن اپنی کتاب (ہسٹری آف انڈیا) میں لکھتا ہے کہ "آلِ سبکتگین کے زمانے میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے گہرے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ میل جول اور تبادلۂ خیالات کی وجہ سے ہندی زبان میں تغیر شروع ہوگیا تھا اور اسی زمانے سے ایک جدید زبان کی بنیاد قائم ہوئی اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے سالویں صدی ہجری تک اس نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کرلی۔" (ملاحظہ ہو ہسٹری آف انڈیا از ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن ص ۲۴۵ طبع لندن ۱۹۰۵ء)

ڈاکٹر فیلن اپنی کتاب طبقات الشعرا میں لکھتا ہے کہ "گیارھویں صدی عیسوی کے قبل تمام ہندوستان میں ویدک زبان کے خلاف ایک اور زبان مروج تھی اور راجپوت کے عہد حکومت میں بھاشا کو عروج شروع ہوا۔ ہنوز بھاشا نشوونما کی ابتدائی حالت ہی میں تھی اور اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ محمود غزنوی نے ہند پر متواتر حملے شروع کردیئے حتیٰ کہ بارھویں صدی میں ہندوستان

میں اپنی حکومت قائم کرلی اور اقتضائے وقت کے بموجب ان دو اجنبی قوموں کے درمیان بات چیت، لین دین، خرید و فروخت اور دوسرے معاملات کے افہام و تفہیم کے لئے ایک جدید اور مرکب زبان کی بنیاد پڑی۔ تیمور کی فتوحات سے اسے ترقی اور استحکام ہوا۔ لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی زبان اس وقت تک فارسی تھی اور جس طرح آج کل انگریزی دانی کے بغیر معاملات زندگی ادھورے اور بے لطف رہ جاتے ہیں اس ابتدائی زمانے میں بھی کیفیت ہندوؤں کی تھی یعنی بطور قاعدہ کے مفتوح کو ضرورتاً فاتح قوم کی زبان سیکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں نے فارسی سیکھنے میں کوشش کی اور اردو جس کا بیج محض زمین میں دبایا گیا تھا اب اس نے چند فٹ کا قد حاصل کیا۔" (دیکھئے بحوالہ دکن میں اردو مولفہ نصیر الدین ہاشمی ص۵ طبع دکن ۱۳۴۴ھ)

اردو زبان سے متعلق لسانی پہلوؤں پر لکھنے والوں کا سب سے بڑا مواد سر جارج گریرسن کا ہندوستان کا لسانی جائزہ (لینگوئسٹک سروے آف انڈیا) ہے۔ اس کتاب کی بہت سی معلومات اور نتائج اب دقیانوسی ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ربع صدی میں ہندوستان اور یورپ دونوں جگہوں کے ماہرین لسانیات نے اس موضوع سے متعلق ایسی اہم تحقیقات کی ہیں کہ اردو کے بارے میں خاص طور پر گریرسن کے بہت سے نظریئے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز (ادارہ معارف شرقیہ) کے اساتذہ آر سائل ٹرنر (پروفیسر ہند آریائی لسانیات) اور ڈاکٹر ٹی۔ جی۔ بیلی (صدر شعبۂ اردو ہندی) کی تحقیقات اور کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ متفرق مضامین کے علاوہ اول الذکر کا مقدمۂ "لغت نیپالی" اور موخر الذکر کی کتاب آوٹ لائن آف اردو لٹریچر (اردو ادب کا خاکہ) سے اس موضوع پر جدید ترین نقطۂ نظر سے روشنی پڑتی ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر ویبر اور پروفیسر جولیس بلوک، جامعۂ کلکتہ کے پروفیسر سینتی کمار چٹرجی کے مضامین اور تحقیقات نے بھی گریرسن کے بہت سے نظریوں کو غلط ثابت کر دیا ہے، خصوصاً پروفیسر چٹرجی کا "مقدمۂ آغاز و ارتقاءِ بنگالی"، اردو کے آغاز و ارتقاء کی نسبت معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

اب میں وہ نظریات پیش کرتا ہوں جنہیں ہم خالص جدید اور کسی حد تک سائنٹفک کہہ سکتے ہیں۔

عبد المالک آروی مرحوم لکھتے ہیں کہ۔ "صدیوں کی اسلامی حکومت، عربی و فارسی قبائل کی ہجرت، اخلاق معاشرت کی تقلید اور اختلاط نے عربی، فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے ایک چوتھی زبان تیار کی جسے ہندوستانی کہئے یا اردو۔ لفظِ اردو بذاتِ خود دورِ ارتقاء ہی کی پیداوار ہے، یہ نہ عربی ہے نہ فارسی، اردو جس قوم کی زبان کا لفظ ہے، وہ اسلامی مبلغ بن کر نہیں آئی تھی، بلکہ ملک گیری کی ہوس پیمائیوں، اور استعماری دست درازیوں نے اس کو ہندوستان میں بھیجا، اس قوم کے داخلے کے قبل مسلمانوں کی حکومت یہاں قائم ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ اگر مسلمان اشاعت دین کے سلسلے میں ہندوستان میں آباد نہ ہوتے تو بھی مغلوں کا حملہ ہوتا۔ اس صورت سے لفظِ اردو کا بھاشا میں داخل ہونا ضروری تھا، اس لئے نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ "اردو" کشمکشِ حیات کا ایک اثر باقی ہے، لہٰذا اس کو صرف مسلمانوں کی لغات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں۔

(مضامین مالک مرتبہ عبد المالک آروی ص ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷ طبع آرہ ہند ۱۹۴۴ء)

اردو زبان کے فدائی جناب برجموہن دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں کہ " فتح نارمن کا اور اس اثر کا جو اس تاریخی واقعے نے انگلستان کے ادب اور زبان پر ڈالا، انگریزی زبان کی تاریخ میں بہت ذکر آتا ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ان واقعات کا تذکرہ ہے جو اردو کی پیدائش کا باعث ہوئے۔ محمود غزنوی اور اس کے پہلے اور نیز بعد کے تاریخی سوانح سے قطع نظر

جو مسلمان فاتح ۱۱۹۱ء میں اور اس کے بعد آئے وہ ہندوستان ہی میں رہ پڑے۔ قبیلے اور حسب و نسب کے لحاظ سے وہ کچھ ہی ہوں لیکن کلچر اور تہذیب کے لحاظ سے وہ آرین تھے یا زیادہ محتاط رہ کر کہیئے تو وہ ایران کی شائستگی اور تمدن و معاشرت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ایرانی اسی تنے کی ایک شاخ تھے جس کی دوسری شاخ آرین تھے۔ اس کلچر کی یگانگی نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاتح اور مفتوح کی مغائرت کو محو کر دیا۔ جب دو قوموں کو ایک ملک میں رہنا ہوا تو معاشرتی اور لسانیاتی لین دین اس کے بغیر نا ممکن تھا، چنانچہ ضرورت نے ایک نئی زبان (اردو) کو جنم دیا۔" (دیکھئے "کیفیہ" از برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی ص۱۳ طبع دہلی ۱۹۴۲ء)

کشن پرشاد کول نے اپنی کتاب "ادبی اور قومی تذکرے" کی پہلی جلد میں لکھا ہے کہ "آٹھویں صدی عیسوی سے یہ پراکرتیں (پالی۔ مگدھی۔ اردھ مگدھی اور سورسینی) علم و ادب کے خزانوں سے خالی ہو کر جنتا کی بگڑی ہوئی بولیاں رہ گئیں اور انہیں اپ بھرنش سے موجودہ ہندوستان کی وہ تمام زبانیں نکلیں ہیں جو آج بنگالی، مرہٹی، پنجابی گجراتی اور ہندی، اردو یا ہندوستانی کے ناموں سے مشہور ہیں۔ ہندوستان کے مدھیہ دیش کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے، ایک پوربی اور دوسرا پچھمی۔ پوربی حصہ یعنی اودھ اور بہار میں اودھی، میتھلی اور بھوج پوری بولیاں رائج تھیں جو اردھ مگدھی اپ بھرنش سے نکلی تھیں لیکن ہندی، اردو یا ہندوستانی کی بحث میں ہمیں سورسینی اپ بھرنش سے واسطہ پڑتا ہے کیونکہ اتر کھنڈ کے اس پچھمی حصے میں جو بولیاں بولی جاتی تھیں وہ سب سورسینی اپ بھرنش سے ہی نکلی تھیں یعنی ستلج پار، پوربی پنجاب میں پنجابی کا رواج تھا۔ ستلج کے کنارے سے لے کر روہیلکھنڈ تک یعنی دلی اور میرٹھ کے ارد گرد کھڑی بولی اور آگرہ، متھرا بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی برج بھاشا بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور یہاں آکر بسنے لگے تو ان کو پہلے پنجابی اور بالآخر کھڑی بولی سے سابقہ پڑا۔ لشکر اور ہاٹ بازاروں میں آئے دن کی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے انہیں کھڑی بولی سے ہی کام لینا پڑا۔ اس میل جول کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کھڑی بولی میں فارسی اور عربی کے لفظ داخل ہونے لگے۔ یہ کیفیت صدیوں اور جگوں تک جاری رہی اور ایک کھڑی زبان پیدا ہوگئی جس نے اردو یا ہندوستانی کا نام پایا۔" (ملاحظہ ہو "ادبی اور قومی تذکرے جلد اول" از کشن پرشاد کول ص۴۷، ص۴۸ طبع علیگڑھ ۱۹۵۱ء)

ایک سوال جو تشریح طلب دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کونسا علاقہ تھا جہاں اردو نے جنم لیا اور وہ کونسی بھاشا تھی جس نے عربی و فارسی وغیرہ سے مل کر اسے جنم دیا۔ اس سوال کی وضاحت کے لئے ہمیں حبیب الرحمن خاں شیروانی کے مضمون "اردو پر اجمالی نظر" میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ "اندرونی اور بیرونی بولیوں کا سب سے پہلا سنگم سندھ علاقہ ہے جہاں عرب ۷۱۲ء میں آئے۔ ان کی زبان عربی تھی اس لئے اس زبان کا رواج ان کے عہد میں ہوا، اور یہ زبان سندھی کے دوش بدوش زبانوں پر رواں ہوئی۔"

سید سلیمان ندوی اپنے ایک مضمون جو "ہندوستانی" (ایک سہ ماہی رسالہ تھا) میں چھپا، لکھتے ہیں: "معاملات تجارتی کی بنا پر ماننا پڑے گا کہ عربی، فارسی کا میل جول بھاشاؤں کے ساتھ ہندوستان کے جس حصے میں پہلے ہوا وہ سندھ ہے جس کی حد اس زمانے میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ایران، ترکستان اور افغانستان سے ہندوستان آنے کا راستہ یہی تھا۔" ایک اور جگہ موصوف کا بیان ہے "مسلمانوں کی عربی، فارسی سب سے پہلے

ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے۔ اس کے بعد پنجابی اور پھر اس کے بعد دہلوی"۔
سید صاحب کے نظریے کا بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جو نتیجہ انہوں نے اپنے مضمون میں مختلف دلائل سے کر نکالا ہے وہ بظاہر مضبوط معلوم ہونے کے باوجود لسانی بنیادوں پر قائم نہیں۔ یہ درست ہے کہ مسلمان سب سے پہلے فاتح کی حیثیت سے سندھ میں آئے لیکن جس وقت وہ سندھ میں آئے ہیں، ان کی تعداد بہت مختصر تھی۔ اس لئے یہ قیاس کرنا درست نہیں کہ ان کے تہذیبی اثرات نے زیادہ وسیع پیمانے پر لوگوں کو متاثر کیا ہو اور اسی بنا پر سندھی میں عربی الفاظ کی آمیزش کا اثر زیادہ نظر نہیں آتا بلکہ چند الفاظ تک محدود ہے۔ دوسرے سندھی کا تعلق آریائی خاندان سے ہے اور عربی کا رشتہ سامی خاندان سے۔ دونوں کے مزاج اور ساخت کے اصول بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا ان کا اس قدر گھل مل جانا کہ ایک نئی زبان پیدا ہو جائے، قطعاً غلط معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے اگر کسی زبان میں فارسی و عربی الفاظ کی موجودگی کی بنا پر اس کو عربی سے ماخوذ بتایا جائے تو پھر پشتو، مرہٹی، بلوچی اور گجراتی زبان کے متعلق ہم کیا کہیں گے جن میں کہ بہت سے الفاظ خالص عربی کے ہیں۔ اور پھر سید صاحب کا یہ کہنا کہ "عربی اور سندھی کا رسم الخط ایک ہی جیسا ہے" تو جہاں تک اس شہادت اور دلیل کا تعلق ہے وہ اس لئے کمزور ہے کہ آج سے ساڑھے بارہ سو برس پہلے سندھی کا جو رسم الخط تھا، وہ آج کے رسم الخط سے مختلف تھا۔ اور اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے موجودہ رسم الخط بہت بعد میں اختیار کیا اور یہ رسم الخط سندھی کے علاوہ بلوچی اور پشتو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پھر سید صاحب نے اپنے مضمون میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ "مسلمان سیاحوں کے سفرنامے اس مطلب کی تائید کرتے ہیں۔ ان سیاحوں میں ابن حوقل اور اصطخری خاص طور پر قابل ذکر اور اہم ہیں" جن سیاحوں کا ذکر سید صاحب نے کیا ہے وہ چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں یہاں آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے ساڑھے تین سو سال بعد کے حالات ہیں۔

اس ضمن میں دوسرا مشہور نظریہ وہ ہے جس میں اردو کا سب سے قریبی تعلق پنجابی سے بتایا گیا ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ پنجاب اردو کا پہلا مولد اور مسکن ہے۔ یہ نظریہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ جو بات شیرانی صاحب نے بڑی تفصیل سے پیش کی ہے، اس سے ملتی جلتی بات سر جارج گریرسن نے اپنی کتاب "لینگوئسٹک سروے آف انڈیا" میں شیرانی صاحب سے بہت پہلے کہی تھی۔ چنانچہ شیرانی صاحب نے اپنی بحث کی ابتدا گریرسن ہی کے قول سے کی ہے، اور اس کے بعد اپنے خیال کی وضاحت کے لئے بہت سے دلائل پیش کئے ہیں۔ ان دلائل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ نظریہ اس حد تک تو بالکل ٹھیک ہے کہ پنجابی اور اردوئے قدیم میں بعض حیثیتوں سے بڑی مماثلت ہے۔ لیکن محض اس مماثلت کی بنا پر پنجابی کی قدیم شکل کو اردو کا ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس مماثلت کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں زبانوں کا ماخذ ایک ہی ہو اور ان میں صرف ترقی کے مختلف مدارج اور مراحل کا فرق ہو۔ اور وہ چیزیں جو شیرانی صاحب نے اردوئے قدیم اور پنجابی میں مشترک بتائی ہیں بلکہ کسی قدر یہ خصوصیات راجستھانی میں بھی موجود ہیں۔ اس مماثلت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ خصوصیات پنجابی، دکنی، گجراتی اور راجستھانی کی خصوصیات نہیں ہیں بلکہ اس بولی کی خصوصیات ہیں جو ان چاروں زبانوں کی

ماخذ ہے، اور یہ وہ اَپ بھرنش ہے جو شمالی ہند میں روزمرہ کی حیثیت سے رائج تھی اور جسے عام طور سے دیس بھاشا کا نام دیا جاتا تھا۔ وہی مقامی بولی یا دیس بھاشا اس مماثلت کی بنیاد ہے۔ علاوہ ازیں شیرانی صاحب کا یہ کہنا کہ "اردو کی ابتدا غلاموں کے عہد میں پنجابی مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد ہوئی" تحقیق پر پورا نہیں اترتا۔ (ماخوذ از "اردو لسانیات پر ایک لیکچر" از استاذِ مکرم پروفیسر حافظ سید وقار عظیم صاحب)

گریرسن کی طرح بلکہ موصوف کے اثر کے تحت بعض جدید یورپین مستشرقین نے بھی پنجابی اور اردو کے اسی تعلق پر زور دیا ہے۔ انھی کے مصنفین میں ڈاکٹر بیلی لکھتے ہیں "لاہور اس زبان (اُردو) کی جائے پیدائش اور پنجابی اس کی ماں ہے"۔

یورپین مصنفوں کے علاوہ بعض ہندوستانی مورخوں نے بھی کچھ اس طرح کی باتیں کہی ہیں۔ جنہیں پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے اس لئے کہ اس چیز کو نظر انداز کر کے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو (طبع لکھنؤ، ۱۹۵۰ء) میں لکھتے ہیں۔ "حقیقت یہ ہے کہ زبان اردو اس ہندی بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق بالواسطہ سورسینی پراکرت سے تھا یہ بھاشا جسے مغربی ہندی کہنا چاہیئے زبان اُردو کی اصل اور ماں سمجھی جاتی ہے"۔

اُردو کے ماہر لسانیات و تاتریہ کیفی بھی اسی خیال سے متفق ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "اردو، ہندوستانی یا کھڑی بولی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ بولی میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی"۔

حکیم سید شمس اللہ قادری رسالہ "تاریخ اردو" (نوائے قدیم نمبر) میں یوں گویا ہیں "مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی، فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی"۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب اپنے مضمون "اردو کے آغاز اور ماخذ کے متعلق بعض اہم غلط فہمیاں" میں تحریر کرتے ہیں: "اردو اصل میں اس وسیع زبان سے مشتق ہے جو جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت اس حصہ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ لیکن اس بیان سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف دو آبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی۔ کیونکہ جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبان میں بہت کم فرق تھا۔ ان کے اس وقت کے اختلافات ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اب تک پتہ چلا ہے۔ یہ واقعہ دراصل مسلمانوں کی آمد بلکہ بارھویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں نے ان اختلافات کی پرورش کرنی شروع کی جو آج انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ ظاہر کرتی ہیں۔ عہد حاضر میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک وقت سے پنجاب اور نواحِ دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔ یہ ضرور ہے کہ یہ فرق مسلمانوں کے قبضۂ دہلی کے بعد سے شروع ہوا ہے ابتدا میں صرف ایک تدریجی تغیر ہوگا مگر آخر کار ان دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہوتی گئی کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری برج بھاشا اور کھڑی بولی۔ اردو نہ تو پنجابی سے اور نہ ہندی یا کھڑی بولی سے بلکہ اسی زبان سے جو ان دونوں کا سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض امور میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی بولی سے لیکن مسلمانوں کے صدر مرکز صدیوں تک دہلی و آگرہ ہی رہے اس لئے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔ چنانچہ اردو پر کھڑی بولی یا ہریانی زبان کا ہی قابل لحاظ اثر ہے"۔ (ملاحظہ ہو ڈاکٹر زور صاحب کا مضمون "اردو کے آغاز اور ماخذ کے متعلق بعض اہم غلط فہمیاں" رسالہ شاہکار لاہور ۱۹۳۲ء)

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر وولنر کے علاوہ حافظ شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں، ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "تاریخ زبان اردو" میں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "اردو زبان کا ارتقاء" میں اچھی خاصی محنت اور کاوش سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اردو اپنی صرفی اور نحوی خصوصیات کے لحاظ سے سورسینی پراکرت یا اپ بھرنش سے مختلف ہے۔ مگر شاید ان سے یہ سہو ہو گیا کہ پراکرت پرکاش (طبع لندن ۱۸۶۸ ہو فصل اول، دوم کی رو سے ورار وچی کی گرامر کے مطابق زبان اردو کا منبع و مخرج بھاشا ہے جس کی تائید تیرہ، چودہ، پندرہ اور اسی قبیل کے اور بہت سے الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں، کرتے ہیں۔ اور اس کا اصلی ڈھانچہ متھرا اور نواح متھرا کا روزمرہ ہے جو برج بھاشا کی اصل ٹکسال ہے۔ (وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ زبان اردو" یعنی اردوئے قدیم، مرتبہ حکیم سید شمس اللہ قادری صہ ۶۔ ۷، طبع لکھنؤ ۱۹۲۵ء)

منشی شیو پرشاد نے "جام جہاں نما" (جلد ا صہ ۹۲۔ نولکشور لکھنؤ ۱۸۵۹ء) میں لکھا ہے "زبان اس ملک میں اب اردو مقدم گنی جاتی ہے۔ مگر یہ صرف تھوڑے ہی دنوں سے جاری ہوئی ہے اردو کے معنی لشکر ہیں۔ جب ترک، افغان اور مغلوں کی ہندوستان میں بادشاہت ہوئی اور ان کے آدمی یہاں لشکر کے درمیان بازاریوں کے ساتھ ہر وقت خرید و فروخت میں بولنے چالنے لگے تو ان کی عربی، فارسی اور ترکی ان لوگوں کی ہندی کے ساتھ مل کر یہ ایک جدا بولی بن گئی اور اس کا نکاس اردو یعنی بازار سے ہونے کے باعث نام بھی اس کا اردو رکھا گیا"۔

مرزا نثار علی بیگ (مدرس اول آگرہ کالج) نے اپنی کتاب "رسالہ قواعد اردو" (حصہ سوم صہ ا۔۳۔ نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۹ء) میں ماہیت زبان کے تحت لکھا ہے۔ "اردو کے معنی پادشاہی لشکر کے ہیں۔ چنانچہ تواریخ کی کتابوں میں پادشاہی فوج کو اردوئے معلیٰ لکھا ہے۔ جب سلاطین تیموریہ نے ہندوستان میں قیام کیا اور دہلی کو اپنا دار الخلافہ بنایا تو لشکر کے آدمی اور بادشاہی متوسل، جو ایران اور توران اور مختلف ملکوں کے رہنے والے تھے، سودا سلف خریدنے میں، دہلی کے بازاریوں کے ساتھ جن کی زبان ہندی بھاشا تھی، فارسی ہندی آمیز بولنے لگے۔ رفتہ رفتہ شاہ جہاں کے عہد تک ہر ایک بولی خلط ملط ہو کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی اور اس کا نام اردوئے معلیٰ سے منسوب ہو کر زبانِ اردو پڑ گیا، اور کثرتِ استعمال سے لفظ زبان اڑ کر صرف اس زبان کا نام "اردو" رہ گیا۔۔۔ اردو زبان لغاتِ ہندی، فارسی اور عربی، ترکی، سنسکرت وغیرہ سے مرکب ہے اور جب سے عملداری سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر کی ہندوستان میں آئی، تب سے صاحبان عالیشان حکام زماں کے الفاظ سے اس نے ایک عجیب رونق پائی۔ بلکہ اکثر کچہریوں میں ہر طرح کے کاغذات مقدمات دیوانی اور کلکٹری اور فوجداری وغیرہ اردو زبان میں لکھے جاتے اور اردو محاورے میں اب لغات انگریزی بھی مثل لغاتِ فارسی اور عربی کے شامل ہوتے جاتے ہیں"۔۔۔ اس بیان میں بھی میر امن کی رائے کا اعادہ ہے اور بس!

کرنل راورٹی صاحب "پشتو انگریزی لغت" کے دیباچے میں اردو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ حقیقت ہے کہ پشتو زبان میں بہت سے لفظ ایسے ملتے ہیں جو اردو میں بھی نظر آتے ہیں۔ مگر جبکہ ان سب کا واضح طور پر سنسکرت میں سراغ نہیں ملتا۔ میں کم از کم اس وقت تک کہ انہیں کسی اور اصلی زبان کا ثابت کیا جائے، خالص پشتو اصطلاحیں سمجھنے کی طرف مائل ہوں، جو بالکل اسی طرح ریختہ میں شامل ہو کر گھل مل گئے ہیں۔ جیسے سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ بلکہ پرتگالی اور ملیالم کے لفظ"۔

جناب امتیاز علی عرشی اپنی کتاب (اردو اور افغان طبع پشاور ۱۹۶۰ء) میں اردو اور پشتو کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"چونکہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تیموری مغلوں کی آمدِ ہندوستان سے پہلے اس زبان میں، جو آگے چل کر اردو کہلائی، نثر اور نظم ہر قسم کی تالیفات معرضِ وجود میں آ چکی تھیں، اس لئے راورٹی کے اردو کی عمر کے تخمینے کو میں نہیں مانتا۔ لیکن میری نظر میں ان کا بنیادی خیال نہ صرف ناقابلِ تردید ہے بلکہ جیسا کہ میں اس مقالے کی تمہید میں از روئے حقائق تاریخی بیان کر چکا ہوں، متقاضی ہے کہ اس ایک قدم اور آگے بڑھا جائے۔ چنانچہ میں یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کی پیدائش کا سب سے بڑا سبب ہندوستان میں افغانیوں کی آمد تھی، اور اس نئی زبان میں عام طور پر بولے جانے والے عربی، فارسی، ترکی اور مغلی الفاظ کا بڑا حصہ بھی افغانیوں ہی کی زبان اور انہی کی وساطت سے داخل ہوا ہے"۔ (اردو اور افغان صہ ۱۲)

ہر چند کہ عرشی صاحب نے اپنے اس نئے نظریئے کو ٹھوس بنانے کے لئے چند تاریخی دلائل بھی دیئے ہیں اور واقعی ان میں کچھ منطقی اور تاریخی تسلسل بھی ہے لیکن یہ کہنا کہ "اردو زبان کی پیدائش کا سب سے بڑا سبب ہندوستان میں افغانوں کی آمد تھی" ایک ماہر لسانیات کو قائل کرنے کے لئے کافی نہیں جبکہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی جیسی باتیں ہمارے سامنے ہیں۔ جہاں تک اس چیز کا سوال ہے کہ پشتو اردو کا سبب بن مانا جا سکتا ہے لیکن اس کی حیثیت ذیلی ہے شکر اتنی شدید جتنی عرشی صاحب نے ازراہِ انسیت پیش کی ہے۔

اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریوں کے سلسلے میں مختلف مورخوں نے جو باتیں کہی ہیں اور جن کا حوالہ مندرجہ بالا سطور میں دیا گیا ہے، ان میں یوں تو بہت سی چیزیں تشنہ ہوں گی مگر بہتر ہوگا اگر کھڑی بولی کے متعلق کچھ بحث کی جائے اور پھر یہ بتایا جائے کہ اردو اور کھڑی بولی کا کتنا قریبی رشتہ ہے۔

سنیتی کمار چیٹر جی نے لکھا ہے کہ "چونکہ کھڑی بولی کا تعلق مسلمان بادشاہوں کے دربار سے ہو گیا تھا اس لئے اسے کھڑی بولی کہا گیا۔ اس علاقہ کی دوسری زبانیں یعنی برج بھاشا وغیرہ پڑی بولیاں کہی جاتی تھیں۔ مگر یہ محض قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ برج بھاشا کی نرم بولی کے مقابلہ میں لوگوں نے اسے (لہجہ اور آوازوں کی درشتی کے لحاظ سے) کھڑی یا کھری بولی کہا ہو یا ایرانیوں نے یہ نام دیا ہو۔ بہرحال کھڑی بولی دہلی اور مغربی یو۔پی کے عوام کی بولی تھی جو نئے لسانی عناصر جذب کر کے بہت اہمیت اختیار کر گئی۔ یہ سب کچھ فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش کا نتیجہ تھا۔

فارسی بولنے والے مسلمانوں نے پہلے پہل پنجاب میں سکونت اختیار کی اور یقیناً انہوں نے پنجابی بولی اختیار کی ہوگی جسے امیر خسرو نے لاہوری اور ابوالفضل نے ملتانی کہا ہے اور جب وہ دہلی کی طرف بڑھے تو انہیں پنجابی سے کسی قدر ملتی جلتی نئی بولیوں سے سابقہ پڑا۔ یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ دو سو سال کی مدت زبان بننے کے لئے کافی نہیں ہوتی لیکن ایک مخلوط زبان کے خط و خال ضرور ابھر سکتے ہیں چنانچہ ابتدائی اردو (یا مخلوط زبان) میں پنجابی کی کافی آمیزش نظر آتی ہے، لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ خود پنجابی اور بالخصوص مشرقی پنجابی اسی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی تھی جس سے مغربی یو۔پی کی بولیاں، اس لئے ان میں فرق ہونے کے باوجود بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ دہلی ایک ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں کئی زبانیں ملتی تھیں۔ پنجابی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا سب اسی علاقے سے قریب تھیں۔ برج بھاشا عام طور سے ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی گو اس کے ادب کا پتہ بہت بعد میں چلتا ہے۔ گریرسن نے البتہ لکھا ہے کہ پرتھی راج راسو قدیم برج بھاشا میں لکھی گئی لیکن یہ عام خیال نہیں ہے۔ شروع میں مسلمان اس ادبی زبان کے بجائے بولیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ تھیں پنجابی، ہریانی یا بانگرو اور کھڑی بولی۔ چیٹر جی نے صاف لکھا ہے کہ ان زبانوں کی قواعدی ساخت میں بہت معمولی فرق ہے، اور آج سے آٹھ نو سو سال پہلے تو اور کم فرق رہا ہوگا، اس لئے جس نئی زبان کا ڈھانچہ عربی، فارسی الفاظ اور آوازوں کے اختلاط سے بن رہا تھا، اس میں پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی ہر ایک کو شریک سمجھنا چاہیئے جیول بلاک (فرانسیسی ماہر لسانیات) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے اور جو چیٹر جی کے یہاں بھی ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا، بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی، دوسری کھڑی بولی اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی سرچشمہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں دونوں کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن دہلی چونکہ مدتوں صدر مقام رہا اس لئے اردو کا تعلق کھڑی بولی سے زیادہ ہے۔ (ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از جان بیمز، ترجمہ و حواشی مع مقدمہ از سید احتشام حسین ص [illegible]۔ طبع لکھنؤ [illegible])

ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے اپنی کتاب "اردو زبان کا ارتقا" میں ایک نیا خیال پیش کیا ہے، وہ اردو کا سب سے قریبی تعلق پالی زبان سے بتاتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "میرے نزدیک اردو کی موجودہ شکل صرفی اور نحوی قاعدوں اور صوتی تبدیلیوں کے لحاظ سے پالی سے ماخوذ ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پالی ادب، فن اور فلسفے کی زبان بن کر ایک جگہ ٹھہر گئی اور اردو یا ہندوستانی روزانہ کی بول چال اور لین دین کی زبان ہونے کی وجہ سے برابر [illegible]

ہر چند کہ سبزواری صاحب نے بڑے علمی دلائل پیش کئے ہیں جن کا بیان خالی از طوالت نہ ہوگا اور جہاں تک [illegible] جستجو اور تحقیق کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ واقعی قابل ستائش ہے لیکن یہ مسئلہ ہنوز کافی محتاج بحث ہے اور ابھی اس نظریئے کو تسلیم کرنے کے لئے اتنا مواد فراہم نہیں ہوا کہ ہم اسے باسانی تسلیم کر لیں۔

مذکورۂ بالا تصور کے سلسلے میں قطعی رائے قائم کرنا ناممکن ہے اس لئے کہ ابتدائی تحریری مواد کی قلت شدت سے کھٹکتی

آتی ہے۔ رہی قرین قیاس بات تو اس معاملے میں جیولز بلاک کی بات ذہن قبول کرنے پر مجبور ہے، اس لئے کہ اس مکتبہ فکر کے لوگوں کے اس نظریئے کو بھی باطل نہیں کرتی کہ اردو کی ابتدائی ہئیت ترکیبی میں پنجابی زبان کا زبردست ہاتھ ہے۔ برج بھاشا سے جو چیز اسے علیحدہ کرتی ہے وہ اس کی صوتی خصوصیت ہے۔ لیکن اردو کی ابتدائی صورت میں جو صوتی خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہ پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی میں بھی ملتی ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تغیر و تبدیلی ہوتی گئی یہاں تک کہ پنجابی اور اردو میں میلوں کے فاصلے پیدا ہوگئے۔ کھڑی بولی میں نکھار آتا گیا اور آخر کار اس زبان نے بول چال کے حصار سے نکل کر مہذب اور ادبی زبان ہونے کا اعلان کر دیا۔

چند وہ کتب و رسائل جو اس موضوع کے سلسلے میں میرے زیرِ مطالعہ رہے ہیں مگر کسی وجہ سے ان کا حوالہ نہ آسکا۔

کتابیات:

۱۔ آثار الکرام۔ از حکیم شمس اللہ قادری۔ طبع دکن۔ ۱۹۲۸ء

۲۔ داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری۔ طبع آگرہ۔ ۱۹۵۷ء

۳۔ آریائی زبانیں، از پروفیسر سید حشمو رورما۔ طبع دکن۔ ۱۹۴۲ء

۴۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں، از مولانا عبدالمجید سالک۔ طبع لاہور، ۱۹۵۷ء

۵۔ مغل اور اردو، از نصیر حسین خیال۔ طبع دکن۔ ۱۹۳۳ء

۶۔ داستان اردو، از نصیر حسین خیال۔ طبع دکن۔ ۱۳۵۷ھ

۷۔ خطبات گارساں دتاسی۔ طبع دکن۔ ۱۹۳۵ء

۸۔ مقالات گارساں دتاسی۔ طبع دہلی۔ ۱۹۴۳ء

۹۔ بہار میں اردو زبان کا ارتقاء، از ڈاکٹر اختر اورینوی

۱۰۔ کیفیہ، از کیفی دہلوی۔ طبع دہلی۔ ۱۹۳۹ء

۱۱۔ قواعد اردو، از سید احمد علی خاں یکتا۔ سنہ ندارد

۱۲۔ نقوش سلیمانی از سید سلیمان ندوی۔ طبع اعظم گڑھ

۱۳۔ نظم اردو، از حکیم ناطق لکھنوی۔ طبع لکھنؤ۔ ۱۹۴۰ء

۱۴۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو، از ڈاکٹر مسعود حسین۔ طبع علی گڑھ ۱۹۵۸ء

۱۵۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، از سید مسعود حسن رضوی۔ طبع الہ آباد۔ ۱۹۵۳ء

۱۶۔ ہندوستانی لسانیات، از محی الدین قادری زور۔ طبع دکن

۱۷۔ علم اللسان، از مولوی سید احمد صاحب دہلوی۔ طبع دہلی۔ ۱۸۹۵ء

۱۸۔ اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ از عبدالحق۔ طبع علی گڑھ۔

۱۹۔ اردو، ہندی، ہندوستانی، از سجاد ظہیر۔ طبع بمبئی۔ ۱۹۴۷ء

۲۰۔ ہندوستانی زبان از امام اکبر آبادی۔ طبع دہلی۔ ۱۹۴۴ء

۲۱۔ تلخیص الاردو مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی۔ طبع کراچی۔ ۱۹۵۲ء

۲۲۔ اختلاف اللسان از منشی وجاہت حسین جھنجھانوی طبع لاہور ۱۹۰۶ء

۲۳۔ ایتھنولوجی، لینگویجز، لٹریچر اینڈ ریلیجن آف انڈیا۔ "انتخاب از امپیریل گزیٹیر آف انڈیا" طبع لندن۔ ۱۹۲۴ء

۲۴۔ فلالوجیکل لیکچرز، از آر۔ جی۔ بھنڈارکر طبع ہند

۲۵۔ ہندوستانی فونیٹکس۔ از ڈاکٹر محی الدین زور۔ طبع پیرس

۲۶۔ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ ۱۹۱۰ء۔ ۱۹۳۳ء۔ ۱۹۴۹ء

۲۷۔ ہسٹری آف پرشین لینگویج ایٹ دی مغل کورٹ۔ از عبدالغنی۔ طبع ہند۔

۲۸۔ سائیکلوپیڈیا آف انڈیا۔ از ایڈورڈ بیلفور۔ طبع مدراس۔ ۱۹۳۴ء

رسائل:

۱۔ "زمانہ" طبع کانپور بابت اگست ۱۹۲۸ء، اپریل و اگست ۱۹۳۸ء، جولائی ۱۹۳۹ء، اکتوبر ۱۹۴۳ء، مئی ۱۹۴۳ء، مارچ ۱۹۴۵ء

۲۔ "اورینٹل کالج میگزین" طبع لاہور، بابت ۱۹۲۵ء، مئی ۱۹۲۶ء، نومبر ۱۹۲۶ء، نومبر ۱۹۲۸ء، مئی ۱۹۲۹ء، فروری، مئی، اگست ۱۹۳۲ء، مئی ۱۹۳۳ء، اگست ۱۹۳۵ء، فروری و اگست، نومبر ۱۹۳۷ء، فروری ۱۹۳۸ء

۳۔ "ادبی دنیا" طبع لاہور بابت اپریل ۱۹۳۸ء

۴۔ "شاہکار" بابت اپریل ۱۹۴۶ء

۵۔ "اردو" طبع ہند بابت ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۸ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۰ء

۶۔ "المؤمن" طبع دکن بابت ۱۳۵۳ھ

۷۔ "ہندوستانی" طبع الہ آباد بابت ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء

۸۔ "مجلہ عثمانیہ" طبع دکن بابت ۱۳۵۰ف، ۱۳۳۶ف

۹۔ "الوارث" ہند۔ بابت مارچ ۱۹۲۳ء، اکتوبر ۱۹۲۸ء

۱۰۔ "لسان العصر" ہند۔ بابت ۱۹۱۰ء

ایڈورڈ مورگن فورسٹر

بہت سے اردو پریمیوں کو اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ انگلستان کے چوٹی کے ناول نویس ای۔ایم۔ فورسٹر نے ایک ہزار پونڈ کا گراں قدر عطیہ حیدرآباد (دکن) کے اردو ہال کی تکمیل کے لئے دیا ہے۔ خود ان لوگوں کو بھی جو فورسٹر کو اچھی طرح جانتے ہیں، اس خبر سے تعجب ہوا، اس لئے کہ فورسٹر نے اردو زبان سے کسی طرح کے لگاؤ کا اپنی تحریروں میں اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اگر ہم پورے پس منظر پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ یہ عطیہ ان احساسات اور جذبات کا نتیجہ ہے جو فورسٹر پر آدھی صدی سے زیادہ سے برابر اثر پذیر ہو رہے تھے، جس کے باعث ایک نسبتاً معمولی تحریک پر انھوں نے پندرہ ہزار روپے کا یہ چک بھیج دیا۔

اردو والوں سے فورسٹر کی دوستی کی داستان بہت طویل ہے۔ سر سید کے پوتے مسعود (جو بعد میں نواب مسعود جنگ سر سید راس مسعود بنے) نو عمری کے زمانے ہی میں انگلستان گئے، اور لندن سے بیس میل Waybridge (وے برج) میں اپنے اتالیق سر تھیوڈور ماریسن کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کا ارادہ آکسفورڈ

ہارون خاں شروانی

یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا تھا، اور اس کے لئے لاتینی زبان ضروری تھی۔ ماریسن نے ایک نوجوان انگریز، فورسٹر سے (جو وے برج میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے) کہا کہ مسعود کو لاتینی کا درس دیدیا کیجئے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۶ع کا ہے، اور یہیں سے فورسٹر کا ہندوستان سے اور اردو سے تعلق خاطر شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۷ع میں، میں بھی اپنی تعلیم کی غرض سے انگلستان پہونچا، اور اپنے دوست مسعود سے ملنے وے برج گیا اور وہاں پہلی مرتبہ فورسٹر سے ملاقات ہوئی۔ طالب علمی کے زمانے اقد

یورپ کے قیام کے دوران میں فورسٹر سے متعدد مرتبہ ملاقات ہوئی، اور میں نے دیکھا کہ یہ ادیب گویا صفوں کو چیرتا ہوا، کس طرح صف اول میں آرہا ہے اور انگریزی ادب میں اپنا نام اور مقام پیدا کرتا جارہا ہے۔

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک فورسٹر کے اردو دوستوں کا حلقہ وسیع ہونے لگا، اور اس میں ابو سعید مرزا [بعدہ' نواب سعید جنگ میرمجلس (Cheif justice) عدالت العالیہ (High Court) حیدرآباد دکن] احمد مرزا مرحوم (بعدہ' چیف انجینیر حیدرآباد دکن)، سید محی الدین (بعدہ' معتمد تعلیمات، حیدرآباد دکن)، شیخ محمد میر مرحوم (بعدہ' ڈسٹرکٹ جج میرٹھ)، عبدالرشید (بعدہ' وزیر امور داخلہ اندور) بھی شامل ہوگئے۔ ہم میں سے بعض کیمبرج میں زیر تعلیم تھے، بعض آکسفورڈ میں اور بعض لندن میں، لیکن جب مسعود آکسفورڈ کی تعلیم ختم کرکے بیرسٹری کے امتحانات دینے کے لئے لندن آکر رہنے لگے تو ان کا مکان ہم لوگوں کا گویا اڈا بن گیا، اور ہم لوگ لندن آتے تو انہی کے یہاں ٹھہرتے۔ لندن میں فورسٹر سے اکثر ملاقات ہوتی۔ مسعود ۱۹۱۲ء کے وسط میں ہندوستان واپس آگئے۔ انگلستان سے چلنے سے پہلے انہوں نے فورسٹر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، چنانچہ اسی سال کے اواخر میں فورسٹر نے ''محض تفریح کی خاطر'' ہندوستان کا سفر کیا۔ لیکن یہاں انہیں وہ مواد مل گیا جس کی بنیاد پر انہوں نے بارہ برس بعد اپنی مشہور آفاق کتاب A Passage to India لکھی۔ مسعود نے ان کے لئے انگرکھا، چوڑی دار پائجامہ سلوایا اور لکھنوی ٹوپی بنوائی، اور اسے پہن کر، گویا اصلی ہندوستان کو دیکھنے کی خاطر رتھوں اور یکوں میں بیٹھ کر شکار کے بہانے میزبان اور مہمان علی گڑھ کے نواح کے گاؤں گاؤں پھرے اور بڑے بڑے زمینداروں کی گڑھیوں میں جاکر آرام کیا۔

۱۹۱۳ء کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ فورسٹر اور مسعود دونوں ہندستانی لباس میں ملبوس لاابالیانہ انداز سے دہلی کے چاندنی چوک میں گھوم رہے تھے، کہ یکایک فورسٹر نے مسعود کی طرف مڑکر پوچھا کہ بھائی اردو زبان کا سب سے بڑا کلاسیکی شاعر کونسا ہے۔ مسعود نے برجستہ جواب دیا کہ غالب سے بڑھ کر کون ہوگا۔ مسعود نے حافظہ زبردست پایا تھا، بیسیوں شعر غالب کے یاد تھے، اور پھر انگریزی کی استعداد میں تو وہ بہت سے انگریزوں کو بھی مات دے سکتے تھے۔ وہ غالب کے اشعار سنانے لگے اور ہر شعر میں جو فلسفیانہ لگاؤ تھا اسے بھی فورسٹر کو سمجھانے لگے۔ فورسٹر نے پوچھا کہ ''غالب کا دیوان تو یقیناً مطبوعہ ہوگا۔ مجھے اس کا ایک نسخہ دلوادو''۔ آج تو چاندنی چوک میں کیا اس کے ارد گرد بھی اردو کتابوں کی ایک دکان بھی نہیں، ۱۹۱۳ء میں تو چار چھ دکانیں فوارے کے قریب تھیں۔ ایک دکان کے سامنے دونوں کھڑے ہوگئے۔ مسعود نے دکاندار سے دریافت کیا ''آپ کے پاس دیوان غالب ہے''؟ دکاندار نے جواب دیا کہ ''جی ہاں، آٹھ آنے والا دوں یا بارہ آنے والا، یا حضور میرے پاس سوا روپے کا ایک بڑھیا

ایڈیشن ہے، اسے حاضر کروں''؟ اور بغیر جواب پائے وہ اندر سے تینوں کا ایک ایک نسخہ لے آیا۔ آٹھ آنے اور بارہ آنے کا دیوان تو بادامی کاغذ پر چھپا ہوا اور سفید تاگے سے سلا ہوا تھا اور سوا روپے والا سفید کاغذ پر، لیکن اس پر جگہ جگہ طباعتی سیاہی کے دھبے پڑے تھے۔ دیوان غالب کے ان تینوں نسخوں کو دیکھ کر فورسٹر مسعود کی طرف پلٹے اور کہنے لگے ''جس شاعر کو تم اردو کا سب سے بڑا کلاسیکی شاعر سمجھتے ہو اس کا دیوان ایسے کاغذ پر چھپا ہے، جس سے ہم اپنا بدن بھی صاف کرنا پسند نہیں کریں گے''۔ مسعود اس ریمارک پر پسینہ پسینہ ہوگئے، اور اسی واقعے کے بعد انہوں نے نظامی پریس بدایوں میں دیوان غالب کی وہ صاف ستھری ایڈیشن چھپوائی جو بعد کے نفیس ایڈیشنوں کا گویا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس قصے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے پچاس برس پہلے بھی فورسٹر کو اردو زبان سے اتنا لگاؤ ہوگیا تھا کہ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ غالب جیسے عظیم شاعر کی کلیات ردی کاغذ پر چھاپی جائے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب فورسٹر سر میلکم ڈارلنگ کے کہنے پر وسط ہند کی مرہٹہ ریاست دیواس گئے اور وہاں سے اپنی والدہ اور اپنے بعض دوستوں کو مفصل خط لکھے، جو اپنی دلچسپی اور اپنے طنز میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ اسی سفر کے دوران میں وہ اورنگ آباد بھی گئے (جو اس زمانے میں حیدرآباد ریاست کے ایک صوبے کا مستقر تھا) اور ابو سعید مرزا کے یہاں قیام کیا۔ اورنگ آباد کے قیام کے جو حالات انہوں نے لکھے ہیں وہ ابھی حال میں لندن کے رسالہ Encounter میں چھپے ہیں، اور ان سے آج سے پچاس سال پیشتر حیدرآباد ریاست کے ایک دور افتادہ شہر کی معاشرت اور سماجی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۱۳ء میں فورسٹر انگلستان واپس ہوئے۔ وہاں کئی مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ ادیبوں کی صف اول میں آرہے تھے۔ ان کے ناول The Longest Journey, Where Angels fear to tread اور Howard's End ہاتھوں ہاتھ بکنے لگے۔ میرے انگلستان سے چلتے وقت انہوں نے اپنی مشہور کتاب A Room with a View میری نذر کی، اور اس پر لکھا:

Haroon Sherwani, With best wishes from the

writer, to read on the journey.

اس کے بعد ۱۹۲۱ع تک میری فورسٹر کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ۱۹۲۱ع میں وہ مہاراجہ دیواس کے معتمد بن کر آئے اور اس چھوٹی سی ریاست میں چھ مہینے قیام کیا۔ انہوں نے ۱۹۱۳ع اور ۱۹۲۱ع میں دیواس سے جو بھی خطوط لکھے، انہیں ایک نہایت دلچسپ کتاب

The Hill of Devi

کی شکل میں شائع کیا ہے، اور اس کتاب سے اس زمانے کی ایک دیسی ریاست کا صحیح نقشہ سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے حیدرآبادی دوستوں کو نہیں بھولے، اور اپنے دوست مسعود کے یہاں، جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے، دو تین روز اس بنگلے میں آکر ٹھیرے جو آج کل آندھرا پردیش کے وزیر فینانس، شری برھمانند ریڈی کی قیام گاہ ہے۔ کتاب Hill of Devi شائع ہوئی تو فورسٹر نے مہربانی کرکے ایک جلد مجھے بھیجی اور اس پر لکھا:

Haroon Sherwani, With affectionate memories of the past and with hopes of a meeting in future, from Morgan Forster.

فورسٹر کے پاس ہندو مسلم سماج ہی نہیں بلکہ اینگلو انڈین زندگی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی عام حالت، ان کے اچھے اور برے پہلوؤں، برطانوی ہند اور ہندستانی ریاستوں کے حالات کی بابت اتنا مواد جمع ہوگیا تھا، اور وہ خود اس ملک کی زندگی میں گویا اتنا سموگئے تھے کہ وہ اب اپنی وسیع معلومات کو ایک لڑی میں پروسکتے تھے۔ یہی وہ کیفیتیں تھیں جن کی جھلک ان کی معرکۃ الآرا کتاب A Passage to India میں نظر آتی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فورسٹر نے ہندستانی سماج کے ہر پہلو کو کس طرح اپنا بنالیا تھا۔ فورسٹر کا یہ شاہکار سب سے پہلے ۱۹۲۴ع میں منظر عام پر آیا، اور اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشنیں نکل چکے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو مسعود کے نام پر اس طرح معنون کیا ہے:

To Syed Ross Masood, and to seventeen years of our friendship.

اس کتاب کا جو نسخہ فورسٹر نے راقم الحروف کے پاس بھیجا اس پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھ دی ہے:

"Haroon, with affection and love, from Morgan, and may we yet meet again".

۱۹۳۸ع میں راقم نے ہندستان کے نمایندے کی حیثیت سے بین قومی تاریخی کانگریس میں جو سوئستان کے شہر زیورچ میں منعقد ہوئی تھی، شرکت کی۔ لندن جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہاں دو مرتبہ فورسٹر سے ملا۔ جس بات کا مجھ پر بطور خاص اثر ہوا وہ ان کا انتہائی انکسار تھا۔ وہ انگریزی ادبیات کی بالائی منزل تک پہنچ چکے تھے، مگر ان کی منکسرالمزاجی بعض مرتبہ شرمیلے پن تک پہنچ جاتی تھی۔ فورسٹر کی اس جبلت سے ان کی اصلی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ باوجود اتنے مشہور اور کامیاب انسان ہونے کے ان میں دکھاوا نام کو بھی نہیں، بلکہ بعض مرتبہ تو وہ باتیں کرتے کرتے اپنی نظریں نیچی کرلیتے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں فورسٹر P. E. N کے بین قومی جلسے میں جو جے پور میں منعقد ہو رہا تھا، پھر ہندستان آئے۔ ان کے جگری دوست مسعود اس دنیا میں باقی نہیں رہے تھے، پھر بھی انہوں نے اس عہد کے "گہوارہ" اردو، حیدرآباد اور اپنے حیدرآبادی دوستوں کی یاد کو فراموش نہیں کیا۔ وہ حیدرآباد چند روز کے لئے آئے اور سجادمرزا کے یہاں (جو اس وقت چادر گھاٹ اسکول کے پرنسپل تھے اور بعد میں چل کر معتمد تعلیمات ہوئے) قیام کیا۔ فورسٹر نے میری تحریک پر نظام کالج میں (جس کا میں پرنسپل تھا) جامعہ عثمانیہ کے معین امیر Vice Chancellor نواب علی یاور جنگ کی صدارت میں دو لکچر "دونوں سنساری جنگوں کے درمیانی وقفے میں انگریزی ادبیات کا ارتقا" کے موضوع پر دئے تھے۔ یہ ان کا ہندوستان کا سب سے آخری دورہ تھا۔ کیا عجب کہ ہندوستان کی کشش ایک مرتبہ پھر ان پر غالب آجائے اور ہم انہیں پھر خوش آمدید کہہ سکیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس صدی کے پہلے دہے میں فورسٹر کی ملاقات جن ہندستانیوں سے ہوئی ان میں سے اکثر رفتہ رفتہ حیدرآباد کھنچ آئے اور اردو زبان کے اس گہوارے کو انہوں نے اپنالیا۔ مسعود نے اپنے جوہر یہیں آکر دکھائے، راقم الحروف یہاں کا ہو گیا۔ ابو سعید مرزا اور احمد مرزا تو پہلے ہی سے یہاں کے تھے، سید محی الدین نے حیدرآباد ہی سے وظیفہ لیا۔ مسعود ایک بڑی شخصیت کے حامل تھے، اور انہوں نے جو مقاصد اپنے سامنے رکھے تھے، ان میں سے ایک اہم مقصد اردو زبان کی ترقی بھی تھی۔ [illegible]

۱۹۲۱ء میں اور اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد آئے تو انہوں نے جامعہ عثمانیہ کو پوری تابناکی کے عالم میں دیکھا۔ کسی پختہ کار کا دوسروں سے پریم محض شخصی نہیں ہوتا بلکہ ان آدرشوں سے پریم ہوتا ہے جو اس کے محبوب اپنے سامنے رکھے ہوئے ہوں۔ فورسٹر کو اپنے ہندستانی دوستوں کے ساتھ اردو زبان سے بھی یقیناً غیر شعوری لگاؤ ہو گیا ہو گا لیکن اس لگاؤ کا انہوں نے حال تک اظہار نہیں کیا۔ جب سجاد مرزا نے انہیں اس بات کی مبارکباد دی کہ سانتا راما راؤ نے ان کے شاہکار A Passage to India کو ناٹک کا روپ دیا ہے، اور اسے لندن اور نیویارک دونوں شہروں کے اسٹیج پر ایسی نمایاں کامیابی ہوئی ہے، اور ساتھ ہی حیدرآباد میں اردو کے موجودہ موقف اور اردو ہال کا ذکر کیا، تو فورسٹر کے دل میں جو غیر شعوری ہمدردی اردو کے ساتھ تھی وہ اپنا رنگ لائی اور انہوں نے فوراً ایک ہزار پونڈ کا چک بھیج دیا۔ وہ سجاد مرزا کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ "گو میں نے کبھی اردو نہیں بولی، لیکن چونکہ میں نے یہ زبان اپنے ایسے دوستوں سے سنی ہے جو میرے محبوب رہے ہیں، اس لئے اسے گویا اپنی زبان سمجھتا ہوں"۔

یورپ میں بڑے بڑے ادیبوں کی مختلف نوع کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ ملکہ الیزبتھ کی تخت نشینی کے موقع پر فورسٹر کو O.M یعنی سرٹیفکٹ آف میرٹ کا اعلیٰ امتیاز عطا ہوا اور اس کے بعد کنگز کالج، کیمبرج نے جس کا شمار اس جامعہ کے عظیم ترین کلیات (Colleges) میں ہوتا ہے، [illegible] اپنی عزت افزائی میں سمجھی کہ

فورسٹر کو اپنا فیلو مقرر کرے اور ان سے خواہش کی کہ وہ کالج میں قیام کریں اور اپنی ادبی کاوشوں میں مصروف رہیں۔

۲۸ برس کے اس بوڑھے انگریز نے اپنی ادبی تصانیف کی وجہ سے انگلستان میں اور اپنی اردو نوازی کی وجہ سے ہندستان میں ایک عظیم مقام پیدا کرلیا ہے۔ اس کے دوست اس کی دوستی پر جتنا بھی فخر کریں اتنا ہی کم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک انگلستان فورسٹر جیسے سپا پرشوں کو جنم دیتا رہے گا، اس وقت تک اس ملک کا اثر اور اقبال برابر کام کرتے رہیں گے اور اس جزیرے کی حکومت دنیا کے کسی حصے پر رہے نہ رہے اس کا بول بالا رہے گا۔

اُردو کا اصلاحی رسم خط

غلام رسول

یہ مسلمہ بات ہے کہ دنیا میں جو رسم خط رائج ہیں، وہ مختلف قوموں کی سیکڑوں، ہزاروں سال کی لگاتار کوشش اور مسلسل محنت کے نتائج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قوم کے گروہوں کے خاص حلقے میں ہر دل عزیز اور مقبول ہیں۔ ہر ایک رسم خط اپنی جداگانہ تاریخ رکھتا ہے اور وہ اپنی زبان کی مخصوص بولی، لہجے اور اہل زبان کی ثقافت کی ترجمانی کرتا ہے۔

رسم خط سے مراد وہ علامتیں ہیں، جو انسان کسی مقررہ طریقے کے مطابق اپنے خیالات، حالات اور واقعات کی حفاظت، ان کے اظہار اور ابلاغ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ لہذا حصول مقصد کے لئے رسم خط میں یہ خصوصیتیں ہونی چاہئیں کہ وہ اس زبان کی ساری آوازوں کو جیسے اہل زبان اپنے منہ سے نکالتے ہیں، اپنی صحت کے ساتھ محفوظ کرے کہ ایک قاری ان کو ویسا ہی دہرا سکے جیسا کہ وہ پہلے ادا کی گئی ہیں اور اس میں طباعت کی سہولت اور دیدہ زیبی بھی پائی جائے، تاکہ کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی بھی زیادہ تعداد میں اور صاف ستھری اشاعت ہو سکے۔

انسان کے منہ سے جو آواز نکلتی ہے، اس میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک نری آواز دوسرا سہارا، جن کے ذریعے آواز نکالی جاسکے۔ ان میں آواز کو حرف اور سہارے کو اعراب کہتے ہیں۔ رسم خط کے لحاظ سے اردو خط اپنی ذات سے بے اعراب ہے اور اعراب ہی اردو زبان کے اہم جز ہیں، کیونکہ اردو کی کسی عبارت کو صحیح پڑھنے اور غیر زبان کے لفظوں کو ٹھیک ادا کرنے میں اعرابوں ہی سے بڑی مدد ملتی ہے، اس لئے شروع ہی سے نامفہم اور اجنبی لفظوں کی اردو لکھاوٹ میں اعرابوں کی پابندی کرنی چاہئے۔

ہندی میں خالص حروف علت ہیں، برخلاف اس کے اردو میں حروف اور حرکات مل جل کر حروف علت کا کام دیتے ہیں۔ دونوں اکٹھے اعراب کہلاتے ہیں۔ یوں تو پہلے ہی سے اردو میں حرکات (۱۲) ہیں، جن کو ہم نئی اصطلاح میں اعراب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

آج کل اردو زبان میں دوسری قوموں کے ساتھ باھمی بات چیت، تبادلہ' خیالات اور تجارتی کاروبار کے ذریعے غیر زبانوں کے الفاظ اکثر و بیشترشامل ھوگئے ھیں، جن کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں ھماری زبان کے موجودہ اعراب ناقص ٹھہرتے ھیں۔ نئے اعرابوں کے وضع کرنے کی ضرورت ھے، یہی سبب ھے کہ ایک عرصے سے ارباب اردو کے سامنے اردو خط کی اصلاح کا مسئلہ حل طلب ھے، جس کے لئے برابر کوشش کی جارھی ھے۔ اج سے تقریباً چالیس برس پہلے اس کے متعلق باباِئے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے رسالہ' اردو میں اردو رسم خط کی اصلاح کے عنوان کے تحت مختلف اھل علم اور ماھرین زبان سے مضامین لکھوا کر شایع کئے اور جب سابق ریاست حیدر آباد میں انجمن ترقی' اردو کے زیر نگرانی اردو درسیات (Readers) کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں کتابیں تیار کرانے کی ضرورت پڑی تو اردو رسم خط کی اصلاحی کمیٹی بٹھائی گئی اس نے املا کے چند قاعدے بنائے۔ اس کی ھدایتوں کے بموجب اردو ریڈریں لکھائی اور شائع کی گئیں۔ اصلاح رسم خط کا مسئلہ ابھی مکمل نہیں ھوا تھا۔ اس لئے اردو کانفرنسوں میں بھی اس مسئلے کو زیر بحث لایا گیا۔ ان کے اجلاسوں میں اردو رسم خط کے بارے میں بعض امور طے اور منظور ھوئے، پھر بھی یہ مسئلہ پایہ' تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ایک زمانے تک اردو رسم خط کا اصلاحی مشغلہ ادھورا غیر اتمام میں پڑا رھا۔ بالآخر ۱۹۰۳ء میں جب کہ مجھے اردو کا قاعدہ لکھنے کی نوبت آئی، تو اس وقت لکھاوٹ کی دشواریاں پیش آئیں اور اردو میں ھندی کے مقابلے میں بعض اعرابوں کی کمی پائی گئی، چوں کہ مجھے اپنی زبان سے محبت تھی اس لئے لکھاوٹ کے نقص کو دور کرنے کے لئے کمر بستہ ھوگیا، اور اس کے لئے ھمہ تن اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ خدا کے فضل سے اس میں مجھے کامیابی ھوئی۔ میں نے اپنی سوجھ بوجھ سے چار نئے اعراب ایجاد و دریافت کئے۔ وہ یہ ھیں: (۱) واو لین (۲) یائے لین (۳) رائے ممدودہ (۴) نیمہ۔ ان اعرابوں کی نسبت ۱۹۰۸ء سے لیکر اب تک وقتاً فوقتاً اپنے فکری و تحقیقی نتیجوں کو ارباب اردو کے سامنے "ھماری زبان علی گڑھ" کے ذریعے پیش کرچکا ھوں۔ آج تک کسی نے بھی ان سے اختلاف نہیں کیا۔

نئے اعرابوں کی اھمیت:۔ (۱) واو لین۔ اس کی علامت (وْ) ھے۔ سابق میں اردو والے اس اعراب کو واو ما قبل مفتوح پکارا کرتے تھے اور اب بھی اردو قاعدوں میں اسی نام سے مشہور ھے۔ (۲) یائے لین۔ اس کی علامت (یْ) ھے۔ یہ اعراب بھی اردو میں یا ماقبل مفتوح کے نام سے موسوم تھا اور اب بھی یہی کہلاتا ھے۔

میری تحقیق میں یہ دونوں قدیم اعراب اردو دنیا میں غلط طور پر مشہور ھوگئے، حالانکہ علم تجوید کی رو سے سلسلے وار واو ماقبل مفتوح اور یا ماقبل مفتوح کے بجائے واولین اور یائے لین کے ناموں سے پکارے جانے

چاہیے تھے۔ اب تک اردو والے ان کے صحیح ناموں سے بالکل بے خبر رہے، چنانچہ اردو کی موجودہ گرامروں میں ان کا کہیں نام ونشان پایا نہیں جاتا۔ ان اعرابوں کی بدولت ہماری زبان میں ہندی اےٛ اور اوٛ کا بدل خود بخود پیدا ہوگیا۔ اس طرح اردو رسم خط میں وسعت پیدا ہوگئی۔ (۳) رائے ممدودہ۔ اس کی علامت (ر) ہے۔ ہماری زبان میں ہندی ''ری'' کا کوئی بدل موجود نہ تھا۔ ہندی والوں میں یہ بات مشہور ہوچکی تھی کہ ہندی ''ری'' کا اردو میں لکھنا محال ہے۔ اس نئے اعراب کی وجہ سے سنسکرت الفاظ کا اردو میں لکھنا سہل تر ہوگیا۔ (۴) نیمہ۔ اس کی علامت (۷) ہے۔ یہ اعراب بھی اردو والوں کے لئے بالکل نیا ہے۔ اس کو سابق صوبہ پنجاب کی اردو گرامروں میں الٹے جزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، حالانکہ اس طرح کہنا غلط ہے۔ اردو میں صرف ایک جزم ہوتا ہے، اور وہ کتابت میں (ں) لکھا جاتا اور اردو ٹائپ میں (۸) چھاپا جاتا ہے۔ یہ اعراب بھی مثل واو ما قبل مفتوح اور یا ما قبل مفتوح کے اردو دنیا میں غلط مشہور ہوگیا۔ اردو میں اس کے لئے کوئی نام نہ تھا۔ میں نے اردو زبان کی مناسبت سے اس کا نام نیمہ تجویز کیا ہے کیونکہ یہ اس حرف کی، جس پر یہ علامت لکھی جاتی ہے، آدھی آواز کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس طرح کی علامت اردو میں پہلے ہی سے نون غنہ کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ بعد ازاں ۲۸ یا ۱۹۲۹ء میں سابق انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) نے اپنی اردو درسیات (جو سلسلہ درسیہ عثمانیہ کہلاتا تھا) میں اس علامت کو یائے مخلوطی یعنی (یٛ) کی جگہ استعمال کیا، چنانچہ کیاری، کیوڑا جیسے لفظوں کو کیٛاری اور کیوڑا لکھا جاتا ہے۔ یہ اعراب اردو جیسی بے اعراب زبان کے لئے بہت ہی کارآمد ہے۔ اس اعراب کی ایجاد سے ہماری زبان میں غیر زبانوں کے نا مانوس اور اجنبی لفظوں کی لکھاوٹ کے لئے راہ کھل گئی اور ان کا لکھنا آسان ہوگیا۔

اس اعراب کی شکل صورت دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسی قبیل کی علامت سنسکرت (۷) ہندی میں بھی پائی جاتی ہے جو چندر بندو کہلاتی ہے۔ اس کی علامت یوں (ں) لکھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو والوں نے اس کو سامنے رکھ کر اپنی جدت طرازی سے چاند نما نشان کو گھٹا کر (۷) بنا دیا۔

اب اردو اور اجنبی لفظوں کی مثالوں کے ذریعے مذکورہ بالا اعرابوں کا عملی ثبوت پیش کیا جاتا ہے:

(۱) واولین (اردو) مثلاً: حوٛض، روٛضہ، شوٛکت، طوٛق، قوٛس۔

(ہندی) مثلاً: بھوٛنچال، ٹھوٛر، چوٛڑا، ڈھوٛنچا، کھوٛرا۔

(۲) یائے لین (اردو) مثلاً: خیٛرات، شیٛخ، صیٛقل، غیٛب، غیٛظ۔

(ہندی) مثلاً: اَیٛمل، جیٛن، چھیٛلا، ڈیٛنکھ، کھیٛلا۔

(۳) رائے ممدودہ مثلاً : رتو، کرپان، کرشتی، الرتیے، هردیے۔

(رائے ممدودہ کا ماقبل حرف همیشه مکسور هوتا ھے، اس لئے زبر دینے کی ضرورت نہیں)

(۴) نیمہ (اردو) مثلاً : بیاہ، پیوسی، دیاسلائی سیوتی، نیاز۔

(هندی) مثلا : جوالا، بیوپار، تیوهار، ملیچھ، سنان، چپوڑا۔

(سنسکرت) مثلاً : تریا، جیوتش، تراس، تیاگ، شری، ویاکرن۔

(انگریزی) مثلاً : سکول، سٹیمر، سٹیڈیو، کیاپ، بیل، پین -

یاد رکھیے انگریزی کے ایسے لفظ، جن کے شروع میں (s) آئے، سنسکرت (۷) هندی کے وہ لفظ، جو شروع میں آدھے حرفوں سے لکھے جاتے اور مدھم آواز دیتے هیں اور اردو، هندی اور انگریزی کے وہ لفظ، جن کے درمیان ہائے مخلوطی ہو، ان سب پر اردو میں نیمہ لکھاپا جاتا ھے۔ زبر ۷ زیر اور نیمه کے اظہار میں بڑا فرق ھے، ان میں کچھ وقفه هوتا ھے اور اس میں مطلق نہیں هوتا۔

غرض اوپر کے چاروں نئے اعراب اردو کے اصلاحی رسم خط کے اهم ستون هیں، جن کے باعث هماری زبان کا رسم خط مکمل اور جامع ھو گیا۔ اردو اصلاحی خط (جو اپنی لسانی خصوصیات کا حامل ھے) هندی کے ناگری لپی سے، جو عربی ۷ فارسی کے مخصوص حرفوں کے حق میں بالکل قلاش ھے، اس باب میں کہیں بڑھا ہوا ھے۔

اب ارباب اردو اور اردو دوستوں کا فرض ھے کہ وہ اردو کے اصلاحی رسم خط کی ترویج و اشاعت میں تن دهی سے کام لیں اور نئے اعرابوں کو اردو قواعد کی کتابوں میں داخل کریں اور اردو کی درسیات کی کتابت و طباعت میں ان پر پوری پابندی کر کے انہیں اردو دنیا میں پھیلائیں۔ کچھ عرصے کے بعد اردو والے ان اعرابوں سے واقف هوجائیں گے۔ اس طرح عمل کرنے سے اردو زبان کا وقار بڑھے گا اور وہ ترقی یافته زبانوں میں اپنا مقام پیدا کرسکے گی۔

اردو میں زبر، زیر، پیش، تشدید، مد، واو معروف، واو مجهول، یائے معروف، یائے مجهول، واولین، یائے لین اور رائے ممدودہ، یه بارہ اعراب بنیادی اور اهم هوتے هیں، جن کو حروف تہجی کے ساتھ شامل کر کے ایک تقطیع کی شکل میں لکھنے کی صورت میں یه مجموعه "اردو بارہ کھڑی" کہلایا جائے گا۔ یه گویا ایک قسم کی اعرابی مشق ھے جو اردو والوں کے لئے نئی اور انوکھی چیز ھے۔ اس کے یاد رکھنے سے لکھاوٹ میں بڑی مدد ملتی ھے۔ مثلاً : (الف کی اردو بارہ کھڑی) اس طرح لکھی جائے گی :

اَ اِ اُ آ اٰ اوٗ او ای اے اوٗ اۓ ارٗ (اِرِی)

واضح ھو کہ اردو بارہ کھڑی هندی بارہ کھڑی کی طرح اصلاحی خط کا مثالی نمونه ھے۔ جس کو اردو دنیا کے سامنے پہلے پہل پیش کر رہا هوں۔

اصول پنج گانہ متعلق اعراب :

(۱) مفتوح حرف پر خواہ وہ مجرد ہو یا مخلوط، زبر کی علامت نہ لکھی جائے۔ مثلاً : دل، جل، تھل۔

(۲) ہر اردو لفظ کا آخری حرف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے، اس لئے اسے خالی چھوڑ دیا جائے اور سکون کا استعمال درمیان میں متحرک حرف کے بعد کیا جائے۔ مثلا : کِشْمِش، تَنْدُرُسْتی، نَسْتَعْلِیق۔

(۳) واو، پیش کی قائم مقام ہوتی ہے، اس لئے واو معروف اور واو مجہول کے ماقبل کو پیش سے نہ لکھا جائے۔ مثلاً : (واومعروف) نوُر، طوُر، پھوُٹ، اور (واو مجہوُل) چور، مور، جھول۔

(۴) واولین اور یائے لین سے پہلے کا حرف ہمیشہ مفتوح ہوتا ہے، اس لئے ان کے ماقبل کو زبر سے نہ لکھا جائے۔ مثلا : (واولین) پوْدا، سوْدا، دھوْل۔ اور (یائے لین) بیْل، میْل، تھیْلا۔

(۵) یائے معروف اور یائے مجہول سے پہلے کا حرف ہمیشہ مکسور ہوتا ہے، اس لئے ان کے ماقبل کو زیر سے نہ لکھا جائے۔ مثلاً : (یائے معروف) ریل، نیل، جھیل اور (یائے مجہول) بیر، سیب، کھیت۔

نوٹ : اوپر کے اصولوں سے اگر کسی لفظ کے تلفظ میں اشتباہ پیدا ہو، تو اس کو اعراب کے ذریعے رفع کرنا چاہئے۔ مثلاً : کور (غلاف) اور سورن (سکہ) کو (۳) اصول کی رو سے کور اور سورن پڑھا جائے گا، اس لئے صحت کے واسطے کوَر کے واو پر اور سوَرن کے واو پر زبر لکھا جائے۔ اسی طرح دیا (رحم) اور بیا (پرندہ) کو (۵) اصول کی رو سے دیا اور بیا پڑھا جائے گا، اس لئے صحت کے واسطے دَیا کے د پر اور بَیا کے ب پر زبر لکھا جائے۔

مرزا ہادی رسوا کی

مثنوی امید و بیم

(بہ ترتیب جدید)

عشرت رحمانی

حرف آغاز اردو شاعری میں دوسری مشرقی زبانوں کی طرح صنف مثنوی کی اہمیت اپنی جامع و دلکش خصائص کے لحاظ سے مسلم ہے۔ مثنوی میں جملہ اصناف اپنی پوری رعنائی و زیبائی جمال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔

اس میں قصیدہ، تشبیب، حمد و نعت، ساقی نامہ، بزم کے نغمہ ہائے نوشا نوش، اور رزم کے نواہائے خروش اور غزل کا سوز و ساز، حسن و عشق کی حکایات، ہجر و وصال، شکوہ و شکایات، معاملہ بندی اور محاکات کی لطیف کیفیات اپنے اپنے انداز میں موزوں اسلوب و ادا کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ نظم کی اتنی خصوصیات کے علاوہ نثر کی مرغوب و محبوب طرز داستان گوئی کی دلچسپ کیفیت بھی شامل ہے۔ یعنی مثنوی میں نظم کی تمام خوبیوں کے ساتھ کہانی کا مکمل پلاٹ بھی ضروری ہے۔ گویا کہانی میں واقعہ نگاری کا دروبست نفس واقعہ، بیان کا ربط و تسلسل، وسعت، عروج اور انجام وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ایک مکمل داستان کے لئے لازمی ہے۔ اور چونکہ مثنوی کے روپ میں نظم و نثر دونوں کا متوازن و دلکش مرکب ملتا ہے اس لئے اس صنف کو نسبتاً کل اصناف شاعری پر فوقیت حاصل ہے۔

مثنوی کے اوزان مقرر ہیں جو دوسری اصناف سخن سے مختلف ہیں۔ یوں تو مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ صنف عرب شعراء کی ایجاد ہے۔ لیکن عربی زبان میں کوئی مثنوی قابل ذکر نہیں۔ البتہ فارسی میں اکثر بلند پایہ مثنویاں مشہور ہوئی ہیں، جو اپنی کامیاب طرز میں مقبول ہیں۔ لیکن بہت زیادہ فرضی قصص و حکایات اور اخلاقی تمثیلیں ہیں۔

فارسی مثنویاں فارسی میں مثنوی کی ترتیب بلحاظ خصوصیت مضامین و موضوع حسب ذیل ہیں۔

۱- رزمیہ یا تاریخی: مثلاً سکندر نامہ اور شاہنامہ فردوسی وغیرہ۔

۲- عشقیہ: مثلاً شیریں خسرو اور لیلیٰ مجنوں (خسرو) وغیرہ۔

۳- تصوف و فلسفہ: مثنوی مولانا روم اور جام جم (اوحدی) وغیرہ۔

۴- اخلاقی: حدیقۂ سنائی اور بوستان سعدی وغیرہ۔

۵- حکایت و افسانہ: ہفت پیکر اور ہشت بہشت وغیرہ۔

فارسی کے تتبع میں اردو مثنوی کو بھی

بھی موضوعات ملے۔ کیونکہ اردو شاعری کی تمام اصناف میں فارسی شاعری کا اتباع ہوا ہے۔ اردو کی متعدد مثنویوں میں مختلف ادوار کے شعراء نے اپنے رنگ میں ہر موضوع پر مثنویاں لکھی ہیں۔

فارسی مثنوی کی ابتدا کے لئے عموماً یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے عربی کی ''کلیلہ دمنہ'' کے انداز ہی کو نقش اول قرار دیا۔ تاریخ میں اس سے پہلے کی کسی مثنوی کا پتہ نہیں تھا۔ اس کے بعد عنصری، لبیبی، ابو شکور اور دیگر شعراء نے مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں۔ ان کے بعد فردوسی کے ''شاہنامہ'' اور نظامی کے ''سکندر نامہ'' کے دور آئے۔ بعد ازاں اسی طرح عہد بہ عہد ایران و ہندوستان میں تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ہندوستان کے بعض فارسی گو شعراء نے بھی فارسی میں مثنویاں لکھیں۔ مگر چنداں قابل توجہ نہیں۔

مثنوی کے لوازم | مثنوی کے فنی لوازم تقریباً وہی ہیں جو ایک افسانہ یا داستان اور ناول کے ہیں۔ یعنی حسن ترتیب، آغاز، پلاٹ کا دروبست، کردار نگاری، واقعہ نگاری، زور بیان، وسعت داستان، نقطۂ عروج اور انجام۔ ان سب کی تکمیل اور ترتیب مثنوی میں بھی اسی طرح ملحوظ رکھی جاتی ہے جیسے نثری داستان یا افسانہ اور ناول میں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ واقعہ نگاری میں نثری داستان یا افسانہ کی طرح بیہودگی اور تذبذب لازمی نہیں۔ کیونکہ مشکوک و مبہم بیان مثنوی نگاری میں معیوب ہے، جس سے واقعات کی سچی تصویر کشی میں فرق آتا ہے، اور بیان کی صحت و صداقت اور روانی و تسلسل میں رکاوٹ پیدا ہونے سے جاذبیت اور دلچسپی میں کمی واقع ہوتی ہے۔

اردو مثنوی | اردو زبان میں مثنوی کا آغاز اس کے منظوم دور تصنیف کے ساتھ ہوا، اور نظم کی ابتدا ہی مثنوی سے ہوئی۔

سب سے پہلی نعتیہ مثنوی ۱۰۱۸ء میں محمد قلی قطب شاہ (والیٔ گولکنڈہ) نے دکنی اردو میں لکھی تھی۔(۱) اس مثنوی کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد رستمی نے ''خاورنامہ'' کے نام سے ایک مثنوی منقبت میں لکھی، جس میں چوبیس ہزار اشعار تھے۔(۲) اور اس میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے کارنامے نظم کئے گئے تھے۔ اس عہد میں دیگر شعرائے دکن نے بھی چند تاریخی و عشقیہ مثنویاں لکھیں۔ سب سے زیادہ قابل ذکر ملا نصرتی کی مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ اور غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال، ملا ہاشمی کی یوسف زلیخا اور خواجہ محمود بحری کی من لگن ہیں اور اپنے دور کی یادگار مثنویاں سمجھی جاتی ہیں۔

ملا نصرتی نے ایک رزمیہ مثنوی

(۱) محمد قلی قطب شاہ سے پہلے بھی کئی شاعروں مثلاً نظامی اور اشرف وغیرہ نے مثنویاں لکھی ہیں۔
(۲) یہ رزمیہ مثنوی ہے۔ (ادارہ)

لکھی۔ اس میں علی عادل شاہ ثانی والیٔ بیجاپور (دکن) کے خاندانی حالات اور فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے، جس کا انداز ذیل کے اشعار سے معلوم ہوسکتا ہے:

کیا ہوں سخن مختصر یہ گمان
که یہ ماھنامہ دکن کا تو جان
که ہراک زباں حضرت غیب داں
سکھایا سب آدم کو جو تھے نہاں

خواجہ محمود بحری کی صوفیانہ مثنوی من لگن کا نمونہ یہ ہے:

اے روپ ترا رتی رتی ہے
پربت پربت، پتی پتی ہے
اور یوں بھی کہا نہ جائے تجھ کون
جو بیچ جگت کے جائے تجھ کوں

یہ اردو زبان کا ابتدائی دور تھا اور ان مثنویوں کی زبان بھی دکنی اردو ہے۔

دوسرا دور شاہ مبارک آبرو کا تھا، جس میں زبان نسبتاً زیادہ فصیح و شستہ ہو چکی تھی۔ لیکن اردو مثنوی کا باضابطہ دور جس کی زبان میں فصاحت و سلاست اور فنی لوازم کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا، سراج اورنگ آبادی کی مثنوی بوستان خیال سے شروع ہوا، جسے اب سے تقریباً دو سو برس پہلے کا زمانہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے موجودہ دور کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا انداز ملاحظہ ہو:

یہ دو دن کی تصنیف ہے حسب حال
زباں پر نکل آیا دل کا ابال
میں کہتا ہوں اول سے سب ماجرا
جو کچھ مجھ پہ گزرا ہے تا انتہا
ارے ہم نشینو مرا دکھ سنو
مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
کہوں کیا کلیجے میں سوراخ ہے
مری داستاں شاخ در شاخ ہے
وہی شمع کاشانۂ دلبری
چراغ شبستان جادو گری
یکایک ہوا سامنے جلوہ گر
نگہ تشنۂ خون ہر یہ جگر

اس مثنوی میں شاعر نے عشق مجازی کے پردے میں حقیقت و تصوف کی کیفیت بیان کی ہے۔

اس کے بعد عہد بہ عہد کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے ساتھ ترقی یافتہ دور کا آغاز ہوا۔ دکنی شعراء شاہ حسین ذوقی، شاہ پیراللہ، مجرمی اور عارف الدین خان عاجز وغیرہ کے بعد دھلی کے مکتب سخن کا عہد نمودار ہوا۔ اس میں میر اور درد کی نکھری اور ستھری زبان میں غزل گوئی کے ساتھ مثنوی نگاری کی ابتدا ہوئی۔

اس عہد میں اردو زبان پر فارسیت کا غلبہ تھا، چنانچہ میر و درد کی مثنویوں کی زبان میں وہی ترا کیب الفاظ اور محاورات ملتے ھیں۔ باقی دونوں اساتذہ اپنے وقت کے صاحب کمال تھے اور دونوں نے مخصوص انداز بیان کے جوہر دکھائے۔ میر کی مثنویوں میں "دریائے عشق" زیادہ مقبول اور مشہور ہوئی جس کا انداز یہ تھا:

ایک جا اک جوان رعنا تھا
لالہ رخسار، سرو بالا تھا
تھا طرحدار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
سر میں تھا شوق، شوق دل میں تھا
عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی
پھر نہ آئی اسے خبر اس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

یہ مثنوی واردات عشق و جذبات انسانی کی لطیف و دلکش تصویر ہے۔

سودا کی مثنویوں میں زیادہ تر ہجویہ مثنویاں ہیں جنکی اہمیت 'چوہے نامہ' 'بلی نامہ' سے آگے نہ بڑھ سکی۔

نسبتاً ترقی یافتہ اور فصاحت و سلاست کے دور کی مشہور و مقبول اردو مثنویوں میں حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جو اساتذۂ دہلی ولکھنؤ کی تصانیف ہیں:

۱- مثنوی سحر البیان (بدر منیر) میر حسن دہلوی
۲- " خواجہ حسن بخشی قلندر بخش جرأت
۳- " خواب و خیال خواجہ میر اثر دہلوی
۴- " بحر المحبت خواجہ مصحفی
۵- " گلزار نسیم پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی
۶- " طلسم الفت خواجہ فلق لکھنوی
۷- مثنوی قول غمیں حکیم مومن خاں مومن دہلوی
۸- " زہر عشق، بہار عشق و فریب عشق نواب مرزا شوق
۹- " معراج المضامین منیر شکوہ آبادی
۱۰- " صبح تجلی و چراغ کعبہ محسن کاکوروی
۱۱- " ترانۂ شوق منشی شوق قدوائی لکھنوی
۱۲- " نالۂ تسلیم امیر اللہ سلیم لکھنوی
۱۳- " ابر کرم امیر مینائی لکھنوی
۱۴- " فریاد داغ نواب مرزا خاں داغ دہلوی

ان کے علاوہ بے شمار مثنویاں اردو شاعری کا سرمایہ ہیں۔

مرزا رسوا لکھنوی کے عہد آخر یعنی ہندوستان کی جنگ آزادی کے بعد کی یادگار تھے۔ ان کی شاعری پر اودھ کے دور انحطاط اور سلطنت کی شکست و زوال کے پورے پورے اثرات تھے۔ ان کی مثنویاں بھی اسی کیفیت سے مملو ہیں۔
گو اس عہد میں مثنوی نگاری کا اسلوب خصوصاً اور اردو شاعری عموماً نمایاں طور پر ترقی پذیر تھی، لیکن مقامی تمدن و معاشرت اور قومی تہذیب کی تبدیل ہیئت سے بڑی حد تک متاثر ہوچکی تھی۔

رسوا کی مثنویاں عام البیانوی اسلوب سے ہٹ کر قدیم مثنوی نگاری کے انداز پر لکھی گئیں، جن کی مختصر کیفیت مرتب کے تعارف اور اور خود مصنف کے دیباچے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور بہر حال اس عہد کے کلاسیکی ادب کی اہم کڑی ہیں۔

تعارف مرزا محمد ھادی رسوا لکھنوی دنیائے ادب میں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (ناول) امراؤ جان ادا کی وجہ سے شہرت عام اور بقائے دوام کا رتبہ حاصل کرچکے ھیں۔ یہ ناول ان کی رسوائی کا سامان بھی ہے اورمقبولیت کا باعث بھی۔

مرزا صاحب کی نثری تصانیف میں تین ناول اور بھی ھیں، جو افسانوی ادب میں اعلیٰ درجہ رکھتے ھیں۔ (۱) ذات شریف (۲) شریف زادہ (۳) اختری بیگم۔ لیکن امراؤ جان ادا خاصہ کی چیز ہے۔ اور اپنی فنی خصوصیات، سلاست زبان و لطافت بیان کے لحاظ سے اردو ناول نگاری کا شاہکار تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت جو اردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ اس کا پلاٹ نہایت باقاعدہ اور منظم ہے، اور اس کے کیرکٹرز (اشخاص قصہ) صاف واضح طور پر نظر آتے ھیں۔ بقول مرزا محمد عسکری لکھنوی ”کسی ناول میں اتنی دلچسپی، اتنی کثرت واقعات، او فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہیں دیکھی۔ اس میں اس زمانے کی طرز معاشرت اور سوسائٹی کے ھو بہو نقشے کھینچے گئے ھیں، جن میں کسی قسم کا مبالغہ یا آورد نہیں ہے“۔

مرزا صاحب اس پایہ کے شاعر نہیں جس انداز کے ناول نویس ھیں۔ بقول خود ”ذوق شعر و سخن بچپن سے طبیعت میں تھا، نشو نما ایسے شہر میں پائی، شاعری جس کی طینت میں تھی“۔

ابتدا میں مرزا تخلص کرتے تھے، بعد میں رسوا ھوئے اور دنیائے شعراء میں دونوں تخلص مشہور ھو گئے۔ فن شعر میں اوج لکھنوی مرحوم خلف الصدق حضرت دبیر لکھنوی مرحوم کے شاگرد تھے۔ جوانی میں غالب کے رنگ کو پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ”دیوان غالب“ ان کو قریب قریب حفظ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ سادگی اور صفائی سے رغبت ھوئی اور مغلق نازک خیالی و عبارت آرائی سے اجتناب کرنے لگے۔

مؤلف تاریخ ادب اردو کا بیان ہے کہ مرزا، صفائی اور سادگی میں مومن کے متبع کہے جا سکتے ھیں۔ ان کا کلام نہایت صاف، سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ھوتا ہے۔

مرزا صاحب کی علمی ادبی فضیلت مسلم ہے۔ وہ اردو کے قادر الکلام شاعر اور ادیب ھونے کے علاوہ قدیم و جدید علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو گھر کی لونڈی تھی۔ عربی و فارسی کے منتہی تھے۔ انگریزی میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے فلسفہ اورعلم النفس میں ڈاکٹری کی تکمیل کی۔ اس لئے ان کو فلسفۂ نفسیات پر کامل عبور تھا۔ علاوہ ازیں فلسفۂ الٰہیات میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

تحصیل علم سے فارغ ھوکر مدت دراز تک لکھنؤ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی، عربی اور فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے کئی مشہور کالجوں میں تعلیم کے فرائض انجام دئے۔ آخر میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ میں رکن اعلیٰ مقرر ھوئے۔

ان کی منظوم تصانیف میں ایک ڈراما ”مرقع لیلیٰ مجنوں“ زیادہ مشہور ہے۔ اور دوسرا منظوم ڈراما ”طلسم اسرار“ جو اس سے

کم مشہور اور اب نایاب ہے۔ علاوہ ازیں غزلیات کا مجموعہ ہے، جو غیر مطبوعہ ہے، جستہ جستہ کچھ اشعار کہیں کہیں چھپے ہوئے ملتے ھیں، جن سے ان کی غزل گوئی کی طرز دلکش کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سب سے الگ مرزا صاحب کی دو مثنویاں بھی ھیں، جن کا ذکر ''تاریخ ادب اردو'' میں نام کی حد تک کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک مثنوی ''امیدوبیم'' ہے،(۱) جو پیش کی جارہی ہے۔ یہ اس دور کی یادگار ہے جب وہ صرف مرزا تخلص کرتے تھے اور کرسچن کالج لکھنؤ میں فارسی کے استاد رہے۔ یہ مثنوی ۱۸۹۶ع کے اوائل میں لکھی گئی اور ماہ اکتوبر میں الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ کے اہتمام سے چھپ کر پہلی اور آخری بار شایع ہوئی۔ اس لئے نادر روزگار سمجھی جاتی ہے۔ خاص خاص کتاب خانوں میں طبع اول کا قدیم نسخہ موجود ہے، ورنہ عام طور پر نایاب ہے۔ اور غالباً شائقین ادب کی نظر سے بہت کم گذرا ہو۔ میرے ذاتی کتب خانہ میں اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اور ایک مطبوعہ نسخہ، مذکورہ اڈیشن کا پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں بھی موجود ہے۔ کتاب خانہ عالیہ رام پور (انڈیا) میں مخطوطات اور مطبوعات دونوں زمروں میں شامل ہے۔ میں نے اپنے قلمی نسخے کی تصحیح ان دونوں نسخوں سے کی ہے، اس لئے زیر نظر نسخہ پر کامل یقین و اطمینان ہے۔

اس مثنوی کی خصوصیات خاصہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: ''اس میں حسن وعشق کی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ جو موجودہ شاعری کا ضروری جزو سمجھا گیا ہے، صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر کی گئی ہے۔ اور انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے۔ پھر طلسم امید و بیم کی ایک نمائش ہے''۔

مرزا صاحب نے مثنوی مذکور کے دیباچے میں سبب تصنیف اور موضوع سخن پر مختصر بحث کی ہے، جو ناظرین کرام خود ہی ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس لئے کسی طویل دیباچے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ترتیب یہ ہے کہ تمام مثنوی کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر حصہ کو ایک جزو قرار دیا ہے۔

(۱) پہلا حصہ یا جزو اول: حسن وعشق کی دلکش چھیڑ چھاڑ اور عام عاشقانہ داستان پر مبنی ہے، جس میں پلاٹ کا دروبست اور واقعہ نویسی اور کردار نگاری، جو مثنوی کے لوازم ھیں نام کو نہیں۔ قصہ برائے بیت گویا سخن گوئی کا ایک بہانہ ہے۔ انداز بیان، سلاست اور لطافت زبان جو مرزا صاحب کی شاعری کا خاصہ ھیں، بدرجۂ اتم پائے جاتے ھیں۔

(۲) دوسرا حصہ یا جزو دویم: خاص طور پر فلسفۂ حیات و کائنات اور صنعت کردگار کی عظمت و جلالت کے بیان میں ہے، جس میں انسان کے عادات و خصائل، حواس خمسہ اور ان کی کیفیات پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔

(۱) دوسری مثنوی ''نوبہار'' ہے جو اردو نامہ شمارہ پنجم میں شائع ہوچکی ہے (ادارہ)

علم النفس کے دقیق مسائل شاعرانہ انداز میں نہایت خوبی و دلکشی کے ساتھ بیان کئے ہیں اور خالق ارض و سما کی قدرت کاملہ کی جلالتوں کا ذکر کرکے کائنات کے مظاہر کی اجمالی صفات آیات قرآنی واحادیث قدسی کے حوالوں کے ساتھ لطیف و بدیع انداز میں نظم کئے ہیں۔(۱)

(۳) تیسرا حصہ یا جزو سویم : ایک خیالی خواب کی دلکش کیفیت ہے۔ یہ خواب "امید و بیم" کی ایک طلسمی نمائش ہے۔ جس میں 'امید' کو ایک حسینۂ پری تمثال اور 'بیم' کو ایک مکروہ ضعیفہ سے تعبیر کیا گیا ہے، خواب کی کیفیت میں لطف آشکار اور تعبیر کے بیان میں عبرت و بصیرت کا اظہار۔

غرض یہ مثنوی مکمل طور پر علم و ادراک اور پندوموعظت پر مشتمل ہے، جس میں جدید فلسفہ کے چند اہم نکات کو نہایت خوش اسلوبی اور جامعیت کے ساتھ نظم کے جامہ سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے۔

گویا آغاز میں عشق و جوانی یا بوالہوسی کا ذکر کرکے مظاہر قدرت کی حقیقتوں کی جانب ذہن انسانی کو متوجہ کیا گیا اور آخر میں انجام حیات دکھا کر درس بصیرت پیش کردیا ہے، کہ یہی فلسفۂ زندگانی ہے اور یہی دنیائے فانی کی مختصر کہانی!

میری ناچیز رائے میں اس مثنوی کی اشاعت ایک ادیب جلیل کی نادر تصنیف کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ اپنے موضوعات اور مرکز خیال کے لحاظ سے بھی ہمارے موجودہ اردو ادب میں ایک دلچسپ اور قابل قدر اضافہ ہے۔

شادم از زندگئ خویش کہ کارے کردم

لاہور ۷ جولائی ۱۹۶۰ع

عشرت رحمانی

---

(۱) مصنف نے حواشی میں ان حوالہ جات کا ذکر کیا ہے جو بجنسہ پیش ہیں۔ ان پر کسی مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

نقل سر ورق

مثنوی ٔ اُمید و بیم

مصنفہ

جناب مرزا محمد ہادی صاحب بی ۔ اے متخلص بہ مرزا
پروفیسر فارسی و عربی، ریڈر کرسچین کالج، لکھنؤ

جس میں

حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ جو موجودہ شاعری کا ضروری جزو سمجھا گیا ہے، صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر کی گئی ہے، اور انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے۔ پھر طلسم امید و بیم کی ایک نمائش ہے۔ المختصر فلسفۂ جدید کو صاف صاف اردو نظم کے جامہ سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔

اور جسے

کارپردازان الناظر بک ایجنسی نے برائے نفع برخوردار محمد علی سلمہ
الناظر پریس واقع لکھنؤ میں طبع کیا۔

مثنوی اُمید و بیم

بسم‌اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

قطعہ

کون پہچان سکے تیری ذات
اصل توحید ہو جب نفیٔ صفات
" ماعرفناک ،، ہے قول سید
ان پہ اور آل پہ انکی صلوات

خدا کی قدرت میں اکثر چیزیں چشم ظاہر کو غیر منتظم معلوم ہوتی ہیں حالانکہ وہی اُنکا عین انتظام ہے۔ عجب نہیں کہ یہ مختصر نظم بھی اس تکلف سے خالی نہ ہو۔ حسن تالیف کے ملاحظے کے لئے سلیقۂ سخن فہم بھی شرط ہے۔

جزو اول میں اُن آرزوؤں کا ذکر ہے، جو کبھی پوری نہ ہونگی، اُن حسرتوں کا بیان ہے، جو دل ہی دل میں خون ہوجائیں۔ کسی کے تصور سے رمز و کنایت، شکوہ و شکایت کا سلسلہ خواہ مخواہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس چھیڑ چھاڑ کی اصل ہے، یا نہیں ہے؟ نہ اس سے ناظرین کو سروکار، نہ شاعر کو ضرورت اظہار۔ صرف اتنا کہہ دینا شاید کافی ہو کہ شکایتیں سراسر غلط اور شکوے بالکل بیجا ہیں۔

یہ ہجر و صل کیا ذکر صنم کیا
ہماری شاعری کیا اور ہم کیا

جزو دوم میں صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر کی گئی ہے، پھر انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے۔

جزو سوم میں طلسم امید و بیم کی ایک نمائش دکھائی گئی ہے۔ ختم کلام ایسے تغزل پر ہے، جسے نہ مجاز کہہ سکتے ہیں، نہ حقیقت۔

شاعر کے خیالات کی تکمیل ناظرین کی وسعت نظر کے حوالے ہے۔ اور تنقیص معترضین کے ذمہ ہمت پر موقوف رکھی گئی ہے۔ دیکھنے والے دیکھہ لینگے، اور سمجھنے والے سمجھہ جائیں گے۔

لمولفہ

ہم اپنے دل میں خوش ہیں عیب بیں
کی نکتہ چینی سے
بھلائی کچھہ تو سمجھے ہیں برائی
دیکھنے والے

عنوان

غیرت دامن گلچیں ہے یہ نظم
حیرت جلوۂ پروین ہے یہ نظم

حسن گلدستۂ انظار بلند
لطف دیباچۂ افکار بلند

نازش فہم ہے دقت اس کی
ستم ایجاد ہے جدت اس کی

دل حاسد کیلئے برق بلا
قلب دشمن کیلئے تیر قضا

نام سے جس کے ہے عنوان بیاں
جس سے ہے یہ سرو سامان بیاں

ایک ہے خوبیٔ تقریر میں وہ
فرد ہے شوخیٔ تحریر میں وہ

دلبری بھی ہے نزاکت بھی ہے
حسن صورت بھی ہے سیرت بھی ہے

کیوں نہ چاہوں اُسے دلدار ہے وہ
کیوں نہ دل دوں کہ دل آزار ہے وہ

جان سے بڑھ کے ہے توقیر اس کی
صفحۂ دل پہ ہے تصویر اس کی

غزل

لا اُبالی ہے طبیعت میری
قیس سے بڑھ کے ہے وحشت میری

لائق رحم ہوں کیا پوچھتے ہو
آنکھ سے دیکھ لو حالت میری

واہ کیا خوب مری عزت کی
اسی قابل تھی محبت میری؟

یہ تو کہدو کہ برائی کیا ہے؟
کیوں نہ اُس در پہ ہو تربت میری؟

تم پہ مرتا ہوں یہ سب جانتے ہیں
اسی باعث سے ہے شہرت میری

یاد ہے یاد ہے اب تک مرزا
حشر یعنی شب فرقت میری

جزو اول

(ذکر عنفوان شباب بہ تمہید حال خواب)

مدد اے حوصلۂ عشق و وفا
مدد اے ولولۂ حرص و ہوا

مدد اے غلغلۂ جامہ دری
مدد اے سلسلۂ بخیہ گری

مدد اے رنج گرفتاریٔ دل
مدد اے راحت بیکاریٔ دل

مدد اے سوزش پنہاں ہوس
مدد اے سوزش طوفان ہوس

مدد اے حسرت ناکامیٔ شوق
مدد اے وسعت بدنامیٔ شوق

مدد اے شدت درد جاں کاہ
مدد اے سرکشیٔ نالہ و آہ

مدد اے دوستیٔ تیغ و جگر
مدد اے دشمنیٔ سعی و اثر

مدد اے لذت افکار محال
مدد اے تلخیٔ اوقات خیال

مدد اے ہمت دشوار پسند
مدد اے جرأت آزار پسند

مدد اے نطق پریشاں تقریر
مدد اے خامۂ ہذیاں تحریر

لکھ وہ احوال کہ شرم آئے مجھے
کہہ وہ افسانہ کہ رلوائے مجھے

سب مرے حال سے ماہر ہوجائیں
آرزوئیں مری ظاہر ہوجائیں

ہاں! مجھے حسرت رسوائی ہے
لوگ جانیں کہ یہ سودائی ہے

حال دل یار سے کہنا ہے مجھے
شوق اظہار تمنا ہے مجھے
تاکہ ظاہر ہو محبت میری
پاکبازوں میں ہو شہرت میری

سب سمجھ جائیں کہ سودا ہے اسے
نہ ملے مجھ سے نہ ملنا ہو جسے
مجھ کو نفرت ہے ریاکاری سے
چڑ ہے عیاری و مکاری سے

دل سے ہوں خادم ارباب وفا
میری طینت میں نہیں مکر و دغا
سوء ظن کی مجھے پرواہی نہیں
بد گماں سے کبھی ملتا ہی نہیں

مجھ کو رغبت نہیں ان باتوں سے
عار ہے ایسی ملاقاتوں سے
جس کی طینت میں نہیں شر و فساد
وہ سمجھتے ہیں مجھے نیک نہاد

زر بے غش ہے طبیعت میری
لوث سے پاک ہے طینت میری
میرا مسلک نہیں جز سادہ دلی
مجھ کو مطبوع ہے آزادہ دلی

فخر ہے خوبیٔ فطرت پہ مجھے
ناز ہے حسن طبیعت پہ مجھے
حضرت اوج ہیں میرے استاد
جو کہ ہیں موجد طرز ایجاد

شعر گوئی کو ہے خود ناز آن پر
شاعر آل محمد جعفر
ہیں وہ یکتا خلف الصدق دبیر
مرثیہ گوئے جناب شبیر

علم تحقیق کے عامل ہیں وہی
فن تنیقد میں کامل ہیں وہی
اہل فن دل سے ہیں قائل آن کے
کون آتا ہے مقابل آن کے

آئے وہ جسکو سر جولاں ہے
ہاں یہی گو ہے، یہی میداں ہے
کہہ کے دکھلائے جو کچھ کہنا ہو
سامنے آئے جسے دعوا ہو

آنکا انداز ہے اعلیٰ سب سے
طرز بندش ہے نرالا سب سے
آنکی قدرت میں ہے اعجاز سخن
آنکے باعث ہی ہے اعزاز سخن

فضلہ خواروں میں نظامی آن کے
دُر دنوشوں میں ہے جامی آن کے
رشک مستوفی وقاآنی ہیں
فخر فردوسی وخاقانی ہیں

کیوں نہ ہوں ان پہ سخنور مفتوں
آن کے حصے میں ہے نازک مضموں
مستفیض آن کی عنایت سے ہوں میں
مستفید آن کی محبت سے ہوں میں

ایسوں ویسوں کی ثنا پر کیا فخر
آنکی تعریف پہ ہے زیبا فخر
چار دن سے نہیں یہ شوق سخن
بچپنے سے ہے مجھے ذوق سخن

قدر دانوں میں ہے عزت میری
نکتہ سنجوں میں ہے شہرت میری
مجھ کو پہچانتے ہیں اہل ہنر
جوہری جانتے ہیں قدر گہر

لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں مجھے
آرزوؤں سے بلاتے ہیں مجھے

رونق بزم سخن ہے مجھ سے
زینت صحن چمن ہے مجھ سے

یہ جو ہے مشغلۂ راز و نیاز
کیا کروں میں کہ طبیعت ہے گداز

دل لگانا کوئی تقصیر نہیں
دل لگی لائق تعزیر نہیں

دل کی وحشت اثری سے خوش ہوں
اپنی آشفتہ سری سے خوش ہوں

ایک مدت سے میں سودائی ہوں
حسن صورت کا تماشائی ہوں

دم نکلتا ہے ستمگاروں پر
جان جاتی ہے دل آزاروں پر

زندگی حسن پرستی میں کٹی
غفلت و رندی و مستی میں کٹی

عاشق حسن خداداد ہوں میں
کشتۂ خنجر بیداد ہوں میں

بچپنے ہی میں گنہ گار ہوا
بادۂ عشق سے سرشار ہوا

اک پری وش پہ طبیعت آئی
دل یہ سمجھا کہ قیامت آئی

وہ تڑپنا شب تنہائی کا
وہ بگڑنا دل سودائی کا

اک بت وعدہ فراموش کی یاد
اور اس یاد میں شوق فریاد

یار سے وعدہ وفائی کی امید
اپنی آہوں سے رسائی کی امید

ہائے وہ ذلت و خواری کے مزے
ہائے! وہ نالہ و زاری کے مزے

عشق میں حد سے گزرنا اپنا
وہ عزیزوں سے نہ ڈرنا اپنا

کسی پہلو جو نہ چین آتا تھا
گھر سے چھپ چھپ کے نکل جاتا تھا

نالہ و زاری و ناکامیٔ دل
ذلت و خواری و بدنامیٔ دل

جان دینے کی قسم کھالینا
ہو کے مایوس وہ سم کھالینا

مگر اس زہر نے تاثیر نہ کی
کیونکہ یہ خواہش تقدیر نہ تھی

کی عزیزوں نے دوا جان بچی
بچ گئی جان تو کیا جان بچی

ہو گئے سب کی نگاہوں میں حقیر
پڑ گئی پاؤں میں بھاری زنجیر

یاد ہے ہائے! وہ ذلت اب تک
یاد ہے قید مصیبت اب تک

یاد ہے وہ تپش درد و الم
یاد ہے وہ خلش جور ستم

ناصحوں کی وہ نصیحت بھی ہے یاد
نمک زخم کی لذت بھی ہے یاد

سوزش زخم جگر یاد ہے ہاں
سوزش دیدۂ تر یاد ہے ہاں

یاد ہے حال پریشانیٔ دل
یاد ہے بے سروسامانیٔ دل

یاد ہیں ہجر کی راتیں مجھ کو
یاد ہیں دل کی وہ باتیں مجھ کو

رات بھر نیند کسے آتی تھی
یونہی باتوں میں گزر جاتی تھی

اپنی حالت کا کبھی ذکر آیا
اس کی صورت کا کبھی ذکر آیا

جلوہ گر جب ہوا ماہ تاباں
یاد آیا ہمیں روئے جاناں

پھر ہوا چشم فسوں ساز کا ذکر
نگہ ناز کے اعجاز کا ذکر

کبھی وہ زلف رسا یاد آئی
یاد آئی تو بلا یاد آئی

وہ بلا جس کی بلائیں لے کر
مر گئے لوگ دعائیں دے کر

وہ دل آویز و مسلسل تقریر
وہ مفصل و مطول تقریر

مگر اس طول سے حاصل نہ ہوا
مطمئن ہم نہ ہوئے دل نہ ہوا

شعر گوئی کی لڑکپن سے ہے دھن
ہے اسی سن سے مجھے ذوق سخن

جی میں آیا کہ سراپا لکھیئے
نا امیدی نے کہا کیا لکھیئے !

یہ تو تھا پہلے پہل کا مذکور
ہے عزیزوں میں جو اب تک مشہور

آج تک لوگ سناتے ہیں مجھے
جھینپتا ہوں میں جھنپاتے ہیں مجھے

یاد ہیں تجھ کو وہ اگلی باتیں
یاد ہیں اب بھی وہ دن، وہ راتیں

یاد ہے تجھ کو جنوں کا آغاز
یاد ہے وحشت دل کا انداز

ہم نے زنجیر پنہائی تھی تجھے
راہ زنداں کی دکھائی تھی تجھے

یاد ہے اب بھی وہ بیداد تجھے؟
یاد ہے سیلیٔ استاد تجھے؟

رنج پہنچا تھا ہمیں سے تجھ کو
مار کھلوائی تھی ہم نے تجھ کو

یاد ہو یا کہ نہ ہو اے مرزا

ہتھکنڈے تیرے برے تھے مرزا

کچھ عجب طور کی جھک تھی تجھ کو
بچپنے ہی میں سنک تھی تجھ کو

گو کہ بے سود ہے اسکا مذکور
وہ بھی کیا دن تھے تری جان سے دور

تو ہی کہہ، حال برا تھا کہ نہ تھا؟
عشقبازی کا مزا تھا کہ نہ تھا؟

دشمنوں کا تھا کچھ ایسا احوال
دوست کہتے تھے کہ جینا ہے محال

ہم نے کی تیرے مرض کی تشخیص
ہم نے کی تیری دوا بالتخصیص

دے کے فقرے ترے ہمراز بنے
سن لیا بھید تو غماز بنے

گو کہ ظاہر میں یہ عیاری کی
فی الحقیقت تری غمخواری کی

گھر سے پوشیدہ گیا تھا تو کہیں!
ڈھونڈ لائے تھے تجھے جاکے ہمیں

الغرض جیتے ہیں اکثر احباب
جن پہ ظاہر ہے مرا حال خراب

کیوں ہوں بدنام برا کہہ کے انھیں
ٹال دیتا ہوں "بجا" کہہ کے انھیں

سامنے ان کے نہ جھینپوں کیونکر
ان کا احسان ہے سر آنکھوں پر

ایسے اچھوں کو برا کیا کہنا
خوب احسان کیا، کیا کہنا!

کم نہیں ہیں، یہ ستانے کے لئے
اب بھی ہنستے ہیں، رلانے کے لئے

کیا کہوں ان کو دل آزار تو ہیں
خیر! جیتے رہیں غمخوار تو ہیں

دکھ لی خوب محبت ان کی
اب ہے بیکار شکایت ان کی

(بیان عشق تازہ)

پھر ہوا عشق دل مضطر کو
دو خبر میرے نصیحت گر کو!

ہے ابھی تک وہی آشفتہ سری
چارہ گر آکے کریں چارہ گری

کوئی تدبیر نکالیں اب بھی
وہی زنجیر نکالیں اب بھی

آج تک سر سے وہ سودا نہ گیا
عشقبازی کا وہ لپکا نہ گیا

راہ الفت میں مجھے ٹوکیں تو
لو میں جاتا ہوں مجھے روکیں تو

ہے بہت حال پریشاں میرا
ٹکڑے ٹکڑے ہے گریباں میرا

دھجیاں ڈھونڈھ کے لائے کوئی
پھر رفوگر کو بلائے کوئی

جوش وحشت سے ہے پھر حال ابتر
کہدو فصاد سے لائے نشتر

ہے وہی جوش جنوں کا انداز
آہ دلسوز، نفس سینہ گداز

ہے ابھی تک وہی شوریدہ سری
دل میں اب تک ہے وہی آگ بھری

شعلے اٹھتے ہیں جلانے کیلئے
اشک جاری ہوں بجھانے کیلئے

کوئی آفت سے بچالے مجھ کو
درد اٹھا ہے سنبھالے مجھ کو

دل کو روکوں یہ مجھے تاب کہاں
مجھ سے ممکن ہی نہیں ضبط فغاں

نہ کروں درد میں اف اف کب تک
ہمنشینوں سے تکلف کب تک!

غیر ممکن ہے کوئی سمجھالے
لب تک آنے ہی کو ہیں اب نالے

کوئی یہ طرز فغاں دیکھے تو
دل سے اٹھتا ہے دھواں دیکھے تو

ہو اگر تاب سماعت ناصح
سن لے افسانۂ وحشت ناصح

صلح کی بات میں لڑنا کیسا؟
کیوں، ابھی سے یہ جھگڑنا کیسا؟

تو مرا حال ذرا سن تو سہی!
ٹھہر، اے مرد خدا! سن تو سہی

تیری عادت ہے فضیحت کرنا
پہلے سن لے، تو نصیحت کرنا

ہائے وہ ہاتھ سے جانا دل کا
وہ کسی شخص پہ آنا دل کا

اسکے کوچے میں وہ جانا سر شام
باغ میں اس کا وہ آنا سر شام

زلف بکھرائے ہوئے تا سر دوش
چشم بد مست نگہ آفت ہوش

بیوفائی کا نشاں چین جبیں
آنکھ میں نام مروت کا نہیں

سانولا رنگ نشیلی آنکھیں
شوخ، طرار، رسیلی آنکھیں

وہ چھریرا بدن اُس کا نازک
سر بسر ناز، سراپا نازک

اس نزاکت پہ غضب سنگیں دل
قتل عاشق پہ ہمیشہ مائل

قد وہ بوٹاسا، قیامت آفت
فتنہ اٹھنے ہی کو ہے قد قامت

فتنہٗ دھر ہے وہ مست خرام
حشرخودجس کو کرے جھک کےسلام

عشوہ و غمزہ و انداز و ادا
دل بسمل کے لئے قہر خدا

تیغ انداز کو چمکائے ہوئے
قتل عاشق کی قسم کھائے ہوئے

دو نگاہوں کا بہم ہو جانا
دل مضطر پہ ستم ہو جانا

اُسکا انداز جو مجھ کو بھایا
اک نظر دیکھتے ہی دل آیا

اُس کیا دیکھ کے یہ حال ہوا
کیا کہوں تجھ سے عجب حال ہوا

روز جاتے تھے ہم اُس کوچے میں
گو ٹھہرتے تھے کم اُس کوچے میں

کرتے کس طرح نظارے بازی!
چڑھ ہے اُس بت کی اشارے بازی

عرض مطلب کی اجازت کیسی!
شوق دیدار کو رخصت کیسی!

اُن سے کچھ عرض کرے کس کی مجال
بات کرنا ہے وہاں امر محال

سعیٔ مجبور، اُمیدیں ناچار
فکر بے سودٗ دعائیں بیکار

اُس کے مذہب میں محبت ہے گناہ
اُسکی ملت میں مروت ہے گناہ

بے حجابی میں حیا اور ستم
بے نیازی کی ادا اور ستم

گو کہ ہم بھی ہیں پرانے مشاق
فن معشوق فریبی میں ہیں طاق

آنکھ بے شرم نگاہیں بیباک
دل ہوس کوش طبیعت چالاک

چشم کو شوق نظر بازی کا
ادعا اشک کو غمازی کا

مگر اُس شوخ پہ قابو نہ چلا
کسی عنوان سے جادو نہ چلا

جذب دل نے کوئی تدبیر نہ کی
آہ و فریاد نے تاثیر نہ کی

رہ گیا گھٹ کے دل عہدہ فن
کوئی پیدا نہ ہوئی راہ سخن

مدتوں میں نے کیا دل میں غور
عرض مطلب کا نہ نکلا کوئی طور

گو کہ موقع تھا سخن سنجی کا
خوف تھا اُن کی شکر رنجی کا

میں نے اک روز پڑھے کچھ اشعار
جن میں تھا مطلب دل کا اظہار

ہوگئے دنگ بتے کی سن کے
اڑ گیا رنگ بتے کی سن کے

طرز گفتار وہ پہچان گئے
جھینپ کر دل میں برا مان گئے

حال دل کا نہیں چھپتا زنہار
کھل ہی جاتا ہے یہ بھید آخر کار

شوق دیدار نظاروں سے کھلا
عشق کا حال اشاروں سے کھلا

نظر شوق میں تھا لطف بیاں
چشم حیراں نے کیا کار زباں

مگر اُس بت کا تغافل نہ گیا
اس تعارف سے تجاہل نہ گیا

میری جانب سے تو اصرار رہا
اُسکو دل لینے سے انکار رہا

بعد مدت کے مجھے شاد کیا
لیکے دل رنج سے آزاد کیا

باتوں باتوں میں کیا عہد وفا
میں یہ سمجھا کہ ہوئی ترک جفا

خوش ہوا میں کہ بس اب کام ہوا
خواہش دل کا سرانجام ہوا

پھر یہ اُس نے ستم ایجاد کیا
شاد کر کے مجھے ناشاد کیا

دفعتہً عہد محبت توڑا
غیر سے رشتۂ الفت جوڑا

دل پہ اک داغ دیا، وائے ستم
مجھ سے منہ پھیر لیا ہائے ستم

میری فریاد و بکا سے نہ ڈرا
کیسی فریاد، خدا سے نہ ڈرا

دل پہ نشتر کا لگانا کیا تھا!
غم رسیدوں کو ستانا کیا تھا!

(حسن التفات بہ معشوقۂ طناز و ختم دستانِ راز و نیاز)

ہم نہ سمجھے تھے کہ ایسے ہو تم
الغرض خوب ہو، جیسے ہو تم

کیوں چراتے ہو نظر، دیکھو تو
جھینپتے کیا ہو، ادھر دیکھو تو

تم کو زیبا نہیں ایسا پرہیز
چاہنے والوں سے کیسا پرہیز

عشقبازی کہیں معیوب نہیں
مان جاؤ، یہ ضدیں خوب نہیں

دیکھو کیا بات ہے دل میں سمجھو!
کیوں دیا حسن خدا نے تم کو!

ایسے مغرور نہ ہو ہم سے ملو!
عشق کی قدر کرو ہم سے ملو!

تھی الفت میرے بھی لیکن عیاں
لیکن ہے ایک طرح پھر عیاں

حسن صورت پہ نہیں اچھا فخر
حسن سیرت پہ نہیں زیبا فخر

تم سے دنیا میں حسیں اور بھی ہیں
دور کیوں جاؤ یہیں اور بھی ہیں!

میرے دل میں ہے تمہاری الفت
ہے یہ الفت بھی خدا کی قدرت

تم پہ مرتا ہوں خدا جانے کیوں
چاہتا ہوں تمہیں کیا جانے کیوں

میں ہوس کار نہیں سمجھو تو
کچھ طلبگار نہیں سمجھو تو

عاشق زار ہوں کہتے کیا ہو؟
میں وفادار ہوں کہتے کیا ہو؟

تم سے ہے نیم نگہ کی امید
کہ ہے درماندہ عمر جاوید

مجھ کو اس امر میں ہے خود حیرت!
کہ مجھے کیوں ہے تمہاری الفت!

مدتوں سے ہے تمہیں یہ وسواس
کہ مجھے غیر کی الفت کا ہے پاس

مجھ کو ہوتی جو کسی سے الفت
تم سے اسطرح نہ کرتا منت

کیا غلط فہم ہو سمجھو تو ذرا
ایسے ناداں نہیں تم نام خدا

میں جو بالفرض کسی پر مرتا
التجا کیوں نہ اسی سے کرتا

عیب بینی نہیں اچھی ہوتی
نکتہ چینی نہیں اچھی ہوتی

باز آجاؤ اب ان باتوں سے
تم کو بھی شوق ہے کن باتوں سے

ہیں زمانے میں در انداز بہت
ہوتے ہیں تفرقہ پرداز بہت

چاہتے ہو تم اگر میری فلاح!
کیوں کسی شخص سے لیتے ہو صلاح؟

فائدہ کیا مجھے رلوانے سے؟
اور پھر غیر کے بہکانے سے

اے مرے دل کے جلانے والے
آگ میں آگ لگانے والے

دل میں جو بات ہے کیونکر نہ کہوں؟
کیا کہوں تجھ کو ستمگر نہ کہوں؟

اور کیا کہہ کے تجھے یاد کروں؟
کس طرح نالہ و فریاد کروں؟

دل سے بیزار ہے حسرت میری
مجھ سے بگڑی ہے طبیعت میری

دم نکالے سے نکلتا ہی نہیں
دل سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں

دم نہ نکلے تو نکالوں کیونکر؟
دل نہ سنبھلے تو سنبھالوں کیونکر؟

حیف اک دم کی بھی مہلت نہ ملی!
مجھ کو مرنے کی بھی فرصت نہ ملی!

شکوۂ بخت بجا ہو کہ نہ ہو
نالۂ شوق رسا ہو کہ نہ ہو

تابکے تیری شکایت نہ کروں؟
گلۂ خوبیٔ قسمت نہ کروں؟

بیوفائی کی بھی حد ہوتی ہے
کج ادائی کی بھی حد ہوتی ہے

کوئی تجھ سا ستم ایجاد نہیں!
کیا تجھے عہد وفا یاد نہیں؟

دلربا ہو کہ دل آزار نہ ہو
تا کہ جینا مجھے دشوار نہ ہو

تا کجا درد چھپاؤں دل میں؟
نفس سرد چھپاؤں دل میں!

عشق اور رشک چھپے بھی ہیں کہیں
کیا کروں دل مرے قابو میں نہیں

تا بہ مقدور چھپایا میں نے
حال دل کا نہ سنایا میں نے

میں نے اب تک نہ بہائے آنسو
پی گیا میں اگر آئے آنسو

آنکھ پر زور ہے دل پر تو نہیں
دل ہے انسان کا پتھر تو نہیں

منہ سے نکلے نہ کہیں شور فغاں
مجھ سے رکتا نہیں اب زور فغاں

مجھ سے ہرگز نہیں رکنے والے
لب تک آنے ہی کو ہیں اب نالے

چیخ اٹھوں تو قیامت ہو جائے
راز کے کھلتے ہی آفت ہو جائے

واقعی میں نے بہت صبر کیا
دل ناداں پہ بڑا جبر کیا

دم نہ گھٹ گھٹ کے نکل جائے کہیں!
کیسے انساں ہو، تمہیں رحم نہیں!

دیکھو اتنا نہ ستاؤ مجھ کو
نہ رلاؤ نہ رلاؤ مجھ کو!

تم پہ ظاہر ہے مرا جوش جنوں
جانتے ہو کہ میں دیوانہ ہوں

چاک کرتا ہوں گریباں اپنا
تم بچاتے رہو داماں اپنا

زہر کھالوں، یہ تمہیں ہے منظور؟
جان لو مجھ سے نہیں یہ بھی دور!

ایسی باتوں کا برا ہے انجام
مفت میں تم نہ کہیں ہو بدنام

بے سبب مجھ کو ستانا چھوڑو!
آزمائش کا بہانہ چھوڑو!

دل یہ صدمے میں اٹھاتا ہی رہا
حال دل تم سے چھپاتا ہی رہا

گو کہ ظاہر میں نہ تھا کچھ پردا
کبھی جی بھر کے نہ تم کو دیکھا

کبھی آنکھوں میں نہ ڈالیں آنکھیں
تم نے دیکھا تو جھکا لیں آنکھیں

[illegible] نہیں جانتے کا میرا حال تباہ!
لوگ یہ پہچانتے ہیں طرز نگاہ

دفعتہً سامنے آیا نہ کرو!
بجلیاں دل پہ گرایا نہ کرو!

میری رگ رگ پہ اثر پڑتا ہے
اسطرح سے، کہ نظر پڑتا ہے

متغیر جو مجھے پاتے ہیں
دیکھنے والے سمجھ جاتے ہیں

مجھ کو دیوانہ سمجھتے ہوں گے
اور کیا کیا نہ سمجھتے ہوں گے

خیر اس کی تو نہیں کچھ پروا
خوف یہ ہے، کہ نہ ہو تم رسوا

یوں تو ہیں دل میں ہزاروں ارمان
غیر ممکن ہے کہ ہو ان کا بیان

ایک مطلب ہے مگر سب سے اہم
تم اگر سن لو تو ہے عین کرم

شیفتہ اپنا سمجھ لو مجھ کو
گوشۂ دل میں جگہ دو مجھ کو

تم کو لازم ہے مرا پاس کرو!
دل میں کچھ اور نہ وسواس کرو!

شاعری اسکو نہ سمجھو زنہار
واقعی ہے یہ مری حالت زار

چاہیئے تم کو مرا دھیان رہے!
عشق پر حسن کا احسان رہے!

جزو دوم

(خطاب بہ نفس و طلوع صبح ہجری)

اے دل بیخبر! اے غافل مدہوش!
صبح ہوتی ہے نہ ہو مائل خواب!

خواب غفلت کا یہ ہنگام نہیں !
استراحت کا یہ ہنگام نہیں !

جلوہ گر ہے سحر بیم و امید
حیرت افزا ہے طلوع خورشید

نیند سے چونک سحر ہے غافل !
وقت سامان سفر ہے غافل !

رات کے عیش کو اب یاد نہ کر
عمر بے فائدہ برباد نہ کر

عیش کیسا، کہ نہ زر ہے نہ شباب
لطف کیسا، نہ گزک ہے نہ شراب

رات کا ذکر اب افسانہ ہے
نہ وہ ساقی ہے نہ پیمانہ ہے

اب نہ وہ ساز مسرت، نہ وہ ہم
نغمۂ عیش میں ہے تال، نہ سم

شب کے پھولوں میں وہ رنگت ہی نہیں
باسی ہاروں میں وہ نکہت ہی نہیں

کیا ضرورت ہے، کہ غافل ہی رہیں
خواب خرگوش پہ مائل ہی رہیں

لذت عیش کو دل کیوں ترسے ؟
وقت وہ ہے کہ اٹھیں بستر سے

صبح کا وقت نہیں شام کا وقت
کیسا آرام، کہ ہے کام کا وقت

نہ وہ ساقی، نہ وہ مطرب، نہ وہ رات
رات کے ساتھ گئی رات کی بات

کیا کریں دیکھ کے اب سوتے فلک؟
شب مہتاب نہ تارے نہ جھلک!

نہ رہا وقت، نہ وہ شوق، نہ ذوق
اب اتاریں گے خمار مئے شوق

نہیں وہ بات تو وہ ہم بھی نہیں !
نہیں وہ رات، تو وہ ہم بھی نہیں !

اب جوانی کو بھلا دیں دل سے
عیش فانی کو بھلا دیں دل سے

اب نہ بھولے سے بھی یاد آئے گی
کیا قیامت میں یہ بخشائے گی

اسی کم بخت نے برباد کیا
دل آزاد کو ناشاد کیا

یاد کیوں آئے یہ کافر ظالم ؟
ستم ایجاد ستمگر ظالم !

اگر ایسی ہی مروت تھی اسے
واقعی ہم سے محبت تھی اسے

پھر گئی ہم سے یہ منہ موڑ کے کیوں؟
چل بسی آپ ہمیں چھوڑ کے کیوں؟

ذوق آوارگی و خواری کیا ؟
بیوفاؤں سے وفاداری کیا ؟

دور ہو! دور ہو، اے یاد شباب
دور ہو! دور ہو، اے خانہ خراب

اے جوانی، نہ ستا تو مجھ کو !
یاد اپنی نہ دلا تو مجھ کو

ساتھ دینا تھا تجھے تا دم مرگ!
تو جو ہوتی تو نہ ہوتا غم مرگ

گو تری یاد میں اک لذت ہے
ایسی لذت سے ہمیں نفرت ہے

جانتا ہوں تجھے، کیا چیز ہے تو!
نقش موہوم ہے، ناچیز ہے تو

تجھ سے ناچیز کا پھر ذکر ہی کیا؟
جس سے حاصل نہ ہو وہ فکر ہی کیا؟

تیرے جانے کی شکایت بیکار!
ہے یہ سب حرف و حکایت بیکار!

ذکر بے فائدہ سے فائدہ کیا؟
فکر بے فائدہ سے فائدہ کیا؟

تیرے جاتے ہی گیا جوش جنوں
اب نہ وہ دل ہے نہ وہ گرمیٔ خوں

اب وہ بے چین طبیعت ہی نہیں
اب وہ شوخی، وہ شرارت ہی نہیں

وہ بھی دن تھے کہ مجھے وحشت تھی
یعنی اعصاب میں اک جودت تھی

ہاں مجھے یاد ہیں وہ عیش کے دن
مگر اس عیش کے اب دن ہیں نہ سِن

اب نہ وہ دل ہے، نہ وہ باتیں ہیں
اب نہ وہ دن ہیں، نہ وہ راتیں ہیں

ہیچ ہے اب، غم ایام شباب
پوچ ہے، ماتم ایام شباب

فائدہ کیا جو ستایا دل کو!
خود کُڑھے اور کُڑھایا دل کو

لغو ہے ذکر خیال گمراہ
ہے گناہوں کا بیاں عین گناہ

وہ گنہ جس میں نہیں کچھ لذت!
حاصل اس ذکر سے کیا جز حسرت؟

چاہیئے مجھ کو پشیماں ہونا
فکر انجام نہیں گریاں ہونا

اک وطیرہ ہے یہی چال جہاں
ہے بہار آج تو کل فصل خزاں

غفلتوں میں کٹا عہد شباب
لیٹو آنکھیں! اے خانہ خراب

عمر بیکار نہ ہرگز کھو تو!
اپنی تقدیر پہ راضی ہو تو!

حیف ضائع ہوئے چالیس برس
زندگی اور ہے دس بیس برس

حسب ظاہر ہیں یہ انداز حیات
ورنہ کیا جانے کوئی راز حیات

ہے وہی واقف اسرار نہاں
جس کو یکساں ہے نہاں اور عیاں

خیر اتنی بھی نہیں کم فرصت
ہے غنیمت جو ہو اک دم فرصت

(صرف توجہ از خوف مرگ)

موت کی یاد سے ڈرنا کیسا؟
قبل مرنے کے یہ مرنا کیسا؟

کچھ خبر ہے تجھے کیا ہونا ہے!
ایک دن سب کو فنا ہونا ہے!

از زمیں تا بہ فلک سب موہوم
آدمی ہو کہ فلک سب معدوم

اک فقط تو ہی نہیں ہے فانی!
آسماں اور زمیں ہے فانی

ایک باقی ہے فقط ذات خدا
جس کے محکوم ہیں سب شاہ و گدا

موت کے نام سے کیوں ہے خفقان؟
ہے یہ اسرار خطائے دو جہاں

اپنی تقدیر پہ قانع ہو تو
ورنہ بیٹھے ماتم ہو تو

کوششوں میں کچھ اثر پیدا کر
دیکھ اس کو، وہ نظر پیدا کر
سر ہو گنجینۂ راز مطلوب
دل ہو آئینۂ ناز محبوب

خوئے مطلوب کی ہو تجھ کو خبر
روئے محبوب پہ ہو تجھ کو نظر

خوئے مطلوب ہے، خلق کامل
روئے محبوب ہے، نور بے ظل

(صرف توجہ از ما سواللہ)

ماسواللہ کی الفت ہے خبط
یہ ہے مضمون سراسر بے ربط

لائق دید نہیں چشم حباب
قابل عشق نہیں نقش بر آب

کمیٔ عمر کا شکوہ ہے فضول
دیکھو ہوتا ہے ابھی تو معقول

تونے اس عمر میں کیا کام کیا؟
کچھ وہاں کا بھی سر انجام کیا؟

تو سمجھتا تھا کہ ہے فرصت کم!
چاہیئے تھا کہ نہ کھوتا کوئی دم!

اپنی حالت پہ نظر تھی کہ نہ تھی؟
تجھ کو مرنے کی خبر تھی کہ نہ تھی؟

گو کہ ظاہر ہے کمی فرصت کی
محض بیجا ہے شکایت تیری

جب کہ مرنا تھا تجھے اے غافل!
کچھ تو کرنا تھا تجھے اے غافل!

فرض اپنے نہ کئے تو نے ادا
کس طرح جائیگا تو پیش خدا؟

تجھ کو فرصت ہی نہ دی، غفلت نے
تجھ کو مہلت ہی نہ دی، حیرت نے

کاش حیرت کا سمجھتا تو مآل!
جانتا دھر کو، اک وھم و خیال

شوق تھا تجھ کو، گنہگاری کا!
ذوق تھا تجھ کو، گرفتاری کا!

معصیت ھی میں گرفتار رہا
فکر توبہ سے تو بیزار رہا

" موتوا قبل ان تموتوا "

وھم و ھستی میں گذر جانا تھا
موت کے قبل ھی مرجانا تھا

موت کیا چیز ہے، ترک لذات
ہے اسی موت سے، مقصود حیات

رنگ و بو سے نہ رہے کچھ مطلب
تیرے نزدیک یہ معدوم ہو سب

جز فنا اور نہ ہو کچھ مطلوب!
جز خدا اور نہ ہو کچھ مطلوب!

(با ھمہ و بے ھمہ)

غیر سے تجھ کو محبت نہ رہے!
زن و فرزند سے الفت نہ رہے!

الفت غیر سے ہے یہ مقصود
جس سے ہو اکرکہ نوال معبود

ورنہ ہے عین علامت الفت
اصل ایمان ہے محبت الفت

گو کہ ہر چیز سے ہے تو مالوف
دل رہے یاد خدا میں مصروف

دل کا رجحان تو رہے ایک طرف
تا بہ امکاں تو رہے ایک طرف

محبت بے غرض

چاہئیے تجھ کو محبت سب سے
ہاں! مگر ہو نہ کسی مطلب سے

جب غرض ہو تو محبت کیسی
اس محبت سے عداوت اچھی

ایسی الفت سے خدا تجھ کو بچائے
دھیان بھی اسکا ترے دل میں نہ آئے

بلکہ لازم ہے یونہی عشق خدا
جس میں مطلب کو نہ ہو دخل ذرا

خوف دوزخ، نہ ہو پروائے بہشت
بیم اعراف نہ سودائے بہشت

بھیج دے دوست جہنم میں اگر!
سو بہشتوں سے وہ دوزخ بہتر

نعت صاحبان تسلیم و رضا

ہے یہی مسلک تسلیم و رضا
ہیں اسی راہ پہ سب اہل وفا

جز خدا غیر سے ڈرتے ہی نہیں
جز خدا اور پہ مرتے ہی نہیں

شاد رہتے ہیں صعوبت میں بھی
شکر کرتے ہیں، مصیبت میں بھی

نفس سرد سے خوش ہوتے ہیں
لذت درد سے خوش ہوتے ہیں

لاکھ آفت ہو تاسف نہ کریں
دم نکل جائے مگر اُف نہ کریں

سر بسر وقف رضائے محبوب
ہمہ تن صرف وفائے محبوب

کعبہ و دیر سے، کچھ کام نہیں
جز خدا، غیر سے کچھ کام نہیں

منزل عشق و وفا کے نزدیک
سب سے بڑھ کر ہیں خدا کے نزدیک

پھر مگر اس قرب پہ مغرور نہیں
اپنے نزدیک بہت دور نہیں

ہے گنہگاروں پہ رحمت اُن کو
خاکساروں سے محبت اُن کو

دور ہیں مرحلۂ خاک سے وہ
فوق رفعت میں ہیں افلاک سے وہ

بلکہ ہیں سرحد ادراک سے دور
اُن کو حاصل شرف بزم حضور

وہ جنہیں چھو نہ سکے گرد ملال
وہ جنہیں پا نہ سکے پیک خیال

ہیں فرشتوں سے وہ رتبہ میں سوا
ہیں وہی اشرف مخلوق خدا

اُن کو ممکن جو ہمیں ناممکن
عجز ہو اُن کو کبھی کیا ممکن

جملۂ معترضہ، ذکر معجزۂ ظاہری کہ از سیرت ایشان پیدا می شود

معجزے کو جو کرے تو تحقیق
یاد رکھ اس میں ہماری تدقیق

سیرت صاحب اعجاز کو دیکھ !
قول راوی کے ہر انداز کو دیکھ!

تجھ کو معلوم ہے تو جیسا ہے !
غور کر دل میں کہ تو ایسا ہے؟

نہیں ایسا تو غلط ہے انکار
پھر نہ انکار پہ کرنا اصرار !

دیکھ اعجاز حسین ابن علی
تا کہ ہو راز خفی تجھ پہ جلی

روز عاشور بڑا کام کیا
غور سے دیکھ تو کیا کام کیا !

جو زمیں سے نہ فلک سے ہوگا
نہ بشر سے نہ ملک سے ہوگا

مقام صاحبان تسلیم و رضا

دیکھ اے مہر و وفا کے بندے
ایسے ہوتے ہیں خدا کے بندے

ہے ملک طفل دبستاں ان کا
ایزد پاک ثنا خواں ان کا

خنجر شوق کے بسمل ہیں وہی
کشتۂ عشرت قاتل ہیں وہی

ہیں وہ مقتول رہ عشق و وفا
خود خدا ان کی دیت ہے بخدا!(۱)

گو کہ ظاہر میں ہیں پامال ستم
فی الحقیقت ہیں وہی اہل ہمم

نہ تاسف نہ تلہف ان کو
ہے زمانے پہ تصرف ان کو

چاہیں ادنیٰ کو تو اعلیٰ کردیں
ابھی دنیا تہ و بالا کردیں

کیا سمجھتے ہو انہیں تم، کیا ہیں؟
بشریت میں وہی یکتا ہیں!

صاحب قدرت اعجاز ہیں وہ
حامل راز ہیں ممتاز ہیں وہ

نہ انہیں فخر کلاہ شاہی
نہ انہیں دعوئے ابن اللہی

کیا بتاؤں کہ ہے کیا مال انکا
خوش ہیں وہ لوگ، خوشا حال ان کا

جن کو توفیق خدا دیتا ہے
ان کو ایسوں کی ولا دیتا ہے

نکتۂ لطیف در وجوب ولائے حضرات اخیار بالطبیعة (علیہم السلام) که موجب تصفیه باطن است

میں بتاؤں تجھے، کیا شے ہے ولا !
اس میں اکثر کو ہوا ہے دھوکا

لوگ سمجھے ہیں زبانی صلوات
تجھ کو کافی ہے فقط بہر نجات

---

(۱) اشارہ بطرف حدیث قدسی ''من طلبنی وجدنی عرفنی و من عرفنی احبنی و من احبنی عشقنی و من عشقنی عشقتہ و من عشقتہ قتلتہ و من قتلتہ فعلی دیتہ و من علی دیتہ فانا دیتہ''

یا فقط روئیے اِن کے غم میں !
کیجئیے عمر بسر ماتم میں !

اس سے مقصود ہے اظہار و لا
ہو مگر دل سے بھی اقرار و لا

یہ تو ہے اُن کی مؤدّت سے غرض
اور بھی کچھ ہے محبت سے غرض

عمر بیکار نہ ہرگز کھونا !
اُن کے اخلاق کا پیرو ہونا !

تا میسر ہو تجھے حسن عمل
تیری طینت سے نکل جائے خلل

عقل سے حد بشر سمجھے تو
اپنی کوشش کا اثر سمجھے تو

تاکہ امکان قویٰ ثابت ہو
وسعت شان خدا ثابت ہو

گو کہ ممکن نہیں ویسا ہونا
کیا ضرورت ہے نکما ہونا ؟

ہیں ترے پیش نظر وہ افراد
جن سے ہے نوع کی تکمیل مراد

ہر اک اُن میں ہے مثال کامل
تاکہ ظاہر ہو کمال کامل

دل کے آئینے میں لے اُن کا عکس
ایسے آئینے میں ہو ایسا عکس

تاکہ ہو قلب ترا عالم نور
ظلمت سوء عمل ہو کافور

تا ارادہ ترا عالی ہوجائے
ترک بیہودہ خیالی ہوجائے

اپنے ساقی کا طلبگار ہو تو !
جام توحید سے سرشار ہو تو !

پھر کبھی ہو نہ تری ہمت پست
ایک ہی جام میں ہو مست الست

نور سے چشم بصیرت کھل جائے
کنز مخفی کی حقیقت کھل جائے(۱)

ہاں یہی تصفیۂ باطن ہے
دیکھ ممکن ہے کہ ناممکن ہے

آزمائش پہ تو آمادہ ہو !
حسن اخلاق پہ دلدادہ ہو

حسن اخلاق ہے عین طاعت
تو اسے ترک نہ کر اک ساعت

نیم ملا خطرۂ ایمان
نیم حکیم خطرۂ جان

نیم ملا سے تو از حد ڈرنا
اُن کی تقلید نہ ہرگز کرنا

ان کی تشخیص ہے از بسکہ سقیم
مار ہی ڈالیں گے یہ نیم حکیم

ظاہر شرع پہ واجب ہے عمل
تاکہ باطن میں نہ کچھ آئے خلل

یہ کہ باطن تو ہو بالکل ابتر
اور ظاہر پہ عمل ہو یکسر

یہ سمجھتے ہی نہیں مغز سخن
سر بسر جہل سراسر کودن

اُن کی معقول ہے وہ نا معقول
جس نے برباد کئے فقہ و اصول

(۱) اشارہ بہ طرف حدیث قدسی ”کنت کنزاً مخفیاً“

جب هو کچھ بحث تو لائیں وہ دلیل
غیر قوموں میں هوں هم جس سے ذلیل

اهل حکمت کو برا کہتے هیں
کچھ سمجھتے نہیں کیا کہتے هیں (۱)

جانتے هی نہیں یه علم کلام
عقلا کو هے خطاب ان سے حرام

ان کو هرگز نه سلجھتے دیکھا
اصطلاحوں میں الجھتے دیکھا

نه محقق، نه مناظر هیں یه
محض مغرور و مکابر هیں یه

چند الفاظ جو هیں ورد زبان
ان کو سمجھے هیں یه علم دوجہان

کیا بتائیں گے همیں راہ نجات
هیں یه خود گمرہ کوئے ظلمات

جو مسائل، که هیں بالکل مردود
علم سے ان کے وهی هیں مقصود

بسکه هے جہل سے تاریک خیال
یه سمجھتے نہیں باریک خیال

چند باتوں په هے حکمت کا مدار
اور سب زعم میں ان کے بیکار

نه قیاس ان کا نه عقل ان کی ٹھیک
فلسفه کفر هے، ان کے نزدیک

ان کی حکمت هے فقط خود رائی
نه قیاسی هے نه استقرائی

اهل تقلید سے رغبت هیں انہیں
اهل تحقیق سے نفرت هے انہیں

میبذی میں جو هے بین الدفتین
ان کے نزدیک هے وہ عین العین

فلسفه سے نه هو کیوں ان کو عناد
دشمن عقل هیں یه اهل فساد

رائے انسان کی بدلتی هی نہیں
بحث اس باب میں چلتی هی نہیں

ان کی تفصیل هے بالکل مجمل
ان کی تاویل، سراسر مہمل

تجربه سے نہیں ان کو سروکار
نظریات سے بالکل انکار

ان کی صحبت میں هو، ضائع اوقات
سوء ظن سے نہیں خالی کوئی بات

ان کو آثار جہاں سے کیا کام!
ان کو اسرار نہاں سے کیا کام!

---

(۱) "زیرا که فلسفه در اصل لغت بمعنی حب عقل است"

زیرا که فلسفه مرادف حکمت است پس از ذم فلسفه خلاف قول باری تعالیٰ شانه است، کما قال الله تعالیٰ من یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً۔ وفی روایة کما روی ان بعض الیهود جتاذبة (امیر المومنین علی ابن ابی طالب) وهو یتکلم مع جماعة فقال له یا بن ابی طالب لو انک معلمت نفلسفة لکان یکون منک شان من الشان قال علیه السلام وما تعنی بالفلسفة الیس من اعتدال طباع صفا مزاجه قوی النفس فیه ومن قوی اثر النفس فیه سما الیٰ ما یر تقیه ومن سما الیٰ ما یر تقیه فقد تخلق الا خلاق النفسانیة و من تخلق بالاخلاق النفسانیة فقد صار موجوداً و بما هو انسان دون ان یون موجوداً بما هو حیوان و من هو صار موجود ابما هو انسان فقد دخل فی الباب الملک الصوری و لیس له، عن هذه الغایة مغیر فقال الیهودی الله اکبر یا بن ابی طالب لقد نطقت الفلسفه جمیعهافی الکلمات رضی الله عنک۔

نہ زمانے کے جز و کل سے غرض
نہ ترقی نہ تنزل سے غرض!

اگلے وقتوں سے محبت ہے انہیں،
اہل یونان سے ارادت ہے انہیں

سن لئے ہیں جو کچھ اُن کے اقوال
بس وہ کافی ہیں پئے استد لال

جو ارسطو نے کہا تھا سچ ہے
جو کتابوں میں لکھا تھا سچ ہے

فکر دنیا سے ہیں از بس مالوف
ان کی ہمت ہے اسی پر موقوف

حال ابنائے زماں

بس بس، اے خامۂ جادو تحریر
قابل فہم نہیں یہ تقریر!

اک جہاں محو ہے خود رائی میں!
لطف کیا قافیہ پیمائی میں!

کون سنتا ہے ترانے تیرے؟
وحشت افزا ہیں فسانے تیرے

دل عزیزوں کا دکھا جاتا ہے
رنگ چہروں سے اڑا جاتا ہے

ان دنوں ہے یہ نصیحت بیکار
لوگ ہیں جام ہوس سے سرشار

علم و حکمت کی انہیں فکر نہیں
ایسی باتوں کا کبھی ذکر نہیں

اک زمانے کو ہے دولت کی تلاش
علم ہے آلۂ تحصیل معاش!

منفعیت کا زمانے میں ہے دور
مادیت نے نکالے ہیں یہ طور

ہے جہاں حرص و ہوا پر مائل
شاذ و نادر ہیں خدا کے قائل

وہ جو بنتے ہیں بظاہر دیں دار
ان کو ہے حد سے زیادہ انکار

کوئی دل ان کے ٹٹولے تو سہی
راز سربستہ کو کھولے تو سہی

کیا کہوں منہ سے یہ کیا سمجھے ہیں
زر کو کمبخت خدا سمجھے ہیں

خود غرض کو یہ سمجھتے ہیں فہیم
خود غلط کو یہ سمجھتے ہیں حکیم

انکی حکمت نہیں جز کذب و دروغ
ہے جہالت کو زمانے میں فروغ

پختہ کاری کو زبوں کہتے ہیں
ہوشیاری کو جنوں کہتے ہیں(۱)

حرص نے ان کو کیا ہے گمراہ
رحم و ایثار کو سمجھے ہیں گناہ

معصیت نام ہے ناداری کا
مصلحت اسم ہے عیاری کا

ان کا انصاف ستمگاری ہے
ان کا اخلاق ریا کاری ہے

عدل سے ان کو نہیں کچھ سروکار
مردم آزار ہیں یہ رشوت خوار

العجب! پاتے ہیں بھاری تنخواہ
پھر بھی رشوت سے نہیں کچھ اکراہ

ایک دو تین نہیں، سیکڑوں ہیں
دور کیوں جاؤ، یہیں سیکڑوں ہیں

(۱) اس زمانے میں جو شخص غرض علمی سے تحقیق علم و معرفت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کو مجنوں کہتے ہیں۔

جاہلہ بد نیا سے ذخیرہ ان کا
بدمعاشی ہے وطیرہ ان کا

گو کہ ہر شے سے ہے بالا تعلیم
ان پہ برباد ہے اعلیٰ تعلیم

محکمہ کوئی نہیں ہے خالی
کہ نہ ہو جس میں یہ بد اعمالی

ہے زمانے میں یہ آفت کیسی!
ظلم ہے ظلم، عدالت کیسی!

شیر مادر ہے انہیں مال حرام
قابل دار ہیں، یہ بد انجام

چھوٹنے ہی کی نہیں یہ عادت
ان کی گھٹی میں پڑی ہے رشوت

ان کی خصلت پہ ہے از حد افسوس!
حاصل علم یہ ہے صد افسوس!

اہل دنیا ہیں کچھ ایسے بیزار
علم و اخلاق ہے گویا بیکار

وسعت نظر بہ عالم کون و فساد

چھوڑ اے دل، ہوس منصب و جاہ!
فکر دنیا میں نہ ہو تو گمراہ!

ہوس مال رہے تجھ سے دور
ہولعبیوں کو مبارک یہ سرور!

ہاں خبردار! کہ فرصت کم ہے
بس غنیمت ہے یہاں جو دم ہے

قابل غور ہیں اسرار وجود
دیکھنا چاہیئے آثار شہود

کچھ تو سمجھیں یہ معما کیا ہے
کچھ تو دیکھیں یہ تماشا کیا ہے

ہے جہاں صنعت صانع پہ دلیل
آیتہ اللہ ہے یہ بے تاویل

غور سے دیکھ شہود ایثار
اک تماشا ہے نمود ابشار

دیکھئے تو صنع خدا کی عظمت
حیرت افزائے فضا کی وسعت

جس میں لاکھوں متحرک اجسام
اک وطیرے پہ ہیں گردش میں مدام

راستوں میں نہ وہ اٹکیں نہ تھکیں
اپنے محور سے کبھی ہٹ نہ سکیں

نہ الجھتے ہیں نہ گرتے ہیں وہ
ایک ہی وضع سے پھرتے ہیں وہ

کیوں گردش دوڑ کے چلتے ہی نہیں
حد سے باہر وہ نکلتے ہی نہیں

بیضوی شکل کسی کی تدویر
حرکت جس میں اسے بے تاخیر

متکافی، متزاید، حرکات (۱)
متبائن، متباعد، حالات

حجم میں کوئی زیادہ کوئی کم
ایک سے ایک کو ہے ربط بہم

---

(۱) متکافی کو انگریزی میں پیرا بولہ جینوی کو الیپس در متزاید کو ہائپربولہ کہتے ہیں۔ یہ تینوں اقطاع مخروط کے نام ہیں۔ علم قطاع مخروطات، متوسطات اقلیدس کے ساتھ عربی میں بھی سکھایا جاتا تھا۔ اب انگریزی میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ یہ علم مبادی علم ہیئت سے ہے، کیونکہ اجرام فلکیہ کی گردش انہی شکلوں میں ہوتی ہے۔

اک نئی شان ہے دیکھو جس کو
کھینچتا ہے یہ اسے وہ اس کو

یہ نہ سمجھو کہ ہیں اتنے تارے
آنکھ سے دیکھے ہیں جتنے تارے

نظر آتے نہیں ہم کو اکثر
جو کہ ہیں حد نظر سے باہر

دیکھ کیا حال ہے سیاروں کا
عجب انداز ہے، رفتاروں کا

گردشوں کے لئے میدان وسیع
اک تناسب ہے بطی اور سریع

سیکڑوں شمس ہزاروں اقمار
بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کے شمار

شمس کے گرد ہیں سائر سیار
گرد سیار ہیں دائر اقمار

روشنی میں کوئی کم کوئی سوا
ایک سے ایک کرے کسب ضیا

اسقدر دور ہیں اکثر انجم
دیکھتے ہی نہیں جن کو ہم تم

ڈھونڈھنے والے اسے پاتے ہیں
دور بینوں سے نظر آتے ہیں

بسکہ حیز ہے بہت دور ان کا
واسطہ نہیں ہے ابھی نور ان کا

دور ایسے ہیں وہ اجرام فلک
روشنی ان کی نہ پہنچی ہم تک

انکے ابعاد خدا ہی جانے
انکی تعداد خدا ہی جانے

ہے فضا جسم اثیری سے بھری
ضو کی اس وجہ سے ہے جلوہ گری

حامل ضو ہے یہی جسم لطیف
یہ ہوا جس کے مقابل ہے کثیف

دیکھ آنکھوں سے یہ ساماں کیا ہے
دیکھ تو ظاہر و پنہاں کیا ہے

ایک ہی حکم کے ہیں سب تابع
کیونکہ ہے ایک ہی ان کا صانع

اک تماشا ہے یہ چلتی ہوئی کل!
عقل نے جس کی نہ پائی اٹکل

ہر اک جزے میں بھری ہے قوت!
جس سے قائم ہے، نظام حرکت!

دور کیوں جا، یہ زمیں کیا کم ہے!
بلکہ ہر ذرہ نیا عالم ہے!

دیکھ اجرام ذوات الاذناب (۱)
ان کے میقات اور ان کے اسباب

جدت نظر در امر عود و معاد

چھوٹے تارے جنہیں کہتے ہیں شہاب
ٹوٹتے رہتے ہیں جو مثل حباب

راہ میں دور زمیں کی آکر
جب وہ کھاتے ہیں ہوا سے ٹکر

فوراً آجاتی ہے شامت ان کی
یہی ٹکر ہے قیامت ان کی

اتفاقاً جو کوئی جرم کبیر
جس کے آگے ہو زمیں جسم صغیر

بیچ میں آکے کہیں ٹکر کھائے
دفعتہ ساری زمیں چکر کھائے

آئے اس طرح اک آفت مہیب
لوگ جانیں کہ قیامت ہے قریب (۲)

(۱) دم دار ستارے
(۲) [illegible]

بڑے بڑے ہو جہاں آباد
ذرہ ذرہ ہو فضا میں برباد

ایک دم میں نہ شجر ہوں نہ حجر
نہ چرندے نہ پرندے نہ بشر

کچھ زمیں پر نہیں موقوف یہ بات
نہیں عالم میں کسی شے کو ثبات

کیا لعجب یہ کرہ جب ہو شکست
یا کوئی اور ہی کوکب ہوشکست

مرکز ثقل سے گر جائے قمر
پھر جہاں میں نہ نظر آئے قمر

شمس پر بھی کوئی آفت آجائے
سارے عالم میں قیامت آجائے

ابھی باطل ہو، نظام شمسی
جائے ظلمت ہو، مقام شمسی

روشنی ہو، نہ حرارت ہو کہیں
زندگی ہو، نہ طبیعت ہو کہیں

نہ ہو صورت نہ ہیولے کا پتا
نہ ہو قوت، نہ انرجی کا پتا

ہیں یہ اعراض و جواہر کیا چیز
ایک ہی آن میں ہوں سب ناچیز

اس سے ہے ذات خدا بے پروا
کہ ہو اکدم میں جہاں نا پیدا

اسکی مرضی پہ ہے پیدا ہونا
کچھ ضروری نہیں ان کا ہونا (۱)

ان گھروندوں کا بتانا بھی ہے سہل
اور پھر ان کا مٹانا بھی ہے سہل

کیوں بنایا یہ ہمیں کیا معلوم
کیوں مٹایا یہ ہمیں، کیا معلوم!

اسکی مرضی ہے سہارا اپنا
کیا جہاں پر ہے اجارا اپنا

اسکی حکمت سے یہ کچھ دور نہیں
خلق ہوں اور فلک اور زمیں

اس کی قدرت سے ہے یہ کون و فساد
اس کی تقدیر سے ہے، عود و معاد

رمز ایجاد کو کیا پہچانیں!
بھید کی بات ہے، ہم کیا جانیں!

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

خوض در مقدمات سائکلوجی یعنی علم نفس
و تقسیم و تعریف قوائے ذہنیہ

پہلے تو اپنی حقیقت پہچان!
کہ حقیقت میں یہی ہے عرفان

اپنی ہستی کو جو تو پہچانے!
کیا عجب ہے، کہ خدا کو جانے

تین اصلوں سے ہے تیری ہستی
جس کو تو کہتا ہے "میری ہستی!"

ایک وہ ہے جسے کہتے ہیں شعور (۲)
جس سے ہے ذہن میں ہر شے کا ظہور

آدمی میں ہے یہ علمی قوت
جس سے کھلتی ہے ہر اک ماہیت

دوسری اصل ہے تیری وجدان (۳)
جس سے کرشادی و غم کی پہچان

---

(۱) کیونکہ یہ سب ممکنات ہیں۔ ضروری صرف ذات واجب الوجود ہے۔
(۲) شعور کی انگریزی کانشنس (Conscience)
(۳) وجدان یعنی "فیلنگ" (Feeling) یا "اموشن" (Emotion)

تیسری اصل ارادہ تیرا (۱)
جو ہے تحریک بدن کا منشا

قوت عام کے تابع ہیں حواس
جن پہ موقوف ہے فعل احساس

بعد احساس ہے ادراک و قیاس
علم و حکمت کا اسی پر ہے اساس

ساتھ ہی اس کے ہے حفظ اور خیال
تاکہ محفوظ ہو ہر شے کی مثال

شیٔ محسوس فنا ہو کہ نہ ہو
اسکو بالفعل بقا ہو کہ نہ ہو

ذہن میں رہتی ہے صورت اس کی
کہ مبادا ہو ضرورت اس کی

ایک رشتہ ہے، لزوم ذہنی
جس کے تابع ہیں، رسوم ذہنی

ذہن میں جتنی صور ہیں موجود
ان میں سے رہتے ہیں اکثر مفقود

اس طرح سے وہ صور ہیں مربوط
ایک سے ایک بندھا ہے مضبوط

گو کہ ہر وقت وہ حاضر نہ رہیں
تجھ کو حاجت ہو تو قاصر نہ رہیں

ہو تلازم کا اگر تجھ کو شعور
تیرے امکان میں ہو انکا حضور

ہیں تلازم کے فقط دو قانون
جو کہ ہیں ذہن بشر میں مکنون

ان میں اول ہے تماثل مشہور
اور ثانی ہے تداخل مسطور

حالتیں ذہن کی جو ہیں یکساں
ان کے مابین ہے اک ربط نہاں

مختلف گو کہ ہیں اوقات وقوع
ایک کی سمت ہو، جب ذہن رجوع

دوسری، سامنے آجاتی ہے
اپنی تصویر دکھا جاتی ہے

حالتیں جو کہ نہ ہوئیں یکساں
ذہن میں ہو، مگر اک ساتھ عیاں

ایک ان میں سے جو یاد آتی ہے
دوسری شکل دکھا جاتی ہے

جملہ احوال پہ جاری ہیں حکم
ذہن میں جاری و ساری ہیں یہ حکم

ذکر قوائے طبیعتہ کہ محرک احساس است

سمجھو ان کو جو قوا ہیں مشہور
جن کے ہونے پہ ہے موقوف شعور

ہے تموج سے انہی کے احساس
یہ نہ ہوں جب تو ہیں بیکار حواس

روشنی ہے، سبب حس بصر
چشم بینا میں ہے، یہ تار نظر

جملہ اشکال میں ہے، اسکا نور
جملہ الوان میں ہے اسکا ظہور

دوسری صوت و صدا کی حرکت
خود ہے در اصل ہوا کی حرکت

اس پہ ہے حسن سماعت موقوف
لطف الفاظ و عبارت موقوف

متناسب جو ہوں لحن و ایقاع
اس سے حاصل ہو تجھے ذوق سماع

حسن تالیف کا ہے سارا کھیل
نہ ہو ترتیب تو ہے تال نہ میل

---

(۱) ارادہ یعنی اولیوشن (Evolution) یا ول (Will)

قابل غور ہے لیکن یہ گر
سات ہی رنگ ہیں اور سات ہی سُر

کچھ نہ کچھ بھید ہے اس میں بے شک
فہم میں گرچہ نہ آیا اب تک

مختصر یہ ہے نہ دو بات کو طول
حرکت دونوں میں ہے اصل اصول

وہ تموج جو بصر میں ہے شعاع
سامعہ میں ہے وہی لحن و سماع

بات پردے کی ہے سمجھو تو سہی
جو سنا تھا اسے دیکھو تو سہی

متحد ہے جو انرجی کا اثر(۱)
اتحاد ایسے ملیں گے اکثر

قابل حس ہیں کچھ اشیائے لطیف
ان سے اڑتے ہیں جو اجزائے لطیف

شامہ پر ہو، اگر ان کا مرور
ان سے ہوتا ہے ہمیں بو کا شعور

بعض اجسام جو ہیں قابل حل
قوت ذوق پہ ہے ان کا عمل

ان کے چکھنے سے مزا ملتا ہے
تیز ہوں وہ تو سوا ملتا ہے

لامسہ کے دو اثر ہیں ظاہر
چاہیئے دونوں سے ہو تو ماہر

دونوں ہاتھوں کے جدا ہیں، دو کام
غور کر ان کو، وہ کیا ہیں، دو کام

ایک تو سردی و گرمی کا حس
دوسرے سختی و نرمی کا حس

جانتے ہو انہیں کیا ہیں دونوں
عالم حس میں جدا ہیں دونوں

ایک ہے سردی و گرمی کا اثر
جانتے ہیں اسے سب اہل نظر

اعتباری ہے یہ دونوں مفہوم
ورنہ ہے ایک حقیقت معلوم

جب زیادہ ہو حرارت سمجھو
جب وہی کم ہو برودت سمجھو

دوسرا ہے اثر میکانی
یعنی وہ تین قوائے جسمانی

ایک کو جس میں سے کہتے ہیں کھچاؤ
دوسرا وہ ہے جو مشہور دباؤ

تیسرے وہ ہے کشش جس کا نام
مرکز ارض میں ہے جس کا مقام

قول ذیمقراطیس کہ لمس اصل جملہ حواس است و توجیہہ متاخرین درین باب

اگلے وقتوں میں جو تھے اہل قیاس
لمس کو جانتے تھے اصل حواس

اس طرح سمجھو اب اس کا مفہوم
حس و مس دونوں ہیں لازم ملزوم

اتصال شئے مدرک ہے ضرور
مدرکہ میں ہے یہی شرط شعور

ذکر تعاون اعصاب و عضلات در امر احساس

باعث حس ہے نظام اعصاب
ہے دماغ اصل و مقام اعصاب

---

(۱) Energy

اصل سے گو کہ یہ نکلی ہے شعاع
ساتھ اس اصل کے ہے فرع نخاع

اس کے نکلے ہیں ہزاروں شعبے
جو کہ ہیں سارے بدن میں پھیلے

جبکہ عضلات بھی ہوں ان کے شریک
ایک ہی ساتھ ہوں حس و تحریک

اس سے حاصل ہو شعور اشیاء
ہے یہ منشائے ظہور اشیاء

اختلاف حکما درباب ماہیت اشیاء

ہم سمجھتے ہی نہیں شئے کیا ہے!
لوگ کہتے ہیں جسے "ہے" کیا ہے!

نظر آتی ہے ہمیں جیسی شکل
کیا ضرورت ہے نہ ہو ایسی شکل

جانتے ہو کہ غلط کار ہے حس
امر تحقیق میں ناچار ہے حس

امر خارج ہے کہ مجموع صفات
ہم کو معلوم نہیں اس کی ذات

بعض کہتے ہیں وہی جوہر ہے
عالم ذہن سے جو باہر ہے

ذہن مدرک میں ہے اس کی تاثیر
حاسوں میں ہے اسی کی تصویر

حضرت مل کا ہے یہ اس میں قیاس
ہے وہی شے سبب حس و حواس

گو نہیں کنہ حقیقت معلوم
اس کے آثار میں لیکن مفہوم

بعض جوہر کو مثالی سمجھے
عالم حس کو خیالی سمجھے

بعض کہتے ہیں کہ وہ ہے لا شئے
فی الحقیقت ہے بشر بھی کیا شئے!

کہتے ہیں کوئی اسے کیوں مانے
جب حقیقت ہی نہ اس کی جانے

تم سمجھتے ہو بدیہی جس کو
عقلا کہتے ہیں لاشئے اس کو

منکر اصل حقیقت ہیں یہ لوگ
مثبت عالم صورت ہیں یہ لوگ

یہ جو سب ہم کو نظر آتا ہے
ان کے نزدیک یہ سب دھوکا ہے

ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں
سب کو اس بات کی تمئیز نہیں

اختراعی ہے وجود اشیاء
انتزاعی ہے شہود اشیاء

ذہن انساں ہے طلسم اسرار
ہیں فضا میں یہ اسی کے آثار

امر ذہنی ہے فضا کا مفہوم
کہ ہیں ابعاد ثلثہ موہوم

ذہن انساں، کہ ہے اصل ابعاد
بُعد مفطور، اسی سے ہے مراد

بعض کہتے ہیں کہ جب کچھ بھی نہیں!
وہم ہی وہم ہے سب کچھ بھی نہیں

پھر کہو ذہن کو بھی تم معدوم
کنہ اس کی بھی نہیں کچھ مفہوم

تم کو جب علم نہ ہو کچھ نہ کہو
وہم ہی وہم کہو کچھ نہ کہو

بعض کہتے ہیں کہ اس سے کیا کام
وہم ہی رکھ لو حقیقت کا نام

خارجیات جو ہیں پیش نظر
اس سے انکار کریں ہم کیوں کر

امر محسوس کو شے کیوں نہ کہیں
هم ''نہیں،، کیوں کہیں ''ہے،، کیوں نہ کہیں

بعض کہتے ہیں کہ ہے ایک ہی ذات
اور اُسی کے متعدد ہیں صفات

ذرہ و مہر و جز و کل ہے وہی
بوستاں و گل و بلبل ہے وہی

متکثّر ہیں جہات واحد
اعتباری ہیں صفات واحد

نه هیولیٰ است نه صورت همه اوست
نیست چیزے بحقیقت همه اوست

مادہ کے ہیں ہزاروں قائل
بعض صورت کی طرف ہیں مائل

بعض کا قول یہ ہے '' لا اعلم ،،
ظاہرا ہے یہ طریقہ اسلم

ھکسلے جو کہ امام فن تھا
سب میں مشہور ہے مسلک اُس کا

عقلا میں یہ نہیں ہے مذموم
صاف کہدے جو نہ ہوئے معلوم

رجوع بطرف اصل مبحث ــ بیان تخئیل

دو طرح سے ہے ہماری تخئیل
تجربہ صدق پہ اُس کی ہے دلیل

ایک وہ، جس کا محاکات ہے نام
اس سے چلتا ہے مورخ کا کام

نقل کا لاصل دکھاتی ہے یہ!
نہ گھٹاتی نہ بڑھاتی ہے یہ!

دوسری ہے شعرا کی تخئیل
اختراعی جسے کہتے ہیں عقیل

اور ہی ڈھنگ پہ چلتی ہے یہ!
نظم و ترتیب بدلتی ہے یہ!

وضع کرتی ہے خیالی تصویر
کہیں دنیامیں نہ ہو جس کی نظیر

ماهیت جزئی و کلی

گو کہ عالم میں ہیں، سب جزئیات
متشابہ ہیں مگر ان کے صفات

مشترک ہیں جو صفات افراد
اُن کے مجموع سے کلی ہے مراد

جب کہ افراد ہوں ایسے معلوم
ایک ہی اسم سے ہوں وہ موسوم

گو کہ خارج میں نہ ہو ایسی شے
اُسکا مفہوم مگر ذہن میں ہے

وجدان و اراده

امر وجداں کہ ہے امر احساس
شادی و غم کے بھی موجب ہیں حواس

بعض سے ہوتی ہے پیدا لذت
بعض سے درد و الم کی حالت

حس ہے تحریک بدن کی تابع
حالت ذہن ہے تن کی تابع

جب کہ انسان کی صحت ہو درست
جان و تن دونوں کی حالت ہو درست

اور تحریک زیادہ ہو نہ کم
عالم ذہن میں لذت ہو بہم

جب نہ ہو یہ تو الم ہوتا ہے
دل نازک پہ ستم ہوتا ہے

ذہن انسان کی جو ہو کیفیت
شاہد حال ہے اُس کی صورت

کب یہ کوشش سے نہاں ہوتی ہے
صاف چہرے سے عیاں ہوتی ہے

کچھ دنوں تک جو رہے ایک ہی حال
کیا عجب ہے کہ تغیر ہو محال

نسبتیں فرع کو ہیں اصل کے ساتھ
منتقل ہوتی ہیں یہ نسل کے ساتھ

مرتکز ہوتی ہے خصلت اس سے
مستقل ہوتی ہے عادت اس سے

دور تک اس کا اثر ہوتا ہے
مثل اجداد، پسر ہوتا ہے

انفعالی تو ہے وجدان مگر
فعل انسان پہ اسی کا ہے اثر

اس کی تاثیر کے ماتحت ہے شوق
شوق وہ، جو کہ ارادے پہ ہے فوق

نہ ہو جب شوق، تو کوشش ہی نہ ہو
کیوں کریں کام جو خواہش ہی نہ ہو

شوق ہوتا ہے ارادے کا سبب
نہ ہو جب شوق، تو بیکار ہے سب

اس کے باعث سے ارادہ ہے صحیح
کیونکہ ہے شوق ہی وجہ ترجیح

نفس انسان کی ہوئی بحث تمام
ہم کو منظور نہیں طول کلام

جزو سوم

ساقی نامہ و تخئیل بر سبیل تمثیل

ساقیا! میری طبیعت ہے اُداس!
دے کوئی جام کہ مختل ہیں حواس!

فکر انجام نے مارا ساقی!
دے مجھے عمر دوبارا ساقی!

ہے نہ کھانے کا نہ پینے کا مزا
دے وہ شے جس سے ہو جینے کا مزا

درد کی میرے دوا دے مجھ کو!
بھر کے اک جام پلا دے مجھ کو!

غم کونین بھلا دے دل سے!
پردے غفلت کے اُٹھا دے دل سے!

نظر آئے مجھے رونے اُمید
اک نظر دیکھ لوں، سوئے اُمید

یاس مطلب نے رلایا ہے مجھے
نا اُمیدی نے ستایا ہے مجھے

تا کجا درد و الم کی شدت!
دل ناداں پہ ستم کی شدت

حال یہ ہے، تو جئیں گے کب تک
خون دل روز پئیں گے کب تک!

کاہلی نے مجھے بیکار کیا
بے دلی نے مجھے بیکار کیا

ایسے بیمار کا ہے تو ہی طبیب
تو اگر چاہے تو صحت ہو نصیب

کیا کہوں! دیکھئے کیا ہوتا ہے!
صدمۂ یاس برا ہوتا ہے

دل کو تسکیں تو کسی طور سے ہو
کیا عجب ہے کہ اسی طور سے ہو

جلوۂ حسن تمنا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تماشا دیکھوں

گو کہ بیجا نہیں یہ شکوۂ یاس
کون سنتا ہے کوئی آس نہ پاس

مے کہاں شیشہ کہاں جام کہاں
میں کہاں ساقی گلفام کہاں

میں ہوں اور عالم تنہائی ہے
میں ہوں اور یہ دل سودائی ہے

میں ہوں بس اور یہ دیوانہ ہے
یہی ساقی یہی پیمانہ ہے

کیوں کہوں مجھ کو کسی نے مارا
سچ تو یہ ہے کہ اسی نے مارا

ہے مرا یار دل آرام یہی
ہے مرا ساقیٔ گلفام یہی

جی سے پیارا ہے یہ کافر مجھ کو
پیار آتا ہے اسی پر مجھ کو

ساتھ رہتا ہے یہی آٹھ پہر
یہی ہمدم ہے سفر ہو کہ حضر

آج لایا ہے یہ اس جنگل میں
ہائے، آیا ہوں میں کس جنگل میں

شب تاریک ہے تنہائی ہے
مینہ برستا ہے گھٹا چھائی ہے

منزلوں تک ہیں یہ گنجان درخت
کیا بھیانک ہیں یہ سنسان درخت

کیا یہی دشت ہے، وحشت آباد
آدمی ہے، نہ کہیں آدم زاد !

نہ سڑک اور نہ میلوں کے نشاں
کوئی رہرو ہے، نہ رہبر ہے یہاں

تھک گئے پاؤں چلوں گا کب تک
راستہ کوئی نہ پایا اب تک

ہیں یہ پر زور ہوائیں کیسی
ہیں یہ پر شور صدائیں کیسی ؟

ہیں درختوں پہ ہزاروں جگنو
گل خود رو کی مہک ہے ہر سو

لطف ہوتا جو نہ ہوتا تنہا
سخت حیرت ہے کروں کیا تنہا

اب مقدر کو نہ اپنے روئیں
چلو اس باغ میں چل کر سوئیں

اب چلا بھی نہیں جاتا، آؤہ !
چبھ گیا پاؤں میں کانٹا، آؤہ !

سانپ بچھو، نہ کہیں گھاس میں ہوں
کیا عجب ہے، کہ یہیں گھاس میں ہوں

کاٹ کھائے تو ابھی آفت ہو
پھر نہ جینے کی کوئی صورت ہو

یہ جو مشعل سی نظر آتی ہے
روشنی غول بیاباں کی ہے

یہ بھی جنگل ہے عجب وحشت ناک
سخت پر ہول ہے اور دہشتناک

کیا کریں اب تو پھنسے آ کے یہاں
اس اندھیرے میں کوئی جائے کہاں

کہوں اتنے میں جو بجلی چمکی
دیکھتا کیا ہوں قضا آدھمکی

سامنے سے نظر آیا اک شیر
ہوگئی آنکھ میں دنیا اندھیر

لو وہ آتا ہے بس، اب کیا ہوگا ؟
دیکھئے ہائے غضب، کیا ہوگا ؟

آئی کس وقت قضا ہائے ستم !
لو وہ شیر آ ہی گیا ہائے ستم !

جان جانے میں بس اب دیر نہیں
ملک الموت ہے یہ شیر نہیں

بھاگ جاؤں کہیں؟ کیوں کر بھاگوں؟
پاؤں اٹھتا نہیں کیونکر بھاگوں؟

جب دوبارہ ہوئی بجلی کی چمک
وہ لپک اسکی وہ آفت کی کڑک

ہوگیا شیر نظر سے پنہاں
بچ گئی جان ہوا اطمینان

کیا کہوں جان پہ کیسی گذری
بن گئی جان پہ ایسی گذری

اب جو دیکھا تو یہ عالم دیکھا
آنکھ سے نور مجسم دیکھا

یعنی اک ماہ لقا آفت ہوش
سامنے میرے کھڑی ہے خاموش

مثل تصویر ہے خاموشی میں
شان تقریر ہے خاموشی میں

تمکنت سے اُسے فرصت ہی نہیں
بات کرنے کی اجازت ہی نہیں

مگر انداز سے یہ پیدا ہے
کچھ نہ کچھ مجھ سے اُسے کہنا ہے

کیا کہوں آہ! عجب حالت ہے!
ایسا بیخود ہوں وہ محویت ہے

آفت و رنج و تعب بھول گیا
دیکھتے ہی اُسے، سب بھول گیا

یاد آئی نہ وہ ہیبت نہ وہ شیر
نہ وہ میدان، نہ وہ راہ کا پھیر

میں کہاں ہوں، نہیں یہ مجھ کو خبر
دیکھتا ہوں اسے حیراں ہوکر

کیا کہوں پیش نظر تھا وہ سماں
کبھی ممکن ہی نہیں جس کا بیاں

اس کا انداز جلائے دل و جاں
اس کے ہر ناز پہ سو دل قرباں

حسن ایسا کبھی دیکھا نہ سنا
[illegible] شان خدا .. جل علیٰ

دفعتہ ابر سے نکلا مہتاب
یا اٹھا اس رخ روشن سے نقاب

چاندنی چھٹکی، ہوئی ظلمت دور
ہوگیا نور سے جنگل معمور

نہ رہا خوف، نہ دہشت باقی
نہ رہا رنج، نہ کلفت باقی

اس کو آئے نہ ہوئی تھی کچھ دیر
دید سے دل نہ ہوا تھا ابھی سیر

کہ ہوئی اور ہی اک شکل عیاں
دیکھ کر جس کو ہوا دل ترساں

نظر آئی مجھے، اک شکل سیاہ
دیکھ کر جس کو ہوا حال تباہ

کیسی بد یمن و کریہہ المنظر
تھی وہ بیچاسے بھی از حد بد تر

یا خدا پھر نہ دکھانا وہ شکل
سامنے میرے نہ لانا وہ شکل

صورتیں دو یہ، مرے سامنے تھیں
ایک بد شکل تھی اور ایک حسین

کمسن اک اُن میں سے تھی ایک بڑھیل
اک پری زاد تھی اور ایک چڑیل

دیکھتے ہی اُسے وہ جانِ جہاں
دفعتہً ہوگئی نظروں سے نہاں

جب گئی وہ تو یہ لپٹی آکر
کھل گئی آنکھ مری گھبرا کر

ایک مدت ہوئی دیکھا تھا خواب
ہے اُسی دن سے مرا دل بے تاب

ہے مقدر میں خدا جانے کیا؟
اس کی تعبیر ہے کیا جانے کیا؟

تعبیر الرویا

وہم [illegible] کہ فنا [illegible] است
محشر ستان امید و بیم است

توغل در اوصاف نفس انسان و تغزل درعشق جاناں

سر مکتوم ہے کیفیت نفس
کس کو معلوم ہے ماہیت نفس

محشر ستاں ہے، خیال انسان
اک طلسمات ہے حال انسان

کبھی ناظر ہے، کبھی ہے منظور
کبھی مختار، کبھی ہے مجبور

مرکز دائرۂ بیم ورجا
مجمر نائرۂ حرص و ہوا

جمع ہیں اس میں صفات متضاد
ہے مرید آپ ہی اور آپ مراد

کبھی طاعت میں، ملک سے بھی سوا
کبھی رفعت میں، فلک سے بھی سوا

رہرو منزل بدنامیٔ ذوق
گمرہ وادیٔ ناکامیٔ شوق

اپنی کوشش پہ کبھی ناز اسے
نا امیدی سے کبھی ساز اسے

مضمحل کوئے جفا میں نہ کبھی
مستقل راہ وفا میں نہ کبھی

کبھی آوارۂ میدان ہراس
کبھی گم کردۂ غول وسواس

کبھی جلوہ ہے، کبھی طور ہے یہ
کبھی سایہ ہے، کبھی نور ہے یہ

میکش خمکدۂ جوش و خروش
خود فراموشِ سراسر مدہوش

کبھی دیوانۂ حسن تجرید
کبھی مستانۂ جام توحید

یوں تو کیا چیز خدائی میں نہیں
مثل اسکا نہ ملا ہم کو کہیں!

وقت نظر در امر بقائے نفس

سر پہ ہے یہ فلک مینا رنگ
زیر پا، سطح زمیں، رنگ رنگ

دیکھ یہ چاند ہے، وہ تارے ہیں
جن کو گن گن کے، بشر ہارے ہیں

لائق دید سہی ان کی چمک
قابل سیر سہی ان کی دمک

قابل رشک ہے، ظالم کی بقا
ہم زمانے میں نہ تھے اور یہ تھا

ہم نہ ہوں گے نہ رہے گا قائم
دور دورہ ہے اسی کا دائم؟

بیشک اس دہر سے کد ہے ہم کو
حسرت عمر ابد ہے، ہم کو

ہیچ ہے یہ بھی اگر ہم نہ رہے
جب نہ ہوں ہم تو یہ عالم نہ رہے

اڑ گئی باغ سے جب بلبل زار
کون دیکھے گا گلستاں کی بہار

نہ ہو انسان، تو دنیا کیوں ہو؟
جب نہ ہو قیس، تو لیلیٰ کیوں ہو؟

اور تو سب ہیں ٹھہرنے والے
بس ہمیں ایک ہیں مرنے والے

ہم یہاں آئے ہیں جانے کے لئے
کیا بنایا تھا مٹانے کے لئے

بس بس اے دل یہ گلے ہیں بیکار
کون سنتا ہے تری حالت زار

اہل ظاہر جو سنیں گے یہ طور
تر شرو ہو کے کہیں گے فی الفور

کفر کی بو، تری تقریر میں ہے
اس پہ شاکر ہو، جو تقدیر میں ہے

تجھ کو تکفیر سے کچھ خوف نہیں
اہل تزویر سے کچھ خوف نہیں؟

بس کہ دشوار ہے یہ طرز سخن
وہی سمجھیں گے جو ہیں ماہر فن

کون سمجھے یہ معما تیرا؟
شکر سے بڑھ کے ہے شکوا تیرا

غزل

کیا کہا تم کو ستمگر نہ کہوں؟
بات طلب کی ہے کیونکر نہ کہیں

دل میں چبھتی ہیں ادائیں تیری
پھر کہیں کیا انہیں نشتر نہ کہیں

اپنی تصویر پہ تم خود غش ہوا
تم سے پھر کیوں اسے بہتر نہ کہیں

بے نیازی کی بھی حد ہوتی ہے
کیوں ترے قلب کو پتھر نہ کہیں

اس قدر ذکر صنم اے مرزا
سننے والے تجھے کافر نہ کہیں!

تمام شد

ترقی اردو بورڈ کے چند خادم
نواز خاں چوکیدار فریدالحق چپراسی محمداسلم چپراسی
بادشاہ میاں چپراسی شریف احمد دفتری

غزل

شان الحق حقی

به لطفِ غزالاں به فیضِ غزل
گوارا هے کچھ زندگی آج کل

غمِ آرزو نغمگی میں بدل
مئے شعله خو آبگینوں میں ڈھل

لبوں پر تبسم هے ابرو به بل
بتائے کوئی اس معمے کا حل

به اجھی پڑی جوشِ وحشت کو کل
گریباں سلامت هے اور هاتھ شل

گوارا هے کچھ اس طرح اس کا جور
که هو جیسے اپنے هی کرموں کا پھل

خرابه [illegible] میں [illegible] مجھے [illegible] دکھنا هے [illegible] بلاؤں کا بل

وہ سنبھلے سے لہجے میں کچھ کچھ هنسی
که جیسے چھلکتا هو گگری سے جل

مجھے تو هے یه بے کلی هی عزیز
مٹا لیجئے اپنی تیوری کے بل

محبت کی بے چینیاں ایک جگ
محبت کی آسودگی ایک پل

لکھے جائیے شرح تا حدِ شوق
خیالوں میں هیں اس کی زلفوں کے بل

یه تخلیق کی کلفتِ بے حساب
یه تخلیق کی راحتِ بے بدل!

خیالوں کے گوهر صدف در صدف
محبت کی باتیں غزل در غزل!!

لفظ اب کی تحقیق

غضنفر امروہوی

'اب' میں الف اشارے کا ہے اور 'ب' سمندر یا ہوا کو کہتے ہیں، اور موج گذرانِ آب یا موج گذرانِ ہوا پر قیاس کرتے ہوئے موج زماں کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے الفاظ وضع کئے تھے، ان کی کوئی تحریر ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ہم یہ ثابت کرسکیں کہ انہوں نے کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ کیوں مقرر کیا۔ صرف قیاس آرائی سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر اس قیاس کے لئے کوئی قرینہ موجود ہوگا تو وہ قیاس زیادہ درست ہوگا ورنہ نا قابل اعتبار ہوگا۔ اب میں اپنے قیاس کی دلیل پیش کرتا ہوں، شاید اہل علم حضرات پسند فرمائیں۔

اردو زبان میں 'اب' اور اس کے اخوات جب، تب، کب، ظروف زماں ہیں۔ 'اب' زمان حال کی طرف اشارہ کرتا ہے، 'جب' موصول ہے، تب اس کا صلہ ہے، کب استفہام ہے۔ ان سب میں 'ب' مشترک ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق زمان سے کچھ ہوگا۔ 'ب'، سنسکرت میں سمندر اور ہوا کو کہتے ہیں، اس سے میرا قیاس ہے کہ واضع نے موج زماں کو موج آب پر قیاس کیا۔ اور یہ کلمات وضع کئے گئے اور اگر ان کلمات میں 'ب' کا متجانس 'واو' ہوا تو بھی میرے قیاس کی تغلیط نہیں بلکہ تقویت ہوتی ہے، کیونکہ 'و' کے بھی یہی معنی ہیں، مگر اردو میں 'آوَ'، راقم الحروف کی نظر سے کبھی نہیں گذرا۔ 'ب'، آواز کا سہارا ہرگز نہیں ہے، کیونکہ کوئی حرف صحیح سہارا نہیں ہوتا۔ صرف حرف علت ہو سکتا ہے۔

اس قیاس کی مزید وضاحت کے لئے اشارات، موصولات وغیرہ کے ارتقا کو ملاحظہ کیا جائے۔ میں نے دلائل کو صرف اردو تک محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ابوالفتح صدرالدین سید محمد حسینی رح نے اپنی کتاب معراج العاشقین میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کی صورت یہ ہے:

'یہ، کو ہر جگہ 'یو، لکھا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰ سطر ۱۳، صفحہ ۲۱ سطر ۱۳،

صفحہ ۲۲ سطر ۱۸، صفحہ ۲۵ سطر ۱۷، صفحہ ۲۷ سطر ۱۲، صفحہ ۲۸ سطر ۵، ۶، ۹، ۱۵، صفحہ ۲۹ سطر ۱۳، صفحہ ۳۰ سطر ۳، ۴، صفحہ ۳۱ سطر ۵، صفحہ ۳۳ سطر ۴، ۱۰۔ ترکیبی حالت میں 'اس' استعمال کیا ہے۔

اشارہ بعید 'وہ'، کو 'او' لکھا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱ سطر ۶، صفحہ ۲۰ سطر ۴، صفحہ ۲۶ سطر ۸، ۱۰، ۱۲، صفحہ ۳۲ سطر ۱۳ —

'او' کے ساتھ لاحقات ملاحظہ ہوں: صفحہ ۲۰ سطر ۱۵، 'او-ون' = اسے یا اس کو صفحہ ۱۹ سطر ۹، صفحہ ۲۱ سطر ۷، 'او نے آیا'۔ سطر ۸ 'اننے نیں دیتا' = اس نے صفحہ ۳۲ سطر ۱۴ 'انے' = اس نے۔ مگر آج کل بعض تراکیب میں علامت فاعل محذوف ہوجاتی ہے۔ ان سب موقعوں پر 'وہ' استعمال کیا جائے گا۔ صفحہ ۲۵ سطر ۶ 'انو کوں' = ان کو صفحہ ۲۸ سطر ۱۵ 'انو بھی' دونوں جگہ جمع ہے۔

اشارہ قریب کی جمع: صفحہ ۲۳ سطر ۲۰ 'اینان'، صفحہ ۳۲ سطر ۱۹۔

اسم موصول، 'جیو' = جو، صفحہ ۲۴ سطر ۸۔

جیکوئی = جو کوئی صفحہ ۲۵ سطر ۷، ۱۱، ۱۴، صفحہ ۲۸ سطر ۱۴، صفحہ ۲۹ سطر ۱۰، صفحہ ۳۰ سطر ۱۶، صفحہ ۳۱ سطر ۳، ۱۳، صفحہ ۳۲ سطر ۱۳، ۲۰، صفحہ ۳۴ سطر ۳۔ مگر صفحہ ۳۱ سطر ۱۷ میں ''جو کوئی''، بھی ہے جو غالباً سہو کاتب ہے۔

صلہ، تیوں صفحہ ۱۹ سطر ۹

تہاں، صفحہ ۳۱ سطر ۱۴

کلمات استفہام = کہاں صفحہ ۲۷ سطر ۳، ۴،

کوں، صفحہ ۲۶ سطر ۱۴ صفحہ ۳۲ سطر ۱۳

علاوہ ازیں یوں، جیوں، کیوں، بھی استعمال ہوئے ہیں۔

ولی کے یہاں انہی کلمات کا استعمال ملاحظہ ہو۔ یہ امر ذہن میں رہے کہ انجمن ترقی اردو نے دیوان میں ایک حد تک ولی کا رسم الخط باقی رکھا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے ایک سے زائد مثال نہ دی جائے:—

وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیراں میں آ

آتش عشق پڑی عقل کے ساماں میں آ (صفحۂ ۱)

کتاب الحسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا

ترے ابرو کے دو مصرع سوں اس کا ابتدا دلتا

یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن
مطول کے معانی کا تمامی مدعا دستا (صفحہ ۴)

جب اس کی طرف جاتا ہوں کرقصد تماشا
کہتا ہے مجھے خوف رقیباں سوں کہ جاجا (صفحہ ۷)

اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھے کی جھنکار سناتی جا (صفحہ ۹)

مجھ شعر کی روانی سنیا جب سوں اے ولی
نم ناک ہے تدھاں ستی دامن سحاب کا (صفحہ ۱۰)

تب ہی

نیں شوق اس کے دل میں کدھیں لالہ زار کا

کبھی

مشتاق ہے جو پیو کے رخ آب دار کا (صفحہ ۱۶)

موے کو جیو بخشے آب حیواں بے گماں ہے جیوں
نین میں تیونچ پانی ہے سوتے دل کے جگانے کا (صفحہ ۳۰)

تو جہاں رھتا ہے واھاں تجھے دیکھتا ھوں میں
تجھ یاد میں ز بسکہ یو دل دور بیں ھوا (صفحہ ۴۴)

کدھی میری طرف لالن تم آتے نیں سو کیا باعث
چھبیلا مکھ اپس کا ٹک دکھاتے نیں سو کیا باعث (صفحہ ۶۶)

انکھیاں سوں ھوا پیو جدا جب ستی میری
جاتے ھیں مرے اشک گیا پیو جدھر سوں (صفحہ ۱۴۱)

بیاں زلف بدیعی کا ہے سعدالدین کا مطلب
اجھوں لگ تم نہیں سمجھے مطول کے معانی کوں (صفحہ ۱۰۱)

دل میں رکھا جدھاں سوں ولی تجھ دنتن کی یاد
واڑم نمن تدھاں سوں سنے میں دڑاڑ ہے (صفحہ ۲۲۹)

صبا جو توں ہے مہرباں تو بول دلبر سوں
کہ تجھ ادھر کے طلب میں جیو ادھر آر ہا (صفحہ ۲۰۷)

میر درد کا مشہور شعر ہے:

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ
جیدھر ہلے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

میرزا رفیع کا شعر ہے:

سودا کسے تھا یار سے اک سو نہیں غرض
اودھر کھلی جو زلف ادھر دل بکھر چلا

میر تقی میر کے کلام سے کچھ زیادہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

جمشید جس نے وضع کیا جام کیا ہوا
وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے ناؤ و نوش (صفحہ ۷۸)

خورشید و ماہ و گل سبھی اودھر رہے ہیں دیکھ
اس چہرہ کا اک آئنہ حیران ہی نہیں (صفحہ ۱۰۰)

آئے عدم سے ہستی میں تس پر نہیں قرار
ہے ان مسافراں کا ارادہ کہاں کے تئیں (صفحہ ۱۱۸)

گزار ابر اب بھی جب کبھو ابدھر کو ہوتا ہے
ہماری بے کسی پر زار باراں دیررو تا ہے (صفحہ ۱۷۰)

دشت میں گرد رہ اس کی اٹھی ہے جیدھر سے
وحش و طیر آنکھیں ادھر ہی کو لگادیتے ہیں (صفحہ ۳۰۲)

محبت جہاں کی تہاں ہو چکی
کچھ اس روگ کی بھی دوا ہی نہیں (صفحہ ۳۰۴)

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسونے (صفحہ ۳۴۳)

ان دلبروں کو دیکھ لیا بے وفا ہیں یے
بے دید و بے مروت و نا آشنا ہیں یے (۱) (صفحہ ۳۰۳)

غالب کے اشعار غور طلب ہیں:

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ نا امید واری ہائے ہائے

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اشارات یو وو (واحد) یے وے (جمع) اور موصول جو تھے، ہندی میں وا اور جا بھی تھے۔ مشہور دوہا ہے:

سیکھ دیجے گا وا کو جا کو سیکھ سہائے
سیکھ نہ دیجے باز کو گھر بئے کا جائے

امتداد زمانہ سے اشارات میں و، ہ سے بدل گیا اور واحد و جمع میں ایک ہی صورت یہ، وہ رہی۔ حالت ترکیبی میں ہ، س سے بدل گئی اور اِس، اُس وجود میں آئے، ان کی جمع میں ن لایا گیا اور اس طرح اِن، اُن رونما ہوگئے۔ اسم موصول میں بھی حالت ترکیبی جس اور جن ہے مگر جو میں ہ کے مبادلہ کی مجھے کوئی مثال دستیاب نہیں ہوئی، جو کا صلہ تو آتا ہے۔

استفہام میں کون بھی حالت ترکیبی میں کس ہو جاتا ہے۔ کون کی اصل

---

(۱) یہ غزل ردیف "یا" میں شامل ہے۔

بھی میرے نزدیک کو ہے، اس کے آخر میں ے کا اضافہ بھی ہوتا تھا، مثلاً :

بات بوجھو بجھکڑ سے اور نہ بوجھو کوئے
چکی کے پاٹن باندہ کے ہر نا کودا ہوئے

جب ان کلمات کی تحلیل کی جاتی ہے، ی و ج ک کے ساتھ و مجہول کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ پہلے جزو کے متعلق کوئی اختلاف نہیں اور سب لوگ ان کا یہی مفہوم بیان کریں گے۔ البتہ دوسرے جزو میں اختلاف ہوگا، ہو سکتا ہے کہ یہ صرف اشباع حرکت ہو مگر اس کی یکسانیت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں ارادہ کو دخل ہے اور یہ کوئی بامعنی کلمہ ہے یا کسی بامعنی کلمہ کا جزو ہے جو نحت کے بعد باقی رہ گیا ہے۔ کلمہ ندا او میں بھی یہی و ہے، میرے خیال میں یہ بامعنی جزو ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو کبھی آئندہ بحث کی جائے گی۔

اب ان کے دوسرے مرکبات تشریح طلب ہیں :—

اب۔ جب۔ تب۔ کب ظروف زمان ہیں۔ اب اشارہ کے لئے، جب موصول، تب صلہ اور کب استفہام۔ ان مرکبات میں پہلے جزو کے متعلق کوئی اختلاف نہیں، دوسرا جزو اختلافی ہے۔ دوسرے جزو کا یکساں ہونا اور ایک ہی معنی دینا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ با معنی کلمہ ہے اور جیسا کہ میرا دعویٰ ہے اس کا مفہوم ہوا یا پانی ہے۔ اور موج زماں کو موج آب یا موج ہوا پر قیاس کیا ہے۔ اس پر یہ اشکال کہ کیا پہلے لوگ اتنے عاقل و فرزانہ تھے؟ میرے نزدیک قابل اعتنا نہیں۔ ان کی تصنیفات موجود ہیں، ان پر ابھی تک بہت کم اضافہ ہوا ہے۔ اگر ابوالعلاء المعری کا واقعہ لکھ دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ایک نو عمر لڑکے نے ابوالعلا سے کہا، کیا یہ شعر تمہارا ہے :

وانی و ان کنت الاخیر زمانة لات بعالم تستطعه الاوائل

یعنی اگرچہ میں اخیر زمانہ میں پیدا ہوا ہوں مگر میں وہ چیزیں لاؤں گا جو پہلے نہ لا سکے۔ ابوالعلا نے جواب دیا، ہاں، تو اس لڑکے نے پوچھا، پہلوں نے جو حروف تہجی اٹھائیس مقرر کئے ہیں، آپ نے ان میں کس کا اضافہ کیا؟ اس پر ابوالعلا حیران ہوکر رہ گیا۔

اور جو لوگ زبانوں کے ارتقا کو وحیِ الٰہی سے مانتے ہیں، ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔

میرے خیال کی مزید تائید ان کلمات سے ہوگی ۔

ادھر۔ اُدھر۔ جدھر۔ تدھر۔ کدھر، جن کی ابتدائی شکلیں ایدھر ۔ اودھر۔ جیدھر۔ تیدھر۔ کیدھر تھیں، مذکورہ بالااشعار میں ان کی اسناد موجود ہیں۔ اشارات اِدھر، اُدھر ایدھر، اودھر میں موصول جدھر، جیدھر، صلہ تدھر، تیدھر اور استفہام کدھر، کیدھر ہیں۔ ان کلمات کے بھی دو جزو ہیں، پہلا جزو اِ، ای، اُ، او، ج، جی، ت، تی، ک، کی ہیں اور دوسرا جزو دھر سب میں مشترک ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے پہلی شکل و کے ساتھ تھی بعد کو ی اس کی جگہ آ گئی۔ یہ مسئلہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے۔ غور طلب یہ ہے کہ دوسرا جزو دھر با معنی کلمہ ہے یا بے معنی ہے۔ مگر یکسانیت کی وجہ سے پھر خیال ہوتا ہے کہ شاید با معنی ہو۔ پتہ چلتا ہے کہ دھر کے معنی زمین کے ہیں، اس کا مزید علیہ دھرتی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ مجاز مرسل کے قاعدہ سے کل بول کر جزو مراد لے سکتے ہیں۔ یہ زمین، وہ زمین وغیرہ یعنی جہت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اسی پر دوسرے مرکبات کو قیاس کیا جائے ۔ یہ سب ظروف مکان ہیں۔

ظروف مکاں کی دوسری صورت یہاں، وہاں، جہاں، تہاں، کہاں ہے۔ ان کلمات میں بھی پہلا جزو تو اپنا مفہوم واضح کر رہا ہے دوسرا جزو ہاں مشترک ہے، آیا یہ بے معنی اور مہمل ہے یا اس کا کوئی مفہوم ہے۔ میرے نزدیک یہ با معنی کلمہ ہے، غالباً استھان کی منحوت شکل ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں جگہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ولی نے جدھاں، تدھاں استعمال کئے ہیں، مگر وہ ظروف زماں میں ہوسکتا ہے کہ ان کا محل استعمال غیر متعین ہو اور بعد کو ظروف مکاں ہوگئے ہوں، یہ امر تحقیق طلب ہے۔

اسی قبیل کے کلمات یوں۔ جیوں۔ تیوں۔ کیوں، ہیں، جو کیفیت کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور اتنا۔ آتنا۔ جتنا۔ کتنا، کمیت کے لئے مستعمل ہیں۔ ان میں بھی دوسرے اجزا یوں اور تنا مشترک ہیں۔ یوں کے معنی طرح کے ہیں اور جس جگہ ہم یوں بولتے ہیں پہلے ایوں ہوگا اور تنا یا تتا کا مفہوم قدر ہے۔ اس پر اہل علم روشنی ڈالیں گے۔

ایسا، ویسا، جیسا، تیسا، کیسا کلمات میں بھی سا مشترک ہے، جزو اول اپنے مفہوم

پر دلالت کرتا ہے، سا مانند کے معنی میں بولا جاتا ہے اور میرے خیال میں با معنی کلمہ ہے ۔ سنسکرت کا استفہام 'کدھی' ولی نے استعمال کیا ہے، سند اوپر گذر چکی ہے ۔ ولی نے 'ابھی' کے معنی میں 'اجھوں' بھی استعمال کیا ہے مگر یہ کلمات اس وقت زیر بحث نہیں ہیں ۔

ان تمام کلمات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان میں پہلا جزو اشارہ، موصول، صلہ یا استفہام پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا جزو ہر جگہ با معنی ہے اور متعین مفہوم کے لئے مستعمل ہے ۔

اس سلسلہ میں ابھی، جبھی، کبھی، کسی، وغیرہ پر غور کرنا بھی ضروری ہے ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان میں 'ھی' کلمہ' حصر ہے ۔ لیکن یہ ہر جگہ حصر نہیں ہے ۔ ابھی، اور جبھی، میں حصر ہے ۔ کبھی، اور کسی، میں تنکیر ہے ۔ اور ان کی پہلی صورتیں

کبھو اور کسو تھیں، لہذا یہ ی و کے بدلے میں ہے، حصر کے لئے نہیں ہے ۔

اسی طرح یہیں، وہیں، میں حصر ہے اور یہاں ھی، وھاں ھی، کی منحوت شکلیں ہیں، 'کہیں' میں تنکیر ہے ۔

اگرچہ اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں مگر عین الحق صاحب فرید کوٹی کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے ۔

موصوف نے 'توسا' بہ معنی روٹی قرار دیا ہے اور اس کو 'دوسا' سے ملادیا ہے ۔ حالانکہ پنجابی 'توسا' کا یہ مفہوم نہیں ہے ۔ 'توسا' اس روٹی کو کہتے ہیں جو میت کے ساتھ بھیجی جاتی ہے اور چونکہ وہ مسافر آخرت ہے، اس کو توشہ یا زاد راہ دیا جاتا ہے ۔ یہی توشہ پنجابی میں 'توسا' ہے اور یہ ایک طرح سے کوسنا ہے ۔

علاوہ ازیں موصوف نے عصر حاضر کے الفاظ کی مشابہت پر اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے، اسی لئے التباس کے امکانات ہیں۔ مثلاً پیشہ وروں کے جو نام آج مستعمل ہیں، ان میں نحت کا عمل ہوچکا ہے ۔ مثلاً کمہار، کمبھکار، لوھار، لوھکار یا لوکھنڈکار، سنار، سنھکار تھے ۔ جن الفاظ کے متعلق دراوڑی الاصل ہونے کا دعویٰ کیا جائے اس کی سند قدیمی استعمال سے بہم پہونچائی جائے، ورنہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دراوڑ لوگوں نے یہ الفاظ بیرونی اثرات کے تحت استعمال کئے ہوں ۔ اس موضوع پر انشاء اللہ آئندہ لکھا جائے گا ۔

غضنفر صاحب کے قیاسات دلچسپ ہیں، لیکن اہل ادارہ کو ان کی صحت میں شک ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبز واری صاحب کا کہنا ہے کہ ”لفظ ’اب‘ اگر آ اور ب بہ معنی سمندر سے مرکب ہے، تو یہ لفظ اس شکل اور ان معنی میں سنسکرت ادب میں ہونا چاہئے“۔

لفظ ’اب‘ کا اشتقاق جو ”اردو نامہ“ شمارہ ۷ میں درج کیا گیا ہے، حسب ذیل ہے:

[قدیم پ: آوَ अव (آ = اشارہ + وَ > وِنت)؛ یا ویدک: اےوے: एवै، پ: एवहिं]

پہلے ڈاکٹر شہید اللہ صاحب نے اس پر حسب ذیل نوٹ تحریر فرمایا تھا۔ (ملاحظہ ہو اردو نامہ شمارہ اول ص ۲۹)

[اپبھرنش: ایوم ہم एवँहिं ، ویدک: ایویہ एवै ، بنگالی: ایبے एव्वे (نظم یا قدیم)، گجراتی: ہیو हेव ، مرہٹی: ایوہام एव्वहीं ، قدیم: ایب: एव تھا۔ جب، تب، کب کے قیاس پر اب ہوگیا۔] (ادارہ)

مرکزی حکومت کی مطبوعات

حکومت پاکستان کی جملہ مطبوعات سارے پاکستان میں ہر بڑے ایجنٹ کے ہاں ہر وقت دستیاب ہوتی ہیں۔

۱۔ مینجر مطبوعات، بلاک نمبر (۴۴) شاہ راہ عراق کراچی۔

۲۔ ڈپٹی کنٹرولر اسٹیشنری، فارمس اینڈ پبلیکیشنز، وجناح ایونیو، بنوٹلی ہاؤز رمنا، ڈھاکہ۔

۳۔ کراچی، لاہور اور پشاور میں حکومت مغربی پاکستان کے کتاب گھر۔

کتابوں کے دام

کتابوں کے دام اسی وقت کم ہو سکتے ہیں کہ ان کی اشاعت میں اضافہ ہو۔ کتاب جس قدر کم تعداد میں چھپتی ہے، اسی قدر گراں ہوتی ہے، تعداد جس قدر بڑھے گی لاگت فی جلد اسی نسبت سے کم ہوتی جائیگی۔ لہذا کتابوں کی اشاعت کو فروغ دینے کی کوشش کیجئے۔

ادارہ

مراسلات

سہیل بخاری صاحب نے ڈاکٹر سبزواری صاحب کے مضمون "ہمارے نقاد" (مطبوعہ اردو نامہ ۶) کے بعض نکات پر توجہ دلائی ہے۔ یہ مراسلہ سبز واری صاحب کے حواشی کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

ادارہ

مکرمی۔ تسلیم

"ہمارے نقاد" کے تحت آپ نے مجھے بہت سی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے لئے میں شکر گذار ہوں۔ نیز مجھ فرد واحد کی رائے (دکنی ادب، اردوئے قدیم نہیں ہے) کو جو آپ نے منفرد(۱) تسلیم کیا ہے، اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ جن ائمۂ فن کے متعلق آپ نے اظہار عقیدت فرمایا ہے، وہ معصوم(۲) نہیں تھے۔ اس باب میں اتنی سی گذارش ہے کہ دکنی ادب کے پنجابی جز کے متعلق شیرانی کی کتاب سے استصواب کرلیجئے۔ اس میں کتنی ہریانی یا میواتی ہے۔ اسے ڈاکٹر مسعود حسین‌خاں صاحب کی کتاب(۳) میں دیکھ لیجئے۔ اس کے بیجاپوری عنصر کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" بھی مختصر طور پر کچھ کہہ رہی ہے، اسے بھی سن لیجئے اور بیجاپوری کی خصوصیات کے متعلق گریرسن نے لنگوئسٹک سروے آف انڈیا کی جلد ہفتم میں جو تفصیلات دی ہیں، انہیں پڑھ کر دکنی ادب میں تلاش کر لیجئے اور پھر اپنی جگہ خود ہی فیصلہ کرلیجئے کہ اس میں سے اتنے حصے نکال دینے کے بعد کتنی اردو بچ رہتی ہے جس کے باعث اسے اردوئے قدیم کا لقب دیا جا رہا ہے۔(۴) بہر حال آپ کو اختیار ہے، مانئے یا نہ مانئے۔ مجھے اس وقت اس پر زیادہ اصرار بھی نہیں ہے۔

۱۔ "منفرد" کے معنی ہیں تنہا اور اکیلا۔ منفرد رائے تنہا ایک شخص کی رائے جس کا کوئی موید نہ ہو۔

۲۔ ائمۂ فن نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ہے وہ مدلل بھی ہے اور مفصل بھی۔ اسے یہ کہہ کر مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ معصوم نہ تھے۔

۳۔ مشترک الماخذ زبانوں کے لفظی اور قواعدی سرمایہ میں اشتراک ہواہی کرتا ہے۔

۴۔ بیجاپوری دکنی اردو مختلف زبان نہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری نے دکنی اردو کی خصوصیات شمار کرائی ہیں اور یہ خصوصیات اس امر کا ثبوت ہیں کہ دکنی اردو۔قدیم اردو کا ایک روپ ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں:

"دکنیوں کی زبان اردو سے جداگانہ زبان نہ تھی بلکہ یہ وہی زبان تھی جسے سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانے میں اور اس کے بعد ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے تھے"۔

آگے چل کر آپ نے فرمایا کہ ''اردو براہ راست سنسکرت سے ماخوذ نہیں'' لیکن میں کہتا ہوں کہ اردو بالواسطہ بھی سنسکرت سے ماخوذ نہیں ہے۔ میرے نزدیک ویدک اور سنسکرت زبانیں ایرانی اور دراوڑی (پراکرت)(۱) زبانوں کی معجون مرکب ہیں، جن میں ہماری زبانوں کے بہت سے اسمی و فعلی روپ مستعار لے کر داخل کرلئے گئے ہیں۔ اور انہیں صوتیات کی ایک منظم اور باقاعدہ اسکیم کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ پراکرتوں کی آوازوں میں کم از کم رگ وید کے عہد سے آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، میں ایک طرف تو رگ وید سے مثالیں پیش کرسکتا ہوں اور دوسری طرف موجودہ بھاشاؤں سے ثبوت فراہم کر سکتا ہوں، لیکن اس بات کو بھی فی الحال جانے دیجئے کہ یہ ایک جدا گانہ بحث ہے اور اردو لغت کی تدوین کے دوران میں اس کا فیصلہ ہو جانا فی الحال دشوار ہے اور فیصلے تک اس کی تدوین کو ملتوی بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پالی سے اردو کا اشتقاق ثابت کرنے کے لئے آپ نے جو آٹھ نکات اپنی کتاب میں تحریر فرمائے ہیں، میں ان سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ چنانچہ آپ کے اس نظریہ کا نکتہ بہ نکتہ جواب انشاء اللہ جلد ہی شائع ہو کر آپ تک پہنچیگا، لیکن یہ مسئلہ بھی تدوین لغت سے متعلق نہیں ہے، لہذا اسے بھی نظر انداز کردیجئے۔

رہی 'اب' اور 'ابھی' کی بات۔ اس کے متعلق جو آپ نے صفیر یہ اور ہائیہ کا سوال اٹھایا ہے، اسکی ضرورت نہیں ہے، نہ وہ کوئی ایسا اصول ہے جو کار آمد ہو—(۲) بات بالکل واضح ہے کہ اردو میں بہت سے قدیم مہاپران، الپ پران بنا کر بولے جانے لگے ہیں۔ ہمیں مہاپرانوں کی موجودگی کا علم صرف اس وقت ہوتا ہے جب اسی لفظ کا کوئی دوسرا روپ سامنے آتا ہے، مثلاً لفظ 'تم' کہ ابتدائی 'تمھ' تھا یا لفظ 'آن' کہ ابتدائی 'آنھ' تھا۔ اس بات کا ثبوت ان کے دوسرے روپوں، تمھیں، تمھارا، انھوں، انھیں وغیرہ سے ملتا ہے جن میں تائید کو مطلق دخل نہیں ہے۔ اس طرح اب، تب، جب، کب جو ابتدا میں ابھ، تبھ، جبھ، کبھ تھے۔ (۳) ابھی، تبھی، جبھی، کبھی میں اپنے ابتدائی مہاپران 'بھ' کے ساتھ نظر آئے ہیں۔ یہ تو ہوا لفظ 'اب' یا 'ابھی' کے متعلق عقلی ثبوت، اب نقلی دلیل بھی ملاحظہ فرمائیے کہ رگ وید میں 'اب' کا لفظ 'ابھ' अभि لکھا ہوا ملتا ہے۔

(۱) اتنا بڑا دعویٰ اور وہ بھی بے دلیل۔ کونسی زبان کس زبان سے ماخوذ ہے اس کے لئے ان زبانوں کی گرامر اور صوتیات کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔ اور میں نے اپنی ایک کتاب میں تقابلی مطالعے کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ اردو جس زبان سے ترقی پائی ہے سنسکرت اس کا ادبی روپ ہے۔

(۲) بہت خوب، کار آمد اصول کا مطلب شاید مفید مطلب اصول ہے۔

(۳) تم ابتداً 'تمھ' تھا اس کا ثبوت تو 'تمھیں' سے ملتا ہے۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ 'اب' کی اصل 'ابھ' ہے اور 'جب' کی 'جبھ' اور 'تب' کی 'تبھ'؟

سند کے لئے دیکھئے سولت نمبری ۱-۵-۳ نیز ۱-۸-۲ نیز ۱-۲۱-۱۰۰ وغیرہ ـ پراکرت کی آخری حرکت اردو زبان کے اس رجحان کے باعث کہ اس کے الفاظ کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے یا تو ساقط ہوگئی یا حرف علت (و ، ا ، ی) میں تبدیل ہوگئی اور اس کی بکثرت مثالیں آپ کو مل جائیں گی' چنانچہ 'اب' اور 'ابھی' دونوں ایک ہی لفظ کے دو روپ ہیں۔(۱) جن میں سے ایک ہمارے یہاں تاکید کے لئے مستعمل ہوگیا اور دوسرا معنی محض تک محدود رہا —

لفظ '' آپج '' کے متعلق عرض ہے کہ یہ پراکرت کا مال ہے ـ یہ یقیناً مفرد ہے اور سنسکرت میں پراکرت سے کسی تبدیلی کے بغیر مستعار لیا گیا ہے (۲)۔ اس کو سنسکرت '' ادپدی '' سے نکالنا محض تکلف ہے ـ سنسکرت کے عالم، تو عالم معمولی طالب علم بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ لفظ '' آت '' مرکب کے جزو اول کی حیثیت سے '' آو '' ہوجاتا ہے (۳) اور پت ، پات یا پد ، پاد میں سے کوئی لفظ بھی آگنا ، پیدا ہونا ، نکلنا ، باہر آنا وغیرہ کے معنی نہیں دیتا (۴) ـ پھر آپ خود فرماتے ہیں کہ 'آپج' سنسکرت میں موجود ہے اور انہیں معنوں میں مستعمل ہے ، اس کے معنی یہ ہوئے کہ سنسکرت " ادپدی " سے خود سنسکرت کا ہی دوسرا لفظ '' آپج '' بنایا گیا (۵) ـ یہ عجیب بات ہے کہ '' ادپدی '' سنسکرت کے 'آپج' کو چھوڑ کر پراکرت کے 'آپج' کا ماخذ ثابت کیا جائے ـ رگ وید میں یہ '' لفظ آ ب ج '' بھی دیا ہوا ہے۔ (دیکھئے ۱-۱۰-۲) — (۶)

میں نے لفظ 'انیت' کا جو تجزیہ کیا تھا اس پر آپ نے اصلاح بھی فرما دی ہے —

(۱) 'ابھ' سنسکرت میں سابقہ ہے اور اس کے معنی ہیں طرف، جانب، جیسے ابھ دھاؤ अभिधाव (ایک طرف دوڑنا) ''ابھی'' اردو میں متعلق فعل ہے اور اس کے معنی ہیں اسی وقت وغیرہ ـ متعلق فعل سابقہ سے ماخوذ نہیں ہوسکتا ـ اس کے علاوہ ''ابھی'' بناوٹ اور معنی دونوں کے لحاظ سے جبھی ـ سبھی ـ تبھی ـ کبھی ،اسی، انھی کی طرح ہے ـ یہ تمام الفاظ 'ھی' کے اضافے سے بنے ہیں ـ سنسکرت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو ''ابھ'' کی طرح ان کا ماخذ بن سکے ـ اس لئے بھی 'ابھی' کو 'اب' اور 'ھی' سے مرکب ماننا ہوگا۔

(۲) پراکرت میں 'اپج' کوئی لفظ نہیں سنسکرت میں ''اپ جن'' ہے ـ

(۳) یہ بھی درست نہیں، اصل لفظ 'اد' उद् ہے جو بعض صورتوں میں آتْ ہوجاتا ہے ـ

(۴) پد، سابقہ 'اد' کے ساتھ ترکیب پا کر پیدا ہونے کے معنی دیتا ہے جیسے دسترانی آتپادیت (پنچ تتر) کے معنی ہیں کپڑے بناتا ہے ـ ''آتپن'' (پیدا شدہ) اس کا حالیہ تمام ہے ـ

(۵) سنسکرت میں ''ج'' (پیدا شدہ) مرکب کے جزو اول کے طور پر مستعمل ہے ـ یہ ''ادپدی'' سے مختلف ہے ـ

(۶) ''آ ب ج'' کوئی لفظ نہیں، 'آپ ج' البتہ ایک لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں ، پانی کی مخلوق

گذارش یہ ہے کہ یہ لفظ اردو میں " ا تی ت " بولا جاتا ہے ۔ اس کی املا دیونا گری میں अतीत ہوگی ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ अति (جس کو میں نے اردو املا کے مطابق " اتی " لکھا تھا) اور इत سے مرکب ہے ، سنسکرت سندھی کے اصول سے इ + इ ہمیشہ ई ہوجاتا ہے، اس لئے अति اور इत مل کر अतीत بن گئے۔ اب معنی سنئے، अति کے معنی ہیں " بہت " اور इत حالیہ تمام ہے इ کا ۔ سنسکرت کے کسی معمولی سے معمولی لغت کو اٹھا کر دیکھ لیجئے इ کے معنی "جانا" ملیں گے ۔ دونوں الفاظ کی سندھی اور इ کا حالیہ تمام معمولی سی معمولی گرامر میں بھی इत ہی ملے گا جس کے معنی ہونگے چلا ہوا۔ (۱) اس طرح اتیت کے معنی ہوئے ، بہت چلا ہوا۔ اگر آپ اتیت کال کے متعلق فرمائیں تو اسے با محاورہ اردو میں بہت گزرا ہوا وقت کہہ لیں ۔ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ زمانۂ قدیم میں اتیت یا سادھو بڑے بڑے سفر کیا کرتے تھے ۔ شام سندر داس یا پلیٹس کے نام ہمیں سچائی اور حقیقت سے زیادہ عزیز نہیں ۔

اٹا کے متعلق آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ واضح نہیں ہے ۔ یا تو اسے پراکرت مانئے یا نہ مانئے ۔ یہ بیک وقت خالص سنسکرت بھی ہو اور قدیم پراکرت بھی، یہ کیونکر ممکن ہے (۲) ۔ پھر قدیم و جدید پراکرت کی تفریق گریرسن کی اپنی اپج ہے ۔ حقیقت میں ایسی کوئی تفریق نہیں ہے (۳)۔ پراکرت وہی زبان ہے جو آریوں کے ہندوستان میں آنے سے قبل رائج تھی ۔ اب اسے آریوں کی بدیسی نسل کے مقابلے میں آپ چاہے پراکرت کہہ لیں چاہے دراوڑی ، چاہے دیسی، چاہے ہندوستانی ۔ ناموں سے اس کی اصلیت نہیں بدل سکتی ۔ زبان وہی ہے جس کا تسلسل جب سے اب تک قائم ہے (۴) ہمارے یہاں اس لفظ کے کئی روپ مستعمل ہیں ۔ اٹا ۔ اٹاری ۔ اٹریا ۔ یہ خالص دیسی یعنی دراوڑی لفظ ہے (۵) سنسکرت والوں نے اس سے اپنے یہاں لفظ بنائے ہیں، چنانچہ 'اٹریا، سنسکرت میں

---

(۱) " اتیت " کے معنی چلا ہوا نہیں، گزرا ہوا کہئے ۔ انگریزی Past, gone by.

(۲) قدیم پراکرت کی ادبی زبان سنسکرت ہے (۳) ماشاءاللہ!

(۴) پراکرت آریائی زبان ہے اور دراوڑ غیر آریائی ۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔

(۵) قدیم پراکرت یعنی پالی میں اس کی حسب ذیل شکلیں ہیں :

اَٹّ ۔ اٹّک ۔ اٹل ۔ اٹالا ۔ اَٹّالَک ۔ ان کے معنی ہیں ۔ قلعہ، دیدبان، بالاخانہ (مجازاً مضبوط، مستحکم) یہ تمام الفاظ جدید تحقیق کے مطابق سنسکرت اَٹّ اور اٹّالَک سے ماخوذ ہیں۔ (پالی انگلش ڈکشنری ڈاکٹر ڈیوڈس) مسٹر برو نے (دراوڑ اشتقاقی ڈکشنری ص ۱۰) ٹامل اور ملیالم 'الم' کی اصل سنسکرت 'اٹ' بتائی ہے۔

پہنچ کر اٹالکا ہوگیا ہے ۔ کس طرح ؟ یہ الگ بحث ہے ۔

لفظ '' آج جول '' ممکن ہے آپ ہی کی تحقیق کے مطابق درست ہو ۔ (۱) یہ لفظ چونکہ اردو میں مستعمل نہیں ہے اس لئے میں اس سے زیادہ تعرض نہیں کرتا لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس دو اردو لفظ آجلا ، آجالا وغیرہ سے متعلق نہ کر دیجئے گا، اس لئے کہ '' جوّل '' خالص قدیم ایرانی لفظ ہے اور آجالا یا آجلا خالص دراوڑی (۲) دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہے ۔

'' اچپل '' کے سلسلے میں بھی آپ نے مجھے بہت سی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کا پھر میں شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن میں یہاں ان کتابوں کو جو کچھ محققین نے اپنی اپنی بساط بھر محنت کرکے تصنیف کی ہیں، مفید مطلب نہیں پاتا ، البتہ اگر آپ ویدک و سنسکرت کی ادبی کتابوں یا گراموں وغیرہ کا حوالہ دیں تو میں انہیں بصد شوق دیکھ لوں گا ۔ جدید زبانوں کے اشتقاق کے متعلق جن حضرات نے صوتی و صرفی و نحوی تغیرات کے اصول وضع کئے ہیں یا ان پر اضافہ فرمایا ہے ان سب کا ایک ہی زاویہٴ نگاہ ہے اور وہ یہ کہ اتنی بہت سی زبانیں سب کی سب صرف ایک سنسکرت زبان سے نکلی ہیں اور یہ نظریہ میری سمجھ سے بالا تر ہے ۔ یہی میرے اور آپ کے نظریات کا بنیادی اختلاف ہے اور مجھے امید ہے کہ اس اختلاف کا حق مجھے ضرور دیں گے ۔ (۳) تحقیق مجھے یہ بتاتی ہے کہ پراکرت کے ابتدائی الفاظ کی خصوصیات میں اب تک کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا ہے، چنانچہ جو لوگ سنسکرت لفظوں میں حسب منشا و حسب موقع تراش خراش کرکے لفظ سازی کی کوشش کرتے ہیں ، یعنی سنسکرت کی مکتوبی شکلوں کو ہمارے ملفوظی روپوں پر ترجیح دیتے ہیں ، وہ اپنے اپنے نقطہٴ نظر سے چاہے جتنی اچھی کوشش کرتے ہوں، میرے لئے ان کو درست تسلیم کرنا ، نہ ممکن ہے نہ واجب اسلئے کہ میں آواز کو حرف پر اور بھاشا کو لپی پر مقدم جانتا ہوں ۔ لفظ اچپل کی جو تشریح آپ نے کی ہے، وہ تسلی بخش نہیں ہے لیکن اس وقت میرے پاس بھی کوئی متبادل تجویز نہیں ہے ۔

لفظ '' ادھر '' کے مفروضہ ماخذ '' اترتس '' کی آپ نے جو توضیح فرمائی ہے اور اس سلسلے میں صفیریہ وھائیہ کی جو پھر بحث اٹھائی ہے ، میں نہایت ادب کے ساتھ اس سے اختلاف کرتا ہوں ۔ آپ نے اپنے اس اصول کو درست ثابت کرنے کے لئے کہ صفیریہ کے پڑوس میں الفاظ ھائیہ ہوجاتے ہیں ، پھانس (پانش) اور بھاپ (واشپ) وغیرہ کی

---

(۱) امکان کا کیا سوال ہے۔ ڈکشنریاں موجود ہیں ، سب میں 'اج جول' لکھا ہے ۔

(۲) 'اجلا' یا 'اجالا' دراوڑ زبانوں کی لغات میں درج نہیں۔ 'اَجّل' پالی میں روشن اور سفید کے معنوں میں ہے ۔

(۳) آپ کو پورا حق ہے۔ لیکن تحکم یا استبداد اہم علمی معاملات میں مناسب نہیں ۔

مثالیں بھی دی ھیں ۔ لیکن میں نے رگ وید میں پھپھڑا کو پپرو اور بھجن کو ورجن لکھا ھوا دیکھا ھے (سند کے لئے ملاحظہ فرمائیے سوکت نمبری ۱۰۰-۱-۱ نیز ۱-۲۳-۲، ۱۰۱)۔ اب میں آپ سے دریافت کرتا ھوں کہ پراکرت کے یہ صفیریہ سے خالی الفاظ جن کو آپ کے نظریے کے مطابق وبدک الفاظ سے ھی مشتق سمجھنا چاھیے ، ھائیہ کیسے بن گئے۔ (۱)
پھر آپ نے اتر تس کے تس کو یہ کہہ کر گرانا چاھا ھے کہ ,, س ،، وسرگ کا قائم مقام ھے اور ,, ت ،، آخری حرف صحیح ھونے کی وجہ سے گرگئی ھے ۔ اس سلسلے میں میری گذارش یہ ھے کہ سنسکرت میں وسرگ کا ,, س ،، الفاظ میں مکتوبی نہیں ھوتا (۲)۔ دوسری قباحت یہ ھے کہ یہ لفظ کا اشتقاقی جز نہیں ھوتا تعریفی لا حقہ ھوتا ھے اس لئے لفظ کے الٹ پھیر سے کوئی واسطہ نہیں (۳)۔ تیسری قباحت یہ ھے کہ وسرگ یا اس کا قائم مقام ,, س ،، صرف اسم فاعل یا اسم مفعول کے بعد آتا ھے (۴)۔ تو ادھر کا مفروضہ ماخذ ,, اتر تس ،، متعلق فعل (ظرف مکاں) ھونے کی حیثیت سے وسرگ یا اس کے قائم مقام ,, س ،، کا مالک کیونکر بن سکتا ھے ۔ آپ فرماتے ھیں کہ آخری ,, ت ،، حرف صحیح ھونے کی وجہ سے آ گئی ھے ۔ یہ بات پراکرت کے گرامر نویس بھی کہتے ھیں اور اس لئے کہتے ھیں کہ انھیں سنسکرت سے پراکرت کا براہ راست اشتقاق ثابت کرنا ھے (۵) اور آپ براہ راست اشتقاق کے قائل نہیں جیسا کہ آپ , اردو نامہ ' کے صفحہ ۸۰ پر فرما چکے ھیں لیکن اصول وھی برت رھے ھیں، جو انھوں نے برتے ھیں ۔ اس کی وجہ آپ ھی بہتر سمجھتے ھونگے ۔ البتہ میرا نظریہ یہ ھے کہ پراکرت کے الفاظ ویدک اور سنسکرت والوں نے اپنی زبان (قدیم ایرانی) میں ملالئے ھیں اس لئے میں یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ ان لوگوں نے پراکرت الفاظ کی آخری

---

(۱) پھپھڑا سنسکرت پھپ پھسہ کا بگاڑ ھے اور بھجن سنسکرت مادہ بھج کا اسم ھے ۔ اور دونوں میں ھائیہ ھے۔ پپرو اور 'ورجن' ان سے مختلف الفاظ ھیں ۔

(۲) یہ کوئی قاعدہ نہیں۔ 'س' کو خاص خاص صورتوں میں جن کی تفصیل گرامر میں دیکھی جا سکتی ھے، وسرگ سے نہیں بدلتے، جیسے نرس ترت (مرد تیرتا ھے) اس میں 'س' موجود ھے۔ نرہ کردت (مرد کرتا ھے) اس میں 'س' وسرگ سے بدل گیا ھے۔ تنہا لفظ کو یورپ کے عالم ھمیشہ 'س' سے لکھتے ھیں۔ یہ 'س' سنسکرت کے علاوہ قدیم فارسی، لاطینی اور یونانی میں بھی ھے۔

(۳) ,, اتر تس ،، کے 'س ، کا ,, ادھر ،، کی بناوٹ اور اس کی تعمیر میں کوئی دخل نہیں ۔

(۴) یہ بالکل غلط ھے ۔ وسرگ 'س' کا قائم مقام ھے جو اسم ۔ فعل ۔ حرف میں ھرجگہ پایا جاتا ھے اور اعرابی علامت بھی ھے۔ چند مثالیں درج ھیں :
سس सस् (دہ) ایشس एषस् (یہ) نرس नरस् (مرد) نراس नरास् (بہت سے مرد)
ناوس नावस (ناؤ سے) ان میں سے کوئی لفظ بھی اسم فاعل یا اسم مفعول نہیں۔

(۵) زبانوں اور ان کی قواعد کے تقابلی مطالعہ کے بعد ماھرین لسانیات نے یہ اصول بیان کئے ھیں۔ پہلے سے کوئی خیال ان کے ذھن میں نہ تھا کہ وہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

حرکت فتحہ کو اپنی تحریر میں (۱) '' ت '' سے ظاہر کیا ہے ۔ اگر آپ اس کی بھی دلیل نقلی چاہتے ہیں تو یا سک کی تشریح رگ وید ملاحظہ فرمائیے ، جس میں اس نے صاف صاف الفاظ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ رگ وید کے الفاظ کی آخری '' ت '' بعض اوقات محض برائے بیت ہوتی ہے جس کا اصل لفظ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا — غرض اترتس کا 'س' و سرگ نہیں ہے ۔ اس لئے 'ت' کے ساقط ہونے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا —

آخر میں آپ کو ایک بات کی داد دینا ضروری سمجھتا ہوں ۔ آپ جس طرح اپنے نقادوں یا تبصرہ نگاروں کی خبر لیتے ہیں اس کا جواب نا ممکن ہے ۔

مجھے امید ہے کہ آپ میرا یہ خط بھی 'اردو نامہ' میں شائع کرکے مزید شکرگزاری کا موقع دیں گے — والسلام

نیاز مند

سہیل بخاری

(۱) کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ سبز واری

تبصرے

ش ح ح
خ ح ش
م ز م

ذخیرۃ الخوانین (جلد اول)
تالیف شیخ فرید بھکری
مرتبہ ڈاکٹر معین الحق
پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی
۳۵۰ صفحات ' قیمت ۱۸ روپیے

'' ذخیرۃ الخوانین ،، کا یہ نسخہ ، جسے ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا ھے ، مہ لقا بائی چندا کے کتب خانے کی یادگار اور فی الوقت غالباً نادر روزگار ھے۔ یہ دربار مغلیہ کے امراء کا بڑا جامع اور اپنی قسم کا اولین تذکرہ ھے' جو ۱۰۶۱ ھ کے لگ بھگ مکمل ھوا ۔ مولف نے تمہید میں خود لکھا ھے کہ اگرچہ بہت سے تذکرے قدما سے یادگار ھیں '' ... اما حالات خوانین سپہر احتشام کہ ھر یکے دستور العمل روزگار کامرانی کردہ اند و میکنند ، واقعات و واردات آنہا کہ عبرت بخش عالمیان و ھوش افزائے جہانیان است تا حال ھیچ عزیزے متصدی بیان حالات آنہا نہ شدہ ۔ ،، اسی نوع کے دوسرے تذکرے ماثر الامراء اور تذکرۃ الامراء دونوں اس کے ایک صدی بعد لکھے گئے تھے اور دونوں اس کے خوشہ چین تھے ۔ شاھنوازخاں نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ھے ، اور ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق بعض جگہ شیخ کے بیان میں تصرف و تبدل بھی ۔ خود یہ تذکرہ جدید مورخین کی نظر سے پوشیدہ رھا۔ زیر نظر باب اول میں عہد اکبری کے ۱۸۴ امراء کا حال درج ھے ۔ ان میں اکابر امراء کا ذکر زیادہ مفصل ھے اور بعض کا صرف نام اور منصب بتانے پر اکتفا کی گئی ھے ۔ شیخ فرید بھکر (سندھ) کے رھنے والے تھے ۔ مشہور مغل امیر مرزا عیسیٰ بیگ سے خاندانی نسبت رکھتے تھے ۔ وہ اور ان کے والد مختلف حیثیتوں میں مغل امراء اور دربار مغلیہ کے معاملات سے وابستہ رھے ۔ وہ ایک صوفی منش آدمی تھے ، شاعری اور تاریخ گوئی سے بھی مس تھا ۔ چنانچہ بہت سی خود نوشت تاریخیں تذکرے میں درج کی ھیں ۔ یہ تذکرہ انہوں نے آخر عمر میں مرتب کیا ھے ، جب کہ ان کی نظر پختہ اور تجربہ وسیع ھو چکا تھا۔ اپنے معاصر امراء کی سیرت و کردار پر مؤلف کی رائے زنی عموماً پختہ اور قابل اعتبار ھے ۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے اس کتاب کو شائع کرکے عہد مغلیہ کے تاریخی مآخذ میں اھم اضافہ کیا ھے ۔ ڈاکٹر معین الحق صاحب کے حواشی نے اسے اور بھی مفید بنا دیا ھے ۔ ش ح ح

دیوان ہاشمی

مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ، ۱/۱۶ دراؤن سائز
صفحات (۳۶۲) قیمت ۶ روپے
ناشر ادارۂ ادبیات اردو
ملنے کا پتہ : سب رس کتاب گھر ، ایوان اردو ۔ حیدرآباد دکن (اے پی)

ہاشمی بیجاپوری (متوفی ۱۱۰۹ ھ) عادل شاہی دور کا قادر الکلام سخن پرداز اور اردو ریختی کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا ۔ اس کے دیوان ریختی کا صرف ایک مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے ، جسے ڈاکٹر حفیظ قتیل نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے ۔ ابتداء میں (۹۲) صفحات کا مقدمہ ہے ، جس میں مرتب نے ہاشمی کے نام، وطن ، مذہب ، سنہ وفات اور مدفن کے متعلق، ان سے پہلے کے محققین کے بیانات پر ناقدانہ بحث کی ہے اور بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے — حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے اپنی کتاب "اردوئے قدیم" میں اور جناب سخاوت مرزا نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالۂ اردو ادب بابت مارچ ۱۹۵۸ء میں ہاشمی کے بارے میں تفصیلی معلومات قلمبند کی تھیں ۔ ڈاکٹر قتیل نے ان سے استفادہ کرتے ہوئے اختلافی مسائل پر سیر حاصل بحث کرکے صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے ۔ مقدمے کے صفحہ (۷) پر ہاشمی کی مثنوی " یوسف زلیخا " کے سنہ تصنیف اور تعداد اشعار کی وضاحت میں مثنوی کے یہ آخری دو شعر :

مرتب کیا میں یہ قصہ کوں دو ہزار برس پر جوتھے نود پونو
اگر کوئی بیتوں کا پوچھے شمار کہ یک صد اسی سات ہے پنج ہزار

پیش کرکے جناب سخاوت مرزا کی بتائی ہوئی تعداد اشعار (۵۱۰۷) کی بجائے (۵۱۰۰) اشعار کا تعین کیا ہے — استدلال یہ کیا گیا ہے کہ آخری مصرع میں " اسی سات " بمعنی " ہمراہ " کے استعمال ہوا ہے نہ کہ سات ، ہندسہ ہے — اس کے بعد وہ لکھتے ہیں : "اس مثنوی کے متعدد نسخے کتب خانوں میں محفوظ ہیں — " کیا اچھا ہوتا کہ مرتب کم از کم ایک دو نسخوں کے اشعار کی تعداد گن کر اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرتے - " اسی سات " جہاں " ہمراہ " کے معنی دیتا ہے وہاں ' اسی سات ' (۸۷) بھی ہو سکتا ہے ۔ آگے چل کر صفحہ [۱۷] پر رقم طراز ہیں : " زیر نظر دیوان میں ایک غزل ایسی بھی ہے جو غواصی [وفات ۱۰۵۷ ھ] کے دیوان مرتبہ محمد بن عمر مرحوم کے حصۂ نظم میں شامل ہے ۔" پھر لکھتے ہیں کہ " ہاشمی کی غزل میں غواصی کے تخلص سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ غزل غواصی کی ہے ۔ بہر حال تقابلی مطالعے کے لئے دونوں غزلیں نقل کردی جاتی ہیں ۔" نہ صرف مقدمے میں یہ غزل درج ہے بلکہ ردیف " ن " کی غزلوں کے تحت صفحہ [۱۵۲] پر بھی شائع ہوئی ہے ۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب مرتب نے اسے غواصی کی غزل تسلیم کرلیا تو پھر

کیوں اسے دیوان ہاشمی میں شریک کیا گیا ؟

لائق مرتب نے صنف ریختی کا ذکر کرتے ہوئے ہاشمی کی ریختی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے :

" ہاشمی کی ریختی دکن کی نسوانی زندگی کا ایسا مرقع ہے جس میں دکن کی عورتوں کی زبان ، ان کی پوری تہذیب ، طرز فکر ، جنسی زندگی کی نفسیات ، اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کا اثر خانگی زندگی پر، جیسی تمام تفصیلات محفوظ ہو گئی ہیں " ۔

ہاشمی کی پُر گوئی اور قادر الکلامی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ تقریباً پونے تین سو سال گزرنے کے بعد آج بھی اس کا کلام دستبرد زمانہ سے بچنے کے بعد کسی اور بڑے شاعر سے کم نہیں ہے ۔ اس کے کلام میں ندرت خیال کے ساتھ ساتھ لطف بیان بھی موجود ہے ۔ محاورے، ضرب الامثال ، تکیۂ کلام ' مخاطبت اور رہن سہن کے شگفتہ و برجستہ نمونے بھی ملتے ہیں ۔ ہاشمی نے جہاں جہاں جنسی معاملات اور خاص نفسی کیفیات کو نمایاں کرنے کی جسارت کی ہے وہاں عریانی سے اپنا دامن بچانے کی حتی المقدور سعی بھی کی ہے۔ چونکہ یہ دیوان پہلی دفعہ شائع ہوا ہے اور ہاشمی کی ریختی سے اردو دنیا بہت کم واقف ہے ، اس لئے مختلف غزلوں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :

مراٹک ہات چھوڑو جی ہے کل سوں درد شانے کا
سے
تمارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے حاجت ہے نہانے کا
تمہارے نہانے

شراب ارغوانی کیا پیے ہو تم مری خاطر
پلائی کون بھونڈی نے مرے پر دُھم مچانے کا
دھوم

اونو آویں تو پردے سوں گھڑی بھر بھار بیٹھوں گی
وہ سے باھر
بہانہ کر کے موتیاں کے پرونے ہار بیٹھوں گی

اونو یاں آؤ کیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
کہیں
اٹھلتی اور مٹھلتی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی

بلایاں جیؤ کے جیو میں لے پڑوں گی پاؤں میں دل سوں
دل سے
و لے ظاھر میں دکھلانے کوں ھو اغیار بیٹھوں گی

مرتب نے کتاب کے آخر میں [۲۲] صفحات کی ایک فرھنگ شامل کردی ھے، جس میں قدیم دکنی الفاظ کے معنی لکھ دئے گئے ھیں ۔ اس فرھنگ سے غزلوں کا مطلب سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ھے ۔ اس نادر مخطوطے کی ترتیب و اشاعت پر لائق مرتب اور ادارۂ ادبیات اردو دونوں شکریے اور مبارک باد کے بہر طور مستحق ھیں ۔ اس دیوان کی اھمیت و افادیت کے پیش نظر اس کی کتابت اور طباعت دیدہ زیب ھوتی تو اچھا تھا ــ ایسی نادر کتابیں بار بار نہیں چھپ سکتیں ، اس لئے ادارۂ ادبیات اردو کو ھمارا یہ بر خلوص مشورہ ھے کہ جس طرح اس کی مطبوعات معیاری اور بلند پایہ ھوتی ھیں ان کی طباعت اور دیدہ زیبی بھی معیاری ھونی چاھئے تاکہ اردو کتابیں دنیا کی دوسری زبانوں کی کتابوں کے پہلو بہ پہلو اپنا مقام حاصل کر سکیں ــ

خ ۔ ح ۔ ش

ابوجہل اور عکرمہ تاریخ اسلام کا دامن عجیب و غریب جواھر ریزوں سے مالا مال ھے ، جن کی تابانی و درخشانی آج تک نگاھوں کو خیرہ کر رھی ھے ۔ جو اھل بصیرت ان درخشندہ جواھرات کو پرکھ سکتے ھیں ، وھی ان کی قدر و قیمت سے خوب واقف ھیں ۔ زندہ قومیں اپنے شاندار ماضی کی روشنی میں مستقبل کی تعمیر کا سامان بہم پہنچاتی ھیں ، اس لئے ان کا کوئی فرد اسلاف کے عظیم الشان کارناموں کو موقع موقع سے ابنائے قوم کے سامنے لاتا رھتا ھے ، تو وہ در اصل اپنی قوم کی صحیح خدمت انجام دیتا ھے ــ

حضرت عکرمہ ابن ابو جہل ۔ صدر اول کے ان فرزندان اسلام میں سے ھیں جنھوں نے ایک مدت تک اپنے باپ کے ساتھ اسلام دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ، لیکن جب حقانیت کے نور سے ان کی آنکھیں روشن ھوئیں تو انھوں نے حق کی حمایت میں جان لڑا دی اور آخر تک کافروں کے مقابلے میں سر فروشی کرتے رھے یہاں تک کہ عین جہاد میں جب کہ جنگ کا پانسہ ان کی بدولت نہایت کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں پلٹا

اور انہیں ایک بے مثال فتح حاصل ہوچکی تھی ، حضرت عکرمہ نے جان عزیز جان آفرین کی راہ میں قربان کردی —

انہی دلچسپ ، ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کی تفصیل جناب مولانا رازق الخیری کی اس کتاب کا موضوع ہے —

مولانا رازق الخیری جو پاک و ہند کے مشہور و مقبول عام ادیب مولانا راشدالخیری مرحوم و مغفور کے خلف الرشید ہیں اور رسالہ عصمت کے ایڈیٹر اور کئی مفید کتابوں کے مولف ہیں، کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے شگفتہ نگار قلم سے کتاب کو دلچسپ بنانے میں جیسی کاوش کی ہے اس کا اندازہ اس (۲۴۸) صفحات کی کتاب کے مطالعہ سے بہ آسانی ہو سکتا ہے — اس کی قیمت تین روپیے آٹھ آنے ہے اور عصمت بک ڈپو کراچی سے مل سکتی ہے —

مجموعی حیثیت سے کتاب کے مفید اور دلچسپ ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں — البتہ کتابت کی غلطیوں پر توجہ دلانا ضروری ہے جن کی صحت کا اہتمام خاطر خواہ نہ ہونےکی وجہ سے کتاب کی خوبی میں کسی قدر کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مثلاً کفّارہ کو کتّفارہ، عبدالیغوث کو عبدالغیوث، شحیم کو شہیم ، پہچانا کو پیچھانا ، وغیرہ لکھ دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں یہ فرو گزاشت دور ہوجائے گی۔ بہر حال کتاب قدر کی مستحق ہے اور اس کے مولف بجا طور پر مبارکباد کے حق دار ہیں —

م، ز، م

چھ نئی کتابیں

اور نیا تنقیدی شعور

پروفیسر اختر انصاری دہلوی
تنقیدی ادب کے ہاتھ میں
ایک نئی مشعل ۔

اردو ادب میں حالی
جس منصب اور اعزاز کے
مستحق تھے انھیں اس پر
نہیں بٹھایا گیا ۔ اس کتاب
میں حالی کو نئے تنقیدی شعور
کی روشنی میں دیکھا اور
دکھایا گیا ہے ۔

قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے

انتخاب داغ

بابائے اردو مولوی عبدالحق
نواب مرزا داغ کی خصوصیات
شعری کا نمایندہ انتخاب ۔
بابائے اردو کے گرانقدر مقدمے
کے ساتھ ۔

قیمت چار روپے

ادب اور شعور

ممتاز حسین
ممتاز حسین کے بلند پایہ مقالات
اور تنقیدات ، تنقید کی ہر خار
وادی میں جس بے باکی اور
شعور سے ممتاز حسین داخل
ہوتے ہیں ، کم ہی مثال
ملتی ہے ۔

قیمت : دس (۱۰) روپے

تذکرۂ جگر مراد آبادی

محمود علی خان جامعی
دیکھا جگر کو خلوت و جلوت
میں بارہا ۔
اور اس نچوڑ کو جامعی
صاحب نے اس کتاب میں
محفوظ کردیا ہے ۔

قیمت : چار روپے ۲۰ پیسے

اردو صرف ونحو

بابائے اردو مولوی عبدالحق
بابائے اردو نے اردو صرف ونحو
لکھ کر اس کی بنیاد کو اور
زیادہ مستحکم اور مضبوط
کردیا ہے ۔

قیمت : تین روپے

روح جاوداں

علامہ ثاقب کانپوری
ثاقب نے اس گئے گزرے دور
میں بھی تغزل کی روح کو
برقرار رکھا ہے اور بدلے ہوئے
رجحانات اور تقاضوں کا بھی
ساتھ دیا ہے ۔

قیمت تین روپے

اردو اکیڈمی سندھ

مشن روڈ ۔ کراچی

اردو مرکز

گنپت روڈ، لاہور

کتاب ایجنسی

تلک چاڑی حیدرآباد

ایک روپیہ
ONE
RUPEE

کامیابی
کا راز
روزانہ
شیو

اپنے داموں
سب سے اعلیٰ

آسان سہل شیو کے لئے

ٹریٹ بلیڈ استعمال کیجئے

۵ آنے یا ۳۱ پیسے کے ۵ بلیڈ
۱۰ آنے یا ۶۲ پیسے کے ۱۰ بلیڈ

گرمائی
اور پائیداری
میں بے نظیر
اے بی سی
ہاتھ سے بننے کی اون
• پختہ رنگ • سکڑنے سے محفوظ
• قسم قسم کے رنگوں میں دستیاب
• کے ذریعہ زندگی بھر کیلئے کیڑا لگنے سے محفوظ
ABC
hand knitting wool
Mothproof

پاکستان کی معاشی ترقی کے لئے
چھوٹی اور بڑی صنعتوں کی
متوازن ترقی ضروری ہے۔
اشیائے صَرف کی وسیع پیمانے پر
پیداوار میں جو دشواریاں پیش آتی
ہیں جدید صنعتی مشینیں ان کا
بہترین حل ہیں۔
چھوٹی صنعتیں موروثی فنون لطیفہ کی
پرورش و سرپرستی کرنے کے علاوہ
فنکاروں اور دستکاروں کیلئے وسیع
ذرائع روزگار مہیا کرکے زندگی کے
معیار کو بلند کرتی ہیں۔

معاشی خوشحالی کی مضبوط بنیادیں!
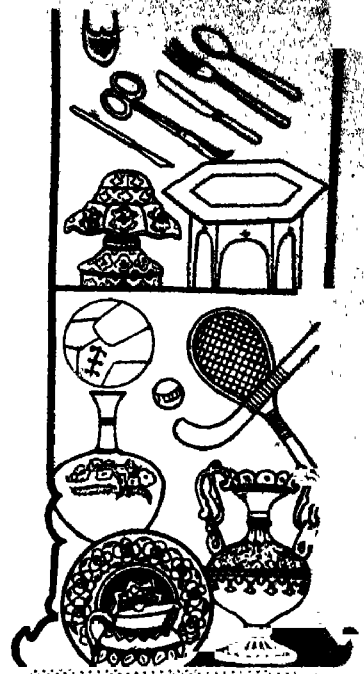
آج تک پی۔آئی۔ڈی۔سی کی کوششیں
صرف بڑی صنعتوں کے فروغ تک ہی
محدود تھیں لیکن اب مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کو چھوٹی
صنعتوں کی جدید طریق پر ترقی کی
ذمہ داری بھی سونپ دی گئی ہے۔
یہ صنعتیں بھی اہل ملک کی خوشحالی کیلئے
پوری طرح کارگر ہونی چاہئیں۔
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
اس فرض پر اپنی گذشتہ کامیاب
روایات کے مطابق

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی نئی اور اہم مہم

چھوٹی اور بڑی دونوں صنعتوں کی یکساں ترقی

WEST PAKISTAN INDUSTRIAL DEVELOPMENT CORPORATION
KARACHI

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

سگریٹ سلگائیے اور لطف اٹھائیے

WILLS's

Navy Cut

MEDIUM CIGARETTES

۳۶ پیسہ میں دس سگریٹ۔

COMPANY

یہ دلپسند نعمتیں بانو ہی میں
پکانے کے لائق ہیں !
قدرت نے انسان کو اپنی نعمتوں کے ساتھ کھانا پکانے کا
ہنر بھی بخشا ہے۔ گوشت ہو یا ترکاریاں اچھے روغن میں
پکائے جائیں تو بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔
غذائیت سے بھرپور بانو بناسپتی میں
پکے ہوئے کھانے زیادہ لذیذ اور صحت بخش ہوتے ہیں
BANO
BANASPATI
A D
10 Lbs. Net
بانو بناسپتی
وٹامن اے اور ڈی شامل ہیں
ہاتھوں سے مس کئے بغیر تیار اور پیک کیا جاتا ہے۔ ۲ پاؤنڈ، ۵ پاؤنڈ، ۱۰ پاؤنڈ
اور ۳۵ پاؤنڈ کے ڈبوں میں ملتا ہے
برما آئل ملز لمیٹڈ - کراچی

ترقی اُردو بورڈ کی جامع تاریخی و تحقیقی

اُردو لُغت

(مختصر، جلی نسخہ)

جلد اوّل : الفِ مقصورہ

اردو لغت کے مجمل نسخے کی قسط وار طباعت کا جو سلسلہ ''اردو نامہ'' نے جاری کیا ہے، یہ اس کی تیسری قسط ہے۔

ہم نے اعلان کیا تھا کہ اگر اہل ذوق نے اس سلسلے سے دلچسپی کا اظہار کیا اور کافی خریدار پیدا ہوگئے ، تو ہر شمارے میں لغت کے صفحات کی تعداد بڑھادی جائے گی اور رسالے کو بھی ماہنامہ بنادیا جائے گا۔ ہمارا یہ ارادہ قائم ہے۔ جو حضرات بچھلی قسطیں حاصل کرنا چاہیں وہ ''اردونامہ'' کے دفتر سے ۵۰ نئے پیسے فی قسط کی شرح سے حاصل کر سکتے ہیں (مع ڈاک محصول) ۔

البتہ جو حضرات یکم ستمبر ۱۹۶۲ع تک سالانہ چندہ بھیج کر خریدار بن جائیں، انہیں پچھلی قسطیں مع ''نمونۂ لغت'' (مطبوعہ جولائی ۱۹۶۱ع) مفت پیش کی جائیں گی۔

ادارہ

تصحیح

غلط		صحیح
ص ۱۵ سطر ۲۰	جھلاپور	جھلابور
ص ۴۴ سطر ۱۷	مُطبر	مَطیر
ص ۴۶ سطر ۱	آبراهیم	اِبراهیم

۲۔ (الف) فولاد کا پانی: فلکی نیلگوں یا دخانی رنگ کی چمکیلی، دھوپ چھاؤں لہریں یا بدلی سے ملتے جلتے دھبے، جو تلوار، خنجر وغیرہ کے پھل یا ڈھال کی سطح، بندوق کی نال یا دوسرے فولادی اسلحہ پر صیقل کے ذریعے نمودار کئے جائیں: جوہر، پانی، (ب) اسی طرح کے لہریے یا دھبے جو رنگ سے کاغذ پر ڈالے جائیں۔

ابر اٹھ کر تیغ قاتل سے سپر ہونے لگا

۱۸۵۳ وزیر، ۴۹

ظلمت جو ابر تیغ عدو کی نظر پڑی
بجلی کی طرح مرکب حیدر چمک گیا

۱۸۶۶ گلدستۂ امامت، ۲۳

برق تیغ نگہ ناز سے جل جائے گا
جوش زن تیغ رگ ابر سپر کیا ہوگا

۱۸۷۳ دیوان بیخود لکھنوی، ۱: ۳۱

جس جا ہیں ابر ڈھالوں کے اس بن میں دتے شراب

۱۹۵۱ آرزو، مسدس متخیرہ، ۳: ۳۸

۳۔ (تصوف) حجاب جو مراتب سلوک یا شہود کے حصول میں حائل ہو۔ (مصباح التعرف، ۲۴)

اف: آنا، اٹھنا، امنڈنا، برسنا، چھانا، گرجنا، گھرنا

[ف: ابر، اوستا: اورہ، قب س: ابھر کالاں]

—آذاری کس اضا آغاز بہار کا بادل؛ ماہِ آذار (شامی مہینہ مطابق ہندی چیت یا مغربی مارچ) میں اٹھنے والی گھٹا

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں پر ابر آذاری اٹھا، برسا، گیا

۱۹۲۴ بانگ درا، ۲۰۴

پھر بہار آئی رسول اللہ کے گلزار میں
فصل گل کے ساتھ ہی ساتھ ابر آذار آ گیا

۱۹۳۷ بہارستان، ۳۶۲

[ف: ابر + آذار (= شامی مہینہ، چیت یا مارچ کے مطابق)۔ مرکب اضافی]

—آذری کس صف ماہ آذر (ایرانیوں کے سال کا نواں مہینہ) کا بادل، جو برستا کم اور گرجتا زیادہ ہے

—بہمن کس اضا وہ بادل جو شمسی مہینے بہمن (پھاگن یا فروری کے لگ بھگ) میں آئے۔

اوپر اوپر جائے مثل ابر بہمن آب میں

۱۸۵۴ ذوق، د، ۴۴

کیا مست اٹھا ہے ابر بہمن

۱۸۹۶ لعل نامہ، ۲۱

[ف: ابر + بہمن > پہلو: وہو مَنَ > اوستا: وہو منہ (وہو = بہتر + من = خصلت)]

—پھٹنا ف ل چھائے ہوئے بادل کا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منتشر ہو جانا، بادل چھٹنا

سولھویں دن ذرا ۔۔۔ ابر پھٹا ، سورج کا کونا دکھائی دیا ۔

۱۹۴۷ فرحت ، مضامین ۲ : ۱۰

زور بڑھ بڑھ کے لعینوں کا گھٹا جاتا ہے
ابر بجلی کے تھپیڑوں سے پھٹا جاتا ہے

۱۹۵۱ آرزو ، خمسہ متحیرہ ، ۱ : ۱۰۲

ـــ تَر کس صف

برسنے والا بادل، بھیگی بھیگی گھٹا، جس سے بارش کی امید ہو۔

آجائے تو روتے ہیں ہم شرط ابر تر سے باندھ کر

۱۸۵۱ مومن، ک، ۶۲

کوئی تو روئے گور غریباں پہ اے فلک
آئے اگر نہ شمع کبھی ابر تر تو بھیج

۱۸۵۴ ک ، ظفر، ۳ : ۲۹

ـــ تُنک کس صف

چھدرا بادل، ہلکی گھٹا جس کا دل کم ہو، ابرِ غلیظ کی ضد

ابر تنک کی صورت منہ پر نقاب ہوگا

۱۸۵۴ صبا، غنچۂ آرزو، ۶

بالوں میں یہ صورت ہے ہر اک خستہ جگر کی
جس طرح جھلک ابر تنک میں ہو قمر کی

۱۸۷۴ انیس، ۳ : جلد ۳۶۲

ـــ تیرہ کس صف

سیاہ بادل، کالی یا گہری گھٹا

چاند نکلا صاف ابر تیرہ سے اک بات میں

۱۸۶۷ رشک، ۱۶۷

ـــ چھٹنا ف ل

مطلع صاف ہونا، گھٹا کا کھل جانا

تھی ہوا دم میں، اٹھی تھی جو بصد شور گھٹا
فوج کا ابر چھٹا کھل گئی گھنگھور گھٹا

۱۹۱۱ شمیم، بیاض (ق)

ـــ رحمت کس اضا

۱۔ وقت پر برسنے والا، خوب برسنے والا بادل؛ وہ گھٹا جس سے کھیتیاں ہری ہوں

لگے گی ابر رحمت کی جھڑی اب چشم گریاں سے

۱۸۵۴ ذوق، د، ۲۳۹

اس پری رو نے جو اٹھوایا مرے تابوت کو
گھر کے آیا ابر رحمت شامیانے کے لئے

۱۸۶۶ د، ھزبر، ۱۱۳

ملک میں علم و ہنر وہ اس طرح برسا گئے
ابر رحمت جس طرح کھیتی پہ برسے ٹوٹ کر

۱۹۰۲ جذبات نادر، ۱ : ۳۶

۲۔ (بطور تشبیہ) خدا کی رحمت، عنایت، مغفرت

ابر رحمت نے تو سو دفتر عصیاں دھوئے
سامنے اس کے میرا نامۂ اعمال ہے کیا

۱۸۲۴ مصحفی، انتخاب (رامپور)، ۲۶

ـــ غَلِیظ کس صف

گہرا بادل، گھنگھور گھٹا

رن میں جو گھرا ابر غلیظ اہل سقر کا
بجلی سا کڑکنے لگا کڑکیت کا کڑکا

۱۸۷۰ دبیر، دفتر ماتم، ۱ : ۲۲۴

طوفان پر طوفان برپا ہے، اوپر سے ابر غلیظ ہے۔

۱۹۱۲ نذیر احمد، تقاریر، ۶۵۵

ـــ قِبْلَہ کس اضا

۱۔ وہ گھٹا جو قبلے کی سمت (مغرب)

سے اٹھے

۲۔ ابر رحمت، خدا کا بھیجا ہوا بادل

ابر قبلہ بڑھتا بڑھتا آیا ہے میخانے پر

۱۸۱۰ میر، ک، ۶۳۹

—کرم کس اضا

۱۔ ابر کی طرح نہال کرنے والا، کرم اور سخاوت کی بارش کرنے والا، سخی، فیاض (بطور تشبیہ)

وہ ابر کرم ہے ہوا دار خلق

۱۷۸۵ سحرالبیان، ۱

یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر

۱۸۷۴ انیس، ۱: ۱

۲۔ (مجازاً) فیض، کرم، رحمت

نہ ہو اس کا شامل جو ابر کرم
اثر ابر نیساں سے ہو وے عدم

۱۷۸۵ سحرالبیان، ۱۱

پرورش دیوے چمن کو جو ترا ابر کرم
موتیا میں عوض غنچہ ہوں پیدا گوہر

۱۸۵۴ ذوق، د، ۳۲۶

بجائے ابر کرم مفلسی برستی ہے

۱۸۸۸ گلزار داغ، ۳۰۰

۳۔ رک: ابر رحمت

کشت امید کو سیراب کریں تو جانیں
روز لکھے ترے اے ابر کرم اٹھتے ہیں

۱۸۸۰ کلیات واسطی، ۱: ۱۳۲

—کو دیکھ کر گھڑے پھوڑنا

(کہاوت) کسی موہوم امید پر نقصان کر بیٹھنا، نا عاقبت اندیشی یا جلد بازی سے کام لینا

—کھلنا ف ل

مطلع صاف ہونا، بارش تھمنا

ابر بھی کھل جائے ہے دریا بھی گہ تھم جائے ہے

۱۸۵۱ مومن، ک، ۱۲۴

دوسرے روز صبح کو ہوا کم ہوئی، ابر کھلا، آفتاب نکلا۔

۱۸۴۲ الف لیلہ (منشی عبدالکریم)، ۱: ۶۹

—گندہ بہار کس اضا

برسات کا بادل (کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے برسات کو گندہ بہار کہتے ہیں)

یہ ابر گندہ بہار گھر کر آیا ہے

۱۸۹۲ طلسم ہوش ربا، ۷: ۵۱۹

—گوہر (گہر) بار کس صف؛ رک: ابر نیساں

بزم کا التزام گر کیجیے
ہے قلم میری ابر گوہر بار

۱۸۶۹ غالب، د، ۱۲۶

آنکھ سے گرتی ہے خون دل افکار کی بوند
اس کی ہمسر ہو کہاں ابر گہر بار کی بوند

۱۸۸۸ گلزار داغ، ۸۶

—محیط کس صف

جو طرف چھائی ہوئی گھٹا، حد نظر

تک پہلا ہوا بادل

— مردہ کس صف

۱۔ برسا ہوا بادل

آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب
ابر مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر
۱۸۵۴ ذوق، د، ۳۲۶

جس دل میں سوزِ عشق نہیں ہے فسردہ ہے
جو چشم اشک ریز نہیں ابر مردہ ہے
۱۸۷۰ دیوان اسیر، ۲۵۱

۲۔ اسپنج جو ایک سمندری جانور کا مردہ جسم ہے اور پانی جذب کرلیتا ہے۔

ابر مردہ، پنسل، ربڑ، یہ چیزیں تھیں نہ
۱۸۷۴ مجالس النساء، ۲: ۳۵

چشم نمناک بھی ہے واقف اعجاز مسیح
ابر مردہ اگر آتا ہے جلا دیتی ہے
۱۹۰۰ مرآۃ الغیوب، ۳

— مطیر کس صف

برسنے والی گھٹا، ابر تر

ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دود گلخن بھی
برستا اٹھے ہے آتش سے مثل ابر مطیر
۱۸۵۴ ذوق، د، ۳۲۰

فلک پر گرجتا ہے ابر مطیر
زمیں پر نہ کیوں رند گائیں کبیر
۱۹۳۲ بے نظیر شاہ، ۳۵۶

— نیسان/نیسانی کس ا نا

ماہ نیسان (شامی سال کے ساتویں مہینے مطابق اپریل) کا بادل ؛ وہ بادل جو (بہ روایت مشہور) نو روز سے ایک چلہ پہلے یا بعد برستا ہے اور اس کی بوند سے سیپ میں موتی اور بانس میں بنس لوچن (طباشیر) پیدا ہوتا ہے

بحر بے پایاں نے مجھ انجھو ستی پایا ہے فیض
ابر نیساں عید ہے مجھ چشم گوہر بار کا
۱۷۰۷ ولی، ک، ۷

کف دست ان کا رشک ابر نیساں
دم بخشش کیوں نہ ہو گوہر افشاں
۱۸۶۳ طلسم شایاں، ۳

مجھے مژگاں سے ہے جیسا در افشانی کا ڈھب آیا
کسے رونے میں ایسا ابرنیسانی کا ڈھب آیا
۱۸۵۶ د، ظفر، ۴: ۷

ابر نیساں کی پڑیں بوندیں جو تیری زلف پر
موتیوں کا گردن افعی میں مالا ہوگیا
۱۸۶۵ نسیم دہلوی، ۱۰۷

قطرہ ہائے ابر نیساں پر نہیں کچھ منحصر
آبرو جس اشک کو دی ہم نے گوہر ہوگیا
۱۹۳۶ گلدستۂ ناز، ۱۹

ابرا (فت ا، سکن ب) امث : وکت : ابرہ

ہوا ثابت کہ دریا باد سے جاڑے میں آئیں گے
ہوا آب رواں کا بھیجا جو ابرا : رشالی کا
۱۸۹۷ جان صاحب (ازمہذب)

ابرا (کس ا، سکن ب) امذ

بری کرنا، بری الذمہ قرار دینا

اگر قرضدار اس ابرا کو قبول نہ کرے تو
وہ غیر موثر ہوجائے گا۔
۱۸۸۵ جامع الاحکام، ۲ : ۶۳

[ع : ابراء (مد : ب ر ء) مص وزن اِفعال]

— نامہ امذ
دستاویز انفساخ، دعوے سے دست بردار
ہونے کی تحریر۔
اسی وقت نظارت خاں کو بلا کر حکم دیا
گیا کہ موضع روھٹ و ککروھی، جو شاھی
تولیت میں ھیں، ان کا ابرا نامہ داخل کر کے
صاحب کلاں بہادر کے قبضے میں دے دئے
جائیں۔
۱۹۳۵ بہادر شاہ کا روزنامچہ، ۸۶

اَبرار (فت ا، سکن ب) امذ

۱۔ (بطور جمع) پرہیزگار، نیکوکار لوگ

کیا جنت ابرار کے واسطے
جہنم گنہ گار کے واسطے
۱۷۶۳ سراج، ۱۲۳

پند احبّا و ابرار و مضار صحبت اشرار میں
تمیز کرو۔
۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۱ : ۱۵

اک ترے عشق کی دولت ہے مرے پاس وہ شے
جو نہ اخیار کے ہے پاس نہ ابرار کے پاس
۱۹۵۱ حسرت موہانی، ۷۰

۲۔ اولیاءاللہ، اصفیا

اب رحمت کرے گا آن کے آتش چھڑکاؤ
خاک پر رکھیں گے مجھو رندکی ابرار قدم
۱۸۴۶ آتش، ۹۷

رونا غم شبیر میں کام آیا بہت اشک
بخشے گئے ہم سید ابرار کے باعث
۱۸۹۳ معیار نظم، اشک، ۸۴

[ع : بَرّ (فت ب شد ر) = سچا، ج
وزن اَفعال]

اِبرام (کس ا، سکن ب) امذ

۱۔ اصرار، تقاضا، تاکید، پُر زور مطالبہ

کام ہوئے ھیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگئی اس نے جوں جوں میں ابرام کیا
۱۸۱۰ میر، ۱۰۶

اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ
مکان خالی کردو۔
۱۸۶۹ غالب خطوط، ۱۸۳

عام طور کی خواستگاری نہ تھی بلکہ اس کے
ساتھ اصرار و ابرام بھی۔
۱۸۹۱ ایامیٰ، ۱۲۷

۲۔ طلب، خواستگاری

شہنشاہ کا جب کرم عام ہو
تو درویش کو کیوں نہ ابرام ہو
۱۹۱۱ ک، اسمٰعیل، ۱۳

۳۔ انکار، ناگواری

خوان والوان سے بھی سیری نہیں ہوتی اس کی
اس کو گر نان جویں بھی ہو تو ابرام نہیں
۱۹۱۴ شبلی، ک، ۵۰

[ع : (ب ر م = تنگ دل ہونا، بے قرار ہونا)
مص وزن اِفعال = پختہ، مضبوط کرنا]

اِبراهیم

(کس ا، سکن ب، ی مع) امذ

سامی پیغمبر آذر کے بیٹے، آر (بابل) کے باشندے، توحید کے مبلغ، جنہیں بابل کے بادشاہ نمرود نے آگ کے الاؤ میں ڈال کر جلادینا چاہا، مگر آگ خدا کے حکم سے گلزار ہوگئی (قرآن پارہ ۱۷، سورۃ الانبیا، آیت ۶۹، رکوع ۴) یہودی آپ کے فرزند حضرت اسحٰق کی اولاد اور قریش آپ کے دوسرے فرزند حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہیں، بانیٔ کعبہ (۲۲۵۰ ق م — ۲۱۰۰)

تجھ سے ماسول عطا سب تو کریم ابن کریم
ہو وے یعقوب کہ اسحق کہ ہو ابراہیم

۱۸۱۰ میر، ک، ۱۳۹۰

ہیں جو مردان فدا آفت میں راحت ہے انہیں
عید تھی قربانیٔ فرزند ابراہیم کو

۱۸۷۳ مرأۃ الغیب، ۲۳۳

ہے رضائے دوست بڑھ کر الفت فرزند سے
ورنہ کیا دو بھر تھے اسمعیل ابراہیم کو

۱۸۹۳ مہتاب، داغ، ۱۳۶

[عبرانی : ابراهام (اب + رهام = بڑی جماعت کا باپ)؛ ابرام (اب + رام = بزرگ باپ کا)]

اَبرَش

(فت ا، سکن ب، فت ر)

(الف) صف۔ چتلا، چت کبرا، کبرا، کچھ سفید کچھ سیاہ

(ب) امذ۔ سرخ و سفید دو رنگا گھوڑا

مبصر جتنے ہیں کہتے ہیں وہ یوں
کہ ہے بعد اس کے ابرش اور کانوں

۱۷۹۵ فرسنامہ، رنگین، ۸

تھا صید کشتہ کون وہ جس کے لہو کو سونگھ
نتھنے پھلا پھلا ترے ابرش نے غش کیا

۱۸۱۷ انشا، ک، ۶

جاتا تھا ہوا پر صفت ابر یہ ابرش

۱۸۷۵ مونس، ۱: ۲۴۱

[ع : صف مشبہ (ب ر ش)، وزن اَفعَل]

اَبرَص

(فت ا، سکن ب، فت ر)

(الف) صف۔ **جس کے بدن پر سفید داغ دھبے ہوں: مبروص، کوڑھی**

دیواروں کا کاغذ بھی اس قسم کے دھبوں سے ابرص کی جلد کی طرح بدنما معلوم ہوتا تھا۔

۱۹۱۲ یاسمین، ۱۱۳

(ب) امذ **چتکبرا گھوڑا، جو عام طور سے بہت کم ہوتا ہے۔** (اصطلاحات پیشہ وراں: ۲۰۵)

[ع : صف مشبہ (ب ر ص)، وزن اَفعَل]

اَبرَق

(فت ا، سکن ب، فت ر) امث

رک : ابرک

سر برق پر یہ الف جب کہ آیا
تو اک دم میں ابرق بنا کر اڑایا

۱۸۹۶ ریاض شمیم، ۱: ۲۸۸

[ف : ابرک کی تعریب]

اَبْرَک (فت ا، سکن ب، فت ر) امث
ابرق

ایک معدنی شے جس کے چھوٹے بڑے پرت دار ڈھیلے، چٹانوں میں سے برآمد ہوتے ہیں، جن میں سے چمکدار، شفاف، کرارے اور بھر بھرے ورق جدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور بآسانی چورا ہوجاتے ہیں۔ ان پر آگ اور پانی اثر نہیں کرتے، نہ برقی رو سرایت کر سکتی ہے۔ برقی آلات میں عدم ایصال پیدا کرنے، قمقموں، دغدغوں، قندیلوں وغیرہ میں شیشے کی جگہ مستعمل چورا کر کے سفیدی میں ملانے سے جگمگاہٹ پیدا ہوتی ہے، طبیب کیمیاوی ترکیبوں سے اس کو جلا کر کشتہ کرتے ہیں، جو پرانی کھانسی، دمے وغیرہ کی دوا ہے۔

بوالہوس سوز دل کو کیا جانے
نہ جلے ھرگز آگ میں ابرک
۱۷۶۲ سراج، ۳۰۸

جھاڑ ابرک کے نہیں چادر مہتاب سے ہیں
جڑ تلک لپٹے ہوئے نخل گلستان ارم
۱۸۵۴ ذوق، د، ۲۹۱

چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی۔
۱۹۳۷ فرحت، دلی کی آخری شمع، ۳۱

[ف : ابرک، قب س : اَبْھْرَک अभ्रक]

اَبْرَن (فت ا، سکن ب، فت ر) امذ

اَبْھَرَن، آبھرن، آبْرَہَن، ابرھن
۱۔ زیور گہنا پاتا، سنگھار کا سامان

اس کی اس سادگی وضع پہ صدقے کیجے
ھیں غرض جتنے کہ سنگار جہاں تک ابرن
۱۸۱۷ انشا، ک، ۲۶۷

حضورا واقعی کہ بارہ ابھرن سولہ سنگھار سے سجی تھی۔
۱۸۸۹ آب حیات، ۲۸۳

۲۔ لباس، کپڑا لتا (قدیم)

پریاں کا جھوما جھوم ہوئے تے تن
کسے تھے سو سنگھار ہور ابرھن
۱۶۵۷ گلشن عشق، ۶۹

[س : آبھرن आभरण < بھر भृ = کپڑے پہننا]

اُبْرَن سُبْرَن (ضم ا، سکن ب، فت ر، ضم س، سکن ب، فت ر) امث (عو)

بچی کھچی چیز، اُخورہ نکمی شے

بنیے بقال سو سو پھیرے کرواتے، ھزار ھزار نکتوڑوں سے نکوڑے جہان کی ابرن سبرن گلے منڈھتے تھے۔
سگھڑ سہیلی، ۴۸

[س : اُدبھرن उद्भरण = بقیہ + س بھرن सुभरण = اچھا بقیہ (تابع)]

اُبَرْنا (ضم ا، فت ب، سکن ر) فعل
آبھرنا (قدیم)

۱۔ باقی بچنا، فاضل ہونا

بہت بیتاب ہے دل، دل منے کچھ تاب نئیں ابریا
جگر میں لہو کہاں کا لہو کی جا گا آب نیں اہریا
۱۶۳۴ سب رس، ۱۲۷

۲۔ ظاہر ہونا، باہر آنا، نکلنا

ولے لوگاں میں کچھ ابریا نہیں حال
نہ رانا بھار خوش نا گھر میں رانی
۱۷۰۰ بحری، ک، ۲۲۵

۳۔ زیادہ ہونا، بڑھ جانا

[س : اُدوارَن उद्धारण پ : اُبارَن उब्बारन

مد : (اُد+ور उद् + वृ رک : ابھرنا]

اُبرنجن (فت ا، سکن ب، فت ر، سکن ن، فت ج) امذ

ابرنجیں

الف۔ (جمع) **ہاتھ پاؤں کے زیور**

ب (واحد) **پہنچی یا پائل (پہنچی : دست برنجن، پایل: پا برنجن)**

[ف : غالباً برنج (= چاول) + ین (= کلمۂ نسبت) : زیور، جس کے دانے چاول کے دانوں سے مشابہ ہوں]

اَبرو (فت ا، سکن ب، و مع) است، نیز امذ

۱۔ بھوں : آنکھ کے اوپر کی محراب پر اگے ہوئے بالوں کی قدرتی لکیر یا دھاری

مد نظر تھی کس پر ظالم جو آئینہ لے
کنگھی پہ ہاتھ پھیرا ابرو سنوار دیکھی
۱۷۸۶ میر حسن، د، ۱۱۱

قتل کرتا ہے عرق آلودہ ابرو خلق کو
کیا تری تلوار پر ہے آبداری ان دنوں
۱۸۵۸ امانت، اندر سبھا، ۱۲۲

بادشاہ کا حلیہ ۔۔۔ ابرو سیاہ، صباحت سے ملاحت زیادہ، شیر اندام، کشادہ سینہ ۔
۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان، ۵ : ۷۰

پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے ۔
۱۹۱۴ شبلی، سیرۃ النبی، ۲ : ۱۹۶

۲۔ [تصوف] کلام والہام غیبی: نیز سالک کا اپنے مرتبے سے ک-ی قصور کے باعث گر جانا (مصباح التعرف، ۲۳)

[ف : ابرو، پہلوی : برو، اوستا : بَرُوت : قب س : بھرو भ्रू]

۔ پر (پہ) بل آنا/ محاورہ ۔

ماتھے پر سلوٹ پڑنا، جو رنجیدگی، ناپسندیدگی یا غصے کی علامت ہے۔

عابد کو غیظ لشکر بد خو پہ آ گیا
غصے سے بل ہلال کی ابرو پہ آ گیا
۱۸۷۴ انیس، مراثی، ۱ : ۸۸

منہ پہ کھاتے رہے تلوار برابر دیندار
بل نہ ابرو پہ مگر بال برابر آیا
۱۹۱۶ جان سخن، نیلملی، ۴۸

— پر بل پڑنا/ڈالنا محاورہ

چہرے سے ناگواری یا ناخوشی ظاہر ہونا، نا خوش ہونا

اس قدر نفرت ہے دشمن کو ہمارے نام سے
جب کوئی بولا سخن بل اس کے ابرو پر پڑے
۱۸۸۶ سخن، د، ۱۹۴

— پر میل آنا محاورہ

تیوری چڑھانا (اظہار آزردگی کے طور پر)

— پر شکن آنا/پڑنا محاورہ

رک ابرو پہ بل آنا

— پھڑکانا ف م

بھویں ہلانا، بھوؤں کو حرکت دینا، (مجازاً) اشارے کرنا

آنکھ کچھ تجھ سے لڑاتا ہے پری رو شیشہ
موج صہبا سے جو پھڑکائے ہے ابرو شیشہ
۱۸۳۸ نصیر، چمنستان سخن، ۱۷۵

— پھڑکنا ف ل

رک: "ابرو پھڑکانا" جس کا یہ لازم ہے

کہتے ہیں لوگ یار کا ابرو پھڑک گیا
تیغا سا کچھ نظر میں ہماری سڑک گیا
۱۷۸۰ سودا، ک، ۱: ۳۷

— تاننا محاورہ

غصہ دکھانا، غصہ ہونا

یہ بھی کوئی ادا ہے یہ بھی کوئی جفا ہے
خنجر کو کھینچ لینا ابرو کو تان لینا
۱۹۳۶ مہر، شعاع مہر، ۳

— چڑھانا محاورہ

پیشانی پر بل لانا، ناخوش ہونا، غصہ ہونا

اتارو تم کماں قوس قزح کے اک اشارے سے
چڑھاؤ ابروئیں دیکھیں تو پھر کیونکر دھنک نکلے
۱۸۷۰ الماس درخشاں، مہر، ۲۵۶

ابرو چڑھا کے آگے بڑھے شاہ لافتا
بھونچال کا سماں نظر آتا تھا جا بجا
۱۸۹۶ ریاض شمیم، ۱: ۸۸

— چننا محاورہ (شاذ)

بھویں سکیڑ کر ماتھے پر بل ڈالنا، ترش رو ہونا

— چنوانا محاورہ

رک: "ابرو چننا" کا متعدی المتعدی

چنوا کے ابرو مجھ سے کیا وہ ہنس کے فرمانے لگے
اس تیغ کے دم کے سدا دکھلائیں گے جوہر بھی ہم
۱۸۳۸ نصیر، چمنستان سخن، ۱۱۳

— سمیٹنا محاورہ

رک: ابرو چننا

تم پیشانی پر بل ڈالوگے، یا ابرو سمیٹ لوگے۔
۱۹۴۴ ایرانی افسانے، ۲۶

— مروڑنا محاورہ (قدیم، شاذ)

رک: ابرو چڑھانا

دیکھ آبرو کوں تم نیں ابرو کے تیئں مروڑا
۱۷۳۰ د، آبرو، (ق)، ۳

ــــ ملانا محاورہ (شاذ)

باہم ساز یا رمز کرنا،
اشارے بازی کرنا

سب سے ملاؤ ابرو ہم سے نفاق رکھو
اس اپنی دوستی کو بالائے طاق رکھو

۱۸۳۸ نصیر، چمنستان سخن، ۱۵۹

ــــ میں بل آنا محاورہ

تیوری چڑھانا، خفا ہونا، ناخوش ہونا

ذرا بھی بل جو ابروئے بت بے پیر میں آئے
کمر ٹوٹے کماں کی بل ابھی شمشیر میں آئے

۱۸۸۱ اسیر (مہذب، ۳۶)

ابرہ
(فت ا، سکن ب، فت ر) امذ ابرا

۱۔ لباس یا اوڑھنے کے کپڑے کا بالائی پرت جو عموماً نیچے کے پرت کی نسبت عمدہ اور بہتر کپڑے کا ہوتا ہے؛ استر کی ضد۔

استر برہنگی کا نکما پڑا رہا
ابرہ جو دیتی خاک تو خاصا لبادہ تھا

۱۸۱۰ میر، ک، ۲۱۲

لباس خود پرستی کو استر اور ابلیس پرستی کو ابرہ کیا۔

۱۸۹۰ بوستان خیال، ۳ : ۲۸۶

اے جان مارے جاڑے کے مہرن ہے کانپتی
ابرہ شفق کا لادو رضائی کے واسطے

۱۸۹۷ جان صاحب، ۱۲۹

لحاف کی تیاری میں کچھ آستر سے لیا اور کچھ ابرہ سے اور دونوں کا جھول جھال لیکر برابر کردیا۔

۱۹۲۱ مہدی، افادات، ۱۷۰

اف : چڑھانا، دینا، ڈالنا

[ف : ابر، پہلوی : اوَر (= اوپر) + ہ (کلمۂ نسبت) = اوپر کا]

ابرہن
(فت ا، سکن ب، فت ر، ہ) امذ (قدیم)

رک : ابرن

تیرا جمال انسان کی تعریف تھے ہے بہار آج
جن کو سنواریا ہے خدا ان ابرہن سوں کیا غرض

۱۶۵۳ غواصی، ک: ۱۲۲

ابرهه
(فت ا، سکن ب، فت ر، ہ) اسم خاص (مذ)

یمن کے حبشی گورنر کا نام جس نے اسلام سے پہلے (چھٹی صدی کے نصف اول میں) مکہ پر ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی لیکن ابابیلوں نے چونچوں سے کنکریاں مار مار کر اس کو اور اس کے لشکر کو تباہ کردیا۔ (قرآن، پارہ ۳۰، سورۂ فیل)

نفس بد ہے ابرهه مسجد ہے قلب برہمن
جو دل کافر بھی توڑے گا وہ کعبہ ڈھائے گا

۱۸۷۶ سخن بے مثال، ۱۹

ہے پھر ابرهه کی کوشش کہ بنائے کعبہ ڈھادے
مگر اس میں ہم کو شک ہے کہ سہم یہ سر بھی ہوگی

۱۹۳۷ بہارستان، ۱۳۹

[غالباً عبرانی : ابراہام کی بدلی ہوئی صورت]

اَبْری (فت ا، سکن ب، ی مع) (الف) امث

۱۔ رنگین روغنی کاغذ جس کے چکنے رخ پر لہردار نقوش ہوتے ہیں؛ کتابوں کی جلد پر چڑھانے کا منقش چکنا کاغذ

انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی
ڈیڑھ دو سو روپے میں بنوائیں۔

۱۸۶۹ غالب، روزنامچہ، ۱۷

سخن گو کہہ رہے ہیں جھوم کر نشے کی حالت میں
کہ ابری دفتر دیواں کی ہے یا ابر رحمت کا

۱۸۷۲ محامد، اسہر، ۲۲۱

رنگ زرد یا سبز اور اس پر ابری کی طرح
کی نقاشی۔

۱۹۱۳ تریاق مسموم، سوزاں، ۴۳

اف : بنانا، چڑھانا، کرنا

۲۔ نری : کمائے ہوئے چمڑے کی اوپری تہ، جس پر رنگ اور جلا ہوتی ہے اور چمڑے کی موٹائی میں سے تراش کر الگ کرلی جاتی ہے۔

(اصطلاحات پیشہ وراں، ۲ : ۲۱۰)

۳۔ رک : ابرہ

خاوند اور بیوی دوہرے کپڑے کی ابری
اور استر ہیں۔

۱۹۳۰ یلدرم، خیالستان، ۹۸

(ب) صف

۱۔ جوہر دار، صیقل شدہ (تلوار وغیرہ)

مینہ ہائے نہ برسا تیروں کا اور ان ابری
شمشیروں کا
کچھ بس نہ چلا تدبیروں کا یہ بھی نہ ہوا
وہ بھی نہ ہوا

۱۸۴۹ گویا، د، ۲۵

تنکے اے گل چن رہا ہوں آشیانے کے لئے
آ تو ابری تیغ سے بجلی گرانے کے لئے

۱۸۵۳ وزیر، د، ۳۰۷

۲۔ جس پر لہردار نقوش بنے ہوئے ہوں، ابری کیا ہوا (کاغذ)

اضطراب دل کو جب میں نے لکھا
موج دریا کاغذِ ابری بنا

۱۷۸۰ سودا، ک، ۸۱

لکھوں کس رنگ سے تعریف اس کی
کہ کاغذ خود بخود ہوتا ہے ابری

۱۸۰۲ ایمان سخن، ۹۵

قتل پر ان کے کی جو بے صبری
بن گیا صفحہ کاغذ ابری

۱۸۱۷ انشا، ک، ۳۶۶

۳۔ جھلا پور، جھل مل کرتا زرق برق (لباس) قدیم

اگر پوشاک ابری پہنے تن میں
چمک بجلی کی ہوئے جیوں کالے گھن میں

۱۷۷۳ تصویر جاناں، ۵۴

[ف : ابر + ی (نسبت) = ابر سے منسوب]

— کا پتھر امذ

دو رنگا پتھر جس میں لہردار دھاریاں یا رگیں ہوں

ہماری گورنمنٹ کو ہندوستان کی رعایا کے ساتھ ایسا ہونا چاہئے جیسے ابری کا پتھر کہ باوجود دو رنگ کے ایک ہوتا ہے۔

۱۸۵۸ بغاوت ہند، ۴۸

اَبْرِیشَم (فت ا، سکن ب، ی مج کس، فت ش) امذ۔ مخفف: ریشم (رک)

۱۔ کچا ریشم، ایک کیڑے کے لعاب دھن کے تار جن سے ریشمی کپڑا بنا جاتا ہے

ابریشم کو سونے کے پانی یا لوہے کے پانی میں تر کرکے جوش دیں۔

۱۸۷۰ قرابادین ذکائی، ۱۰۴

۲۔ سازکا تار؛ لوہے، پیتل تانبے، جست وغیرہ کا تار (فرہنگ نظام)

[ف : ابریشم، پہلو: اپریشم، قب س : آپ अप = پانی + رَشیم रश्मि = رسی، کرن]

اَبْرِیشمی/اَبْرِیشمیں (فت ا، سکن ب، ی مج، سکن ش ی مع / ن غنہ) صف **ریشم کا، ریشم جیسا، ریشم کی طرف منسوب**

اور اس پہ کوئی پارچہ ابریشمی اک بار
اس طرح سے کھینچے کہ جدا تار سے ہوتار

۱۸۷۵ دبیر، دفتر ماتم، ۴: ۲۱۳

سیہ رنگ بد شکل اس آنگ پر
اتھی کسوت ابریشمیں خوب تر

۱۶۴۵ قصۂ بے نظیر، ۱۰۷

لباس ان کا ہے گو کہ ابریشمیں
مگر آدمیت کی بو تک نہیں

۱۹۲۸ اودھ پنچ، ۱۳، ۱: ۳

[ف : ابریشم + ی (تخفیف ین : علامت نسبت]

اِبْرِیق (کس ا، سکن ب، ی مع) امذ

۱۔ مٹی، چینی یا کانچ کا برتن

وہ طشت اور ابریق تھے ہاتھوں میں اٹھائے

۱۸۷۴ انیس، ۵: ۴

کوئی ابریق پہ لپکا سوئے ساغر کوئی
ہر طرف پھرتا ہے حیران پئے زر کوئی

۱۸۹۶ ریاض شمیم، ۱: ۱۷۶

۲۔ ٹونٹی والا لوٹا

قافلے والے قدم ماریں جو راہ جذب پر
چاہ سے یوسف کو ابریق جرس میں کھینچ لیں

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۱۶۲

لئے ہے طشت زمرد کوئی، کوئی ابریق
مؤدبانہ کھڑی ہے ملائکہ کی قطار

۱۹۳۵ عزیز، صحفیۂ ولا، ۱۴

۳۔ جام، شیشہ، قرابہ

ہاں چھیڑ بھی رباب کہ ہے گرم اختلاط
حسن مہ دو ہفتہ و ابریق یک منی

۱۹۴۵ سیف و سبو، ۲۴۹

[ف : ''آب ریز'' کامعرب]

ابڑ دھبڑ (فت ا، ب، سکن ڑ، فت د ھ، ب، سکن ڑ)

(الف) مف - بے تال، بے سری آواز میں یا بے ڈھنگے انداز سے م : ابڑ دھبڑ ڈھول پیٹنے سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں -

(ب) مث (عو)

گڑ بڑ، افراتفری، بھاگ دوڑ، م : ایسی ابڑ دھبڑ میں ریل پر سوار ہوئے کہ بعض ضروری چیزیں چھوٹ گئیں۔

[ار : حکائی، پاؤں کی چاپ یا طبلے کی تھاپ]

ابس (فت ا، ب) شاذ

بے بس، مجبور، ناچار

[س : اوش अवश (ا نافیہ + وش) = بے بس]

ابسرا / ابسرہ (فت ا،سکن ب،فت س) امث

رک : اپسرا

گوتم کو ابسروں یعنی حوروں کے جم غفیر نے گھیر لیا۔

۱۹۱۳ تمدن ہند، ۲۰۰

اُبسنا (ضم ا، فت ب، سکن س) ف ل اوبسنا، بسنا

گل جانا، سڑ جانا،

خراب ہوجانا

چوتڑ نہ فقط بھُبھس رہے ہیں
چڈے بھی تمام اوبس رہے ہیں

۱۷۹۳ قائم، ۳۱۹

فرق آیا رنگ و بو میں ہوا کو ترس گئے
ایسے بچھے کہ ہند میں مسلم ابس گئے

۱۹۲۱ اکبر، ۲ : ۱۴۳

خدا کرے خالی خولی محبت جتانے والے
---- اپنا سڑا آبسا مضمون چھپوانے والے
ہمدردوں کے علاوہ، اسے نقد خریدار مل جائیں -

۱۹۲۸ اودھ پنچ، ۱۳ : ۷، ۶

[س : اُپ وَش उपवस् پ : اُبس उब्बस् بسنا، رہنا]

اَبصار (فت ا، سکن ب) امث ج

آنکھیں، نظریں

گر خاک مری سرمۂ ابصار نہ ہووے
تو کوئی نظر مائل دیدار نہ ہووے

۱۷۸۵ درد، ۸۱

[ع : ج بصر (= بینائی)، وزن آفعال]

اَبطال (فت ا، سکن ب) امذ ج

بہادر لوگ، بڑے لوگ، ہیرو

عمود صبح سے جیسے فرار فوج نجوم
ہوا اس کی ہیبت سرکوب سے صف ابطال

۱۸۴۶ قصائد سحر، ۱۹

قصے کہو نہ عقل سے ابطال غرب کے
از بر کراؤ سیرت شاہ حجاز کو

۱۹۲۱ ز خ ش، فردوس تخیل، ۱۷

[ع : ج بَطَل (فت ب، ط)، وزن آفعال]

اِبْطال (کس ا، سکن ب) امذ

۱۔ بطلان، تردید، جھٹلانا، کسی چیز کی صداقت یا وجود سے انکار

اس کے ابطال کو تو وحی منزل من اللہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔

۱۸۹۸ سرسید، مضامین، ۲ : ۳۳۵

یہ علم کلام جو کچھ تھا، صرف اسلامی فرقوں کے رد و ابطال میں تھا۔

۱۹۰۲ علم الکلام، ۱ : ۵۷

وہ اجرام فلکیہ کا ابطال کرتا ہے۔

۱۹۲۸ مرزا حیرت، عمر و عیار، ۳۶۲

۲. باطل قرار دینا، کسی چیز کو دلیل سے غلط، محال یا غیر معقول ٹھہرانا، ردکرنا

عدالت اس کے ابطال کے لئے شہادت پیش کئے جانے کی اجازت نہ دے گی۔

۱۸۷۶ شرح قانون شہادت، ۲۰

طلسم اثمار کا انہدام و ابطال لازمی و ضروری ہے۔

۱۸۸۳ بوستان خیال، ۸ : ۳۶

قرآن مجید میں اصل وجود باری تعالیٰ کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال ہے۔

۱۹۳۵ سیرۃ النبی، ۴ : ۳۸۲

۳۔ ترک، فسخ، چھوڑدینا، موقوف کردینا

نصاریٰ کی رضا جوئی ہے مقصد اس نبوت کا
اور ابطال جہاد انجاح مقصد کا وسیلا ہے۔

۱۹۳۷ بہارستان، ۵۶۷

[ع : مص (ب ط ل)، وزن آفعال]

اَبْعاد (فت ا، سکن ب) امذ ج

۱۔ فاصلے، دوریاں

بعضے اجرام و ابعاد کی مساحت کے فکر میں رہتے۔

۱۸۱۰ اخوان الصفا، ۱۳۷

دو چیز کی دریافت ضرور ہے، ایک پیچوں کے درمیان کے ابعاد اور دوسری درازی بیرم کی۔

۱۸۳۷ ستہ شمسیہ، ۱ : ۱۱۳

۲. ضخامت، موٹائی

یہ جدولوں پہ ہو انبار معنیٔ نازک
کہ خط جوہری ہوجائے قابل ابعاد

۱۸۸۳ گلستان نازک خیالی، ۲۹۴

۳. الف (اقلیدس) جسم یا مکان کی حدود جن سے اس کا حجم یا ضخامت متعین ہو، مثلاً قطر، محور یا کناروں کے خطوط؛ طول، عرض و عمق۔

رک: ابعاد ثلاثہ

ناپے ہیں کر کے قاعدہ ایجاد
فاصلہ ارتفاع اور ابعاد

۱۸۸۷ ساقی نامہ شقشقیہ، ۳۳

یہ ممکن ہے کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہوں۔

۱۹۳۸ اقبال نامہ، ۲ : ۳۴۴

ب۔ (الجبرا) کسی رقم کے اعداد قوت نما
کا مجموعہ

[ع : ج بُعد (=دوری، فاصلہ)، وزن اَفعال]

ــــ ثلاثہ (ثلثہ) کس صف ۔ (اقلیدس)
جسم کے ہر سہ اطراف یعنی طول،
عرض و عمق،

ایک نہج میں صفت ابعاد ثلثہ یعنی طول، عرض،
عمق کو داخل پاتے ہیں۔
۱۸۹۷ کاشف الحقائق، ۱ : ۱۵

جو ستارے زمین کے بہت پاس ہیں، ان کے
ابعاد ثلثہ اور ان کے فاصلے ٹھیک ٹھیک ناپ
لیتا ہے۔
۱۹۱۲ حیات النذیر، ۶۹

[ع : ابعاد + ثلثہ (=تین) مرکب توصیفی]

اَبعادی (فت ا، سکن ب، یٰ مع) صف
جسامت رکھنے والا، ابعاد ثلاثہ کا حامل، مادی

ان کا مقصد روح کی صفائی ہے جو اس
عالم ابعادی میں اپنے موقتی سکون کے باعث
آلودہ۔۔۔۔ ہے۔
۱۹۴۴ قرون وسطیٰ کا اسلامی فلسفہ، ۱۴

اَبعاض (فت ا، سکن ب) امذ ، ج
رک: "بعض" جس کی یہ جمع ہے۔

آپ نے احباب ابعاض کی خیر و عافیت
عموماً لکھی، بالتخصیص شاہ عالم صاحب کا
سلام نہ لکھا۔
۱۸۶۹ غالب، خطوط، ۲۷۰

جملے و مجموعے ابعاض کے سوا ہرگز
کچھ نہیں۔
۱۹۲۵ ملل و نحل، ۳۰ : ۳۸۳

اَبعد (فت ا، سکن ب، فت ع) صف
۱۔ بعید تر، زیادہ دور، بہت پرے

قریب رشتے والا بہ نسبت دور کے رشتے
والے کے بلا شبہ ہم سے زیادہ جزئیت رکھتا
ہے۔ اور اسی طرح بعید بہ نسبت ابعد کے۔
۱۸۹۸ سرسید، مضامین، ۲ : ۲۲

اِبقا (کس ا، سکن ب) امذ
۱۔ بقا، پایندگی

اس کے نزدیک مآثر باطن کی تاسیس کے
سامنے آثار ظاہر کے ابقا کی وقعت کچھ نہ تھی۔
۱۹۱۰ ذکاء اللہ، بادشاہ نامۂ عالمگیری، ۲

۲۔ باقی رکھنا، زندہ رکھنا، محفوظ کرنا

ہم لوگوں کو کسی فن کے ابقا کا خیال
خداناخواستہ کبھی نہیں ہوتا۔
۱۹۲۵ اودھ پنچ، ۱۰، ۳ : ۶

[اِبقاء مص (ب ق ی) وزن اِفعال=باقی رکھنا]

ــــ نوعی کس صف (حیاتیات)
سلامتیء نسل، بقائے جنس

نباتات و حیوانات ان میں حفظ نوع کی
صلاحیت ابقائے نوعی کے پیرایے میں ظاہر

ہوتی ہے۔

۱۹۰۶ الحقوق والفرائض، ۳ : ۴

اُبْکا (ضم ا، سکن ب) امذ

رسی کا پھندا جسے پانی کھینچنے کے لئے کسی برتن کے گلے یا کمر میں پھنسایا جائے۔(پلیٹس)

[س : آپ کنٹھ उपकंठ = گلے کے اوپر، یا آد उद + واھک वाहक پ : آباھک = اوپر اٹھانے والا] उद्वाहक

اَبْکار (فت ا، سکن ب) امث نیز امذ، ج

۱۔ کنواریاں، بن بیاھی لڑکیاں

رھی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہ کیسی ہے، سو حدیث نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثیبات پر ثابت ہوتی ہے۔

۱۸۸۴ حیات سعدی، ۱۲۱

۲۔ اچھوتے، انوکھے، نادر، افکار یا مضامین

ابکار مضامین و معانی کے سب اس میں تھے زادہ طبع ان کے جو گزرے ھیں مشاھیر

۱۷۸۰ سودا، ۲ : ۳۸۹

چہرہ کشایان عرائس آثار گلگونہ سازان رخسار ابکار افکار نقاب خفا کو عارض معانی سے یوں اٹھاتے ھیں۔

۱۸۹۰ بوستان خیال، ۶ : ۳۹۴

ابکار افکار سے معجزہ آرائیاں ۔۔۔ پیدا ہوئیں۔

۱۹۲۵ اودھ پنچ، ۱، ۱۶ : ۲

[ع : جمع بِکْر (کس ب) = دوشیزہ وزن اَفعال]

اُبْکار (ضم ا، سکن ب) امذ۔ رک : اُپکار

جیسا تونے ابکار کیا ویسی ھی مجھ سے اسیس لے۔

۱۸۰۳ سنگھاسن بتیسی، ۳۰

اُبْکائی (ضم ا، سکن ب، ی مع) امث

کھایا پیا حلق کی طرف لوٹنے کی کیفیت، جی برا ہونا، قے آنے کو ہونا، متلی، مالش

مسواک کرتے کرتے ابکائی آئی۔

۱۸۷۷ توبتہ النصوح، ۱۱

آبکائی پر آبکائی اٹھنی شروع ہوئی

۱۹۲۸ عمر و عیار، ۳۰۳

اف: اٹھنا، آنا لگنا، لینا

[س : آ ُدْ وَ مَ کر उद्वमन = قے کرنا]

۔ آنا محاورہ

۱۔ رک : ابکائی

۲۔ نفرت پیدا ہونا

ہو ئی باطل دے و بہمن کی وہ تقویم پارینہ خزاں کے نام سے آتی ہے فوارے کو ابکائی

۱۹۳۵ عزیز، صحیفہ ولا، ۱

اَبْکَبِت (فت ا، سکن ب، فت ک، کسر ب) صف

(موسیقی) وہ گویا جس کے الفاظ گلے ہی میں رہ جائیں اور سننے والوں کی سمجھ نہ آئیں ۔

[س : آپ + کوِتو अपकवित्व
بگڑی ہوئی شاعری]

اَبکت (فت ا، کس ب، سکن ک،ت) صف

ان جانا، اوکھا، سمجھ میں نہ آنے والا۔ غیر معقول

راجا بل کی تمام سبھا میں رونا مچا کہ
بڑا ابکت کام اس برانی نے کیا۔

۱۸۰۳ سنگھاسن بتیسی، ۸۸

[س : اویکت अव्यक्त (ا نافیہ + ویکت
- معلوم، مشخص) - نا مشخص]

اَبکَم (فت ا سکن ب، فت ک) صف

گونگا : جو قوت گویائی سے محروم ہو

تیرے مکھ پاس عقل ابکم ہے
جب تجھے دیکھوں عیش اس دم ہے

۱۷۱۴ د، فائز دہلوی، ۱۹۴

ایسے شیریں کہ اگر رکھے زباں پر ان کو
وصف شیریں سخنی پائے زبان ابکم

۱۸۵۴ ذوق، د، ۲۹۰

[ع : صفت مشبہ (ب ک م) وزن اَفعل]

اُبکنا (ضم ا، فت ب، سکن ک) ف ل

اُبکائی لینا، قے کی تحریک ہونا (شبد ساگر)

[رک : ابکائی]

اُبکوں ڈُبکوں (ضم ا، سکن ب، و مع، ضم ڈ، سکن ب، و مع)

۱- است - **غوطے کھانے، ڈوبنے ترنے کی کیفیت**، م: ناؤ ابکوں ڈبکوں کر رہی تھی۔

(مجازاً) امید و بیم کا عالم، م: ابکوں ڈبکوں میں جان آدھی ہوئی جاتی ہے، کہیں جلد قضیہ چکے۔

۲- صف - **ڈوبنے کے قریب** م : سفینہ ابکوں ڈبکوں ہو رہا تھا۔

اف: کرنا، ہونا

[ار : ابکوں (تابع) + ڈبکوں ۔ رک : ڈبکنا]

اُبَل (ضم ا، فت ب)

رک: "ابلنا" جس کا یہ مادہ ہے اور ذیلی محاورات میں مستعمل

ابل آوے گا وہ عرق منہ تک
سانپ کی طرح مار فنکارے

۱۸۱۸ انشا، ک، ۲۱۶

کیا کیا بتوں کو ناز ہے جوش شباب پر
طوفان کی مثال یہ قطرے ابل چلے

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۲۱۸

سینہ ہجوم راز سے اپنا ابل گیا
دل سے بھی جو چھپائیں تو منہ سے عیاں ہے اب

۱۸۸۱ سالک، ۵۶

اف : آنا، پڑنا، جانا

[س : آ دَ وَلَ उद्वल (آد = او پر + وَلَ = جانا) پ : اُبَلّ उब्बल = اوپر جانا]

— پڑنا ۱۔ رک: ابلنا

۲۔ (مجازاً) کم ظرفی دکھانا، آپے میں نہ رہنا

دودھ کی صورت ابل پڑتے ہیں بوڑھے جوش میں
نوجوانی کی ہے کیفیت مئے سر جوش میں
۱۸۳۶ ریاض البحر، ۱۰۰

منصور کا یہ ظرف تہاں تک، ابل پڑا
مشکل ہے شرب بادۂ مرد آزمائے عشق
۱۸۸۱ اسیر، ۱۸۹

۳۔ نکل آنا، (بکثرت) نمودار ہونا، پھوٹ پڑنا

موجودہ زمانے میں تو اس سرعت و کثرت کے ساتھ نظریات ابل پڑے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے زیادہ واقعی خیال کرنا قریباً نا ممکن ہو گیا۔
۱۹۲۸ سیرۃ النبی، ۳ : ۱۶۱

اَبْلا (فت ا، سکن ب)

(الف) امث ۔ عورت، استری

جو بوڑھی پھوس ہے بارہ برس کی ابلا ہے
۱۸۳۰ نظیر، ۲ : ۲۵۰

ایک ہندو ابلا جو خاوند کے گھر کو اپنا مندر اور خاوند کی محبت کو اپنی پوجا۔۔۔ سمجھتی ہے۔
۱۹۳۵ آغا حشر، پہلا پیار، ۵۶

(ب) صف مث

۱۔ نازک، کامنی، البیلی

سرد، سادہ، سجل، سہانی صبح
ابلا، انمول، ارغوانی صبح
۱۹۵۲ سرود و خروش، ۱۱۳

[س : آبَلا अबला (ا = نافیہ + بل = طاقت + ا = علامت تانیث) ناتوان بمعنی نازک]

— بلی امذ

(قدیم) کمزوروں کا حامی۔ ضعیفوں کا مددگار

تجے جد براہیم ابلا بلی
تو سلطاں محمد کا جایا علی
۱۶۵۷ گلشن عشق، ۲۲

[از : ابلا (= کمزور + بلی = طاقت ور، مددگار) مرکب اضافی]

اَبْلا پا (فت ا، سکن ب) امذ

۱۔ کمزوری، ناتوانی

۲۔ نازک اندامی، نازکی، کامنی پن

[س : ابلا + پا (اردو علامت مصدر)]

اَبْلا پری (فت ا، سکن ب، فت پ، کس ر، ی مع)

حسین و جمیل، حسن و نزاکت کا مجسمہ، نازک حسینہ (گاہے طنزاً)

گل دکھاتے ہو یہاں، ہے بنارس میں گل بدن
ابلا پری کا اپنی یہ تم کو خیال ہے
۱۸۹۷ جان صاحب، ۱۹۶

اِبْلاغ (کس ا، سکن ب) امذ

۱۔ پہنچانا، بھیجنا، ارسال کرنا

ابلاغ خانساماں کو ہو وے اس امر کا
تا بہ کبھی بلا کے وہ اپنے بھی پیش کار
۱۷۸۰ سودا، ۱ : ۳۰۴

آپ کو بعد ابلاغ سلام، آپ کے خط کے پہنچنے سے آگہی دیتا ہوں۔
۱۸۶۹ غالب، خطوط، ۴۷۹

۲۔ تبلیغ، اشاعت

یقیناً وقت آ پہنچا ہے ابلاغ رسالت کا
یہی وہ وقت ہے اسلام کی ہو صورت آرائی
۱۹۳۵ صحیفہ ولا، ۸۶

[ع : مص (ب ل غ) وزن اِفعال= پہنچانا]

اَبْلاکھا (فت ا، سکن ب) امث (شا)

خواہش، آرزو، تمنا

میں نے اپنے نمر کا منہ نہیں دیکھا، کداچت جی نکل جائے تو من میں دیکھنے کی ابلاکھا رہ جائے۔
۱۸۰۳ سنگھاسن بتیسی، ۲۷

[س : آبھ لاشا [illegible] =خواہش]

اُبْلان (ضم ا، سکن ب) امث (شاذ)

۱۔ جوش، ابال ۲۔ محدب کی اونچائی یا برآمدگی، سطح کا ابھار ۳۔ محدب کا ابھار یا پیٹ

[ار : آبلانا کا حاصل مصدر]

اُبْلانا (ضم ا، سکن ب) ف م

۱۔ پانی میں کھولا کر گلانا، ابالنا

۲۔ ابلوانا (متعدی المتعدی)

۳۔ (مجازاً) رنج دینا، کھولانا

۴۔ تیز نظروں سے گھورنا، م : کچھ کہو تو دیدے ابلاتے ہیں۔

۵۔ (آنکھیں) سجانا یا سرخ کرنا

م : رو رو کے آنکھیں ابلائیے گی۔

[رک : ابلنا]

اَبْلائی (فت ا، سکن ب، ی مع) امث

رک : **آبلاپا**

[ار : آبلا + ئی (مصدری)]

اَبْلَغ (فت ا، سکن ب، فت ل) صف

۱۔ مبالغے کی حد پر، نہایت کے درجے کو پہنچا ہوا

رحمن اور رحیم دونوں مبالغے کے وزن پر ہیں، مگر رحمن ابلغ ہے۔
۱۹۰۶ الحقوق والفرائض، ۱ : ۲۳

۲۔ نہایت بلیغ، بلیغ (ترین)

افصح الفصحا، ابلغ البلغا، سحر بیاں۔
۱۹۴۷ فرحت مضامین، ۳ : ۲۵۲

[ع : تفضیل بلیغ (مد : ب ل غ) وزن ۲ فعل]

اَبْلَق (فت ا، سکن ب، فت ل)

(الف) مف ۔ دورنگا، (خصوصاً) سیاہ اور سفید

گائے بھینس ناپید، ہر ایک جانور مثل ان کے بہ رنگ ابلق دودھ دیتا ہے۔

۱۸۰۳ آرائش محفل، افسوس، ۱۶۰

آدھی سفید آدھی سیہ، ہر اک پہ وحشت کی نگہ
آنکھیں تو دو ابلق ہرن، اک اس طرف اک اس طرف

۱۸۹۶ صنم خانۂ عشق، ۱۰۶

(ب) امذ ۔ گھوڑا جس کی جلد پر بڑے بڑے سیاہ اور سفید یا سرخ و سفید دھبے ہوں، چتلا گھوڑا

کب ان کے ابلقوں کی ثنا مجھ سے ہو سکے
میں کیا کہوں کہ جلدی ہے ان میں کہاں تلک

۱۷۸۰ سودا، ۱ : ۲۵۰

جمتی نہیں ہے ران کسی شہ سوار کی
کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی

۱۹۱۱ نور، ۵۰۸

۲۔ مبروص، جس کے جسم پر برص کے دھبے یا چھیپ کے نشان ہوں

[ع : صفت مشبہ (مد : ب ل ق) مذ در کے لئے]

اَبْلَقا (فت ا، سکن ب، فت ل) امذ

چڑیا جس کے پر سیاہ ہوتے ہیں اور پوٹا سفید

کیا کبوتر کیا ٹیری کیا بزے
قمری اور تیتر لوے اور ابلقے

۱۷۸۰ سودا، ۱ : ۳۹۳

کیا بلبل و قمری و چہے، پدڑے و پدّے
چنڈول، اگن، لال، بئے، ابلقے، طوطے

۱۸۳۰ نظیر، ۶۸

[ابلق ۔۔ ا (نسبت)]

اُبْلَن (ضم ا، سکن ب، فت ل) امث (عو)

[رک : آبال، آبلان]

اُبَلْنا (ضم ا، فت ب، سکن ل) ف ل

۱۔ کھولنا، جوش کھانا

دیگ کا قاعدہ ہے کہ منہ بند کرنے سے دونی اوبلتی ہے۔

۱۸۳۵ نغمۂ عندلیب، ۵۶

ڈرھی کیا سکتا تھا آنکھوں کا ذرا سا پانی
جب لگی بجھ نہ سکی کھول کے ابلا پانی

۱۹۵۱ آرزو، سریلی بانسری، ۹۱

۲۔ لبریز ہونا، چھلک پڑنا، ابھر کر گرنا

دل کے چشمے یہ کیوں ابل آئے
اشک کیوں دفعۃً نکل آئے

۱۹۲۰ روح ادب، ۷

۳۔ وفور کرنا، نکل پڑنا، پھوٹ پڑنا

ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا
کہ ابلے گا اس جا سے چشمہ ہدیٰ کا

۱۸۷۹ مسدس حالی، ۱۲

سبزہ اور پھول زمین سے ابلے پڑتے۔

۱۹۶۱ اردوئے مصفیٰ، ۵۱

۴۔ جوش دیا جانا، پکنا؛ پک کر نرم ہو جانا، گل جانا

مردوں کی سلامتی کی گھنگنیاں اب تک نہ ابلیں۔

۱۹۳۶ راشدالخیری، بیلے میں میلا، ۱۲

یادداشت بنک

دی بنک آف بہاولپور لمیٹیڈ نگرانی و حصہ داری حکومت مغربی پاکستان

(حکومت مغربی پاکستان حاوی حیثیت میں حصہ دار ہے)

رجسٹر شدہ دفتر بہاولپور مغربی پاکستان

مرکزی دفتر پی آئی ڈی سی ہاؤس کچہری روڈ کراچی

سرمایہ

منظور اور ادا شدہ سرمایہ ۲۵۰۰۰۰۰ محفوظ سرمایہ ۱۲۵۰۰۰۰

صدر جناب میاں ریاض الدین احمد ، سی - ایس - پی سیکریٹری محکمہ امداد باہمی ، محنت اور سماجی بھلائی حکومت مغربی پاکستان لاہور

نظما

۱- جناب اے جی این قاضی سی ایس پی سیکریٹری محکمہ مالیات حکومت مغربی پاکستان

۲- جناب محبوب حسن صاحب ڈپٹی سکریٹری، شعبہ اقتصادی امور ، وزارت مالیات حکومت پاکستان - کراچی سی - ایس - پی

۳- جناب ملک خدا بخش بوچا ایس کے سکریٹری محکمہ مال و آبکاری حکومت مغربی پاکستان لاہور

۴- جناب ایس فضل حسین ڈائرکٹر مواز نہ و مالیات ادارہ ترقیات آب رسانی و وسائل قوت لاہور

۵- جناب میر خلیل الرحمان مینیجنگ ڈائرکٹر - " جنگ " کراچی

۶- جناب سردار غضنفر اللہ خاں زمیندار و تاجر معرفت جنرل ٹریکٹر اینڈ مشینری ٹی - ڈیو - اے عثمان چیمبرز ، وکٹوریہ روڈ - کراچی

۷- جناب محمد شبیر صاحب مینجنگ ڈائرکٹر محمد امین محمد بشیر لمیٹیڈ تیسری منزل - فنلے ہاؤس - میکلوڈ روڈ - کراچی

۸- جناب ایم - ایس - داؤد ڈائرکٹر داؤد کارپوریشن لمیٹیڈ دوسری منزل ، انشورنس ہاؤس حبیب اسکوائر بندر روڈ

شاخیں

۱- احمد پور شرقیہ ۲- بہاولپور (صدر دفتر) ۳- بہاولپور نگر ۴- چشتیاں
۵- گجران والا ۶- گجرات ۷- ہارون آباد ۸- حاصل پور ۹- حیدرآباد
۱۰- جیکب آباد ۱۱- کراچی ایکسچینج برانچ بندر روڈ ۱۲- کراچی لیاقت بازار
۱۳- کراچی - جوڑیا بازار ۱۴- کراچی پی - آئی - ڈی - سی - ہاؤس ۱۵- کراچی لالوکھیت برانچ
۱۶- کموک ۱۷- قصور ۱۸- خانپور ۱۹- لاہور ۲۰- لیاقت پور
۲۱- لائل پور ۲۲- ملتان ۲۳- رحیم یار خان ۲۴- راولپنڈی
۲۵- صادق آباد ۲۶- سرگودھا ۲۷- سکھر ۲۸- وزیر آباد

۱- بینک کی تمام شاخیں ہر قسم کے بینک کے کاروبار جن میں بیرون ملک کے زرمبادلہ کا کام بھی شامل ہے ' انجام دیتی ہیں -

۲- امانتیں مقابلۃً بہتر شرحوں پر جمع کی جاتی ہیں - مسلمہ ضمانتوں پر قرض دیئے جاتے ہیں - مسلمہ گاہکوں کے لئے دنیا کے ہر تجارتی مرکز پر (اعتبار نامے) جاری کرنے کا بندوبست ہے -

ان کے مستقبل کا تحفظ کیجئے
NATIONAL BANK OF PAKISTAN
Saving Bank Account pay
مشرقی اور مغربی پاکستان میں ہماری ۲۱۰ شاخوں میں سے کہیں بھی سیونگ بینک اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے
سیونگ اکاؤنٹ پانچ روپے کی قلیل رقم سے کھولا جا سکتا ہے۔ اور بذریعہ چیک روپیہ نکالا بھی جا سکتا ہے۔
آپ کی جمع شدہ رقم پر ۲½ فی صدی منافع بھی ملے گا۔
NATIONAL BANK OF PAKISTAN
خدمت اور تحفظ کا ضامن
نیشنل بینک آف پاکستان
ہیڈ آفس : بالمقابل بولٹن مارکیٹ۔ کراچی

تصویر مجلّہ

ترقیء اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

اُردو نامہ

شمارہ ۱۰- اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۲ع

نگراں

جناب ممتاز حسن

ادارہ تحریر

جوش ملیح آبادی   شان الحق حقی

خواجہ حمید الدین شاہد

ترقی اردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون نمبر : ۳۲۱۶۳

چندہ سالانہ چار روپے ◆ فی پرچہ ایک روپیہ

اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی ۵
(مغربی پاکستان)

مضامین

شعبۂ مطبوعات

نادرات

اردو کی ترقی کے مسائل

شعبۂ لغت

سرورق: آزاد، قلمی خاکہ از آذر زوبی (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۶۰)

سید یوسف بخاری مہتمم اردو نامہ نے ترقی اردو بورڈ

مطبوعہ [illegible]، صدر، کراچی

اُردو نامہ

گذشتہ شمارے میں اس مسئلے پر توجہ دلائی گئی تھی کہ اردو قواعد میں فارسی و عربی الفاظ کے بالمقابل، دوسرے ہندی و غیر ہندی الفاظ کے ساتھ جو امتیاز برتا جاتا ہے، وہ نا واجب بھی ہے اور اکثر آبادی کے لئے ناقابل عمل بھی۔ تلفظ، املا، محاورے اور تذکیر و تانیث کی پیچیدگی ویسے ہی کچھ کم نہیں، اور اس میں غیر زباں‌داں ہی نہیں بلکہ اہل زبان اور اہل علم بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ کڑا اصول کہ کسی "غیر" لفظ کو (ہندی ہو یا انگریزی یا پرتگالی) فارسی یا عربی الفاظ کے ساتھ ترکیب نہ دیا جائے، یعنی ان کے درمیان واو عطف یا کسرہ اضافت نہ آنے پائے، اسی صورت میں نبھ سکتا ہے کہ لوگ ہر لفظ کا اشتقاق جانتے ہوں، اور یہ امر محال ہے۔ لہذا اس کی پابندی پر اصرار بجا نہیں ہوسکتا۔ وہ زبان جسے صرف اہل علم یا متخصصین ہی برت سکیں، زندگی میں عام کیونکر ہوسکتی ہے اور کام کیسے چلاسکتی ہے؟ جب لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو زبان مکتب و محفل کے علاوہ سرکار دربار، بازار سب جگہ چل چکی ہے، تو یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ رواج اس نے کتنے تصرفات کے ساتھ پایا تھا۔ مکتب و محفل سے باہر اردو کی اس چال یا چلن نے تلفظ، محاورے اور قواعد کی کتنی بندشوں کو پامال کیا تھا۔ اگر "اجرائے ڈگری، وارنٹ گرفتاری، کارروائی برائے تعمیر یک سڑک پختہ" اور اس قسم کی صدھا ترکیبیں، فقرے اور جملے جو سرکار اور بازار میں بلا تکلف بولے جاتے اور تحریر میں آتے تھے، گوارا کرنے کے لائق تھے، تو اب کیوں گوارا نہیں ہوسکتے؟ پھر وہ بے شمار مخلوط لغت بھی ہے جو اردو روز مرہ کا جزو بن چکی ہے اور جس کی فصاحت میں کسی کو کلام نہیں۔ اردو الفاظ محاورات اور امثال میں ہندی وغیر ہندی الفاظ اس طرح گھلے ملے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے۔ اس طرح کی ساری لغت اردو کی اپنی ایجاد اور خاص اپنا سرمایہ ہے جو اسے دوسری زبانوں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔

جہاں تک قواعد زبان کا تعلق ہے، ہم فارسی و عربی الفاظ پر اپنی ہی تذکیر و تانیث عائد کرتے ہیں۔ عربی کے مونث الفاظ کو (جو تائے تانیث پر ختم ہوتے ہیں) بلاتکلف مذکر بولتے ہیں، وعلیٰ ہذا القیاس۔ امالہ جو ہندی کا مخصوص قاعدہ ہے، غیر ہندی الفاظ پر بھی یکساں عائد کیا جاتا ہے۔ تو پھر ترکیب عطفی و اضافی ہی کے ضمن میں یہ تفریق کیوں روا رکھی جائے؟

ہمارا مطلب بدمذاقی کو رواج دینا یا اردو کی کایا پلٹ کرنا نہیں ہے۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ زبان کے معاملے میں منطق نہیں چلتی۔ لیکن اپنی زبان کے الفاظ کے ساتھ ذہنی تعصب بھی روا نہیں ہوسکتا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ نئی ترکیب وضع کرنے میں ذوق سلیم کو رہبر ہونا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات ہندی اور فارسی یا عربی الفاظ کا جوڑ کانوں کو اس لئے کھٹکتا ہے کہ اس میں تنافر یا بھونڈا پن آجاتا ہے۔ ایسی ترکیب خود ہی رواج نہیں پا سکے گی، لیکن اکثر صورتوں میں ایسے غیر متجانس الفاظ کو باہم

ملائے بغیر اور ان کے درمیان کسرہٗ اضافت یا واو عطف لائے بغیر کام بھی نہیں چل سکے گا، لہذا اس قاعدے کو روا رکھنا پڑے گا۔

اگرچہ اب خالص پرست اصحاب اس مسئلے پر چونکتے اور ایسی تجویزوں کو اردو کے حق میں ایک تخریبی کارروائی سمجھتے ہیں، لیکن اردو نے واقعی زندگی میں پورا پورا دخل حاصل کرلیا اور ملک کی عام زبان بن گئی تو اس قسم کے بہت سے تصرفات کئے جائیں گے جیسے کہ اب سے پہلے کئے گئے جب کہ زبان صرف ادب و صحافت تک محدود نہ تھی۔

ہمارے نزدیک اردو قواعد میں سہولت اور کشادگی پیدا کرنے یعنی ایسی غیر ضروری اور محض رسمی بندشوں کو دور کرنے کا مسئلہ، رسم الخط کے مسئلے کے بعد سب سے اہم مسئلہ ہے جس پر اردو کی بقا، ترویج اور نشو و نما کا دارو مدار ہے۔ ترقی مسائل کو حل کرنے کا نام ہے، اور مسائل کو حل کرنے سے پہلے ان کو پہچاننا ضروری ہے۔

رسم الخط کے متعلق ان کالموں میں یہ رائے پیش کی گئی تھی کہ ہم اپنا رسم الخط تبدیل نہیں کر سکتے۔ اس میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے، کسی زبان کا رسم الخط مکمل نہیں ہوسکتا۔ حروف اصوات کا بدل نہیں ہوسکتے، ہم ان کے ذریعے الفاظ کو پہچانتے ہیں، ہجے کرکے نہیں پڑھتے۔ ہماری زبان جس رسم الخط سے شناخت ہوتی ہے، اس میں بعض بے مثل محاسن بھی موجود ہیں اور یہ ہماری اکثر ضروریات کے لئے کافی و شافی ہے۔ جو کسر رہ جاتی ہے وہ یوں پوری ہو سکتی ہے کہ ہم بعض ضروریات کے لئے، مثلاً کاروباری خط و کتابت میں، رومن حروف استعمال کریں۔ اس طرح ہمیں ایک مزید سہولت مہیا ہوجائے گی۔ رومن کی حرف شناسی بہر حال موجودہ تعلیم کا لازمی جزو ہے۔ لہذا ان حروف کو محدود طور پر اپنی زبان کے لئے استعمال کرنا قدرتی سی بات ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہئے، بشرطیکہ اپنے رسم الخط کے

مرزا محمد سعید کا داغ ابھی تازہ تھا کہ ڈاکٹر زور کے سانحہٗ ناگہاں کی خبر آئی۔ مرزا سعید ایک گوشہٗ عزلت کا چراغ تھے جو بڑی خاموشی و بے نیازی کے ساتھ آخری سانس تک روشن رہا۔ لیکن اس سے ایک مدت تک بہت سے چراغوں نے روشنی پائی، اور اس دور محرومی میں اس چراغ کا اپنا اجالا بھی بساغنیمت تھا۔ ایسے لوگ ہمیشہ کم ہی ہوتے ہیں جنکی صحبت میں انسان اس لئے جائے کہ کبھی بے فیض پائے واپس نہ آئے گا۔ ڈاکٹر زور سرچشمہٗ علم بھی تھے اور سرچشمہٗ عمل بھی۔ اگرچہ ان کے عمل کا میدان بھی علم ہی کی خدمت تھی، لیکن وہ اس میدان میں تنہا سرگرداں نہ رہے، بلکہ ایک قافلے کو ساتھ لیکر چلے۔ تحقیق کے لئے نئے میدان تلاش کئے اور خدمت کی نئی راہیں دکھائیں۔ انہوں نے زبان، ادب اور تعلیم کو اپنے دم سے جو فیض پہنچایا اور جذبہٗ خدمت کی جو مثال ان سے مخصوص ہے، اس کے بہت سے عکس اور شبیہیں بھی ہیں، مگر اصل انہی میں نظر آتی تھی۔ موت زندگی سے دور نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کا اس قدر جلد دنیا سے اٹھ جانا کہ ان کے قویٰ سلامت اور علمی سرگرمیوں کا شباب تھا، بڑا صبر آزما واقعہ ہے۔

ش ۔ ح ۔ ح

تحفظ کا پورا اطمینان اور پوری ضمانت موجود ہو۔

''اردو نامہ'' کے اس شمارے میں ایک مضمون شامل کیا جا رہا ہے جو ہمیں ''پشتو اکیڈمی'' کی جانب سے وصول ہوا ہے۔ اس میں تجویز کیا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کی سب زبانوں کا ٹائپ اور ٹائپ رائٹر مشترک ہونا چاہئیے۔ اردو کی طرح مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں کا رسم الخط بھی عربی رسم الخط پر مبنی ہے۔ لیکن غیر عربی آوازوں کے لئے اس میں جو ترمیمیں کی گئی ہیں وہ یکساں نہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل منصوبہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ اردو اور دوسری علاقائی زبانوں میں جو حروف مشترک ہیں وہ جوں کے توں لے لئے جائیں۔

۲۔ جہاں آواز ایک، مگر حرف کی شکل میں خفیف اختلاف ہے، وہاں اردو حرف اختیار کیا جائے۔

۳۔ پشتو اور سندھی کے وہ حروف جو ان زبانوں کی بعض مخصوص آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں، باقی رہنے دئے جائیں۔

اس طرح صاحب مقالہ کے بقول صرف ۴ زائد حروف یا ۸ زائد شکلیں اختیار کرنی ہوں گی۔ اس تجویز میں فائدے یہ ہیں کہ پورے مغربی پاکستان کا رسم الخط جہاں تک ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کا تعلق ہے، ایک ہوجاتا ہے۔ اسی نسبت سے یہ زبانیں قریب تر آجائیں گی، اور ان کو ایک دوسرے سے استفادے کا موقع بھی ملے گا۔ اس کے علاوہ مشترک ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کی مانگ چونکہ زیادہ ہوگی، لہذا قیمتوں میں بھی کچھ نہ کچھ تخفیف ہوگی۔

لیکن جہاں تک ٹائپ رائٹر کا تعلق ہے، ایک قباحت ضرور پیدا ہوتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یعنی جدید ٹائپ رائٹر میں صرف ۴۶ لکیروں کی گنجائش ہے جن میں صرف ۹۲ حروف اور علامتیں سما سکتی ہیں۔ اردو کے معیاری ٹائپ رائٹر کے بارے میں ترقیٔ اردو بورڈ کی شائع کردہ رپورٹ میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی گئی تھی کہ اس محدود گنجائش میں اردو کے ضروری حرفوں، جوڑوں اور علامتوں کو کیونکر سمایا جائے۔ اب اگر اسی کلید بورڈ میں کم از کم چار مزید حروف کے لئے گنجائش نکالنی پڑی تو بعض ضروری علامات کم کرنی ہونگی۔ اس سے ٹائپ رائٹر کی افادیت میں ضرور فرق آئے گا۔ بہر حال ہم اپنے قارئین کو اس مسئلے پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

''اردو نامہ'' چند اہل ادارہ کی کوشش اور ذوق کا نتیجہ ہے اور اس کا جاری رہنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے اردو دوستوں کی اعانت حاصل رہے۔ جن احباب کو ابتک یہ پرچہ ہدیۃً ملتا رہا، توقع ہے کہ وہ آئندہ مستقل خریداروں میں اپنا نام درج کرالیں گے۔ ہم اسے ماہنامہ بنانے کے منصوبے میں اسی لئے ناکام رہے کہ اس کے لئے جو شرطیں ہمارے پیش نظر تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں۔ اسی لئے اس بار لغت کے صفحات کی تعداد کم کردی گئی ہے۔ اگر اردو دنیا نے قدر دانی کا ثبوت دیا تو اگلے شمارے سے پھر اس میں اضافہ کردیا جائے گا۔

ش۔ح۔ح

لپی اور تلفظ

سہیل بخاری

انسانی صلاحیتوں سے پوری آگاہی نہ ہونے کے باعث یہ غلط مفروضہ قائم کرلیا گیا ہے کہ اس نے حیات ارضی کے دوران میں اپنی کوششوں سے ایجاد زبان کی قدرت حاصل کی در آنحالیکہ اس کا یہ ملکہ اکتسابی نہیں وھبی ہے۔ انسان دنیا میں گویائی اپنے ساتھ ہی لایا ہے جو حلقی تاروں کے ارتعاش محض سے آگے بڑھ کر معنی خیز اور معنی آفریں بھی ہے۔ آواز کی یہی معنویت جس کا دامن تعقل و تفکر سے بندھا ہوا ہے، اسے نوع حیوانی میں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے۔ اس لئے عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ انسانیت کسی دور میں بھی آوازوں کے اس ضابطے سے محروم رہی ہو جسے زبان کہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں غلط مبحث کردیا جاتا ہے۔ در اصل وہ چیز جسے ہم انسان کا اکتساب کہہ سکتے ہیں، زبان نہیں فن تحریر ہے اور بلاشبہ آوازوں کا قلم بند کرنا انسان کا ایک ایسا عہد آفریں قدم تھا جس نے اس کی مادی و روحانی ترقیوں میں بہت کچھ مدد دی ہے، انسانی نسلوں کو اپنے بزرگوں کا سچا جانشین اور ان کی وراثت کا صحیح حقدار ٹھہرایا ہے اور انسان کے تفکر و تخیل کو وہ مسلسل تحریک بخشی ہے کہ آنے والی نسلیں اپنی فلاح و بہبود کے لئے ابدالآباد تک اس کی ممنون رہیں گی۔

لپی جو مختلف آوازوں کی تحریری شکلوں یعنی حروف ہجا کا ایک نظام ہوتا ہے، صرف اس لئے ایجاد ہوئی تھی کہ انسانی آوازیں آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ ہوجائیں تاکہ اسلاف کے افکار و خیالات سے اخلاق بھی متمتع اور بہرہ مند ہوسکیں۔ اس اجتماعی عمل کی ابتدا یقیناً کسی فرد واحد سے ہوئی ہوگی جس نے قبول عام پاکر ایک مخصوص معاشرے میں معیاری اور مستند حیثیت حاصل کرلی اور پھر ایک زندہ اور مسلسل روایت بن کر آنے والی نسلوں کو منتقل ہوتی رہی۔ لپی کی ایجاد کی ضرورت آوازوں کو قلم بند کرنے کے لئے پیش آئی تھی، اس لئے اس کی بنیادی غایت آج بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی زبان کی جملہ آوازوں کو اس قدر قطعیت اور صحت کے ساتھ محفوظ کرلے کہ پڑھنے والے کی زبان سے وہ آوازیں بالکل اسی طرح ادا ہونے لگیں جس طرح متکلم کی زبان سے نکلی تھیں لیکن جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے لپی اپنے مخصوص معاشرے میں جملہ افراد کی باہمی رضامندی سے آوازوں کا ایک مشترک معیاری ترجمان بن جاتی ہے۔ اس لئے کسی لپی کو اس کے معاشرے یا اس معاشرے کی کسی زبان کے تعلق سے پرکھنا بے سود ہے۔ اس کی صحیح جانچ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس

میں کسی دوسری زبان کی آوازیں قلم بند کرکے دیکھا جائے یا کسی دوسرے معاشرے کے فرد کے ذریعے اسے استعمال کرایا جائے۔

لپی ھی کی طرح تلفظ بھی ایک اجتماعی عمل ہے جو افراد معاشرہ کی عام رضامندی سے رواج پاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح کسی معاشرے کی آوازوں اور حروف میں مکمل ھم آھنگی ھوتی ہے، اسی طرح وھاں کی زبان کا تلفظ اور لپی بھی باھم گر پیوست رھتے ھیں۔ وجہ ظاھر ہے کہ حروف آوازوں کے لئے وضع ھوئے ھیں اس لئے تلفظ کو لپی پر تقدم حاصل ہے اور لپی تلفظ کی اسی طرح مطیع و منقاد ھوتی ہے جس طرح غلام آقا کا اور چونکہ اپنے آقا کی خدمت گزاری ھرغلام کا فرض ھوتا ہے، اس لئے اگر کوئی لپی اپنے مخصوص معاشرے کی زبان کا تلفظ ادا کردیتی ہے۔ تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ غلامی کا کمال تو یہ ہے کہ کسی آقا کی خدمت سے مشرف ھو، اسے شکایت کا موقع نہ دے۔ چنانچہ لپی بھی وھی کامل کہلائے گی جو ھر زبان کا صحیح تلفظ ادا کرسکے، لیکن ایسی مثالی لپی آج دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کم از کم ھزاروں زبانیں پائی جاتی ھیں اور ان کی آوازوں میں بھی کافی اختلاف ملتا ہے، اس لئے موجودہ لپیوں میں سے کسی ایک لپی میں تمام آوازوں کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لپیاں ھزاروں سال سے چلی آرھی ھیں۔ اس وقت وسائل آمد و رفت کی کمی کے باعث دنیا کے دور دراز مقامات کی آوازوں کا علم ھونا بھی ناممکن تھا اس لئے یہ لپیاں اپنے محدود علاقوں ھی کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ھیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی زبانوں کی بیشتر آوازیں مشترک ھیں، پھر بھی کسی کسی زبان میں کچھ ایسی مخصوص آوازیں بھی نکل آتی ھیں جو دوسرے علاقوں میں نہیں ملتیں مثلاً انگلستان میں ت، د وغیرہ اور یونان و ایران میں ٹ، ڈ، ڑ کی آوازیں نہیں ھیں۔ عربی میں اے، آو، پ، چ، ژ، گ اور پاک و ھند کی دراوڑی زبانوں میں ع، غ، خ، ز، ژ، ف، ش، و، ہ، ی وغیرہ کی آوازیں عنقا ھیں اور یہ وہ آوازیں ھیں جو ھم آج اپنے کانوں سے سن رہے ھیں۔ ان قدیم زبانوں کی مکمل آوازوں کا تو ھمیں علم بھی نہیں ہے جو مردہ ھوچکی ھیں۔ اس لحاظ سے ایسی کسی ایک لپی کا تصور جو دنیا کی تمام آوازوں کو اپنے اندر سمولے، ناممکن ہے۔ مجبوراً ھمیں لپیوں کے تقابل میں یہی معیار مقرر کرنا پڑتا ہے کہ جو لپی زیادہ سے زیادہ آوازیں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ دوسری سے بہتر ہے۔

انقلاب و تغیر زمانے کا وہ رجحان ہے جس سے ھر شے متاثر ھوتی ہے بلکہ تلون پسندی خود سرشت انسانی کا ایک ایسا خاصہ ہے جو اس سے اس نئی دنیا میں نت نئی تبدیلیاں کرتا رھتا ہے۔ اس صورت میں لپی بھی اس کی قطع و برید سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی۔ دنیا کی کسی لپی کو لے لیجئے، آج اس کی وہ صورت باقی نہیں رھی ہے جس میں اس کی ایجاد ھوئی تھی۔ ھمیں یک نظر اس تبدیلی کا احساس نہیں ھوتا کیونکہ ھر اجتماعی عمل بہت کم ھوتا ہے اور لپی کی تبدیلی کا عمل تو سیکڑوں ھزاروں سال کی مدت پر پھیلا ھوا ہے۔ لپیوں

کی بتدریج تراش خراش کا پہلا اور بنیادی سبب تجویری سہولت تھا۔ لیکن انسان کی نفاست پسندی اور حسن کاری نے بھی اس باب میں کچھ نہ کچھ گل ضرور کھلائے ہونگے جنہیں معاشرے نے اسی طرح قبول کرلیا جس طرح لپی کی ابتدائی شکل کو اپنا لیا تھا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ لپی تلفظ کی تابع ہوتی ہے اور اس کا ہر حرف ایک جداگانہ آواز کی نیابت کرتا ہے۔ لیکن حرف اور آواز یا لپی اور تلفظ کا رشتہ عوام کی رضامندی سے قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب تک لوگ اس تعلق سے باخبر رہتے ہیں، ہر لپی اپنے علاقے کے تلفظ کی مکمل طور پر امین و ترجمان ہوتی ہے لیکن یہ نازک رشتہ نظر سے اوجھل ہوتے ہی زبان کا پورا صوتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں لپی تلفظ کی صحیح ترجمانی سے منہ موڑ لیتی ہے اور غلام اپنے آقا سے بے وفائی کر جاتا ہے۔ لوگ زبان کے صحیح تلفظ سے بے خبر رہ جاتے ہیں اور لفظ کی اصلی آوازیں کچھ کی کچھ ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ یہی صورت حال ہمیں آج ویدک اور سنسکرت ادب کے مطالعے میں پیش آرہی ہے کیونکہ اس ادب کی صوتی روایت ہم سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ میں اس کی تشریح آئندہ سطور میں کروں گا۔

تلفظ کی تبدیلی ہماری روزمرہ زندگی کا کتنا ہی معمولی واقعہ کیوں نہ سمجھا جائے، دنیائے صوتیات میں اس کی اہمیت ایک جانگسل اور ہوش ربا سانحے سے کم نہیں ہے اس تبدیلی کے کتنے ہی اسباب ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بعض علاقوں کی زبان میں [illegible]

کچھ ایسی آوازیں پائی جاتی ہیں جو دوسرے مقامات پر نہیں ملتیں۔ ایسی صورت میں انسان یوں نکال لیتا ہے کہ اسی آواز کو اپنی زبان کی کسی دوسری ملتی جلتی آواز سے ادا کرنے لگتا ہے۔ مثلاً یوپی کے عوام ق، ز، ض، ظ کی آوازوں کو ج، خ کو کھ، ف کو پھ، غ کو گ اور ش کو س بولتے ہیں اور مرضی، منظور، مزہ، خرچ، غفور اور شرم کو بالترتیب مرجی، منجور، مجا، کھرچ، گپھور اور سرم کہتے ہیں۔ فرانسیسی مادام انگریزی میں میڈم ہوگیا ہے۔ انگریزی کا ٹیلیگراف فارسی میں تلگراف اور عربی میں تلغراف بولا جاتا ہے۔ اور قدیم ہند یورپی کا آتم انگریزی میں ایٹم ہوگیا ہے۔ فارسی والے ہمارے ہر مہاپران کو الپ پران بولیں گے۔ وہ لوگ تمہارا کو تمارا، بھائی کو بائی کہیں گے اور ٹ، ڈ، ڑ کو ت، د، ر ادا کریں گے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ کی جملہ آوازیں اپنی زبان میں موجود ہوتے ہوئے بھی لوگ اس لفظ کی بعض آوازوں کو اپنی بول چال کے رجحان کے مطابق بدل لیتے ہیں مثلاً اردو کے 'س' کو مشرقی پاکستان میں 'ش' اور 'چھ' دونوں ہی آوازوں میں ادا کیا جائے گا اور پھسلنا کو پھشلنا یا پھچھلنا بولیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر یہ لفظ وہاں کی لپی میں اسی تلفظ کے ساتھ قلم بند ہو اور یوں 'س' اور اس کی آواز کا وہ ابتدائی اور بنیادی تعلق جو اردو میں قائم ہے، بنگال والوں کے لئے اجنبی ہوجائے۔ چنانچہ آنے والے زمانے میں بنگالی لپی کے پڑھنے والے کے لئے اس لفظ کے صحیح تلفظ کا پتہ لگانا دشوار ہوسکتا ہے۔ [illegible]

مندرجہ بالا دونوں قسم کی تبدیلی کا تعلق بعض آوازوں سے ہے۔ چنانچہ جب ہم ایک زبان کے لفظ کو دوسری زبان میں بدلے ہوئے تلفظ کے ساتھ پاتے ہیں تو اس کا سبب نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور تبادل حروف کی تشریح قدرے سہولت سے ہوجاتی ہے۔ صحیح تلفظ کو سمجھنے میں اصل دقت وہاں پیش آجاتی ہے جہاں لپی کا قدم درمیان آجاتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات جب کوئی لفظ ایک لپی سے دوسری لپی میں منتقل ہو جاتا ہے تو ابتدائی لپی کے بعض مشابہ حروف کے باعث پڑھنے والے کو تشابہ لگتا ہے اور وہ اس لفظ کو فقط آواز کے ساتھ دوسری لپی میں منتقل کردیتا ہے۔ مثلاً جب مسلمانوں نے ایرانی کتابوں کو وہاں کی قدیم لپی سے پہلوی میں منتقل کیا تو اس کے آخری کاف کو ہائے ہوز پڑھا اور اسی طرح لکھ بھی دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ الفاظ آگے چل کر ہائے ہوزہی سے لکھے پڑھے جانے لگے اور اس غلطی کا حال اس وقت کھلا جب ان کی جمع پر غور کیا گیا۔ ان میں بندہ اور مژہ جیسے بہت سے الفاظ شامل ہیں جن کی جمع بندگاں، مژگاں اور ابتدائی شکل بندک، مژک ہے۔

تبادل حروف کا اہم ترین سبب یہ ہے کہ بعض زبانوں کی لپی اتنی ناقص ہوتی ہے کہ اس کا ایک ایک حرف کئی کئی آوازوں کی نیابت کرتا ہے۔ اس اعتبار سے قدیم ہند یورپی زبان کی ابتدائی لپی نہایت ہی ناقص تھی جس کا ایک ثبوت رومن لپی کے حرف ایکس (X) کی شکل میں آج بھی آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہی حرف قدیم ایرانی میں ''خش'' اور دیوناگری میں ''کش'' بولا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ خ، ش، گ، غ اور ز میں سے ہر ایک کی نمائندگی کرتا تھا۔ چنانچہ انگریزی لفظ بوکس (Box) میں آپ اس کی آواز ''کس'' اور ایگزٹ (Exit) میں ''گز'' پاتے ہیں۔ اسی حرف کو آپ موجودہ فارسی زبان کے دو مصادر افراشتن اور افراشتن میں دیکھیں گے جو غالباً ایک ہی ابتدائی لفظ ''افراخشتن'' کی دو شکلیں ہیں۔ فارسی زبان کے ہی زیر اثر یہ حرف پشتو میں بھی آگیا ہے جہاں اسے خین کہتے ہیں۔ چنانچہ خٹک بولی میں اسے ش اور دوسری بولیوں میں خ کی آواز سے بولتے ہیں، مثلاً پشتو، پختو، پشاور، پخاور یا پیخور۔ نوشہرہ اور نوخار۔ شے اور خے (بمعنی چھا) شاپیرک (فارسی شپرک بمعنی چمگادڑ) اور خاپیرک وغیرہ اس حرف کا جلوہ آپ کو یونانی لفظ ''دُدَرکے'' فارسی لفظ ''درخش'' اور ویدک لفظ ''درش'' میں نظر آئے گا۔ اسی کا کرشمہ آپ ویدک لفظ وکشن اور انگریزی لفظ اوشن (Ocean) بمعنی سمندر میں بھی دیکھیں گے۔ اور یہی حرف ویدک کشترم، اوستائی خشترم (حکومت)، ویدک ورکش (درخت)، اوستائی ورش (جنگل)، ویدک چکشو (آنکھ) ایرانی چشو (چشم)۔ ویدک دکش (دودھ دوھنا) ایرانی دُغ یا دوغ وغیرہ میں مل جائیگا۔

یہ صرف ایک قدیم حرف کی سرسری بات ہے اور وہ بھی ادھوری ہے۔ اس کی سرگزشت کو مکمل کرنے کے لیے لگے ہاتھوں اس کی اس خدمت کا تذکرہ بھی کردوں جو اس نے ہندوستان میں آکر پراکرتوں کی نمائندگی کے

سلسلے میں انجام دی ہے۔ آریوں کی قدیم ایرانی زبان میں جھ اور چھ کی آوازیں نہیں تھیں۔ جب وہ ہندوستان میں آئے اور ان کا سابقہ یہاں کی پراکرتوں سے پڑا تو انہوں نے دیکھا کہ ان میں جو بہت سی نئی آوازیں ہیں ان میں ان دونوں کا بھی شمار ہے۔ اس لئے جہاں انہوں نے پراکرت الفاظ کو ویدک میں منتقل کرتے وقت دوسری آوازوں کے لئے دوسری علامات مقرر کیں وہاں جھ اور چھ کو ظاہر کرنے کے لئے اسی حرف کو منتخب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پراکرت جھر (جھرنا) رگ وید میں کشر اور پراکرت چھرا رگ وید میں کشرا تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ محققین ہند و پاک الٹے رگ وید 'کشر' سے پراکرت 'جھر' اور ویدک 'کشرا' سے پراکرت 'چھرا' کا اشتقاق ثابت کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ فاعتبر و یا اولی الابصار!

میں تلفظ کی تبدیلی کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ لفظ ایک لپی سے دوسری لپی میں پہنچ کر اپنا ابتدائی تلفظ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی مثال کے لئے دور کیوں جائیے اپنی ہی زبان (اردو) اور اپنی ہی لپی (نسخ یا نستعلیق) کو لے لیجئے اور ڈبیا، بٹیا، اٹیا وغیرہ الفاظ کی حقیقی آوازوں اور تحریری شکلوں کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ لپی آوازوں کی صحیح ترجمانی نہیں کر رہی ہے یعنی ہم ان کو ''ی'' کی مدد سے لکھتے ہیں حالانکہ ان کے تلفظ میں ''ی'' کی آواز کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ اسی طرح کلوا (کالا آدمی)، ننھوا (ننھا)، جوروا (بیوی) وغیرہ الفاظ میں واو کا حرف مکتوبی ہے، ملفوظی نہیں ہے۔ یہ صرف رسم و رواج کی بات ہے کہ ہم نے ان الفاظ کی مکتوبی اور ملفوظی شکلوں کو ایک سمجھ لیا ہے اور ہم ان میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے یعنی ہم ان الفاظ کے پڑھنے میں تلفظ کی روایت پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔ اب اگر یہی الفاظ کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں کے لوگوں میں ان کی صوتی روایت پیشتر سے موجود نہ ہو تو وہاں کے افراد یقیناً ان الفاظ کی صرف مکتوبی شکلوں میں سے ان کے تلفظ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ڈبیا، بٹیا، لٹیا کو ڈب۔ یا، بٹ۔ یا، لٹ۔ یا اور کلوا، ننھوا، جوروا کو کل۔ وا، ننھ۔ وا، جور۔ وا بولیں گے۔

اس انقلاب کی مثال میں یوسف، میکائیل، یسوع، یعقوب، وغیرہ نام بھی پیش کئے جاسکتے ہیں جو ایک ہی زبان عبرانی سے چل کر ایک طرف تو عربی لپی کے توسط سے مندرجہ بالا تلفظ کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں اور دوسری جانب رومن لپی کے وسیلے سے جوزف، مائیکل، جیسس، جیکب کی ملفوظی شکلوں میں ہمارے گوش گزار ہو رہے ہیں، حالانکہ ہمیں یہ اچھی طرح یقین ہے کہ عبرانی میں ان کا تلفظ ایک ہی طرح کیا جاتا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ جب لپی بدلی تو ان کی مکتوبی شکلیں ملفوظی روایت سے دور جا پڑیں اور جب لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ وہ تحریر کو اساس مان کر ان کے تلفظ تک پہنچیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ جب حرف کو آواز پر ترجیح حاصل ہو گئی تو پورے کا پورا صوتی نظام بدل گیا اور بولنے والے محض غرضی

اور غیر حقیقی آوازیں نکالنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انگریزی سینٹر (مرکز) اور سنسکرت کیندر، انگریزی ایٹم اور ویدک آتم، انگریزی جوئل، ویدک یہو اور فارسی جوہر یا گوہر ویدک گرشٹھا اور انگریزی گوریلا میں اھگیں کسی رشتے کا گمان تک نہیں ہوتا۔

ویدک زبان میں پہنچ کر ایرانی الفاظ کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوا ہے، مثلاً اوستائی = تخم، ویدک = توکم، فارسی جدید = تخم۔ فارسی = دریا، ویدک = جردو، اوستا = زمت فارسی جدید = دست (ہاتھ)، اتھرب وید = ہست، اوستائی = خرتش، فارسی جدید = خرد (عقل) ویدک = کرتس، اوستا = درجم (لمبا) ویدک = دیرگھم، اوستا = وونُستا (تو جانتا ہے) ویدک = ویتھ، اوستا = جسیتی (وہ آتا ہے) ویدک = گچھتی، وستا = زاتو (جنا ہوا) فارسی جدید = زادہ ویدک جا تو، اوستا = آء وتو (چاروں طرف)

ویدک = ابھتس، اوستا = یے زی فارسی جدید = گر ویدک = یدی وغیرہ۔

میرے نزدیک قدیم ہند یورپی زبان کے ان تمام الفاظ کا ابتدائی تلفظ جو قدیم ایرانی اور ویدک میں مشترک ملتے ہیں وہی تسلیم کرنا ہوگا جو ایرانی شاخ میں پایا جاتا ہے۔ میرے اس خیال کو تاریخی حمایت حاصل ہے کیونکہ آریہ جب ہندوستان میں آئے تھے اس وقت ان کے منہ میں وہی زبان تھی جو وہ اپنے پیچھے بھی ایران میں چھوڑ آئے تھے اور یقینی طور پر وہ اسی طرح بولتے بھی ہونگے جس طرح اوستا وغیرہ میں بولی گئی ہے۔ البتہ اس وقت جو دونوں میں فرق پایا جاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں اس زبان کو دوسری لپیوں سے سابقہ پڑ گیا جنھوں نے اب آکر اس کی صوتیات کو کچھ کا کچھ بنادیا۔ آج ہم چونکہ اس زبان کے ابتدائی تلفظ کی روایت سے بہت دور آگے بڑھ آئے ہیں، ہمیں اس کا صحیح صحیح علم نہیں رہا، اسی لئے ہم اس کی موجودہ لپی (دیونا گری) ہی کو بنیاد قرار دے کر اس کے تلفظ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ تلفظ جو اس لپی کو پڑھ کر براہ راست حاصل ہوتا ہے، حرف بحرف صحیح ہونے کے باوجود آواز بآواز درست نہیں ہے۔

بالکل یہی بات ہماری قدیم دراوڑی زبانوں (پراکرتوں) اور ویدک کے باہمی تعلق میں بھی پائی جاتی ہے۔ آریوں نے یہاں آکر ہماری زبانوں کے جو الفاظ ویدک میں داخل کئے اور ان کی جو مکتوبی شکلیں ہم تک دیونا گری کے ذریعے پہنچی ہیں، انکی آوازوں سے ہمارا موجودہ تلفظ مختلف نظر آتا ہے اور یہ اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ ویدک کے دراوڑی الفاظ کو کتنی ہی لپیوں میں سے ہوکر گذرنا پڑتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دیونا گری ہندوستان کی وہ قدیم لپی نہیں ہے جو آریوں کے داخلے سے قبل یہاں رائج تھی اور رگ وید کو جس وقت اس لپی میں منتقل کیا گیا ہے، اس وقت یہ اپنے تعمیری دور سے گذر رہی تھی۔ چنانچہ اس کی دور بدور اصلاحیں اور اضافے خود رگ وید کے موجودہ نسخے میں صاف صاف نمایاں ہیں۔ اس کے باوجود معتقدین ہیں کہ ویدک کا جو لفظ جس طرح لکھا ہے

اس کو اسی طرح پڑھتے ہیں اور پھر یہ اصرار بھی کرتے ہیں کہ اس کا اصلی اور ابتدائی تلفظ یہی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم رگ‌وید میں داخل کی ہوئی دراوڑی زبان کے مسئلے میں اس تاریخی حمایت سے محروم ہیں جو اس کے قدیم ایرانی جزو کے سلسلے میں ہمیں حاصل ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رگ وید کی مکتوبی شکل میں جو اصول قدیم ایرانی زبان کے لئے کام میں لائے گئے ہیں، وہی دراوڑی زبانوں کے لئے بھی برتے گئے ہیں۔ چنانچہ دراوڑی اور ایرانی اجزا کی کتابت کے مشترک اصولوں کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ ایرانی جزو کی مکتوبی شکل کو اس کے ابتدائی تلفظ پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ اسی طرح اس کے دراوڑی حصے کا صحیح تلفظ معلوم کرنے کے لئے بھی ہمیں اپنی بول چال کی زبانوں کو معیار ٹھیرانا ناگزیر ہے۔

اس کے برعکس دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ لوگ ہماری زبانوں کی ملفوظی شکلوں کو ویدک اور سنسکرت کی مکتوبی شکلوں سے مستخرج کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، یعنی وہ ویدک اور سنسکرت کے حرف کو ہماری بھاشاؤں (یعنی بول چال کی زبانوں) پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس باب میں پراکرت کے گرامر نویسوں نے اور بھی غضب ڈھایا ہے کہ ہر ویدک لفظ کو دراوڑی اور ایرانی کی تفریق سے قطعی بے نیاز ہوکر چند مفروضہ اصولوں کے تحت بدل ڈالا اور اسے پراکرت کا نام ارزانی کردیا۔ ہمارے یہاں کچھ ایرانی الاصل الفاظ آج اپنی اصلی شکل میں بھی مستعمل ہیں اور کچھ بدلی ہوئی شکل میں بھی ملتے ہیں لیکن آخرالذکر قسم کے الفاظ گرامر نویسوں کی ذہنی ورزشوں اور لفظ سازی کی کوششوں سے رائج نہیں ہوئے بلکہ ان کے پس پشت جہاں کچھ تاریخی عوامل یعنی دیسی اور بدیسی باشندوں کے میل جول کی کارفرمائی نظر آتی ہے، وہاں کچھ بدیسی لفظوں کی مکتوبی شکل بھی ان کے بدلے ہوئے تلفظ کی ذمہ دار ہے۔

یہاں میں قدیم ایرانی کا ایک ایسا لفظ پیش کرتا ہوں جو گرامر نویسوں کی کوششوں کے باوجود ہمارے یہاں رواج نہیں پاسکا۔ یہ لفظ ہے "شست" جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں اور جو سابقہ "ن" کے ساتھ آج بھی فارسی میں "نشست" بولا جاتا ہے۔ رگ وید میں یہ لفظ "تشٹھ" کی مکتوبی شکل میں ملتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ویدک کال میں بھی اس کا تلفظ وہی تھا جو آج فارسی میں رائج ہے۔ لیکن لپیوں کی ردو بدل کے صدقے اس کا چہرہ اس قدر مسخ ہوگیا ہے کہ آج پہچاننے میں نہیں آتا اور وہ تعلق جو اس کے ابتدائی تلفظ اور لپی میں قائم تھا، لوگوں کے دائرۂ عمل سے نکل گیا تو بڑے بڑے پنڈت اور اسکالر یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کا اصلی تلفظ "تشٹھ" ہی ہے۔ اس غلط فہمی نے ایک اور مضحکہ انگیز صورت یہ پیدا کی کہ جب سنسکرت کے ڈرامہ نگاروں نے اس لفظ کو اپنی مصنوعی پراکرت میں ڈھالا تو اسے "چٹھ" کرکے چلتے سکے کی طرح تمام ڈراموں میں بلا استثنا استعمال کیا جیسے یہ بھی دراوڑی زبان کا ہی کوئی لفظ ہو، چنانچہ سنسکرت کے کسی ڈرامے کو اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو ہر جگہ اس لفظ کا پراکرت روپ "چٹھ" ہی ملے گا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ شمالی ہندوستان

کی موجودہ زبانیں جن کو سبھی پراکرت سے متعلق جانتے ہیں، اس لفظ سے خالی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ ورثہ نہیں سنبھالا اور گرامر نویسوں کی اس نادر دین کو ہاتھ نہیں لگایا۔

میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ قدیم ہند یورپی زبان کی لپی نہایت نادار تھی جس میں ایک ایک حرف کئی کئی آوازیں دیتا تھا چنانچہ اس زبان کی جو نسلیں مختلف ممالک میں پھیلیں ان میں تبادل حروف نے ایک مسلمہ اصول کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ان لوگوں پر ہوتی ہے جو ہندوستان کی قدیم دراوڑی زبان کو بھی اسی عینک سے دیکھتے اور ان میں تبادل حروف کا اسی دھوم دھام سے سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے جوشیلے اور حوصلہ مند محققین سے میں بصد احترام گذارش کرتاہوں کہ وہ پراکرتوں کا مطالعہ کرتے وقت کم از کم اس قدر جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کریں کہ اشتقاق الفاظ میں جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں کوئی حرف ساقط کردیں یا کسی حرف کا اضافہ فرمادیں۔ میں وثوق کے ساتھ کہتاہوں کہ پراکرتوں میں تبادل حروف کا عمل تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے لفظ سازی کی دھن میں حسب منشا حروف میں ہیر پھیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ بھاشا (بول چال کی زبان) کی آوازوں کو اساس مان کر مکتوبی الفاظ کی تشریح کی جائے اور یہ سراغ لگایا جائے کہ ان آوازوں کو قلم بند کرتے وقت کن اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے، یعنی اس سلسلے میں ان لامعلوم لپیوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کو کتنا دخل رہا ہے جن سے گذرنے کے بعد شوخیٔ تحریر کے فریادی الفاظ کو موجودہ کاغذی پیراہن نصیب ہوا ہے۔

حرف و صوت یعنی لپی اور تلفظ کے اس بنیادی نقطہ کے پیش نظر جس کی وضاحت سطور بالا میں کردی گئی ہے، زبانوں کے صحیح تلفظ کے معلوم کرنے کا خواہ وہ قدیم ہوں خواہ جدید ایک ہی اصول ہے کہ ملفوظی آوازوں کو مکتوبی حروف پر تقدم و ترجیح حاصل رہے۔ اس برصغیر کی زبانوں کے مطالعے میں جو لوگ ویدک اور سنسکرت کی مکتوبی آوازوں کو ہماری بھاشاؤں کی ملفوظی روایت پر ترجیح دے رہے ہیں، وہ لسانیات کے مذاق صحیح سے بیگانہ ہیں۔ اس سلسلے میں اردو کے ان نام‌نہاد ہوا خواہوں کو بھی جو اردو کے لئے بھی کسی نہ کسی طرح رومن لپی ضروری سمجھتے ہیں اور جن کا کھانا محض اس لئے هضم نہیں ہو رہا ہے کہ اردو عربی لپی میں لکھی جارہی ہے، یہ بات اچھی طرح ذہن‌نشین کرلینی چاہئے کہ لپیوں کا اختلاف ایک ہی زبان کی دو مکتوبی شکلوں کا ذمہ دار ہوتا ہے، یعنی لپی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان کا ابتدائی تلفظ بھی بدل جاتا ہے۔

سرسید کے سماجی تصورات

ڈاکٹر سیدہ جعفر

سر سید کی ادبی تحقیقات جس تمدن میں نمو پا کر ابھری تھیں، وہ ہندوستان میں ایک نئی ہیئت اجتماعی کی تشکیل اور ترتیب اور پرانی روایات کا شیرازہ بکھرنے کی تاریخ ہے۔ اس ماحول میں معاشرت کے تمام عناصر ایک ایسی سطح پر پہنچ کر ساکن ہوگئے تھے جس سے آگے بڑھنے کے لئے ایک بڑے انقلاب کی ضرورت تھی۔ مذہب، تعلیم و تربیت، اخلاق اور ادب کی رفتار میں جو تہذیبی سرمائے کے اہم اجزا ہیں، ٹھہراؤ اور جمود سا پیدا ہوگیا تھا۔ یہ انجماد ہمیشہ انحطاط اور انتشار کی نشان دہی کرتا ہے لیکن اس کا پر تو بعض وقت اتنا مدھم ہوتا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو دھوکا ہوتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت عیش و عشرت کی جو مصنوعی چمک اور شاعری اور شایستگی میں جو ظاہری نکھار نظر آتا ہے، وہ ہمیں لوی مم فورڈ کے اس قول کی یاد دلاتا ہے کہ "جب کسی تہذیب کا زوال ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کے بعض اداروں میں ایک ایسی اجتماعی سرگرمی آجاتی ہے جو دھوکے میں ڈالنے والی ہوتی ہے مگر یہ صحت مند زندگی کا دوران خون نہیں، ایک مریض کا بحران ہوتا ہے۔ چہرے کی بڑھی ہوئی سرخی ہمیشہ تندرستی کی علامت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خطرناک امراض کا پیش خیمہ ہوتی ہے"۔

سر سید کا شعور اسی طرح کی "اجتماعی سرگرمی" کے زمانے میں بیدار ہوا تھا اور ان میں وہ قوت ذہنی اور ژرف نگاہی موجود تھی جو حالات کا صحیح تجزیہ کرسکتی ہے۔ سرسید کی تمام تصانیف اور خصوصاً ان کے مضامین میں ان کے فلسفۂ تمدن اور سیاسی آدرش کی واضح اور روشن تصویریں نظر آتی ہیں۔ سرسید کے فلسفۂ تمدن کی بنیاد اس تصور پر رکھی گئی تھی کہ ہمارے نظام معاشرت کے مختلف شعبوں میں جو تعطل اور کمزوری پیدا ہوگئی تھی اس کو دور کیا جائے اور جو روایات اور قدریں اجتماعی افادیت کی حامل تھیں اور جو نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں کی تکمیل کرسکتی تھیں، انہیں برقرار رکھتے ہوئے، ان عمرانی روابط اور سماجی عوامل کو اپنے تمدن میں سمولینا چاہئے، جنہیں معاشی اور سیاسی حالات نے جنم دیا تھا۔ 'رسم و رواج' "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہئے" "آزادی رائے" "طریقۂ زندگی" "سولیزیشن یا تہذیب" اور "تعلیم و تربیت" ایسے مضامین ہیں جو سر سید کی بہت سی اصلاحی خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تمدن کی اصلاح، اسکی نشو ونما اور اسکی خوش حالی کے مسائل اور اس کی موت اور زیست کے متعلق "تہذیب الاخلاق" میں سرسید نے جن حقایق اور تصورات

کا اظہار کیا ہے وہ نہایت صاف اور واضح ہیں
مبہم اور پیچیدہ نہیں۔ پیچیدہ اور الجھے ہوئے،
خیالات ذہنی کج روی اور خام فکر سے پیدا
ہوتے ہیں اور یہ بات سرسید کے نظریات میں
ہم کو کہیں نہیں ملتی۔ سرسید کے یہاں
تہذیب کا ایک مکمل اور بھرپور تصور نہ
سہی تاہم اس پہنائی کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور
مل جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''سولیزیشن
انگریزی لفظ ہے جسکا 'تہذیب' ہم نے
ترجمہ کیا ہے مگر اسکے معنیٰ نہایت وسیع
ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال
ارادی اور اخلاقی اور معاملات اور معاشرت
تمدن اور طریقہ، تمدن اور صرف اوقات اور علوم
اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے
کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی
اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی
اور جسمانی خوبی حاصل ہوتی ہے اور تمکن
اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے
اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر
آتی ہے۔''

سرسید اس نظریے کے حامی تھے کہ
تہذیب اور تمدن انسان کے لئے مسرت کا
حقیقی ذریعہ ہو اور اس سے اس کے چھپے ہوئے
جوہر بروئے کار آسکیں۔ اسکا عمل اخلاق
کے ابدی محوروں سے قریب تر ہو اور وہ مادی
زندگی کے حقیقی وقار اور عزت سے آشنا ہوسکے۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید آرائشی اور
مصنوعی تہذیب کے بجائے زندہ تہذیب کا
تصور رکھتے تھے اور ان کے ذہن میں تمدن
کا ایک بچا ہوا تصور موجود تھا۔ سرسید کو
اس کا پورا پورا علم تھا کہ سماجی ڈھانچہ
کہاں کہاں سے مجروح ہوا ہے، اسکے افعال
کی ہم آہنگی اور ربط کن حالات اور عوامل
کی وجہ سے برہم ہوا ہے انہوں نے اس کو
سمجھنے میں کہیں غلطی نہیں کی۔ ان کے
مضامین معاشرتی زندگی کے بہت سے اہم رخوں
کی تصویریں ہیں اور ان تصویروں میں سرسید
کے تاریخی شعور اور ذہنی بیداری نے اصلاح
کے جو رنگ بھرے تھے ان کی چمک آج بھی
پھیکی نہیں ہوئی۔

سرسید کی تحریک میں ہمیں جو حقائق
کی تلاش، خارجی اور منطقی استدلال کے تیور
نظر آتے ہیں وہ ان کی عقل پرستی کے شاہد
ہیں۔ سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی
کا قیام بھی اسی کا نتیجہ ہیں۔ سائنٹفک
سوسائٹی کا مقصد انگریزی کتابوں کا اردو
میں ترجمہ کرنا اور اردو داں طبقے میں
سائینس کی تعلیم کو عام کرنا تھا۔ لیکن اس
کے پس منظر میں ایک اور مقصد بھی پوشیدہ
تھا اور وہ یہ کہ اردو دنیا کو طبعی علوم
کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ مادی زندگی
کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے انہیں تیار کیا
جائے اور متوسط طبقے تک سائنسی علوم کی
معلومات پہنچائی جائیں یعنی، وہ ہندوستانیوں
کو عقلیت اور مادیت سے قریب لانا چاہتے
تھے۔ سرسید کے پیش نظر ایک سوچی سمجھی
ہوئی اور منظم تجویز تھی۔ اپنی ایک تقریر
میں انہوں نے مروجۂ نظام تعلیم کی کوتاہیوں
پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا:

''میرے ایک دوست کا ایک رشتہ دار
دیو بند ضلع سہارنپور کے مدرسے میں جو
لوگوں کے ماہواری چندے سے اپنی قدیم

علموں کی تعلیم کے لئے قایم ہے، تعلیم پاتا تھا۔ اس نے تمام علوم پڑھ کر فراغت حاصل کی۔ فضیلت کی پگڑی سر پر باندھی اور میرے دوست کو لکھا کہ اب میں کیا کروں۔ میرے دوست نے جواب دیا کہ دنیا میں کام آنے کے لائق تو تم نے کوئی چیز سیکھی نہیں۔ اب بجز اسکے اور کچھ چارہ نہیں کہ کسی مسجد یا چوپال میں جاکر بیٹھو اور مردوں کے فاتحوں کی اور جمعرات کی روٹی پر گذارا کرو"۔

سر سید نے مروجہ تعلم میں اصلاح کی شدید ضرورت محسوس کی تھی۔ پرانی تعلیم روایتی تھی اور نئی تعلیم عقلی تھی۔ خانقاہوں اور درسگاہوں سے جو ذہنی روشنی اور تعلیم ملتی تھی وہ ایسی نہ تھی کہ نئے سرمایہ دارانہ نظام کے لائے ہوئے نئے ذرائع معاش اور سیاست کی نئی روشوں سے ہم آہنگی پیدا کرسکے۔ انگریزی تعلیم ذہن کو بیداری عطا کرتی اور ہندوستانیوں کو غلط رسم و رواج کی تقلید سے آزاد کرسکتی تھی۔ اس تعلیم میں ایسے افراد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی جو سماج کی نئی تشکیل میں حصہ لے سکتے اور حکومت کی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے سخت مخالف تھے جو وقت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ سر سید نے مشرقی نصاب تعلیم اور مشرقی نظام تعلیم کو رد کرکے ہمیں نئے تعلیمی امکانات سے روشناس کیا، ورنہ لارڈ رپن کے آنے کے بعد اس کا اندیشہ ہوگیا تھا کہ تعلیم کی از کار رفتہ قدروں کو دوبارہ زندہ کیا جاتا اور ہندوستانی اپنی ذہنی تربیت کے اعتبار سے پھر قرون وسطیٰ میں لوٹ جاتے۔

لارڈ رپن کی کوششوں سے پنجاب یونیورسٹی مشرقی سانچے میں ڈھل چکی تھی اور اب انگریزوں کی تعلیمی پالیسی الہ آباد یونیورسٹی میں بھی اسی طرز کو رائج کرنے پر مائل تھی۔ سر سید وہ پہلے دور اندیش اور باشعور سیاسی رہبر تھے جنہوں نے اس کی زبردست مخالفت کی اور سامراجیوں کی اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ انگریزوں کے اس تمدنی استحصال کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں سر سید لکھتے ہیں:

"اب یہ زمانہ ہے کہ اس کے بر خلاف خفیہ اور علانیہ تدبیر ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں کو انگلش ہائی ایجوکیشن سے محروم کیا جائے۔ ابتدا میں تمام انگریزوں اور تمام مشنری سوسائٹیوں کو یقین تھا کہ انگریزی تعلیم سے تمام ہندوستانیوں یا اس کا ایک بڑا حصہ عیسائی ہوجائے گا، نیز گورنمنٹ کو اپنے دفتر کے کاروبار کے لئے انگریزی خوانوں کی ضرورت تھی، مگر اس تعلیم سے مشنری سوسائٹیوں کا مقصد پورا نہ ہوا، بلکہ اس کے برخلاف ظہور میں آیا۔ اس لئے مشنری سوسائٹیاں ایجوکیشن کے خلاف آمادہ ہوئیں"۔

آج یہ بات ہم کو عجیب معلوم ہے کہ سر سید نے قومی سیرت کی تشکیل اور اجتماعی ذہنی تربیت، اپنی تہذیبی بنیادوں کے بجائے مغربی معیاروں پر کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے تقاضے کی تکمیل کر رہے تھے۔ مغربی علوم و فنون اور تعلیم و تربیت سے ہندو

...میں سرسید کا منشا یہ معلوم
ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پرانی
...ت میں تربیت پائے ہوئے لوگوں کے
میں ہندوستان کی علمی، تہذیبی اور
تعمیر جدید طرز کی تعلیم پانے والوں کے
...ہوں میں زیادہ بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔
ہندوستانیوں میں ایک ایسا تعلیم یافتہ
...ہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو مستقبل میں
...کی ترقی اور حکومت کی ذمہ داری کی
...محسوس کرسکتا۔

...رسید کی عقل پسندی اور تعمیر پرستی
کا ایک اور ثبوت ہمیں ان تصورات میں ملتا
ہے جو انہوں نے مذہب کی نئی تاویلوں اور
تمدن کی اصلاح کے بارے میں پیش کئے تھے۔
توہم پرستی، جہالت اور تنگ نظری نے رسم
و رواج کو بھی مذہب کا رنگ دے دیا تھا۔

اس زمانے میں تہذیب کے تمام شعبوں پر
مذہب کی چھاپ بہت گہری تھی اور مروجہ
اصولوں میں ذراسا ردو بدل اور تھوڑاسا اجتہاد
بھی بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اکبر نے
سر سید پر جب یہ کہہ کر چوٹ کی تھی کہ:

حاضر ہوا جو خدمت سید میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

تو انہوں نے اس اجتماعی ذہنیت اور اس
...احساس کی ترجمانی کی تھی جو سر سید
...کے خلاف تنگ نظر اور بیمار ذہنیت
...لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔
...والوں نے سر سید کو "پیر نیچر"
...خطاب دیا تھا، اس میں ان کی ساری
...کا نچوڑ آگیا ہے۔ پروفیسر عبداللہ سرسید

...کی عقل پسندی کے متعلق لکھتے ہیں:

"وہ انگلستان سے نئے تصورات اور خیالات
لے کر آئے تھے، ان کے ساتھ معقولیت کی نئی
روشنی ہندوستان پہنچی تھی، انہوں نے تحقیقات
کو مذہب کی جانچ کا واحد ذریعہ قرار دیا۔
ان کا نعرہ نیچر تھا۔ وہ ایک حقیقی نیچری تھے
اور اسی نام سے ان کے مخالفین انہیں یاد کیا
کرتے تھے۔ سیاست اور مذہب میں ان کا
نصب العین بالکل بدل چکا تھا"

سر سید نے نہ تو مذہب کے بنیادی
اصولوں میں تبدیلی کرنی چاہی تھی اور نہ
ان کے بعض مخالفین کے خیال کے مطابق وہ
کسی نئے مذہب کی رہنمائی کے لئے تیار تھے
اس کے برخلاف انہوں نے تہذیب کے مختلف
رخوں مثلاً تعلیم و تربیت، ذرائع معاش اور
طرز زندگی وغیرہ پر مذہب کی غیر ضروری
مداخلت کو کم کرکے سائنسی اور مادی
ضروریات سے مذہب کو ہم آہنگ کرنا چاہا
تھا۔ مذہب اور مادی زندگی کی کشمکش
اور اس کی ضروریات کو ایک دوسرے سے بالکل
بیگانہ بنایا جا چکا تھا۔ اپنے ایک مضمون میں
اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

تعجب کی بات ہے کہ اس بات پر کوشش
کرنا کہ مسلمانوں میں قومی ترقی ہو،
علوم دینی قائم رہیں، علوم کی بنیادیں جو
مفید و بکار آمد ہیں ان کا رواج اور ترقی ہو،
لوگ معاش سے فارغ البال ہوں ... کل ...
پیدا کرنے کے وسیلے ہاتھ آویں، جس ...
میں جو نقص ہیں وہ رفع ہوں ...
اور خراب عادتوں سے ... مسلمان ...
اور اسلام کو حقیر و ذلیل ...
... کی ...

و توھمات ھیں اور ھر طرح کی ترقی کے مانع ھیں، وہ دور کئے جائیں۔ ان تمام باتوں کو محض دینداری اور حب قومی سے نہ سمجھنا اور انہماک دنیا کا الزام دینا کس طرح خدا کے نزدیک درست ھوگا''۔

''ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار'' کی حکایت میں انھوں نے دانا دنیا دار کے روپ میں اپنے آپ کو پیش کیا ھے۔ جب دانا دنیا دار نے مذھب اور اخلاق کی مختلف قدروں کا تجزیہ کر کے دیکھا اور دنیا میں ان اعلیٰ معیاروں کی کمی دیکھی جو مذھب کی اصل روح ھیں، تو پھر اس نے مذھب کو عقل کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ سر سید نے اس کا حال اس طرح بیان کیا ھے :

''اس نے بہادرانہ طور سے مذھب کو عقل کے سامنے ڈال دیا کہ جس طرح چاھو جانچو۔ سچا سچا ھے۔ اس نے مذھب کو حقائق موجودات سے موازنہ کیا اور دنیا کو یہ دکھلانا چاھا کہ خدا کا قول یعنی مذھب اور خدا کا فعل یعنی فطرت موجودات دونوں کا مبدأ ایک ھی ھے''۔

اس نے اپنی قوم سے تعصبات اور پابندی رسومات اور اوھام مذھبی کے جو حقیقت میں مذھب سے متعلق نہ تھے چھڑوانے پر کوشش کی تاکہ لغو خیالات سے لوگوں کے دل پاک ھوں۔ اس نے لوگوں کو اس بات پر رغبت دلائی کہ اچھی باتیں جس میں ھوں ان کو لو اور بری باتیں جس میں ھوں پرھیز کرو۔

سر سید نے عظیم آباد کے جلسے میں دین اور دنیا کے متعلق بڑی کام کی بات کہی تھی کہ :

''دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی، دنیا چھوڑنے سے دین جاتا ھے''۔

سر سید کے مذھبی خیالات کو علماء اور مشایخین کا گروہ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ سر سید کو ''اخوان الشیاطین'' کا نمائندہ سمجھنے لگے تھے۔ علماء سر سید سے اس لئے بد ظن تھے کہ نئی تعلیم اور نئے خیالات کے اثر سے ان کی جماعت آھستہ آھستہ عوام پر اپنے برسوں سے قائم شدہ تسلط اور اقتدار کو کھو رھی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ نئے سماجی حالات میں یہ جماعت اپنے حق رھبری سے محروم ھوتی جا رھی تھی۔ اس وقت علماء نے اپنے مؤثر ترین حربے کو استعمال کیا اور ھندوستان میں ھر طرف سے تکفیر کے فتووں کی بوچھار شروع ھوگئی۔ واقعہ یہ ھے کہ علماء اور سر سید دونوں انتہا پسندی سے کام لے رھے تھے، سر سید نے پرانے خیالات کی ضد میں مذھبی معاملات کو سمجھنے میں کہیں کہیں لاپروائی بھی برتی تھی جسے بعض لوگ علماء کی بے اعتنائیوں کا رد عمل سمجھتے۔ سجاد انصاری نے سر سید پر تنقید کرتے ھوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا :

''علماء ایک حد پر تھے اور سر سید دوسری حد پر۔ سر سید پر سب سے بڑا الزام یہ قائم کیا جاسکتا ھے کہ انھوں نے علماء کی ضد میں مذھب کو غلط سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔۔ سر سید سے سب سے بڑی غلطی یہ ھوئی کہ انھوں نے مذھب کو صحیح نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا اور قصداً ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ علماء کے نقطۂ نظر کو غلط ثابت کردیں۔۔۔۔ یہ صرف یہ ثابت [illegible]

کہ مذہب وہ نہیں ہے جو ان کو
بتانے والے علما سمجھتے تھے"۔

سرسید کے سیاسی مسلک میں بھی بہت
کجرویاں اور بہت سے نشیب و فراز ہیں۔
مضامین اور لکچرروں میں پہلے وہ ہندوؤں
مسلمانوں کو ایک قوم اور ایک دیس کے
رہنے والے کہتے ہیں اور ان کے اتحاد کی
بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے
نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے اپنے سیاسی تصورات
کی توضیح کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں
دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا ہے۔ وہ کونسلوں
اور لوکل بورڈوں کے انتخاب کے اصول کی تائید
بھی کرتے ہیں۔ "رسالہ اسباب بغاوت" میں
سرسید نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا
تھا کہ "ذمہ دار حکومت" نہ ہونے کی وجہ
سے "ہندوستانیوں" کی مذہبی، قانونی، اقتصادی
اور تجارتی قدروں میں انحطاط پیدا ہوتا جا رہا
ہے۔ اس مضمون میں سرسید نے جہاں سامراجی
سیاست کے بعض نازک گوشوں کو چھونے کی
کوشش کی ہے، وہیں انہوں نے صرف مسلمانوں
یا صرف ہندوؤں کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ وہ
محض "ہندوستانی" لکھتے ہیں۔

رسالہ اسباب بغاوت میں سرسید نے ہندوستانی
سیاست اور معیشت کے جن اہم پہلوؤں سے بحث
کی ہے ان میں کوئی ایسا اصول نہیں پایا جاتا
جو صرف کسی ایک فرقے پر لاگو ہوسکتا تھا۔
ہندوؤں اور مسلمانوں کا برطانوی پالیسی
اقتصادی اور سیاسی استحصال کے خلاف
ایک متحدہ احتجاج تھا۔ پٹنہ کے ایک جلسے
میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:
"اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے
اور کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی
مانند ہے۔ جس کی خوبصورت اور رسیلی دو
آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر دونوں آپس
میں نفاق رکھیں گے تو وہ ہماری دلہن بھینگی
ہوجائے گی اور ایک دوسرے کو برباد کرینگے
تو وہ کانی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان
کے رہنے ولے ہندو اور مسلمانو اب تم کو
اختیار ہے کہ چاہے اس دلہن کو بھینگا بناؤ
چاہے کانا۔"

اس طرح سرسید نے اپنے نظریہ سیاست
میں بڑی وسعت، گہرائی اور ہمہ گیری کا ثبوت
دیا تھا۔ ایک اور موقعے پر انہوں نے اپنے
قومیت کے تصور کی اس طرح وضاحت کی تھی:

"میں نے اس وقت انجمن میں اپنی زبان
سے کئی دفعہ "قوم" کا لفظ بیان کیا ہے، اس
سے میرا مطلب صرف مسلمانوں ہی سی نہیں
ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ تمام انسان بالکل
شخص واحد ہیں اور میں قوم کی خصوصیت کے
واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ نہیں پسند کرتا"۔

اس وقت سرسید انقلاب پسند نظر آتے ہیں
اور اپنے آپ کو "ہندوستانی مسلمان" کہتے
اور جمہوری حکومت کو اپنے سیاسی عقائد
کا مرکز تصور کرتے ہیں۔ لارڈ رپن کے زمانے
میں جب میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ قائم ہوئے
تو کونسل میں سر سید نے "سلف گورنمنٹ"
سے قریبی تعلق رکھنے والی مراعات کا پرزور
شکریہ ادا کیا تھا اور دونوں فرقوں کی طرف
سے اظہار مسرت بھی کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ
سر سید کے قومی نظریہ میں بعض رجعت پسند
عناصر داخل ہونے لگے۔ ۱۸۶۷ء میں جب
اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا اور بنارس اور
الہ آباد وغیرہ میں ہندی کمیٹیاں قائم ہوئیں
تو سرسید کا مسلک بھی اس سے متاثر

[illegible] اسی دور کی تشکیل اور تعمیر میں مسٹر بک کی ذات کو بھی دخل تھا۔ [illegible] ۱۸۸۳ع میں ہندوستان آئے تھے۔ ان کا تعلق انگلستان کی کنزرویٹیو جماعت سے تھا، اس لیے جب مسٹر ہیوم نے انڈین نیشنل کانگریس قائم کی تو وہ ہیوم کے لبرل خیالات کے خلاف اظہار خیال کرنے لگے اور سر سید کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ اس طرح واقعات کی رفتار نے آہستہ آہستہ سر سید کے تصور سیاست کی وسعتوں کو سکیڑنا شروع کیا اور ان کی سیاست منفی رد عمل کی سیاست بن کر رہ گئی۔ جب لوکل بورڈ کے انتخابات کی بحث شروع ہوئی تو سر سید نے اسکی ممانعت کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسے انتخابات صرف اکثریت کے حق میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی اقلیتوں کا سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

سر سید کے سیاسی مسلک کی کجرویوں کو ہم عقیدت کے حسین لفظوں اور خوبصورت توجیہوں سے ڈھانک نہیں سکتے۔ سر سید کی بڑائی یہ ظاہر کرنے میں نہیں ہے کہ انہوں نے کانگریس کی مخالفت نہیں کی۔ ان کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ہماری سماجی زندگی کو اس وقت جھنجوڑا جب بیداری کا تخیل بھی سیاسی رہنماؤں اور ناخداؤں کے ذہن میں پوری طرح ابھرا نہ تھا۔ اس وقت تک نہ تو کلکتے سے سریندر ناتھ بنرجی اٹھے تھے اور نہ کانگریس عالم وجود میں آئی تھی۔ سر سید کی اولیت اس میں ہے کہ انہوں نے ہندوستانی سیاست کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا جس سے ہو کر بعد میں سیاست کے بہت سے کارواں آگے بڑھے۔

سر سید کے سیاسی لائحہ عمل کے علاوہ [illegible] نصب العین میں بھی تضاد اور [illegible] نظر آتی ہیں۔ ایک طرف وہ نئے [illegible] ابھرتے ہوئے صنعتی نظام کی [illegible] اور اس کی [illegible] ضروریات اور تقاضوں سے [illegible] اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے خواہش [illegible] دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف جاگیردار [illegible] کے مٹتے ہوئے عناصر سے انہیں ہمدردی [illegible] ہے۔ جس کے دل میں قوم کی بے پناہ محبت بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انگریز دوستی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ برطانوی سامراج کے استبداد کو نظر کرکے ان کے [illegible] کی حمایت کرتے اور ان کے انصاف کے گاتے ہیں۔ "رسالہ اسباب بغاوت" میں سر سید نے غدر کے واقعے کی بعض غلط تاویلیں کی ہیں اور اسے محض ایک اتفاقی حادثہ بتایا [illegible] اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ [illegible] سارا ہنگامہ ہندوستانیوں کی ناسمجھی، جہالت اور غلط فہمی پر مبنی تھا۔

سر سید کی تہذیبی اور ادبی خدمات کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک مخصوص فرقے کی رہنمائی اور اصلاح کے حامی تھے۔ سر سید دراصل ایک ایسی جماعت سے ہمدردی کر رہے تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دوسری جماعتوں سے زیادہ پامال اور برباد ہوئی تھی۔ اگر سر سید [illegible] جماعت کی ترقی کے لئے کوشش نہ کرتے [illegible] ہندوستانی سماج کا ایک حصہ زمانے کی [illegible] سے پیچھے رہ جاتا اور اس طرح پوری [illegible] ترقی متاثر ہوجاتی۔ سر سید کا سب سے [illegible] کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانیوں [illegible] زندگی کے نئے امکانات، نئی آمنگوں اور نئی [illegible] کا شعور عطا کیا۔ بدلے ہوئے حالات سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا [illegible] مذہب کو قابل قبول انداز میں [illegible] کی کوشش کی۔ ہمارے تعلیمی نظام [illegible] اصلاح کی، ہماری مجلسی زندگی [illegible] ادب کو زندگی [illegible] [illegible] کیا [illegible]

شیخ سعدی ہندی کا مدفن

سید مبارز الدین رفعت

"اردو نامہ" کے شمارہ ۵۰ (اپریل تا جون ۱۹۷۵ء) میں جناب تحسین سروری نے "شیخ سعدی ہندی" کے عنوان کے تحت اردو کے ابتدائی دور کے ایک شاعر کے بارے میں ایک دلچسپ مقالہ پیش کیا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے "روائح الانفاس" نامی ایک کتاب کا اقتباس پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ شیخ سعدی ہندی حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے خلیفہ حضرت برہان الدینؒ کے مرید تھے اور وہ شہر برہان پور کے قریب [illegible] مدفون ہیں۔ شیخ سعدی ہندی کے مدفن کے بارے میں یہ ایک اہم اطلاع ہے۔ جیسا کہ صاحب مقالہ نے خود اعتراف کیا ہے، وہ "روائح الانفاس" کا تفصیلی مطالعہ نہ کر سکے۔ اگر انہیں تفصیلی طور پر اس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملتا تو یقیناً ان کی نظر سے اس عبارت سے پہلے کی عبارت بھی گزرتی جس سے شیخ سعدی ہندی کے مدفن پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ نیز کتاب روائح الانفاس کے بارے میں بھی ان کی فراہم کردہ معلومات تفصیل کی محتاج ہیں۔

حسن اتفاق سے مجھے حال ہی میں "روائح الانفاس" کے تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ میرے محترم کرم فرما [illegible] نوادرات، محقق اور صوفی جناب محمد اشرف صاحب مہتمم کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد دکن کے بیش قرار کتب خانے میں موجود ہے۔ موصوف نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر اس کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ چھپنے چھپانے سے ان کے گریز اور شہرت سے ان کے نفور کی وجہ سے یہ ترجمہ بھی ان کی بہت سی قلمی کتابوں کے ذخیرے کی زینت بنا ہوا ہے۔ موصوف کی عنایت سے مجھے اصل کتاب اور اس کے ترجمے کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ذیل میں "روائح الانفاس" کا تعارف اور شیخ سعدی ہندی سے متعلق اس کی عبارتیں جناب محمد اشرف صاحب کے ترجمہ کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری کے [illegible] حضرت برہان محمد بن محمد کبیر بن الصدیقی الگجراتی معروف بہ برہان الدین راز الٰہیؒ ایک مشہور بزرگ ہیں جنہوں نے [illegible] میں وصال فرمایا۔ مزار [illegible] کے مشہور شہر برہان پور میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ آپ کے ملفوظات آپ کے ایک [illegible] حضرت [illegible] نے جمع کیا اور [illegible] حضرت [illegible] کے ایک مرید حضرت عبد الحیٔ [illegible] کے نام سے مرتب کیا [illegible] حضرت راز الٰہیؒ اور حضرت [illegible] کے [illegible] زندگی درج کئے [illegible] [illegible] حضرت راز الٰہیؒ کے [illegible] [illegible] حضرت [illegible] عبد الحیٔ کے [illegible] روائح الانفاس کے نام سے [illegible] [illegible] حضرت راز الٰہیؒ [illegible]

[illegible]

کی زندگی کے مختلف واقعات پر مشتمل ہیں۔

حضرت راز الٰہیؒ کے ملفوظات کا ایک اور مجموعہ ان کے ایک دوسرے مرید علی عسکری بن محمد تقی بن قاسم الخوافی نے "ثمرات الحیات" کے نام سے فارسی میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کا بھی ایک قلمی نسخہ جناب محمد اشرف صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے اس کا بھی موصوف نے اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ روائح الانفاس کے ترجمے کی طرح موصوف کا یہ ترجمہ بھی اب تک چھپا نہیں ہے۔

" روائح الانفاس " کے دو رائحوں میں شیخ سعدی ہندی کا ذکر آیا ہے۔ پہلی مرتبہ رائحہ نشان (۸) کے ذیل میں اور دوسری مرتبہ رائحہ نشان (۸۲) کے ذیل میں ان دونوں رائحوں کے متعلقہ حصے جناب محمد اشرف صاحب کے ترجمے اور ضروری حواشی کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔

رائحہ نشان (۸) کے ذیل میں آیا ہے:۔

روزے آں حضرت افاض اللہ علینا و علی العالمین برکاتہم تماشائے عرس شیخ سعدی سوئے سیرپور رواں شدند۔ در راہ ماندہ شدند۔ اولہ از کسے می رفت، بر و سوار شدند۔ راقم در رکاب بود۔ چوں نزدیک موضع سندہ کہرہ[1] رسیدند از عقب دیہ خواستند کہ درون دیہ آیند۔ راہ نبود و خاربندی محکم داشت و بشگافتند۔ اما بنوعی شگافی زدند کہ غیر او را نے رفتن و طاقت در آمدن نبود۔ راقم ضعیف نتوانست از راہ دیگر رسید۔

ایک دن آں جناب (یعنی راز الٰہیؒ) افاض اللہ علینا و علی العالمین برکاتہم شیخ سعدی کے عرس کے تماشے میں سیرپور کی طرف روانہ ہوگئے راستے میں تھک گئے کسی کا چھکڑا جا رہا تھا۔ اس پر سوار ہوگئے۔ راقم الحروف بھی ساتھ تھا۔ جب سندہ کہرہ گاؤں کے قریب پہنچے تو چاہا کہ گاؤں کے پیچھے سے داخل ہوں مگر راستہ نہ تھا۔ کانٹوں کی باڑہ مضبوط تھی۔ اس کو چیر کر روانہ ہوئے اور ایسا شگاف ڈالا کہ کسی دوسرے سے اس میں جانے کا حوصلہ اور آنے کی طاقت نہ تھی۔ راقم ضعیف دوسرے راستے سے پہنچا۔

رائحہ نشان (۸۲) کے ذیل میں لکھا ہے:۔

می فرمودند کہ روزے شیخ برہان الدین قدس سرہ کہ در دولت آباد مدفون است در خدمت پیر خود شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ رسید شیخ سعدی مرید شیخ برہان الدین کہ در سیرپور مدفون است، ہمراہ شیخ برہان الدین متوجہ شیخ خود گشت و شیخ سعدی باآنکہ پیر پیر روبرو بود توجہ بہ پیر خود نمود۔ این ادائے او دل نشین شیخ نظام الدین اولیاء گردید از شیخ برہان الدین پرسید کہ این جوان سعادت مند از مریدان کیست۔ گفت از خاکساران ہمیں بارگاہ است۔ شیخ نظام الدین رو۲۱ از کتف برآوردہ بہ شیخ

فرماتے تھے کہ ایک دن شیخ برہان الدین[2] قدس سرہ جو دولت آباد میں مدفون ہیں اپنے پیر شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں پہنچے تو شیخ برہان الدین کے مرید شیخ سعدی جو سیرپور میں مدفون ہیں ہمراہ تھے۔ برہان الدین اپنے پیر کی طرف متوجہ رہے اور شیخ سعدی اپنے پیر کے پیر کے روبرو ہوتے ہوئے بھی اپنے پیر کی طرف ہی متوجہ رہے۔ ان کی یہ ادا آپ کو پسند آئی۔ شیخ برہان الدین سے پوچھا کہ یہ سعادت مند جوان کس کے مریدوں سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسی بارگاہ کے خاکساروں سے ہے شیخ نظام الدین نے اپنے کندھے سے

---

[1] سیرپور کے اطراف میں کوئی تین چار میل کے فاصلے پر آج بھی ایک قصبہ سندہ کہرہ کے نام سے موجود ہے: سندہ کہرہ اسی سندہ کھیڑہ کی فارسی شکل ہے۔ سیرپور سندہ کھیڑہ کے قریب دو چار میل کوئی قصبہ ہوگا۔

[2] حضرت برہان الدین غریب حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے خلیفہ تھے۔ اپنے بڑے بھائی حضرت خواجہ منتجب الدین کے انتقال کے بعد حضرت محبوب الٰہی کے حکم پر ان کے جانشین کی حیثیت سے خلد آباد تشریف لائے۔ ۷۳۸ھ میں انتقال فرمایا۔ خلد آباد، اورنگ آباد (دکن) سے کوئی ۱۳ میل دور جانب مغرب واقع ہے اور دولت آباد سے چار میل دور۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کا مزار بھی اسی خلد آباد میں واقع ہے۔

سعدی اشارہ کرد کہ بگیر۔ شیخ سعدی گفت کہ اگر از پیر من برسد قبول کنم۔ گرفت۔ شیخ نظام الدین مدا ئے مذکور بہ شیخ برہان الدین داد تا بواسطۂ او برسد شیخ سعدی آداب خدمت بجا آورد و بسر و چشم قبول نمود ؑ

چادر ساتھ لاکر شیخ سعدی کو اشارہ کیا کہ اسے لو۔ شیخ سعدی نے عرض کیا کہ اگر یہ میرے پیر سے پہنچے تو لے سکتا ہوں۔ شیخ نظام الدین نے وہ چادر شیخ برہان الدین کو دیدیا تاکہ ان کے ذریعے شیخ سعدی کو پہنچے۔ شیخ سعدی آداب بجا لائے اور بسر و چشم اسے قبول کیا۔

ترقی اُردو بورڈ کی مرتب کردہ چند مطبوعات

مرآۃ العروس

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم   مع مقدمہ و فرہنگ

مرتبہ

جناب ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ

ناشر   ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی، لاہور،   قیمت: تین روپے

منازل السائرہ

مصنفہ علامہ راشد الخیری مرحوم   مع مقدمہ و فرہنگ

مرتبہ

جناب رازق الخیری

ناشر   جنرل پبلشنگ ہاؤس، بندر روڈ۔ کراچی   قیمت پانچ روپے

منتخب الحکایات

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم   مع مقدمہ و فرہنگ

مرتبہ

جناب شاہد احمد دہلوی

ناشر   ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور   قیمت دو روپے ۶۲ پیسے

ؑ حکیم اللہ صاحب راشد برہانپوری نے اپنی کتاب "تذکرہ اولیائے سندھ" شائع کردہ سندھی ادبی بورڈ کراچی ۱۹۵۹ء کے صفحہ ۲۷۰، ۲۷۱ پر یہ روایت نقل کی ہے جو "سواطع الانفاس" کے ایک قلمی نسخے کے صفحہ ۱۲۱ پر درج ہے۔ (ا۔ا۔ر)

شاعری ـــــ سماجی ترکہ

عبدالرؤف عروج

اس مضمون میں صرف تاریخی اشارے کئے گئے ہیں طوالت کے خوف سے میں نے چند ہی شاعروں کے کلام پر اکتفا کیا ہے۔ مجذوب اشک، گویا، سرور، مرزا علی لطف، مہربان خاں رند، غلام جیلانی جیاش، درگاہ قلی خاں ایجاد، ہوس، آزردہ، یکتا اور شیفتہ کا ذکر ناگزیر تھا بعض مجبوریوں کے باعث معذوری رہی۔ کتابی صورت میں مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی تو کوشش کروں گا کہ موضوع پوری جامعیت کے ساتھ سامنے آئے۔

عروج

انشا نے سعادت علی خاں کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے، اسی علم و فضل نے یہ گل بھی کھلا دیا کہ انشا اپنے وطن ہی میں بے وطن ہو گئے۔ دو جوان بیٹوں کی موت اور قتیل و راغب کی تعریض معمولی حادثہ نہیں تھی۔ وہ چراغِ مردہ محفل کا دھواں تو بن ہی چکے تھے۔ سعادت علی خاں نے وظیفہ سے محروم کر کے گور کنارے پہنچا دیا۔ ان کی ذہانت اور طباعی دیوانگی کے دامن میں جا چھپی اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ انشا وہاں تھے جہاں ایک بے خبری محض ہوتی ہے۔

رنگین انشا کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ ان کی صحبتوں نے انھیں سعادت علی خاں کے دربار تک پہنچایا تھا انھوں نے خواجہ سراؤں کی وہ فطرتی بھی دیکھی تھی اور کنیزوں کے مصنوعی حجرے بھی۔ انھیں لکھنؤ کے زمانۂ قیام ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کم سواد مصاحبت کتنے رنگ بدلے گی وہ لچکنے کی بجائے ٹوٹ جانا پسند کرتے تھے۔ انھوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ لکھنؤ سے باہر چلے جائیں۔

سعادت علی خاں کی بیماری جان لیوا نہیں تھی۔ وہ غسل صحت کے بعد درگاہ عباس پر حاضر ہوا تو ہزاروں مصاحبوں میں سے کسی ایک نے بھی اس کی دلجوئی نہیں کی۔ سند اور پرکاش کے تھرکتے اور ناچتے قدموں نے سامان تفریح بہم کیا تو محرموں نے عزت کی دہائی دی اور پھر جواہر علی خاں خواجہ سرا کی کور چشمی نے تاریخ اودھ کا ایک اور ناپاک ورق الٹ دیا۔

ناسخ ایک لاہوری تاجر کے بیٹے تھے۔ فیض آباد میں ان کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں۔ تنگ معاشی نے گھر سے قدم نکالا تو زمین اور بھی سخت ہو گئی۔ لکھنؤ کے رئیسوں میں نواب محمد تقی خاں، مرزا کاظم علی اور مرزا حاجی کا بڑا چرچا تھا۔ ان کو پانچ تر چھے اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں سے دلچسپی تھی۔ ناسخ کو اپنی شاعری سے کیا ہاتھ آتا، وہ وزشی جسامت کے سہارے توسل کی کوشش کی تو منہ کی کھا گئے۔ زبان کی اصلاح، مضمون آفرینی، خیال بندی، سب کو فکر معیشت نے بے معنی بنا دیا۔ ان کی شاعری صنعت لفظی کا نمونہ ہوتے ہوئے بھی تجربے اور ماحول کی آواز ہو گئی۔

ہو رنج سے دل کو دیا ہو آرام ‏ ‏ ‏ جز ذکر خدا نہیں ہے مجھ کو کام

فاقوں سے تباہ میری حالت ہے مگر ‏ ‏ ‏ آنتیں پڑھتی ہیں قل ہو اللہ مدام

روٹی ہی کا اس کو ہے تصور دن رات ‏ ‏ ‏ لگ جائے نہ کس طرح پیٹھ سے پیٹ

لکھنؤ میں دوسری مرتبہ قحط پڑا تھا عوام کا ذکر کیا، تعلقہ داروں کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ سب ہی ایک شدید اقتصادی عذاب میں مبتلا تھے۔ لکھنؤ کی یہ قحط سالی تفصیل تھی۔ ناسخ نے اس کا اجمال پیش کیا، یہ انفرادی تبصرہ نہیں، اجتماعی تقاضہ ہے۔ اس کے پیش منظر میں پورے اودھ کی معاشی ابتری کا بھیانک چہرہ نظر آتا ہے۔

غازی الدین حیدر بہادر عیب کی داستانوں کے جلو میں مسند پر آیا تھا اس کی ذات منجملہ خسرواں نہیں تھی کہ وہ خود ملکیت بھی سمجھتا اس نے آغا میر کو معتمد الدولہ بنا کر تمام اختیارات اسے سونپ دیے اور خود طوائفوں کی شعلہ پیکائی تانوں میں گم ہو گیا۔ آغا میر کی زندگی گناہوں کا پشتارا تھی۔ اس

کی شہ پر سا ہو کارہ میں ڈاکے پڑتے اور کوتوال احتجاج کے طور پر خودکشی کرتے تھے۔ اس نے ایک طرف سرکاری رقم میں خرد برد کر کے ملازموں کو تنخواہ سے محروم رکھا۔ دوسری طرف اپنے رہائشی مکانوں کی تعمیر کے لیے دولت پور کی بستیاں اجاڑ دیں۔ یہ ناسخ کی بدنصیبی تھی کہ وہ اس لوٹ کھسوٹ میں صرف سو روپے پاتے رہے۔ میر نے تین سو روپے پاکر بھی افلاس کی زندگی گذاری تھی۔ ناسخ کا سو روپوں میں کیا بھلا ہوتا۔

آغا میر کے مظالم کی داستان بڑی طویل ہے۔ نصیر الدین حیدر کے نطفہ نا تحقیق ہونے کا افسانہ دربار سے نکل کر ریزیڈینٹ تک پہنچا تو عوام نے ندامت سے گردنیں جھکا لیں۔ آغا میر نے لٹیروں، بدمعاشوں، رقاصوں، مسخروں، بانکوں، ترچھوں، فراشوں اور خاکروبوں کو گردوں نکاب کر دیا۔ نجیبوں، وضیعوں اور شریفوں پر ایک قیامت گذر گئی۔ ہر لبھے کی پیٹھ پر اطلس کا جھول نام نہاد عدل و انصاف کا سرا پردہ بن گیا۔

نصیر الدین حیدر کا اقبال چمکا تو آغا میر نے پہلی مرتبہ اپنے جسم میں خوف اور دہشت کی لہر محسوس کی۔ ضمیر کا کانٹا خلش بن گیا اور پھر گرفتاری سے لیکر جلاوطنی تک ہر صعوبت اور ہر اذیت اس کے دل و دماغ کو ڈستی رہی اور وہ خود محسوس کرتا رہا "آج اس گھر کا سنیچر اترا"۔ آغا میر کی جلاوطنی واقعی اس گھر کا سنیچر اترنے کے مترادف تھی۔ میر فرو کی وہ تاریخ بڑی عجیب ہے جس میں اس نے اسے مہ کہن سالہ بنا کر محاق قدم سے نکالا ہے؛

حسد سے چرخ جفاجو کے مثل یوسف وہ　　　فریب و مکر زمانہ میں پڑ گیا ناگہ
سر دش غیب سے آئی صدا کہ سال خلاص　　　محاق قدم سے نکلا وہ مہ کہن سالہ

محمد حسین آزاد کی یہ روایت غلط ہے کہ ناسخ نے غازی الدین حیدر کے دربار میں قصیدہ پڑھنے اور ملک الشعراء کا خطاب قبول کرنے سے انکار کر کے جلاوطنی مول لی تھی۔ آغا میر کا زوال ان کا بھی زوال تھا۔ مرزا مہدی، میر افضل علی سب ہی آغا میر کے سیاسی حریف تھے۔ ان میں کسی ایک سے بھی ناسخ کو سرپرستی کی امید نہیں تھی۔ وہ لکھنؤ میں رہ کر بھوکے مرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ محض جبر تھا کہ اس نے ان کو کانپور میں لا پھینکا اور وہ ہر پھر کر الہ آباد کے دائرہ ہی میں قدم رکھنے پر مجبور ہوئے۔

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم　　　آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں
ناسخ وطن میں دیکھئے دیکھیں گے گھر کو کب　　　غربت میں مدتوں سے ہے اپنا مکاں سرا
سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ　　　شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

کانپور کو انگریزوں نے اودھ کا فوجی مرکز بنا رکھا تھا۔ اس میں ادب و شعر کی نشوونما ناممکن تھی۔ ٹاپو کا نظارہ کرنے والے فوجی افسر ادب کے نام پر کانوں میں انگلیاں دھرتے تھے۔ ان کو تفریح کی ضرورت تھی لیکن ایسی تفریح نہیں جس میں گرہ سے کچھ جاتا بھی ہو۔ ناسخ کی زندگی ان کے دیوان اول کی طرح ستائش سے محروم تھی۔ وہ اپنے روز و شب کے ہر لمحہ پر لکھنؤ کو یاد کرتے رہے؛

مرے دم سے تھا بوستاں لکھنؤ　　　مگر ہو گیا اب خزاں لکھنؤ
نہ دیکھا خزاں سے یہ خالی چمن　　　ہوا کیا تباہ ناگہاں لکھنؤ
میں حزیں آزردۂ غربت جو ہوں　　　اندلوں بیت الحزن ہے لکھنؤ
دشت غربت میں نظر آتی ہے جب ہماں سرا　　　یاد آتی ہے مجھے عشرت سرائے لکھنؤ
ہوا ابھی سرمۂ کوری شتاب　　　چشم اعدا میں غبار لکھنؤ
دیکھیں کیوں کر دھوپ میں جلتے ہیں　　　نونہال سایہ دار لکھنؤ

نصیر الدین حیدر رقص کا دلدادہ تھا۔ ہر طوائف اس کی آغوش میں جوان ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس نے اپنی محل سرا کو پانچ طوائفوں کی چھاؤنی بنا رکھا تھا۔ سعادت علی خاں کی ہنڈی پائی پائی دھنیا مہری اور ڈلاری مہری جیسی بدقماش عورتوں پر صرف کر دی تھی۔ فقیر محمد خاں گویا ان بدمعاش عورتوں کی بدولت

جلا وطن کئے گئے تو محمود خاں آفریدی کی دلیری اور شجاعت کو پسینہ آگیا۔

آتش خواجہ زادہ تھے۔ صفائی قلب اور پاکیزگی نفس کا سوتا ان کے گھر سے پھوٹا تھا۔ محمد تقی خاں ترقی کی معیت میں فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے تو انشا کا مال سامنے آگیا۔ قدموں سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ دربار کی بے تعلقی نے مفلس رکھا۔ ایک چھپر ایک چٹائی اور ایک لنگی میں اپنی زندگی کے ستر سال گذار دئے لیکن اپنے ہاتھوں کو کشکول نہیں کیا۔ نصیر الدین حیدر کی حکومت کے دس سال رعایا پر شہاب ثاقب بن کر ٹوٹے۔ دلیلوں کی گرہ میں مال نہیں تھا کہ وہ اہل کمال کے دام لگاتے۔ کبھی کسی احتیاج نے کروٹ لی تو آتش نے یہ کہہ کر اس کا گلا دبادیا:

ملا جو اس کو سمجھے منّ و سلویٰ — توکل پر رہا شام و سحر خرچ
ہوا ہے لقمہ میرے بہن کا نصیب غیر — کم بختی نے کیا ہے سفال گدا مجھے
نہ بوریا بھی میسر ہوا بچھانے کو — ہمیشہ خواب ہی دیکھا کیا چھپر کھٹ کا
آتش یہی دعا ہو خدائے کریم سے — محتاج اے کریم نہ کیجو ذلیل کا

نصیر الدین حیدر کی حد سے بڑھی ہوئی عیاشی نے اسے اس قابل نہیں رکھا تھا کہ اس کی اولاد بھی ہو۔ اس نے قدسیہ محل کو مجبور کیا کہ وہ کسی اور کا لطفہ لے آئے۔ ان گنا مہینہ خیریت سے بھی نہیں گزرا تھا کہ برہان الملک اور اس کے خاندان کی عزت سر عام رسوا ہوگئی۔ قدسیہ محل نے زہر کھالیا تو محتشم خانی جیسے مورخ کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔

کیا گردش فلک نے صدمہ دیا ہے عظم — عالم نے جس کے غم میں پہنا لباس ماتم
بیتاب و بیقراری ، باگریہ آہ و زاری — ہر اک کو میں نے پایا اس دن بچشم پرنم

نصیر الدین حیدر نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا تھا۔ انگریزوں کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی سعادت علی خاں کے بھائی محمد علی کو تخت پر لے آئی وہ اپنی پیرانہ سالی کے باعث قبر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس میں حکومت کی اہلیت نہیں تھی۔ اس نے آغا میر کو کانپور سے بلا کر نیابت دی تو پھر سے اودھ میں کہرام پڑ گیا۔ آغا میر کی نیابت کے پیچھے انگریزوں کی طاقت کام کر رہی تھی۔ اس لئے عوام نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اسے برداشت کرلیا۔

اسی زمانے میں غالب کی پنشن نے قضیہ کی صورت اختیار کی۔ انھوں نے انگریزوں کی خدمت میں عرضیاں بھیجیں، حکام کو خوش کرنے کے منصوبے باندھے "جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید" کی خواہش نے کلکتہ پہنچایا۔ معتمد الدولہ آغا میر کی کشش لکھنؤ بھی لے آئی۔ مدح میں ایک قطعہ لکھا:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوس سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید — جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

لکھنؤ میں کس کی قدر ہوتی تھی۔ سب ہی ناقدری کا شکار تھے۔ غالب کو بھی اسی مرحلہ سے گذرنا پڑا۔ ان کی شاعری میں ہوش مندی بھی تھی اور دنیاداری بھی۔ جب انھیں آغا میر سے ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید نہیں رہی ——— تو انھوں نے اس کی مدح والے شعروں کی صورت بدل دی اور اس طرح یہ افسانے باطل ہوگئے کہ لکھنؤ دلی کے اہل کمال کا بھی سرپرست تھا۔

مرزا خانی نوازش مصحفی کے شاگرد تھے۔ مصحفی نے اپنی شاعری سے کیا فائدہ اٹھایا تھا، لکھنؤ والوں نے ان کی کتنی قدر و منزلت کی تھی، یہ سب واقعات ان کے سامنے تھے۔ نسلوں کی بگڑی ہوئی عادتوں نے ہر دربار کو افترا ساز بنا دیا تھا۔ محمد علی کے دربار میں اہل کمال کی بجائے صرف [illegible] جمع ہوگئے تھے۔ یہ بات مبالغہ نہیں سے نوازش کے اس شعر میں دیکھئے ——— شاید آپ سیر توں کی رسوائی کا صحیح اندازہ کرسکیں:

ناظمانِ حال سرگرم افترا سازی کے ہیں — ہے سنا کہنے ہی کے قابل ان کے دربار کی دھوم

لکھنؤ کا ہر صاحبِ کمال مردہ بدست زندہ تھا۔ نوازش کی تنگ معاشی نے بہت پہلے لکھنؤ سے اپنا بستر اٹھا لیا تھا۔ کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھے کہ محمد علی کی سرکار سے گنگا پار کا فرمان آپہونچا، یہ جلا وطنی کسی عشق پیشگی کا نتیجہ نہیں تھی، نوازش نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اصل محرکات کو چھپا دیا ہے۔ اس کے باوجود دیکھنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

لکھنؤ سے تھا ہوا حکم اس پہ گنگا پار کا　　یاں بھی اک بت سے بھر آیا مگر دل نے انخلا

زندگی بھر کا اندوختہ نذرِ غربت ہو گیا تو وہ زمینوں کی خرید و فروخت سے کام چلاتے رہے۔ لیکن لکھنؤ کی مطمئن زندگی ہر کر دو لمحے ان کو یاد آتی اور تڑپاتی رہی:

کیا پری لوگ تھے ہم ان سے جدا ہائے ہوئے　　لکھنؤ کی نہ دلا یاد نوازش ہم کو
آباد یہ دعا ہے سدا لکھنؤ رہے　　یارانِ چند اپنے نوازش وہاں پہ ہیں

اگر پدر نتواند پسر تمام کند" یہ کہاوت کسی پر صادق آتی ہو یا نہ ہو محمد علی کے بیٹے امجد علی پر اس کا ضرور اطلاق ہوتا ہے۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی مذہب پرستی ہر اتفاق کو امرِ غیبی سمجھتی رہی۔ ہر کام میں استخارہ اس کے قوائے عمل کو ناکارہ کر گیا۔ اس نے شاعروں کی تنخواہیں بند کیں تو لکھنؤ میں مرثیہ خواں باقی رہ گئے یا تعزیہ بنانے والے۔ صاحبانِ علم نے دوسرے شہروں کی راہ لی تو لکھنؤ ذہینوں سے خالی ہو گیا۔ اسی سیاسی اور سماجی انتشار میں مبارک ہو شاہانہ تاج کے زمزمے گونجے تو عوام نے واجد علی شاہ کو تخت پر پایا۔

واجد علی شاہ اور لہو و لعب ہم معنے تھے۔ اس نے عورتوں کی گود میں آنکھ کھولی۔ بوڑھی اور جوان کنیزوں نے اس کے لڑکپن کے اجلے ورق داغدار کر دئے تھے۔ تخت پر بیٹھا تو عورتوں کی بھی فوج بنا ڈالی، بانکا، ترچھا، گھنگھور، نادری اور اختری عورتوں کے رسالے تھے۔ ہر خوبصورت عورت متعہ کے نام پر اس کی ہوس گاہ پر قربان ہوتی رہی۔ اس کا وزیر علی نقی خاں خود ارباب نشاط سے تھا۔ اس کی بیٹی اختر محل ممتوعہ ہونے کے باوجود گاتی بجاتی اور ناچتی تھی۔ ممتوعات کی تعداد میں اضافہ ہوا تو عورتوں کے طائفہ سیکڑوں تک پہنچ گئے۔ رادھا منزل والیاں، لٹکن والیاں، نتھ والیاں، گھونگھٹ والیاں، رہس والیاں، نقل والیاں اور اچھوتیاں، یہ فہرست نامکمل ہونے کے باوجود فحاشی اور عریانی کا مکمل دفتر ہے۔ اس کی موجودگی نے امرا اور حکام میں تعیش کے جذبہ کو اتنا فروغ کر دیا کہ ہر اخلاقی قدر گالی ہو گئی۔ اپنے تقدس اور بزرگی کی دہائی دینے والے امیر مینائی کو بھی قیصر باغ، سایۂ بال ہما، نظر آنے لگا اور پھر عصمتیں لٹنے اور بکنے لگیں تو ان کی نظموں میں چاند سے رخساروں کے آئینہ چمک اٹھے۔

قاضی میر ہاشم علی، عاشور علی خاں کے شاگرد تھے، امجد علی نے ان کو آبکاری کے محکمہ میں مقرر کیا تھا۔ قیصر باغ سے اچانک گرفتاری کا حکم جاری ہوا تو ان کے ذہن نے زلزلے کے متعدد جھٹکے محسوس کئے۔ خاندانی وجاہت اور خودداری نے اس ذلت کو گوارا نہیں کیا کہ لکھنؤ کے منصب دار ہو کر لکھنؤ ہی میں پابہ زنجیر ہوں۔ شہر کے ناکہ پر سپاہی کو رشوت دیکر راتوں رات دلی اور پھر بریلی کی راہ لی۔ ان کی شاعری میں ان حالات کی وضاحت نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہمارے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم انکے ان شعروں کو ان ہی حالات کا اظہار نہ سمجھیں:

کسی کسی کی ہے یاد صورت خیال ہے کچھ کہیں کہیں کا　　کہاں وہ اہلِ وطن کی صورت، وطن کو چھوڑے ہوئی ہے مدت
رزاق رزقِ خلق کیا آسیا کے ساتھ　　گردشِ عبث ہے کنجِ قناعت میں بیٹھ رہ

آغا مہر، آغا میر کا لڑکا تھا۔ اس نے ناسخ کی صحبتوں میں لکھنؤ کے ادبی معرکے دیکھے تھے وہ کاشور میں واجد علی شاہ کی ہنر پروری اور علم دوستی کی داستانیں بڑے غور سے سن رہا تھا اسے واجد علی شاہ سے اپنے آبائی منصب کی توقع تھی۔ وہ اپنی تمام تر ذہانت اور طباعی کے باوجود علی نقی خاں کی ہیرا پھیری کے آگے شکست کھا گیا اور پھر لکھنؤ کے دروازہ ہمیشہ کے لئے اس پر بند کر دئے گئے اور اس کی یہ حسرت بھی پوری نہ ہو سکی:

غیر سے فائدہ یارانِ وطن مل جائیں　　خارِ تلک کے گل خندانِ وطن مل جائیں

دشت پیمائی غربت سے یہی مطلب ہے	کوچہ ہائے چمنستانِ وطن مل جائیں
داغ جلتے ہیں غریب الوطنی کے مٹ جائیں	مہر سے وہ مہِ تابانِ وطن مل جائیں

اور ایک غزل کے چند شعر دیکھئے :۔

کم نہیں نصف زمانہ سے فضائے لکھنؤ	کوچہ ہائے اصفہاں ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ
جب کنارِ گنگ آتی ہے کبھی ٹھنڈی ہوا	یاد آتی ہے مجھے آب و ہوائے لکھنؤ
صورتِ طوبیٰ شجر ہیں حوریں ہیں بھٹیاریاں	ہر سرائے خلد گویا ہر سرائے لکھنؤ
آرزو ہے تجھ سے اے غفراں ردائے کائنات	قہر پر ہوں مہرباں فرماں روائے لکھنؤ

ہنومان گڑھی کا واقعہ واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت کا سیاہ ترین باب ہے۔ ہندوؤں نے بابری مسجد کو شہید کر کے مندر میں بدل دیا تو پورے اودھ میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ علی نقی خاں ہنگامہ فرو کرنے کی بجائے ہندوؤں کا ہم نوا بن گیا تو سلطان العلماء سید محمد نے یہ فتویٰ دے دیا کہ "قصاص مسلماناں از کافراں و قصاص کلام اللہ و بنا نہادن مسجد بر حکام وقت بہ تجویز حاکم شرع واجب است" تاریخِ اسلام میں یہ پہلا فیصلہ تھا جس میں ایک شیعہ مجتہد نے بغیر امام جہاد کو واجب کر کے تمام مسلمانانِ ہند کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی۔

حدیقۃ الشہداء کا مؤلف اس کارزار کا تماشائی تھا۔ سیکڑوں مسلمان اس کی آنکھوں کے سامنے حکام کے ہاتھوں موت کا نشانہ بنے تھے۔ امیرِ شریعت مولانا امیر علی کی شہادت پر اس نے ماتم کیا تھا۔ بابری مسجد میں اٹھارہ، ہنومان گڑھی میں تین سو اور رودولی میں چھ سو مسلمانوں کا قتل معمولی بات نہیں تھی۔ اور اس کے قلم سے اشکِ غم ٹپکا تو پتھر جیسے انسان پگھل کر موم ہو گئے۔ ایک مسلمان حکومت میں خالص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کی اس قدر بے دردی سے خوں ریزی بجائے خود شہر آشوب تھی :۔

حکام کافروں کی خوشامد سے کہتے ہیں	کیا خوش نما شوالہ یہ بندہ نواز ہے
کس طرح سے اودھ میں ہو بانگِ اذاں بلند	حاکم کو بت پرستوں سے راز و نیاز ہے
اختر نگر میں گاؤکشی کیوں نہ بند ہو	گوسالہ پوجتا ہے جو بینشِ نماز ہے
سب کو تلاشِ زر ہے جو ہیں اہلِ کار یاں	چاندی کی جوتی کھاتے ہیں یہ حرص و آز ہے
ہندو کھلے خزانہ تعلی کی لیتے ہیں	حاصل بہ زورِ زر یہ انھیں امتیاز ہے
واں کربلا میں خیمہ جلائے کیا غرور	یاں اب کلام حق کے جلانے پہ ناز ہے
بھٹکے ہوئے ہیں چھوڑ کے دیں کی راہِ راست	متھرا کو سب سمجھتے ہیں مکہ حجاز ہے

ہنومان گڑھی کا واقعہ چراغ زیرِ دامن تھا۔ اس کی لو بھڑکی تو ایک لکھنؤ ہی کیا، کانپور، فرخ آباد، مراد آباد، بدایوں، بریلی، شاہجہاں پور سب ہی شعلہ برسانے لگے۔ واجد علی شاہ کے حکام اور عمال کا اخلاق کوڑھی اور حمیت اپاہج تھی۔ اس نے مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی موقف کو تباہ کر کے اپنی موت کے محضر پر دستخط کر دئے تھے۔ فیض احمد بدایونی نے اپنے زمانۂ قیام لکھنؤ میں اس مرقع اور نیم جاں نظم و نسق کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ خود ان کی اپنی علمائی حیثیت اودھ میں کیا تھی ان ہی کی زبانی سنئے :۔

نہ طوطیِ شکرستاں ہوں میں نہ بلبلِ زار	نہ شمعِ بزم ہوں میں اور نہ مرغِ آتش خوار
ہوں پائمال پریشاں و بال جاں ہوں سیت	نہیں ہوں میں کسی کا فر کا [illegible]
ستم ہے گر کوئی مریخ کو کہے جلاد	کہ میرے حق میں تو زہرہ بھی [illegible]

ہوں غم نصیب یہاں تک کہ اب مجھے سال ہوا   ہلال عید مرے حق میں مغربی تلوار
جو بھاگوں میں جگر خستہ تو کدھر بھاگوں   کہ سنگ حادثہ کی ہر طرف سے ہو بوچھار
یہ چرخ فتنہ دکھاتا ہے سبز باغ مجھے   جو بہر زخم ہو درکار مرہم زنگار
ہجوم رنج و الم سے یہ حال ہے میرا   کہ جیسے قبر منافق ہو تیرہ و شب تار
وہ کون ہے کہ جگہ میری اس کے دل میں ہو   وہ کون شخص ہے جسکو نہیں ہے مجھ سے عار
حرم سے مجھ کو مسلمان منع کرتے ہیں   تو جانے دیر کو دیتے نہیں مجھے کفار
زمین پاؤں کے نیچے سے نکلی جاتی ہے   نہیں ہے میری دعا کو بھی آسماں پہ قرار

واجد علی شاہ کی خواہش تھی کہ انگریز اودھ کے داخلی معاملات میں دخل نہ دیں۔ انگریزوں نے آنکھ دکھائی تو وہ اپنے آبا و اجداد کی طرح انکا سعادتمند بن گیا۔ یہ سعادتمندی شاخ آہو پر برات عاشقاں نکلی۔ دوستی اور وفاداری کے وعدے ذراسی جنبش میں شیشہ کے برتن کی طرح ٹوٹ کر پاش پاش ہو گئے۔ ادھر اوٹرم نے الحاق اودھ کا معاہدہ اس کے آگے بڑھایا، ادھر ضبطی اودھ کے اشتہار تمام تھانوں پر مشتہر ہو گئے۔ واجد علی شاہ کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ اس کے بزرگوں کی حکومت اتنی آسانی سے اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس نے استرداد کے لئے انگلستان جانے کا منصوبہ بنایا تو سہل انگاری نے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ کلکتہ میں ایک نیا پری خانہ بنا کر مطمئن ہو گیا۔

واجد علی شاہ میں برائیاں ضرور تھیں وہ لہو و لعب میں ڈوبا ہوا یقیناً تھا اس کے باوجود اس کے دربار سے سترہ سو اہل قلم، پانچ سو طبیب اور پندرہ سو چوبدار تنخواہ پاتے تھے۔ سیکڑوں شاہدان بازاری زیر پرورش تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے وداع لکھنؤ کے وقت عورتوں نے سر پر خاک ڈالی، بچے بلک بلک کر رو پڑے، بوڑھوں اور جوانوں نے دیواروں سے سر پھوڑ لیا۔ ادھر اس کی زبان سے نکلا:۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں   خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

ادھر ارباب نشاط نے جدائی کے بول اور ہجر کے دوہرے مرتب کر دئے، شاعروں نے فراقیہ غزلیں اور نظمیں لکھیں، ہر گھر سے ایک ہی آواز سنائی دینے لگی:

واجد علی شاہ پیارا کلکتہ سے سدھارا
سونی پڑی ہیں سڑکیں ویراں گلی گلی ہے

واجد علی شاہ نے ارشد علی خاں قلق کو آفتاب الدولہ بنا دیا تھا۔ وہ ایک قادر الکلام ہونے کے باوجود خود کو واجد علی شاہ کا شاگرد کہتے تھے۔ واجد علی شاہ نے لکھنؤ چھوڑا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا پھیل گیا۔ اس اندھیرے میں ان کی اپنی زندگی کی روشنی گم ہو چکی تھی ان کے دل سے دعا نکلی جو ہر سننے والا تصویر حیرت بنکر رہ گیا:

دل خراش ایسی الہیٰ کوئی روداد نہ ہو   اس طرح گھر کسی دشمن کا بھی برباد نہ ہو
[illegible] ایسا سپہر ستم ایجاد نہ ہو   کسی بے جرم پہ دنیا میں یہ بیداد نہ ہو
ایسی سرکار کسی کی نہ لٹے دنیا میں   یوں وطن سے کوئی اپنے نہ چھٹے دنیا میں

امراؤ [illegible] - واجد علی شاہ نے اسے مہک پری اور پھر حضرت محل بنا دیا اس کے لڑکے برجیس قدر کی گیارھویں سالگرہ بہار اودھ نے [illegible] کو کس [illegible] حضرت محل اور بھی برجیس قدر دونوں اودھ کی انقلابی جدوجہد کا مرکز بن جائیں گے۔ [illegible] اور مملکت سے [illegible] محل [illegible] اور دشمنوں کی [illegible] کو کسی حصہ [illegible] نہیں کر سکی۔ اور اس کی تخت نشینی کے پیچھے [illegible] کام کر رہے تھے۔ احمد حسین خاں نے تحریک کی تو شہاب الدین نے [illegible] اس [illegible]

بادشاہت کا اعلان کردیا۔ لوگوں کے پاس روپیہ تھا نہ اثاثہ سب بے روزگاری کے ہاتھوں شدید اقتصادی بحران میں مبتلا تھے حضرت محل نے اپنے مکان کا اسباب فروخت کرکے برجیس قدر کا سکہ مضروب کردیا تو زمینداروں اور تعلقہ داروں کی بڑی تعداد بھی انقلابی جدوجہد میں شامل ہوگئی۔ ادھر اودھ میں بغاوت کے شعلے بھڑکے تو ادھر واجد علی شاہ پر بھی آفت آئی۔ اس کے پاس فوج تھی نہ سپاہی۔ اس کے باوجود انگریزوں نے خوف زدہ ہوکر اسے فورٹ ولیم میں بے قصور قید کردیا۔ اس ابتلا کا دور ختم ہوا تو اس کی وہ مثنوی بھی مکمل ہوگئی جو اس کی حیات زندان کا ایک مہیب ورق تھا۔ اس میں اس نے رفیقان گریز پا کا شکوہ، ممنون کرم لوگوں کی شکایت، جاں نثاروں کی بے وفائی، عزیزوں کی کور چشمی، ملازموں کی نمک حرامی، مصاحبوں کی غداری، احباب کی خود غرضی اور اپنی قید کے مصائب سب بے کم وکاست بیان کئے ہیں:

سوا اپنے سائے کے کوئی نہیں — ہوا بھی نہیں رو د تن کے قریں
ہوا تک نہیں قید خانے میں آہ — ہوا بے گنہ قید میں بادشاہ
کسی کی محبت کو پایا نہ ٹھیک — محبت کو دیکھا ہے ابر رکیک
عجب ہے یہ نیرنگ نیلے دوں — زبوں ہے زبوں ہے زبوں ہے
نقط نام شاہی سے ہوں میں خراب — کہاں میں کہاں قید کیسا عذاب
دل زار ہونٹوں پہ آ آ گیا — میں گھبرا گیا سخت گھبرا گیا
الٰہی مجھے قید سے دے نجات — نکلتی نہیں غم سے اب منہ سے بات
بس اب الحذر الحذر اے خدا — کر اس اختر زار کو تو رہا

اودھ کے عوام نے انگریزی اقتدار ختم کرنے کے لئے جان کی بازی لگائی۔ گردنیں کٹائیں، مال واسباب نیلام کیا۔ انگریزوں کے خلاف خود کو برسر جہاد کرتے رہے، دار ورسن کا افسانہ پارینہ زندہ ہوا تو بہادری عقیدت اور مذہب بن گئی۔ بدخواہوں کی سازباز سے انگریز غالب آگئے تو حضرت محل کی قیادت اور برجیس قدر کی حکومت شعلہ مستعجل ہوگئی۔ اور برجیس قدر یہ کہنے کے لئے حضرت محل کے ساتھ نیپال چلا گیا:

ہے شکر کردگار عقوبات سے بچے — قدرت نے کردیا مجھے تاج ونگیں سے دور

اودھ کی تباہی تاریخ کا دلخراش حادثہ تھی۔ انگریز ہاتھیوں پر بیٹھے اہل شہر پر گولیاں برساتے رہے۔ آصف الدولہ کی بنائی ہوئی عمارتیں گرتی رہیں تعزیہ خانوں اور امام باڑوں سے دھواں اٹھتا رہا۔ واجد علی شاہ کی کروڑوں اور لاکھوں کی جائداد ہزاروں اور سیکڑوں میں نیلام ہوگئی۔ مہاراجہ کپور تھلہ نے لاکھوں کا مال کوڑیوں پر خرید اور عباس کی درگاہ بھی نہیں بچا سکی۔ اودھ کی تباہی کے فسانے امیر مینائی نے سنے نہیں دیکھے تھے۔ ان کے پاس ایک مکان کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے بھی انگریزوں نے منہدم کردیا تو سر چھپانے کا آسرا بھی نہیں رہا۔ یہ خانہ ویرانی ان کے نقطۂ نگاہ سے بڑی اہم تھی وہ کس سے فریاد کرتے کہاں جاتے۔ ایک بے بسی تھی تو وہ بھی چیخ بن کر رہ گئی:

گھر کھدنے کی نہ پوچھو نہ مصیبت ہم سے — روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے ہیں گھر سے رخصت ہوکر — یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

اودھ کی ہی تباہی کی صورت کشی امیر کی غزلوں کے بعض شعروں میں دیکھئے۔ ان شعروں کی موجودگی میں غالباً کسی کو ان سے یہ شکایت نہیں ہوگی کہ وہ داغ کی معاملہ بند شاعری کے بھونڈے نقال تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ امیر نے غزلوں میں جو کچھ دیکھا اسی کو لکھ کے رکھ دیا:

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے — زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
الٰہی رے انقلاب جہان پلید کا — خون حسین غازہ ہے عارض یزید کا

بگولے اب نہیں غربت میں گرد شاہاں پر   سر دلبر پر چتر جلو میں کبھی سپاہیں تھیں
نکلے کٹیں گے نہ یوں پینترے بدل کے چلو   چلے گی تیغ سپرہ ذرا سنبھل کے چلو
ظلم سادگی بھی چند روزہ ہے ایک دن انتقام کا بھی   امیر حمام گرم کریں فقیر کا جھونپڑا جلا کر

انگریزوں نے الحاق اودھ کے وقت عوام کو بڑے بڑے سبز باغ دکھائے تھے مذہبی قوانین کا انکشاف ہوا تو ان کی شاطرانہ ذہنیت کھل گئی۔ ایک طرف زمیندار اور تعلقہ دار مفلس ہو گئے۔ دوسری طرف کاشتکاروں نے بھی بے آب رنگی کی شکایت کی۔ دفعہ ایک سو چوالیس کے نفاذ نے ہر تقاضے اور ہر مطالبہ کو خاموش کر دیا۔ میر امان علی سحر نے منور الدولہ کی مدح لکھی تو انھیں لکھنؤ کی تباہی اور پھر انگریزوں کے عیارانہ آئین بھی یاد آ گئے:

عجیب مجمع اہل کمال تھا افسوس   ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا
جہاں میں صاحب جوہر کی ہے یہ بے قدری   ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا
کسی کا گھر گیا پشتہ کہیں گری دیوار   چبوترہ کہیں غائب کسی کا دروازا
جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی   وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہچانا
یہ حکم ہے کہ نہ ہوں چار ایک جا باہم   وہ دن گئے کہ شب و روز رہتا تھا جلسا

اودھ کا الحاق ایک کلچر، ایک معاشرت اور ایک تہذیب کی تباہی تھا۔ اسی کوکھ سے فنون لطیفہ بھی جنم لیتے رہے اور جنسی آوارگی بھی۔ یہی فنون لطیفہ اور یہی جنسی آوارگی، بعض حالات میں فراغت حال کا اظہار بھی رہی ہے اور عوام کا ایک بہت بڑا گروہ رقص و سرود محض سے نان و نمک پاتا رہا ہو۔ وحید الہ آبادی نے لکھنؤ کو چمن کہہ کر پوری رعایتیں سامنے رکھ دی ہیں۔ یہ خصوصیت کسی اور شہر آشوب میں مشکل ہی سے ملے گی:

لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہو گیا   جلوۂ شمع شبستان چمن کیا ہو گیا
اے صبا نشو و نمائے غنچہ و گل کیا ہوئی   آب و رنگِ خوبرویان چمن کیا ہو گیا
تختہ ہائے ارغوان و لالہ و گل کیا ہوئے   کشورِ آباد سلطانِ چمن کیا ہو گیا
جس کو دیکھو بے اجازت ہی وہ رکھتا ہو قدم   اہتمام اہلکارانِ چمن کیا ہو گیا
پھیر دی کس سمت رہوارِ عزیمت کی عناں   وہ ہجوم نے سواران چمن کیا ہو گیا
کون سے ناواقفوں نے کاٹ ڈالا سر فکر   مصرعۂ موزونِ دیوان چمن کیا ہو گیا

دبیر کے کلام کی اس سے بڑھ کر اور معراج کیا ہو گی کہ خود واجد علی شاہ ان کی چتر برداری کی خدمت انجام دیتا تھا۔ وہ لکھنؤ سے کیا گیا تعزیہ خانوں اور امام باڑوں کی رونق چلی گئی، ضریح اور قبہ دھواں دینے لگے۔ لکھنؤ دبیر کے لئے جنت تھا یہی جنت مار دکثردم کا ٹھکانہ بن گئی تو اہل کمال غیرت سے ڈوب گئے۔ عیش عقرب نیش زندگی کا علاج [illegible] تھی۔ اس کے باوجود دبیر لکھنؤ کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں بچپن اور جوانی گزر گئی تھی وہاں بڑھاپا بھی بیت جائے، ان کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ دل پر جبر کر کے گھر سے باہر قدم نکالا اور عظیم آباد میں امام باندی کی مجلس میں یہ رباعی پڑھی تو سننے والے دہشت سے کانپ اٹھے۔ یہ رباعی نہیں، لکھنؤ کی تباہی اور دبیر کی بے بسی کا مکمل مرقع ہے۔ اس بہانہ امام مظلوم کے ساتھ لوگوں نے انھیں بھی پرسہ دیا تو اجر کم اللہ تعالیٰ کی دل خراش آواز نے رقت اور [illegible] کا ایک عجیب منظر پیش کر دیا:

[illegible] کبھی نہ بوستاں سے نکلے   اس دور میں جور آسماں سے نکلے
[illegible] شہر لکھنؤ تھا جنت   آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

[illegible] انھیں جذبات کا اظہار کر کے بڑی بے بسی تصویر کر دی ہے:

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا — قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل — پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

فقر و فاقہ کا قرینہ انیس کی زندگی تھا۔ ان کے پاس دولت تھی نہ وجاہت۔ رہ گیا ایک خاندانی غرور تو اس کو بھی کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ اپنے نسب ناموں اور شجروں کو صحیفوں کی طرح آنکھوں سے لگانے والے در در خاک اڑا رہے تھے۔ باپ مداح کا مداح تھا۔ دادا مداح اعلیٰ تھے۔ انیس نے غیر کی مدح کر کے اپنی جوانی نہیں کھوئی تھی اور زمین شعر کو آسمان کر دیا تھا۔ جو لوگ ان کی چلمیں بھرتے، حقہ تازہ کرتے اور جوتیاں اٹھاتے تھے ان سب کو زمانے کی نظر کھا گئی تھی۔ وہ اپنے مرثیوں میں لکھنؤ کی تباہی اور بربادی کے منظر اس سادگی اور برجستگی سے پیش کر رہے تھے کہ ان کا سامع ایک ایک شعر پر چونک اٹھتا تھا۔

لکھنؤ میں کون قدردان تھا کس کو اپنے کمال کے جوہر دکھلاتے۔ حالات کی ستم ظریفی نے ان کو اس منزل پر پہنچا دیا تھا کہ وہ شمع سحری بن کر رہ گئے تھے۔ یہی شمع سحری دکن پہونچ کر سالار جنگ کی ایک مجلس میں بھڑک اٹھی تو اس کے شعلہ کو ان دور افتادہ لوگوں نے بھی اپنے دلمیں دہکتا ہوا محسوس کیا۔

جب فوج غنیم ملک برباد کرے — کیونکر دل غم زدہ نہ فریاد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم — اُجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

یک بیک ایسا زمانے میں ہوا ہے انقلاب — قدرداں سب اُٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے
الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا ایک طبقہ — انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

اور ادھر دلی میں نجف خاں الہ آباد کے صوبہ دار محمد قلی خاں کا ملازم تھا۔ اس کے دن بدلے تو اسے قسمت شاہ عالم کے ساتھ دلی لے آئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے امیر الامرا ہو گیا۔ جب سکھوں اور جاٹوں کے قتل سے اس کی سیری نہیں ہوئی تو اس نے مسلمانوں کو اپنا تختۂ مشق بنایا۔ علما، صلحا، فقرا اور شعرا بھی اسکے دست ستم سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ مرزا مظہر نے دلی کے ہر تغیر اور تبدل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کے سامنے دلی بار بار لٹی اور آباد ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ "اس شہر میں جب سے نجف خاں آیا ہے بادشاہ سے لیکر غریب تک سب تباہ ہیں"

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

مرزا مظہر کے اس شعر میں کنایہ محض و اشارۂ عام سہی، اس کے باوجود ان کا مدعا شاعروں کے کسی فرضی قاتل سے نہیں تھا۔ غزل کے علائم و رموز پر غور کریں تو اس شعر کے پس منظر میں ہمیں نجف خاں ہی کی تصویر نظر آئے گی۔ مرزا مظہر نے اپنے بیشتر خطوط میں نجف خاں کی امیر الامرائی پر طنز کیا ہے وہ پر اسرار طریقے پر قتل کر دئے گئے تو ان کے مریدوں نے حقیقی قاتل کو پہچان لیا۔ مظہر کی موت ذاتی عناد کا مسئلہ نہیں، سیاسی معاملہ تھی، چنانچہ مقامات مظہری کا مؤلف یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا کہ مرزا مظہر کے قتل میں نجف خاں کا ہاتھ تھا اور وہ اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے۔

شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک، سیاسی بھی تھی اور مذہبی بھی، معاشی بھی اور ادبی بھی۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں جگہ جگہ ملوکیت کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ ان کی تحریک کا یہ ترقی پسندانہ پہلو بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ ملک و قوم کی اصلاح کے لئے عوام ہی کو اپنا صحیح مخاطب سمجھتے تھے۔ انہوں نے قرآن شریف کا فارسی میں ترجمہ کیا تو نجف خاں اور اس کے مصاحبوں میں دہشت پھیل گئی۔ ان کے نزدیک یہ ترجمان کے اپنے اقتدار کی موت کے مترادف تھا۔ چنانچہ وہ شمشیر برہنہ بن کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ نجف خاں کی صلحا دشمنی کی بدترین مثال اس کے علاوہ اور کیا ہوگی کہ اس نے شاہ ولی اللہ کے ہاتھ ہی نہیں کٹوائے بلکہ ان کے بیٹوں میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو بھی جلاوطن کر دیا تاکہ ان کے خیالات کی اشاعت نہ ہو۔

نجف خاں، مکروہات کے استعمال اور عورتوں کی ہم جلیسی کی بدولت نوجوانی ہی میں مر گیا تو دلی کے حالات نے ایک اور کروٹ لی۔

غلام قادر خاں کی خوبصورتی ضرب المثل تھی۔ ضابطہ خاں کے خاندان میں صرف وہی زندہ رہ گیا تھا۔ شاہ عالم نے اسے خواجہ سراؤں کا لباس پہنا کر

قدرے بلاغ کی چمک دی تو معاملات میں وہ تو بڑی دور تک جا پہونچے۔ شاہ عالم کی شاعرانہ دون فطرتی کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے یہ شعر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس نے غلام قادر خاں کی مدح میں کہے تھے

دلبند خاص ہے یہ اور ہیں غلام سارے	آباد رکھیو یارب فرزندی کو گھر ہمارے
پھولا رہے ہمیشہ باغ شباب اس کا	ہرگز خزاں نہ پہنچے اس باغ کے کنارے
سایہ میں پرورش ہو ظل الٰہ کے یہ	ہو آفتاب جب لگ انور فلک کے تارے

ظل اللہ پر ایک کیفیت جمال طاری تھی، اس کو اس وقت ہوش آیا جب یہی غلام قادر خاں اپنے خاندان کی تباہی اور بربادی کا بدلہ چکانے ایک عذاب بن کر اس پر مسلط ہو گیا۔ شاہ عالم نے تیس لاکھ روپے دیکر اپنی جان بچانی چاہی تو اس نے بیدار بخت کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا۔ مدتوں پہلے تیمور کے گھر سے حمیت اٹھ گئی تھی۔ شاہ عالم کی سندھیا پروری نے تمام مسلمانوں کو بددل کر دیا تھا۔ ہزاروں مصاحبوں اور خادموں کی موجودگی میں کسی ایک نے بھی ہمت نہیں کی کہ غلام قادر خاں کا ہاتھ پکڑ لے۔

غلام قادر خاں نے حرم گاہوں کی تلاشی لی تو مرزا اکبر کے گھر سے چار ہزار اشرفی چودہ ہزار روپے، ایک من سونا، چار من چاندی، ۳۵ من تانبہ دس تختہ دوشالہ اور پندرہ تختہ کمخواب برآمد ہوا۔ اسی طرح شاہ آبادی بیگم کے مکان سے بھی دس ہزار اشرفی، چالیس ہزار روپے ایک من سونا، پانچ من چاندی اور دو صندوق جواہرات نکلے۔ تاج محل، مبارک محل اور رانی جے پور کے اسباب کی فہرست اس پر مستزاد تھی

غلام قادر خاں کے مظالم سے تمام سلاطین دہشت زدہ تھے۔ اس نے کبھی اکبر شاہ کو الٹا لٹکایا، کبھی اس کی پھوپھی کے جسم پر تیل چھڑک کر کوڑے مارنے اور کبھی شہزادہ سلیمان کو ٹکٹکی کی سزا دی۔ ان مظالم سے اسے دل خواہ دولت نہ ملی تو اس نے شاہ عالم سے مطالبہ کیا اور پھر اس کا پیٹ چاک کر کے دفینوں کے حاصل کرنے کی دھمکی دی۔ پھر دفعتاً افغانوں کو حکم دیا کہ اسے گرا کر اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دو۔ افغان اسے لپٹ گئے۔ وہ درد اور تکلیف کے مارے زمین پر لوٹنے لگا، لکڑیاں مار مار کر اس کو بٹھایا اور پوچھا کچھ نظر آتا ہے۔ اس نے کہا قرآن مجید کے سوا جو درمیان میں ہوا تھا کچھ نظر نہیں آتا۔ تو غلام قادر خاں نے اس زور سے اس کے سینہ پر لات ماری کہ وہ دور جا پڑا اور پھر چھاتی پر چڑھ کر اپنے خنجر سے اس کی آنکھیں نکال پھینکیں۔ مصور حسب حکم موجود تھے انہوں نے تصویر کھینچی تو غلام قادر خاں شاہ عالم کے سینہ پر چڑھا ہوا اس کی آنکھیں اپنے خنجر سے نکال رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تمام شہزادے، اور سلاطین بلائے گئے۔ ان کو ناچنے کی فرمائش کی وہ بھوک اور پیاس کے مارے اس کے اشاروں پر ناچتے رہے اسی اثنا میں شاہ عالم کی لڑکی اور محمد شاہ کی محل خاص نے انتقال کیا تو اس نے ان کی لاشوں پر قہقہے لگائے اور پھر اس وقت تک ان کو دفن نہیں ہونے دیا جب تک ان میں بدبو پیدا نہ ہو گئی۔ اس سانحہ کی سندھیا کو اطلاع ہوئی تو وہ مرہٹوں کو لے کر شاہ عالم کی مدد کے لئے دلی آ پہنچا۔ غلام قادر خاں نے سندھیا کی آمد کی خبر پاتے ہی شاہدرہ کی راہ لی اور اپنی فوجوں میں مل گیا۔

مرہٹہ نہیں چاہتے تھے کہ شاہ عالم کی بجائے کسی اور کو بادشاہ نامزد کریں۔ انھوں نے اسی اندھے شاہ عالم کو اپنا بادشاہ مقرر کیا اور پجاری کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔

شاہ عالم کی کوری دنیا کے لئے ایک عبرت تھی، تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مغلوں نے مال و زر کے علاوہ عصمت بھی لٹائی اور اپنے آپ کو اس قابل نہیں رکھا کہ لوگ ان کا احترام کریں۔ شاہ عالم کو مرہٹہ سو روپے روزینہ دیتے تھے۔ وہ اسی پر مطمئن تھا۔ اسے حکومت کی احتیاج تھی نہ تخت و تاج کی ضرورت۔ وہ دلی کے مقبرے میں ایک مجاور کی طرح بیٹھا موت کی سی ہچکیاں لیتا رہا۔ یہ موت کی سی ہچکیاں طویل اور الٹ ثابت ہوئیں [illegible] کے لزادوں کی طرح [illegible] پر سر دھننے والوں نے مصرعہ اٹھایا تو شاہ عالم نے اپنی کوری کی داستان منظوم کر دی۔ یہ داستان فارسی میں ہے۔ اسے اسی کے [illegible] شاعر مرزا علی لطف نے ریختہ میں یوں ترجمہ کیا ہے :-

حادثہ کی جو اٹھی آندھی مری غم خواری کو | دم میں برباد کیا میری جہانداری کو
آنکھیں نکلیں تو ہوا خوب کہ دیکھوں گا نہیں | غیر کے قبضہ میں اور ننگ جہانداری کو
مملکت کا بھی خیال ایک مرض تھا جانکا | گردش چرخ نے کھویا مری بیماری کو
تھا جس افغاں بچہ کو دودھ پلا کر پالا | بدلے اس حق کے وہ آیا مری خواری کو
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سر و پا | بخشنے کا کل تجھے حق تری سرداری کو

شاہ عالم کے انتقال پر اکبر شاہ ثانی نے حکومت سنبھالی تو انگریزوں نے اپنے اقتدار کے منصوبے کو مکمل کر لیا۔ ملک کے تمام معاملات میں بطور خود حاکم اور مختار مطلق ہو گئے۔ یہ بات خود اکبر شاہ ثانی کو بھی گراں تھی۔ اس نے راجہ رام موہن رائے کو اپنا وکیل بنا کر لندن بھیجا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہندوستانیوں کے معاملات طے کرتے ان کی زندگی کا معاملہ طے ہو گیا۔

سپاہی برائے نام سات اور سینتالیس روپے تنخواہ پاتے تھے۔ ان کی حقیقی آمدنی چند آنوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مختلف صنعتوں اور پیشوں کا بھی یہی حال تھا۔ انگریزی اشیا کی فروخت ہر صنعت اور پیشہ کو تباہ کر رہی تھی۔ شاہ کمال الدین انگریزوں کی اس شاطرانہ ذہنیت کا مطالعہ کر چکے تھے انہوں نے اس اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار صرف انگریزوں ہی کو ٹھیرایا۔ ان کے ایک شہر آشوب میں انگریزوں کی پیدا کی ہوئی اس بدحالی کی تصویر دیکھئے۔

وہی یہ شہر ہے اور وہی یہ ہندوستاں | کہ جس کو رشک جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہو کے سب ویراں | نظر پڑے بھی تو ہے ہر طرف فرنگستاں
نہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار
جہاں کہ نوبت و شہنائی جھانجھ کی تھی صدا | فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو رہا سلطنت میں کیا رتبا | ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہیں نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

اسی زمانے میں شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیکر انگریزوں کے اقتدار کے خلاف موثر ترین قدم اٹھایا۔ ان کی رائے میں غلامی سب سے بڑی لعنت تھی۔ اس کے علاوہ وہ ہر صاحب اقتدار کی اطاعت کو شریعت کے منافی خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے زندگی کے ہر فکری موڑ پر آزادی کی جنگ لڑی اور ایسا گروہ پیدا کیا جو منصب امامت کا تصور زیادہ واضح صورت میں پیش کر سکتا تھا۔

سید احمد بریلوی نے شاہ عبدالعزیز کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی۔ یہ محض ان کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ "قرب بالنوافل" کو چھوڑ کر قرب بالفرائض کے مسلک پر کاربند ہو گئے۔ اور پھر توحید، ایثار اور جہاد کی تعلیمات کی اشاعت کے لئے غازی آباد، مرادنگر، میرٹھ، کاندھلہ، مظفر نگر، نانوتہ، رامپور، سہارنپور، بانس بریلی اور رائے بریلی کا تبلیغی دورہ کیا۔ اس تبلیغ کے سب سے بڑے دشمن سر ولیم ہنٹر نے اپنی تالیف مسلمانان ہند میں اعتراف کیا کہ میرے لئے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں سید احمد بریلوی کی جماعت میں اکثر لوگ مستعد اور مقدس جوانوں کی طرح سرگرم کار تھے اور بہت سے آخر تک مذہب کے لئے جانفشانی اور جوش پر قائم رہے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو داستانی کہانیوں کی تصنیف اور بے قیاس غزلوں اور مثنویوں کی تالیف سے فرصت نہیں تھی۔ .... رئیسوں، وزیروں اور بادشاہوں کی عیش کوشیوں اور کم سواد سرپرستیوں نے ان کو اس قابل نہیں رکھا تھا کہ وہ ملک و قوم کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ جن لوگوں نے سیاسی اور سماجی اصلاح کے لئے نظمیں لکھی تھیں ان سے ہماری ادبی تاریخ ناآشنا ہے۔ ان کے حالات تک ہمیں تذکروں میں نہیں ملتے ہیں۔ ایک غیر معروف شاعر حسن نے سید احمد بریلوی کی تحریکوں اور اصلاحوں پر قلم اٹھایا تو خلیے بڑے قدآور شعرا پست معلوم ہونے لگے۔

سید احمد وعالی حسب و نخستر نشاں　　رہبرِ راہِ شریعت خلفِ پیغمبر
قطع بدعات ہوئی تیغ سے تیری ایسی　　ہند سے رسمیں بُری اُٹھ گئیں ساری یکسر
ذات سے تیری یتیموں کو بہت تقویت　　زنِ بیوہ کے لئے تو ہو سحابِ ممطر
تھا غضب ظلم کہ بیوہ نہ کرے عقدِ نکاح　　کھوئی یہ رسم زبوں رحمتِ حق ہو تجھ پر

مومن شاہ عبد القادر دہلوی کے شاگرد، شاہ عبد العزیز کے حاشیہ نشین، سید احمد بریلوی کے مرید اور شاہ اسمٰعیل کے ہم درس تھے، قطب الدین باطن نے اپنے تذکرہ گلشنِ بے خزاں میں انکے عشق پر دلنشیں کو رسوا کر کے اپنی وقعت بھی کھوئی ہے۔ مومن کا پیرایۂ بیان انکے شعروں کو تیر نیم کش ضرور بناتا ہے لیکن اسی تیر نیم کش کو محمد باقر یا محمد حسین آزاد کے سینہ میں پیوست کردینا ذاتی عناد کے سوا کچھ نہیں۔ مومن کے عشق نے نگاران عشوہ فروش کی آغوش میں نشوونما پائی تھی لیکن جب وہ اس عام سطح سے بلند ہوئے تو انہیں غیر ملکی اقتدار کے خلاف جہاد ان کو اصلِ ایمان نظر آنے لگا

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار　　پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　عروجِ شہید اور صدیق دے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

مومن کا یہ جذبہ مصنوعی نہیں ہے۔ اس کو ان کی اپنی وارفتگی نے ایک جامع حقیقت بنا دیا تھا۔ ان کی فکر سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیلؒ کی صحبتوں میں تپ کر زرِ خالص بن چکی تھی۔ چنانچہ ایسے دور میں جب کہ ناسخ کی تقلید، ذوق کی لایہ گری اور غالب کی مدح سرائی کو منصبِ شعری سمجھا جاتا تھا۔ اُنہوں نے جہادیہ شعر لکھے :-

فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا　　خداوند اس سے رضامند ہے
حبیبِ حبیبِ خداوند ہے　　خدا کے لئے جاں نثاری کرو
امامِ زمانہ کی یاری کرو

اسی خیال کو ایک رباعی میں یوں کہا ہے :-

مومن تمہیں کچھ بھی جو پاسِ ایماں　　ہے معرکۂ جہاد چل دیجئے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز　　وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

مومن نے جگہ جگہ سید احمد بریلوی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ایک قطعہ میں انکے ورودِ جہاد کی تاریخ نکالی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے مسلک کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھا بھی دیا تاکہ بعد میں کوئی مورخ ان کی تحریک کو "وہابیت" کے نام سے رسوا نہ کرے۔

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ　　کہ ذکر مدحتِ سبطِ قسیم کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں، احمد　　کہ محض مقتدیٔ سنتِ پیمبر ہے
وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جس کا سال خروج　　امام برحق مہدی نشان علی فرہے　　(۱۲۴۲ھ)

مومن کو جہاد کی بڑی تمنا تھی۔ اس کا اظہار ان کی جہادی مثنوی سے بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اکثر شعر اس ذوقِ شہادت سے خالی نہیں۔ ایک شعر دیکھئے :-

شوق ہر دم ہے ذوقِ شہادت ہے مجھے　　جلد مومن لے پہونچ اس مہدیٔ دوراں تلک

مومن کی ایک اور رباعی دیکھئے۔ اس میں انہوں نے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے جو ان کے مسلک کے بارے میں نزاعی حیثیت رکھتے ہیں اس سے ان کے مقصد پر بھی روشنی پڑتی ہے اور عقائد پر بھی۔

ارباب حدیث کا میں فرماں بر ہوں — تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روایت ائمہ نہ قیاس — یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد سکھوں کے خلاف تھی۔ انہوں نے انگریزوں کے سوا کسی دوسری غیر مسلم قوم کو اتنے خطرناک رنگ میں پیش نہیں کیا ہے کہ اس کے خلاف جہاد کی ضرورت ہو۔ ان کی رائے میں انگریز ہندوستان کے بلاد پر دریائے سندھ سے لیکر بحر عرب اور خلیج بنگال تک قابض ہو گئے تھے اور پھر توحیدی جذبہ کو ختم کرنے کے لئے جگہ جگہ تشکیک و تزویر کا جال پھیلا دیا تھا۔

لیاقت علی الہ آبادی جہاد کو فرض کفایہ خیال کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے سید احمد کی تحریک میں جو تن دہی دکھائی اس سے ان کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے ہر ہر اشتہار سے سید احمد بریلوی کے انداز فکر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ایک منظوم اشتہار کے کچھ شعر سنیئے جو جہادیوں کا رجز بن گیا تھا۔

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد — اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
فرض ہے تم پہ مسلمانوں جہاد کفار — اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار
دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے — غلبہ کفر سے ایمان مٹا جاتا ہے
بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آگے — حیف اس دولت بیدار سے مومن بھاگے
اے گروہ فقرا نفس کشی کے استاد — عمل نفس کشی کون ہے بہتر ز جہاد

اکبر شاہ ثانی کی حیثیت کمپنی کے ایک ملازم سے زیادہ نہیں تھی، انگریز اس کے سہارے اپنے قدم مضبوط کر رہے تھے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ اس کے اختیارات کا دائرہ محدود ہو کر دہلی تا پالم رہ جائے۔ اس نے انتقال کیا تو قسمت نے بہادر شاہ کو مغلیہ تخت پر نشان عبرت بنا کر بٹھا دیا۔ سرسید نے اس کی نااہلیت ثابت کرنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی رائے بڑی دلچسپ ہے۔

"اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا۔ کہا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں۔ اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور وہ سب تصدیق کرتے تھے۔"

بہادر شاہ کو انگریز ایک لاکھ روپیہ دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ میر حامد علی خاں، حافظ داؤد خاں اور لالہ نہال چند کا مقروض اور دست نگر تھا قلعہ معلی میں نذرانوں کے نام سے رشوتیں بھی لی جاتی تھیں۔ سلاطین کی داستان اتنی ہی عبرت ناک تھی۔ ان کا گذارہ مقررہ تنخواہ سے ممکن نہیں تھا۔ قرضخواہ ان پر مقدمے قائم کرتے تھے احسن الاخبار کے بعض بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نے ۸ مئی ۱۸۴۸ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ

"آغا حیدر ناظر کے نام ایک شقہ جاری کیا گیا کہ سلاطین کو سمجھا دیا جائے کہ قرض لینے سے ہاتھ روکیں۔ قرضخواہ عدالت انگریزی میں دعوی کرتے ہیں اور انھیں گھسٹنا پڑتا ہے تو خاندان تیموریہ کی تذلیل ہوتی ہے۔"

جب بہادر شاہ اور سلاطین کا یہ حال ہو ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی داستان مبالغہ معلوم ہوتی ہے۔ شاہ نصیر استاد ذوق تھے اسکے باوجود ان پر یہ حقیقت منکشف تھی کہ دلی مغلوں کی نہیں انگریزوں کی ہے۔ ان کی مفلسی شروع ہی میں ان چھوٹے نگینوں کی چمک دیکھ چکی تھی جو فرق شہریار کا پر تگار ہے تھے۔ مومن، صہبائی آزردہ اور شیفتہ سب نے مصاحبت کو اپنے لئے وجہ ننگ جانا انھیں کسی شہزادہ جواں بخت کا سہرا لکھنے کی تمنا تھی

نہ وہ کسی شاہ دیندار کے غسل صحت پر تہنیت پڑھنے کے خواہش مند تھے۔

غالب کا پیشہ سو پشت سے سپہ گری تھا۔ وہ شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے استاد شاہ کی خدمت سنبھالی تو سارا طلسم خانہ کھل گیا بعض احباب کے مشورہ پر غالب نے واجد علی شاہ سے امداد چاہی تو بجز حسرت کچھ ہاتھ نہ آیا۔ سلطان العلماء سید محمد غالب کے سلام اور مرثیہ سے بہت متاثر تھے۔ اس کے علاوہ اکثر لوگوں سے غالب کی تعریف بھی سن رکھی تھی۔ غالب نے ان کو اپنا وسیلہ کیا تو کچھ روپیوں کی صورت پیدا ہو گئی لیکن درباریوں کی دستبرد نے انہیں ان تک پہونچنے نہیں دیا۔

غالب کی مالی حالت بڑی سقیم تھی وہ قرض کی مے پی کر اپنی فاقہ مستی کا تماشہ کرتے تھے۔ یہی فاقہ مستی حد سے بڑھی تو انھوں نے اپنے ایک قصیدہ میں بہادر شاہ کو مخاطب کر کے عرض احوال کیا۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے	اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض	اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں چہارم کا	ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا	آپکا نوکر اور کھاؤں ادھار

اسی قصیدہ میں غالب کی یہ جھنجلاہٹ بھی دیکھئے:۔

رات کو آگ اور دن کو دھوپ	بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

اسی معاشی زبوں حالی اور اقتصادی پسماندگی نے اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامہ کو جنم دیا۔ یہ غلط ہے کہ اس میں بہادر شاہ اور اس کے خاندان کی بھی مساعی تھیں۔ بہادر شاہ اور اس کا خاندان کسی انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ محض حالات کا جبر تھا کہ وہ اور اس کے اہل خاندان بھی انقلابیوں کے ہمنوا ہو گئے۔ زینت محل کے دشمنوں سے ساز باز، شہزادوں کی رقابتیں حکیم حسن اللہ خاں، احمد قلی خاں اور مرزا الٰہی بخش کی ریشہ دوانیاں ۔ کیا یہ سب اس بات کی شاہد نہیں کہ دلی کے امراء کیا چاہتے تھے، یہ جذبہ یقیناً گمراہ کن ہے کہ ہم بہادر شاہ کی کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے اسے آزادی کا سب سے بڑا سپاہی سمجھیں۔

۱۸۵۷ء کی تحریک کو ہر شخص نے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اس لئے یہ کہیں سپاہیوں کا ہنگامہ کہیں رجعت پرست عناصر کی سرگرمی اور کہیں ڈوبتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کا سنبھالا نظر آتا ہے۔ مصلحت وقت نے اکثر جگہ سرسید کا قلم پکڑ لیا ہے۔ اس کے باوجود وہ اسباب بغاوت ہند میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے کہ:۔

"بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دلوں میں جمع ہوتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کے شتابہ میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گذشتہ فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی"۔

کارتوسوں میں چربی ملی ہوئی تھی میرٹھ کے ۸۵ جوانوں نے ان کے استعمال سے انکار کیا تو وائسرائے لارڈ کیننگ نے ان کے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ تمام سپاہی اس خیال سے کانپ اٹھے کہ کل ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔ انگریزوں کے سفاکانہ رویے نے نفرت کے جذبے کو ہوا دی۔ وہ دہک کر جوالا مکھی بنا تو فوجی افسر اور ان کے اہل خاندان سب راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ اس داستان کے ساتھ میرٹھ کا باغی ہجوم دلی پہنچا تو انگریزوں نے شہر اور چھاؤنی چھوڑ دی۔ جنگلوں کی طرف بھاگے تو زمین سخت اور آسمان تنگ ہو گیا۔ کہیں گنواروں نے دغا دی، کہیں چوروں نے لوٹا۔ ہر قریہ اور ہر بستی دام اجل بن گئی جو جہاں نظر آیا قتل ہو گیا۔ فریزر اور ڈگلس کے قتل پر نعروں اور جے کاروں نے رجز کی صورت اختیار کر لی اور پھر یہ رجز عوامی گیت بن گیا۔

"دلی میں ہو گئی مارا ماری"

اُٹھ پاؤں بھاگا فرنگی
پھر دلی میں اب کون کرے گا راج
سراج الدین بہادر یار جنگ"

ایران کو اپنے اندرونی خلفشار سے فرصت نہیں تھی۔ روس اپنی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ ان دونوں کو ایسی کیا پڑی تھی کہ وہ ہندوستان والوں کی مدد کرتے۔ پھر بھی دلی میں جو بات زبان سے نکلی کوٹھوں چڑھ گئی۔ افواہ ہو یا حقیقت، اخبار گو اور وقائع نویس سب ہی لے اڑے۔ سراج الدین بہادر جنگ کو عوام نے زبردستی اپنا سرپرست بنایا تو وہ بھی اپنی رعایا کی طرح پکار اٹھا۔

ایران نے کیا نہ کیا شاہ روس نے   انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے

سراج الدین بہادر جنگ کے آبا و اجداد کابل سے برما اور قندھار سے راس کماری تک پھیلی ہوئی وسعت پر حکمران تھے۔ اس کے زمانے میں یہی وسعت سمٹ کر لال قلعہ کی چار دیواری میں محصور ہو گئی تھی۔ اس کے پاس فوج تھی نہ خزانہ، ملک تھا نہ دولت۔ وہ جانتا تھا کہ انگریز اس کی سلطنت کو ختم کیے بغیر دم نہیں لیں گے اس نے دھرم پور، مردان پور، بھاسو، سعد آباد، دنادلی، بیگم پور، بدایوں، بے پور، متھرا، بلب گڑھ، اترولی اور بھرت پور کے رئیسوں سے مدد مانگی تو سب اپنا دامن بچا گئے اور پھر ان کی کوتاہی نے اس پر یہ بھی واضح کر دیا۔

اے ظفر اب ہو مجھی تک انتظام سلطنت   بعد اپنے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

سراج الدین بہادر جنگ کا یہ شعر دلی میں ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا سب ہی چاہتے تھے کہ وہ حکومت کرے۔ اس خواہش میں شدت ہوئی تو دلی کا محلہ محلہ اس ہمہمہ سے گونج اٹھا۔

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی   جا کے لندن میں لڑے گی تیغ ہندستان کی

علما ہوں یا فضلا، صوفیا ہوں یا مشائخ، ملوک ہوں یا سلاطین، ادبا ہوں یا شعرا، سب کی داستانیں رقص طاؤس تھیں، پائے زشت سامنے آ گیا تو نمک حرام بے نقاب ہو گئے۔ سکھوں کی انگریز دوستی کا ذکر کیا۔ خود مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی قوم سے غداری کی۔ سرفراز خاں کھرل نے لاہور میں محمد حیات خاں نے پشاور میں، ملک فتح خاں نے ملتان میں، ملک شیر خاں نے خوشاب میں، مراد خاں گردیزی نے بھاولپور میں، ملک صاحب خاں ٹوانہ نے لاہور میں، صادق محمد خاں نے شجاع آباد میں، غلام مرتضیٰ خاں نے قادیان میں، مظفر خاں نے کالا باغ میں اور محمد علی نے نگینہ میں مسلمانوں کی گردن پر تلوار چلوا کر خان بہادر کے خطابات حاصل کیے، دکن کے سالار جنگ، دلی کے رجب علی اور گوالیار کے راجہ کے سیاہ کارناموں پر صادق اور جعفر کی روحیں تک پشیمان ہو گئیں۔

بہادر شاہ پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا۔ دور اندیشوں نے جلا وطن کرنے کی ٹھانی۔ بہادر شاہ، زینت محل اور دوسرے شاہی افراد رنگون بھیج دیے گئے۔ بہادر شاہ نے انگریزوں کی تیزی سے بدلتی ہوئی حکمت عملی کا اپنی غزلوں میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ یہ غزل دیکھیے ——
ہر شعر کی دلالت اپنے مفہوم میں دو دو رس اور معنی آفریں ہے

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی   جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
چشم قاتل مری دشمن تھی ہمیشہ لیکن   جیسی اب ہو گئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی
پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں   دھم آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار   بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
کیا سبب ہے جو تو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار   تیری خو حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

لوگوں کو بہادر شاہ سے اس لئے ہمدردی نہیں تھی کہ اس نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حصہ لیا تھا، سب اس کے لڑکوں کے دردناک قتل اس کی اسیری اور ابتلا کے باعث اس کے ہمدرد تھے اور پھر ایک دو ہی کا کیا ذکر اس نوع کے بہت سے شاعروں کا کلام اس کے نام سے منسوب ہو گیا۔ ایک ہولی دیکھئے۔ یہ دیسی گائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے لوگوں نے بہادر شاہ کے زندان خانے کی دیوار پر کوئلہ سے لکھا ہوا دیکھا تھا

ہند میں کیسو بھاگ مچوری ـــــ جو راجوری
ہند کا تختہ گلشن بنا تھا
کیسر کی سی کیاری
کرم ہی مدہ تی کے جو بنے ۔ لٹ گئی باگ بہاری
ہند میں کیسو بھاگ مچوری ـــــ جو راجوری
گولن کے کنکے بنائے   توپن کی پچکاری
سینہ پھکائی ـــــ دلی دکھ ماری
ایسی ہولی کھیلی شور عالم میں مچوری
ہند میں کیسی بھاگ مچوری ـــــ جو راجوری

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مختلف طبقات نے حصہ لیا۔ مختلف جماعتیں برسرِکار آئیں بعض ترقی پسند تھے اور بعض رجعت پرست۔ اس کے باوجود سب کا مقصد ایک تھا۔ سب ایک محکم نظام کی تشکیل چاہتے تھے جو غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو۔ رانی لکشمی بائی، نانا صاحب، ناہر سنگھ حضرت محل، نواب علی بہادر، نواب تفضل حسین خاں، خان بہادر خاں، نواب محمود خاں، تانیتا ٹوپے عظیم اللہ خاں بخت خاں، وزیر خاں، احمد اللہ شاہ، حاجی امداد اللہ، قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، حنیف احمد بدایونی، لیاقت علی افضل حق خیر آبادی اور عبدالقادر لدھیانوی کے مقصد کی سچائی کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ ان سب کے سرفروشانہ جذبات کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

بنگال اور کرناٹک کی آئی ہوئی دولت کے باعث انگلستان کے صنعتی انقلاب نے کامیابی کی صورت دیکھی تھی۔ دہلی کالج کی چند نامور شخصیتوں نے اپنے جرائد و رسائل اور تراجم و تصانیف کے ذریعہ اجتماعی شعور کو بیدار کر دیا تھا۔ یہ اجتماعی شعور کی بیداری تھی کہ ہندوستانیوں نے دہلی کالج کے کتب خانے کو آگ لگا دی، سائنس کے تمام آلات توڑ ڈالے اور پھر پرنسپل ٹیلر کو بھی قتل کر دیا۔

محمد حسین آزاد نے بزرگوں کی صحبتیں دیکھی تھیں، ان کے تجربوں سے فیض اٹھایا تھا۔ وہ انگریزوں کے سیاسی استیصال اور ہندوستانی معیشت کی تباہی کو پوری شدت سے محسوس کرتے تھے۔ ناداری اور محتاجی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ڈیڑھ آنے یومیہ پر بھی کام نہیں ملتا تھا۔ ریاستوں کے الحاق نے ہزارہا لوگوں کو بے روزگار کر دیا تھا۔ اہلِ حرفہ الگ تباہ تھے۔ دیا سلائی بنانے والوں اور کپڑا بننے والوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ محمد حسین آزاد ہندوستانیوں کی کامیابی سے خوش تھے۔ انھیں توقع تھی کہ انگریزوں کی لائی ہوئی اقتصادی زبوں حالی جلد ہی رخصت ہو جائے گی۔ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے انگریزوں کے خلاف نظمیں لکھیں۔ تاریخ انقلاب عبرت افزا، ان کی ایک ایسی نظم ہے۔ یہ آپ کے کسی مجموعہ میں نہیں ملے گی۔ اسے ۲۴ مئی سنہ ۵۷ء کے قریب اخبار میں پڑھیے، لکھا ہے :-

در تاریخ انقلاب عبرت افزا من نتائج افکار مولوی محمد حسین آزاد تلمیذ خاص استاد ذوق حضور سلامہ اللہ

کو ملک سلیماں و کجا حکم سکندر   شاہانِ اولو العزم و سلاطین جہانگیر
کو سطوت حجاج و کجا صولت چنگیز   کس جا ہے جہاں اور کہاں ہیں وہ جہاندار

نے شوکت و حشمت ہے نہ وہ حکم نہ حاصل — کو خان ہلاکو و کجا نادر خونخوار
کو رستم و سہراب کجا سام نریمان — اس معرکہ میں کند ہے ایک ایک کی تلوار
کو حکمت لقمان و کجا علم فلاطون — خیل حکماء و علمائے اولی الابصار
ہونا ہے ابھی تجھ سے کچھ اک چشم زدن میں — ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ — تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
تھے صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت — تھے صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے — آفاق میں تیغ غضب حضرت قہار
سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے — سب ناخن تدبیر و خرد ہو گئے بے کار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت — پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار
حکام نصاریٰ کا یہ ابن دانش و بینش — مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یکبار
اس واقعہ کی چاہی جو آزاد نے تاریخ — دل نے کہا قل فاعتبروا یا اولی الابصار (۱۲۷۳ھ)

فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے سارے ملک کو انتقام کی آگ میں جھونک دیا۔ قتل و غارتگری کے ایسے مظاہرے کیے کہ ان کی مثال انیسویں صدی کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ بربریت کا شکار ہو گئے بے شمار دیہاتوں اور قصبوں میں درختوں پر لٹکی ہوئی لاشوں پر چیلیں منڈلاتی رہیں۔ چوک سعد اللہ خاں۔ اردو بازار، خانم بازار، بلاقی بیگم کا کوچہ، خان دوران خاں کی حویلی۔ دریا گنج کی گھاٹی۔ گیہوں کا بازار، پنجابی کٹرا دھوبی کٹرا۔ رام گنج۔ سعادت خاں کا کٹرا۔ دار البقا۔ اکبرآبادی مسجد، اورنگ آبادی مسجد، جبلی مسجد۔ سب مسمار ہو گئیں۔

دلی کی جامع مسجد ۱۰۶۰ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ ہندوستان کے پانچ ہزار معماروں نے ایک سو بیاسی دن خون پسینہ ایک کر کے حسن و جمال، رعنائی و زیبائی دیدہ زیبی و خوشنمائی کو مضبوطی اور استحکام بخشا تھا۔ ڈلہوزی اور کلایو کی نسل اسے ڈھانے یا گرجا میں تبدیل کرنے کے منصوبے باندھ کر شاہ جہاں کے ذوق تعمیر کا منہ چڑا رہی تھی، جب انہیں انگریزوں کا مشاورتی مرکز قائم ہوا اور سکھوں نے اپنے ڈیرہ ڈالے تو مغلوں کی رواداری کا آخری نمائندہ ہمایوں کے مقبرہ میں جا بیٹھا جب اس میں سوئر ذبح ہوئے اور غلاظتیں ڈھیر ہو گئیں تو پاکیزگی اور تقدس بے معنی ہو گئے۔ اس میں کتوں کی آواز کرالوں سے ٹکرائی تو گرونانک کا ہر آدرش چیخ بن گیا۔ قربان علی بیگ سالک نے شاہ جہاں آباد کی تباہی پر مرثیہ لکھا تو جامع مسجد کی ویرانی اور بربادی پر بھی اس آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

ہجوم مسجد جامع کا کیا کروں اظہار — صف ملائکہ ہوتی جہاں نماز گذار
ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلیوں کا شمار — اب اس کو دور ہی سے دیکھنا ہوا دشوار

نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھئے خالی تو جی بھر آتا ہے

۱۲ ذی الحجہ ۴۸ھ میں شاہ جہاں نے لال قلعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ استاد احمد اور حامد نے دو برس پانچ مہینے دو دن میں بنیاد کا کام ختم کیا تھا۔ اور وردی خاں نے دو برس ایک مہینہ گیارہ دن میں دیواریں تعمیر کی تھیں۔ مکرمت خاں نے نو برس میں تمام ضروریات سے آراستہ کر دیا تھا۔ پچاس لاکھ قلعہ پر اور پچاس لاکھ اسکے مکانات پر صرف ہوئے تو شاہجہاں کے خواب نے تعبیر کی صورت دیکھی۔ اس کے بعد آنے والا اس کی بربادی کا سبب بن گیا۔ نادر اور ابدالی ہی پر کیا موقوف ہے۔ مرہٹہ، روہیلہ، جاٹ سپاہی سب ہی اسے لوٹتے رہے اس بار اس کی عمارتیں ڈھا دی گئیں محلات کو مسمار کر دیا گیا۔ ایوان کھنڈر ہو گئے۔ نہریں اجڑ گئیں۔ فوارہ اور آبشار ٹوٹ گئے۔ رونقیں کھرچ گئیں۔ قلعہ کا تو محلہ مسمار ہوا تو ہر شخص بھاگ پڑا۔

وہ تو محلہ کہ تھا رشک کوچہ و بازار　　طواف کرتی تھی ہر صبح جس کا باد بہار
ہر ایک مکان مصفٰے تھا صورتِ گلزار　　بنا تھا کوچہ ہر ایک اس کا مصر کا بازار
اب اس محلہ کا باقی رہا نہ نام ونشاں
نظر وہ خلد میں آتا ہے مثل گورستاں

حکیم محمد حسن خاں کا بیٹا محمد محسن ملیک ایک غدار کو جانتا تھا۔ اس کو خبر تھی کہ غداری قوم کو فقیر بنا کر اپنا دامن الطاف وکرم سے بھرتی ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دلی میں غداروں اور مجرموں کے علاوہ کسی کی بھی قبا سلامت نہیں ہے۔

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے سائے　　ہر ایک شخص یہاں تھا بجائے خود اخواں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانیٔ غلماں　　وہ پیر چرخ کا ہمسر تھا یہاں کا ہر ایک جواں
رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیر امیر
برائے مخبری کے رہ گئے ہیں چند شریر

مراد آباد کے مجاہدوں میں جوش وخروش پیدا ہوا تو مولانا کفایت علی کافی نے امیر شریعت کی جگہ سنبھالی۔ شہزادہ فیروز شاہ دلی سے مراد آباد پہونچا تو سولہ ہزار آدمیوں نے جہاد کی قسم اٹھائی۔ یوسف علی خاں والی رامپور کی انگریز دوستی نے مراد آباد پر قبضہ کرلیا اور مسلمانوں کی قوت منتشر ہوگئی تو مولینا کفایت علی کافی نے انگریزوں کے قتل کا فتوی دے دیا۔ اس فتوی کے بعد یوسف علی خاں والی رامپور کے قدم ضرور ڈگمگائے لیکن اس کی ایما پر جنرل جانسن نے مراد آباد کی ناکہ بندی کر کے لوگوں کی تلاشی لی۔ مولانا کفایت علی کافی بھی گرفتار ہوئے۔ پھانسی کا حکم ہوا، پھانسی کے تختہ پر انتہائی خوشی میں جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھے تو مراد آباد کے لوگوں نے اپنی رگوں میں جرات ایمانی کی بجلیاں دوڑتی ہوئی محسوس کیں۔

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا　　ہاں رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا
اطلس وکم خواب کی پوشاک پہ نازاں نہ ہو　　اس تن بے جان پہ خالی کفن رہ جائیگا
نام شاہان سلف مٹ جائینگے لیکن یہاں　　حشر تک نام ونشان پنجتن رہ جائے گا

دلی کی تباہی اور بربادی کے واقعات کسی طرح تبصرہ کے محتاج نہیں ہیں، انگریزوں نے دلی فتح کیا کی، دلی سے علم وہنر، فضل وکمال سب ہی رخصت ہو گئے، ظہیر دہلوی نے لال قلعہ میں پرورش پائی تھی۔ ان کے لئے ہندوستانیوں کی بغاوت اور انگریزوں کا قتل، دلیری اور ہمت کا ایک نیا باب تھا۔ ادھر میرٹھ کی فوجوں نے شہر پناہ کی فصیل توڑی، ادھر انہوں نے اپنا رخت سفر اٹھایا اور ——— دکن کی راہ لی۔ ان کی "داستان غدر" ان کی تباہی اور بربادی کا دلدوز مرقع ہے ——— انھوں نے دلی کی تباہی پر "شہر آشوب" لکھا ——— تو اس سے بھی قمار بازوں، چغل خوروں، بدمعاشوں کے فروغ اور دھنیوں، شریفوں اور نجیبوں کی تباہی کے واقعات سامنے آگئے

ہر ایک رونق بزم جہاں قتل ہوا　　ہر ایک قبلۂ ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیٔ شیریں زباں قتل ہوا　　ہر ایک بلبل نوشیں بیان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

جہاں میں جتنے تھے اوباش ورند نافرجام　　قمار باز چغل خور بد قماش تمام
ہوئے شریک سپاہ شریر و بد انجام　　کیا تمام شریفوں کے نام کو بدنام

دوچند آتشِ فتنہ کو بلند کیا
کیا وہ کام کہ عالم کو دردمند کیا

شریر و جاہل و نااہل سر اٹھانے لگے | کہ گمرہوں کو رہِ گمرہی دکھانے لگے
چھپے ہوؤں کا سراغ و نشاں بتانے لگے | پکڑ پکڑ کے ستم گار خوں بہانے لگے

اٹھائی گیرے اچکے گھروں سے دھر بھاگے
جو گٹھ کٹے تھے وہ گٹھری لپک کے گھر بھاگے

صدرالدین آزردہ مفتی بھی تھے اور صدرالصدور بھی۔ انھیں بہادر شاہ بھی تنخواہ دیتا تھا اور کمپنی بھی۔ ایک طرف مجاہدوں نے ان کو اپنا دشمن سمجھ کر ان کی آنکھیں ضائع کیں۔ دوسری طرف انگریزوں نے بغاوت کا الزام لگا کر قید میں ڈالا۔ انہوں نے ایک نظم میں قید کے واقعات لکھے تو ان کی اپنی دلی کیفیات بھی شعر کے سانچے میں ڈھل گئیں۔

آ پھنسے بیڈھب الٰہی دیکھئے کیسے بنے | مر رہے ہیں سب الٰہی دیکھئے کیسے بنے

بشیرالدین احمد نے ان کی فضیلت اور بزرگی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا نام نیک اور شہرت معدلت ضرب المثل تھی۔ ابوالکلام آزاد کی رائے میں ان کی حیثیت ایک اکیڈمی کی تھی۔

دلی میں وہ جلسے رہے تھے نہ وہ خوش باشوں کی محفلیں۔ دوستوں میں شیفتہ نے بھی جہانگیر آباد کی راہ لی۔ صہبائی بھی بے جرم قتل ہو گئے۔ نظام الدین اولیاء کی بستی میں بیٹھے ہر کسی کو آواز دیتے رہے۔ یہ آواز دردناک ہوئی تو ہر سننے والا دلی کی تباہی اور اسباب کمال کی ہلاکت پر رو پڑا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا اصل سبب قلعہ تھا ــــ وہ بہادر شاہ اور اس کے غدار ساتھیوں کو مجرم سمجھتے تھے

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی | واں کے اعمال سے دہلی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی | کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا | اہلِ دنیا سے کچھ خلط انھیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا | آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں ان کو ڈالیں سر پر

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے | سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے | مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

"قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو" آزردہ کے اس نوحہ پر اکبر الہ آبادی کی نظم مستزاد ہے۔ اس نام نہاد غدر میں صرف صہبائی ہی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ انگریزوں نے ذوق کے لڑکے فوق کے علاوہ صہبائی کے بھی بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ اکبر الہ آبادی کے تئیں اہل کمال کی یہ موت بڑا

ساتھ تھی۔ انھوں نے صہبائی اور ان کے لڑکوں کے قتل پر نظم لکھی اس کے دو شعر یہ ہیں

نوجوانوں کو ہوئی پھانسیاں بے جرم و قصور   ماردیں گولیاں پایا جسے زور آور

وہی صہبائی جو تھے صاحبِ قول فیصل   ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

تجمل حسین خاں نواب فرخ آباد، غالب کے الفاظ میں نصیر دولت دیں اور معین ملت و ملک تھے۔ غالب نے جس وقت یہ دعویٰ کیا تھا کہ:۔

"بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے"

تو خبر نہیں تھی کہ انگریز ان کے جانشین کو عمر بھر کے لئے جلاوطن کر دیں گے۔ وہ جلاوطن ہوئے تو غالب کی مدح کا ورق تمام ہوگیا اور انھیں اس بحر بیکراں کے لئے سفینہ کی حسرت نہیں رہی۔

لاہور کرانیکل کے اخبار پرداز وقائع نگار مسلمانوں کے خلاف نفرت کا زہر بو رہے تھے۔ ان کو ہر ہنگامہ کی تہہ میں مسلمانوں کی سازش نظر آ رہی تھی۔ انکے نزدیک مسلمانوں کی فطرت میں باغیانہ جذبہ انکے توحیدی مذہب نے پیدا کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز مسلمانوں کا وجود برداشت کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کو شدید سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ غالب نے تحریک آزادی کو رستخیز بیجا کا نام دیا تھا۔ خود کو آدھا کافر اور آدھا مسلمان کہکر اپنی جان بچائی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ علاء الدین احمد علائی کو خط لکھنے بیٹھے تو ان کے اصل جذبات ان شعروں میں جھلک پڑے۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک   تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کسی زمانے میں غالب نے حالی سے کہا تھا کہ تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پہ ظلم کرو گے۔ حالی نے شیفتہ، نیر، آزردہ اور ذوق سب کی صحبتیں دیکھی تھیں، دلی کی تباہی نے انکے ہر محترم اور مقدم بزرگ کو ترک وطن کا داغ دیا تھا۔ وہ مومن، صہبائی اور ممنون سب کو رو تے تھے۔ حالات نے ان کو ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا تھا جہاں انھوں نے بلبل کی ہمزبانی ہی نہیں بزم شعراء کی شعر خوانی بھی چھوڑ دی۔ دلی کبھی علم و ہنر اور فضل و کمال کا وطن تھی۔ وہاں اب صرف داغ اور مجروح کے نغمے رہ گئے تھے۔ اور پھر ان نغموں کی بھی ہر لے بے تالہ ہو گئی تھی۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ   نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

لے کے داغ آئیگا سینہ پہ بہت اے سیاح   دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو   ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں   نہ سنو گے گل و بلبل کا ترانہ ہرگز

داغ کی شاعری بلبل کا ترانہ تھی، وہ دلی کو بہشت و خلد میں انتخاب سمجھتے تھے۔ جب یہی دلی خیال میں خواب ہو گئی تو ان کی آنکھ سے ٹپکا ہوا اشک غم مغلوں کے عروج و زوال کی تصویر بن گیا۔

فلک نے قہر و غضب تاک کر ڈالا   تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا

یکایک ایک جہان کو ہلاک کر ڈالا   غرضکہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

دلی کی تباہی بہت ہولناک تھی۔ مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں نے بھی دربدر کی خاک اڑائی، نازنینوں کے چہرے اتر گئے۔ شہزادیاں

کے ہاتھ میں کشکول آگیا۔ ہر خوبصورتی فاقوں سے کمہلا گئی، ہر جوانی پر بڑھاپا اور ہر بڑھاپے پر مردنی ـــــــ اسی جانکاہ منظر کی ایک تصویر داغ کے ان شعروں میں دیکھئے :۔

بنا ہے حالِ سیہ رنگ مرجھالوں کا ۔۔۔ دو تا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا اب ہے تو شور نالوں کا ۔۔۔ عجیب حال دگرگوں ہے دلی والوں کا

کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

غالب نے علی بہادر کو عالی گہر کہا تھا اور سمندِ ناز پر دیکھنے کی تمنا کی تھی۔

نواب علی بہادر والئ باندہ نے اپنے وزیروں اور مصاحبوں سے مشورہ کیا اور پھر تحریکِ آزادی میں ایک مخلص مجاہد کی طرح شامل ہو گئے ۵ / جون کو ایج کاک ڈی سنے باندہ کا دورہ کیا تو قتل ہو گیا۔ وائٹ لاک کی سرکردگی میں انگریزوں نے فوج کشی کی تو فرخ آباد کا انقلابی دستہ مدد کو پہنچ گیا۔ انگریزی فوج نے باندہ پر قبضہ کر کے نوابان فرخ آباد کو بھی اعانت کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اقبال مند خاں اور غضنفر حسین خاں کو پھانسی دیدی گئی۔ منیر نے ان کے قتل کا واقعہ لکھا تو جرأت فکر و آزادئ تحریر یاد آ گئی۔

اقبال مند خاں و غضنفر حسین خاں ۔۔۔ دونوں در محیط قضا ہائے ہائے
دونوں جوانِ نیک امیرانِ ذی حشم ۔۔۔ مقتول تیغ تیز جفا ہائے ہائے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہوا ہے منیر ۔۔۔ دونوں شہید راہِ خدا ہائے ہائے

منیر، اقبال مند خاں اور غضنفر حسین خاں کی موت پر رو ہی رہے تھے کہ تجمل حسین خاں والی فرخ آباد کے چھوٹے بھائی سخاوت حسین خاں کے پھانسی پانے کی بھی سناونی آ گئی۔ منیر نے چند سال ان کی رفاقت میں گزارے تھے۔ واقعہ مرگ سنا تو دل مسوس کر رہ گیا۔

ریاضِ خلق سخاوت حسین خاں نواب ۔۔۔ نہالِ باغ کرم زیب مسند شوکت
جوان قابل و فرزندِ خاص نصرت جنگ ۔۔۔ غلام آل نبی سرو قد قمر طلعت
وہ بے گناہ ہوا تیغ ظلم سے مقتول ۔۔۔ عنایت اسکو کیا حق نے گلشن جنت
منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ ۔۔۔ ہوا شہید امیر دلیر با ہمت

محمد باقر شیعہ مجتہدین کے خاندان سے تھے، اردو اخبار دہلی ان کی نگرانی میں بیس سال سے شائع ہو رہا تھا۔ انگریزوں کے نزدیک ان کی صحافت جرم نہیں تھی، ان کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ ایک سکھ جرنیل نے دہلی دروازہ کے باہر ان کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا تو تمام پڑھے لکھے حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔

منیر شکوہ آبادی کو بھی محمد باقر سے بڑی عقیدت تھی جب ان کی شہادت کا واقعہ ان تک پہنچا تو وہ باندہ میں علی بہادر خاں والی باندہ کی سرکار سے وابستہ تھے۔ محمد حسین آزاد کو اپنے مقتول باپ کا نام لینے کی ہمت نہیں تھی۔ خود ان کی موت کا پروانہ جاری نکلا تھا۔ وہ تو یہ غنیمت ہوا کہ انھوں نے ایک انگریزی افسر کے سائیس کے لباس میں فرار کی راہ لی۔ منیر شکوہ آبادی نے ان کی شہادت پر بڑی دردناک نظم لکھی اور "شہید و متقی و عالم علوم نہاں" کہہ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب فاضل کامل محمد باقر ۔۔۔ سپہرِ علم و فضیلت کے اخترِ تاباں
شہید عالم ایجاد دہلوی مولد ۔۔۔ بزرگ اصل میں انکے تھے ساکن ایراں

حدیث و فقہ و کلام و مناظرہ میں وحید　　　مصنفات سے ان کی ہے مثل شمس عیاں
خلیق و نامرِ آلِ رسول و تعزیہ دار　　　فدائے نام نبی عاشق شہِ مرداں
کہی منیرؔ نے یہ ان کے مرگ کی تاریخ　　　شہید و متقی و عالم علوم نہاں

منیرؔ شکوہ آبادی کو والیانِ باندہ کی رفاقت کے جرم میں کالا پانی کی سزا ملی تھی۔ وہ فرخ آباد سے باندہ، پھر وہاں سے الٰہ آباد اور پھر کلکتہ سے انڈمان بھیجے گئے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پاؤں میں بیڑیاں اور پیادہ سفر ایک بدترین عذاب تھی۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں اپنی قید و بند کے واقعات کو تفصیل سے لکھا ہے، ان کی یہ رباعی اسی تفصیل کا اجمال ہے ؎

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا　　　زہرِ غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیرؔ　　　کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

اس نام نہاد غدر کو ہماری تحریکِ آزادی کا سنگِ میل سمجھنا چاہیئے، جہاں اس سے دلی اور لکھنؤ کی تہذیبی، سماجی، سیاسی اور اخلاقی قدریں متاثر ہوئیں وہیں ہندوستانیوں کے لئے انگریزوں کی نیت اور سرشت کے پرکھنے کا ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ اور انہوں نے پہلی مرتبہ غیر ملکی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے تنظیم، اتحاد اور یقین کی ضرورت محسوس کی ——— اور پھر جہادِ آزادی کا قافلہ تیزی سے اپنی منزل کے قریب پہونچ گیا۔

آہا آہا برکھا آئی

جوش ملیح آبادی

بدلی آئی ، بدلی آئی
بدلی آئی ، بدلی چھائی
بدلی چھائی اور لہرائی
جھر جھر برسی ، گھڑ گھڑ گائی
آہا آہا، برکھا آئی

میلے ریلے تال کنارے
بوڑھے بچے لت پت سارے
دھوم دھڑکا ندیا نارے
چڑھتے دریا، بڑھتے دھارے
گرتی بوندیں، چھٹتی کائی
آہا آہا، برکھا آئی

بادل کالے، نیلے، دھانی
ساری دھرتی ہے جل رانی
پانی پانی پانی پانی
گلیاں، کوچے کھیت، انگنائی
آہا آہا، برکھا آئی

پانی آیا، جھم جھم جھم جھم
کالے جھنڈے، نیلے پرچم
پریاں اتریں چھم چھم چھم چھم
چھم چھم بولی، بالم بالم
پاپی آشا پھر گدرائی
آہا آہا، برکھا آئی

اڑتے مڑتے بوجھل گالے
اودے اودے کالے کالے
ہاہا کرتے ندی نالے
تڑ تڑ تڑ تڑ سب پرنالے
سن سن سن سن سن سن پروائی
آہا آہا، برکھا آئی

نشے جھومے، بَن لہرائے
پربت بولے، پنچھی گائے
مچلے بادل، ناچے سائے
راتیں ڈوبیں، دن کجلائے
نالے تھرکے، ندی گائی
آہا آہا، برکھا آئی

کرنیں چمکیں، شوخی دمکی
مدھرا چھلکی، بوتل جھنکی
طبلہ ٹھنکا، چھاتی گمکی
ادھر ادھر بجلی چمکی
جیسے چنچل کی انگڑائی
آہا آہا، برکھا آئی

دل میں پھوٹی ٹے کی کونپل
ندی نالے سارے جل تھل
مکھڑے، شیشے جھل جھل جھل جھل
تان اڑاتی جنگل جنگل
کالے بھونروں کی بھونرائی
آہا آہا، برکھا آئی

پھرنے نکلی گھر سے چھوری
گال اچھوتے، بانہیں گوری
آنکھیں مٹکیں چوری چوری
آگے آگے الھڑ گوری
پیچھے پیچھے چاتُر دائی
آہا آہا، برکھا آئی

بیٹھا کیوں ہے سر کھجلاتا
اُٹھ اور سر پہ لے کر چھاتا
تان اڑاتا، بین بجاتا
ہنستا گاتا شور مچاتا
مدھرا پیتے چل رے بھائی
آہا آہا، برکھا آئی

سینہ ابھارے ندی ندی
بازو کھولے پنچھی پنچھی
دور تلک ہے پانی پانی
در در آئی جمنا دیوی
گھر گھر پہنچی گنگا مائی
آہا آہا، برکھا آئی

پانی مرتا دیواروں میں
گھٹنوں گھٹنوں بازاروں میں
گرتا چکراتا غاروں میں
اور مینہ کے آڑے تاروں میں

لپٹا ڈگی باتا پائی
آہا آہا، برکھا آئی

جوبن اُبھرا ہر چتون میں
ساون گونجا سب کے تن میں
رادھا، تھرکیں اُلھڑ بن میں
مدھرا برسی گوکل بن میں
شام نے کیسی بین بجائی
آہا آہا، برکھا آئی

طبلہ، سارنگی، اکتارا
نوبت، بیلا، بین، نقارا
ڈھولک، ڈفلی، جھانج مجیرا
کوئل، دادر، مور، پپیہا
دائرہ، بربط، نے، شہنائی
آہا آہا، برکھا آئی

سُن کر اپنے پی کی آون
بولی بدھی لادے مالن
مہندی پیسی ژن ژن ژن ژن
چڑیاں بولیں کھن کھن کھن کھن
انتی کا پی تو گرمائی
آہا آہا، برکھا آئی

ٹھمری لہریں، لے کے دھارے
گوری دُہری لاج کے مارے
توڑا، جیسے ٹوٹیں تارے
سارے گاما، گاما سارے
پائل جھنکی، مستی چھائی
آہا آہا، برکھا آئی

دھرپد کر گانا گایا
من میں کالا بادل چھایا
ہلکا ہلکا مُرچھا آیا
سایہ دیپک، دیپک سایا
تالو دھکا، دُھن چکرائی
آہا آہا، برکھا آئی

جلدی سکھیو لاؤ جھومر
ہلکی چھاگل، بھاری چادر
دوڑ د آیا پانی سر پر
اے دیکھو وہ ڈولی لے کر
پیت نگر سے آیا نائی
آہا آہا، برکھا آئی

اچھلیں من میں لے کی دھاریں
آڑی ترچھی آئیں پھواریں

ناچیں چھم چھم گوری ناریں
تار پکارے، آ نزیں آ نزیں
دھرتی بہکی رُت بولائی
آہا آہا، برکھا آئی

ثر ثر پانی، ہوں ہوں جھکڑ

چھپڑ ٹپ ٹپ، نالے دھڑ دھڑ
بدلی گھم گھم، بجلی کڑ کڑ
جھیتم جھیتم، تڑ وڑ تڑ وڑ
دھرتی بولے رام دہائی
آہا آہا، برکھا آئی

اہم مطبوعات

(۱) اندرون و بیرون ملک ملازمتوں کے امتحان بابت ۱۹۵۷ء کے پرچہ جات سوالات۔
قیمت فی جلد ۱۰ روپے

(۲) چنگی اور مرکزی محصول کی سالانہ انتظامی رپورٹ ۵۷-۱۹۵۶ء ۸ روپے ۲۵ پیسے

(۳) فولاد کی سلاخیں ڈھالنے کی صنعت کی رپورٹ بابت جولائی ۱۹۶۱ء ۲ روپے

(۴) پاکستان میں مزدور تنظیم کے تعلقات پر بین الاقوامی مزدور تنظیم کی مشترکہ جماعت کے ماہرین کی رپورٹ
ایک روپیہ ۳۷ پیسے

ملنے کے پتے

(۱) منیجر مطبوعات۔ حکومت پاکستان۔ بلاک نمبر (۲۴) شاہراہ عراق، کراچی۔

(۲) مغربی پاکستان میں جملہ اجازت یافتہ ایجنٹ

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

خواجہ حمید الدین شاھد

از شمارِ دو چشم یک تن کم　　وز حسابِ خرد ہزاراں بیش

اُردو دنیا کی عظیم المرتبت شخصیت ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ کی بے وقت اور اچانک موت کی خبر سے پاکستان و ہندوستان میں ان کے بے شمار پرستاروں اور قدردانوں کو جو دلی صدمہ پہنچا ہے، وہ آسانی سے بھلایا نہیں جا سکے گا۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں جب مرحوم عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحقہ چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی کے عہدے سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے تو کشمیر یونیورسٹی نے ان کی خدمات سے استفادہ کرنے کے لئے شعبۂ اُردو کی صدارت پیش کی۔ اتفاق کی بات ہے میں ان دنوں چند روز کے لئے حیدر آباد دکن گیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب اس نئی پیشکش کے قبول کرنے یا نہ کرنے پر غور فرما رہے تھے۔ اس موضوع پر مرحوم نے مجھ سے بہت دیر تک گفتگو فرمائی اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اس نئی خدمت کے قبول کرنے کی طرف مائل ہیں۔ میں نے ان کے اس ارادے کی سختی سے مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ ادارۂ ادبیات اُردو کی خاطر انہیں حیدر آباد میں ہی رہنا چاہئے کیونکہ ادارۂ ادبیات اردو اور ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے کے لئے ان سے موزوں تر تو ایک طرف، ان جیسی کوئی اور شخصیت مجھے وہاں نظر نہ آئی۔ میری مخالفت جب شدت اختیار کر گئی تو فرمانے لگے:

"حیدر آباد میں اُردو کی جو خدمت کرنی تھی وہ میں کر چکا۔ یہاں اُردو کی عمارت مستحکم ہو چکی ہے، جس کی دیکھ بھال کرنے کے لئے اور سب یہاں موجود ہیں۔ اب کشمیر کو میری ضرورت ہے جہاں کی سرکاری زبان اُردو ہے، اور وہاں مجھے اُردو کی ترقی و توسیع کے زیادہ امکانات دکھائی دے رہے ہیں۔ میں وہاں جا کر اُردو زبان و ادب کی زیادہ خدمت کر سکوں گا۔ فی الحال ایک سال کے لئے جاؤں گا اور اگر وہاں کی فضا سازگار نہ ہوئی اور حیدر آباد میں میری عدم موجودگی کی وجہ سے اُردو زبان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو میں فوراً لوٹ آؤں گا۔ یوں بھی یونیورسٹی سال بھر میں تین مہینے بند رہتی ہے، مختلف کمیٹیوں میں شرکت کے لئے بھی مجھے دہلی، علی گڑھ، بمبئی اور حیدر آباد آنا جانا پڑے گا؛ اس طرح سال میں کئی مرتبہ ادارے کے کاموں کا جائزہ لینے کے مواقع ملیں گے اور کمیٹیوں کے اجلاس طلب کر کے میں ضروری ہدایات دیتا رہوں گا۔ میں تنہا کام کرتے کرتے اتنا تھک گیا ہوں کہ میری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تبدیلِ آب و ہوا اور نئے ماحول سے میری صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ اس کے لئے کشمیر سے زیادہ پُر فضا جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب کی ان باتوں کو سننے کے بعد میں نے کچھ اور کہنے کی جرأت نہیں کی اور بادلِ ناخواستہ "اچھی بات ہے" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب سرینگر تشریف لے گئے اور سوا سال کی قلیل مدت میں وہاں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اورینٹل کانفرنس کا انعقاد کیا اور سلسلۂ مطبوعاتِ کشمیر کی بنیاد رکھی جس کی طرف سے وہاں کے تین ابھرتے ہوئے فنکاروں کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر قاضی غلام محمدؐ کے مجموعۂ کلام "حرفِ شیریں" کے تعارف میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ خطۂ جنت نظیر بڑی بڑی پہاڑیوں اور دشوار گزار راستوں سے محصور رہا ہے' اس لئے یہاں کے شاعر، ادیب اور فن کار بیرونی دنیا سے بالکل الگ رہے ہیں۔ ان کے فطری جوہر یہاں کے لاتعداد پھولوں اور رنگ و نکہت کی بہاروں کی طرح یہیں اپنی چمک دمک دکھا کر رہ جاتے ہیں اور باہر کی دنیا ان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتی۔"

ڈاکٹر صاحب کی پُر عظمت شخصیت' ان کا علم و فضل اور ان کی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ اُردو زبان و ادب کی خدمت ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اسی شوق خدمت گزاری میں انھوں نے اپنے محبوب وطن حیدر آباد دکن کو چھوڑنا گوارا کرلیا اور بڑی اُمنگوں، جوش و خروش اور بلند عزائم کے ساتھ اُردو زبان کی ترقی کے لئے نئی مہم کا آغاز کیا ہی تھا کہ ان کی زندگی کے دن پورے ہوگئے اور وطن سے سیکڑوں میل دور خانیار شریف کے شہر خموشاں میں پیوند خاک ہوگئے۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو اُردو کا یہ کوہ نور کشمیر کی وادیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہوگیا۔

ان کی وفات کے ساتھ اردو زبان کی ایک تحریک، ایک ادارہ بلکہ ایک عہد ختم ہوگیا وہ نہ صرف صاحب طرز انشا پرداز، بلند پایہ محقق، بالغ نظر نقاد اور ماہر لسانیات تھے بلکہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، قدرت کی طرف سے ان کی فطرت میں وہ تمام صلاحیتیں یکجا ہوگئی تھیں جو علمی کاموں کی قیادت کے لئے ضروری ہیں اور بہت کم کسی ایک فرد میں پائی جاتی ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے اُردو زبان و ادب کی خدمت کی لگن تھی۔ اوروں سے کام لینے اور انہیں راہ پر لگانے کا ان میں خداداد ملکہ تھا۔ دوسروں سے جتنا کام لیتے تھے اس سے کئی گنا زیادہ کام خود کرتے تھے۔ حیدر آباد کے مصنفین و مؤلفین کی خدمات کو ایک مرکزی اجتماعیت کے ذریعے سے روبہ عمل لانے کے لئے ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اُردو کی تشکیل کی۔ اس ادارے کے قیام اور اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں ڈاکٹر زور صاحب نے جس ایثار اور جذبۂ خدمت گزاری کا ثبوت دیا ہے وہ یقیناً دوسروں کے لئے قابل تقلید ہے۔

ڈاکٹر زور صاحب عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۷ء میں ایم اے کا امتحان بدرجۂ اول کامیاب کرنے کے بعد سرکاری وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گئے تھے۔ وہاں آپ نے آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات اور بالخصوص اُردو کے ارتقاء پر مقالہ تحریر کیا اور تین سال کی بجائے دو سال کے اندر ہی ۱۹۲۸ء میں لندن یونیورسٹی سے پی، ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کے بعد علم اصوات کی تحصیل میں منہمک ہوگئے، اور ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات کا تحقیقاتی کام "لے انستی تیوت دی فونیتک" میں مکمل کیا۔ ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور جیسی زبانوں کے متعلق "سوربون یونیورسٹی" پیرس میں درس حاصل کئے اور پیرس سے انگریزی میں ایک کتاب "ہندوستانی فونیٹکس" شائع کی جو اپنے موضوع پر پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ "ہندوستانی کی گجراتی شاخ" پر ایک پُر مغز مقالہ ڈاکٹر جے بلوک کی نگرانی میں لکھا تھا جس کے چند حصے "ژورنل ایشیاٹک" پیرس میں شائع ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب نے اُردو زبان و ادب کی جتنی خدمت کی ہے، عصر حاضر کے کسی اور شخص نے نہیں کی۔ طالب علمی کے دور سے بلکہ مرتے دم تک ان کی تقریباً (۵۰) علمی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوکر ایوان اردو کی زینت بن چکی ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ "روح تنقید" اُردو دنیا میں فن تنقید پر سب سے پہلی کتاب ہے' جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ معرکۃ الآرا کتاب ڈاکٹر زور صاحب کی تصنیفات کا نقطۂ آغاز تھا۔

ڈاکٹر زور صاحب نے ڈیڑھ ماہ قبل "ایوان اردو" حیدر آباد دکن میں اردو غزل کے ایک مایۂ ناز شاعر شاہد صدیقی مرحوم کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"حیدر آباد کی ممتاز شخصیتیں یکے بعد دیگرے ہم سے جدا ہوتی جارہی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حیدر آباد قبرستان بنتا جارہا ہے۔"

"لیکن کسے خبر تھی کہ وہ بھی بڑی تیزگامی کے ساتھ اس کاروانِ عدم کے مسافروں سے جا ملیں گے اور اہلِ حیدرآباد یہ محسوس کریں گے کہ حیدرآباد واقعی قبرستان بن گیا ہے۔ انتقال سے ایک دن پہلے یعنی اتوار ۲۳ ستمبر تک وہ بھلے چنگے تھے۔ اس دن اپنے تمام دوستوں سے ان کے مکانوں پر جا کر ملاقات کی اور شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس سے وہ نہ ملے ہوں۔ ۲۳ اور ۲۴ ستمبر کی درمیانی رات میں کوئی ساڑھے بارہ بجے ان پر قلب کا زبردست حملہ ہوا۔ فوراً ڈاکٹر بلائے گئے اور وہ سب کچھ کیا گیا جو کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے دن ماہر ڈاکٹروں کا ایک بورڈ ان کے علاج کے لئے بلایا گیا لیکن کسی کی مسیحائی کارگر نہ ہوئی اور "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ شدید تکلیف سے کراہتے تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ "اب یہاں سے مجھے لے چلو، اب حیدرآباد چلے جائیں گے"۔ شاید انہیں اپنی موت کا علم ہو چکا تھا اس لئے اپنے محبوب وطن ہی کو اپنی ابدی خواب گاہ بنانے کی خواہش ان کے درد بھرے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی ہے کہ دکن کی تاریخ بنانے والے، دکنی ادب کو زندہ کرنے والے اور سرزمین دکن کے ذرہ ذرہ سے محبت کرنے والے ہی کو وہاں دو گز زمین بھی نہ مل سکی۔ "ہمیشہ رہے نام اللہ کا"۔ اب آخر میں مرحوم ڈاکٹر زورؔ کی بیگم صاحبہ کے خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کے بغیر یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا :-

"کیا لکھیں اور کیونکر لکھیں، کس کے متعلق لکھیں۔ بہتیری کوشش کی لکھنے کی مگر قلم نہ اٹھ سکا۔ آپ کے خط نے اور بے قابو کر دیا۔ دامن صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ ایک ایک جملہ یادِ ماضی سے تڑپا گیا۔ آپ کو اُن سے اور اُن کو آپ سے جو خلوص تھا، اس بنا پر ہم نہیں بتلا سکتے کہ آپ کا کتنا خیال آیا اور آ رہا ہے جبکہ کوئی یہاں اپنا نہیں مگر سب غیروں ہی نے اپنوں کی طرح ساتھ دیا اور دے رہے ہیں۔ اس سوا سال کے قلیل عرصے میں اتنے مقبول اور ہر دلعزیز ہو گئے تھے کہ : 'جو تھے نا آشنا آشنا بن گئے !' (زورؔ)

امیر، غریب، بچے بوڑھے سب رنج کر رہے ہیں۔ جو بھی سنتا ہے، سکتے کے عالم میں رہ جاتا ہے۔ کبھی گمان بھی نہ آتا تھا کہ ایسا ہوگا اور یہ بدنصیبی ہمارے حصے میں آئے گی۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ پہلے ہی حملے میں قلب جواب دے دیگا اور ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جائے گا۔ غیر جگہ، غیر شہر، اپنوں سے دُور، اتنا بڑا حادثہ برداشت کرنے کیلئے ہم رہ جائیں گے۔

انقلاب زمانہ ہے شاید یہی   دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے (زورؔ)

اللہ کی مرضی کے آگے انسان بے بس ہے۔ پھر صبر کا اس کو ایسا درس دیا گیا ہے کہ اسی سہارے جیتا ہے، اپنی بے کسی کو اللہ کی مصلحت اور مشیّت سے ڈھارس دے لیتا ہے۔ کوئی لمحہ اس یاد سے خالی نہیں گزرتا۔ یہ ایسا زخم دل پر لگا ہے کہ تا زیست نہ مٹنے پائیگا۔ نہ معلوم کتنی زندگی باقی ہے اور کیا کیا جھیلنا حصے میں ہے۔ اب بس یہی کہ

"جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا"

کس خوشی سے یہاں آئے تھے اس سے بڑھ کر مغموم یہاں سے جانا ہے۔ اب تو جی بھی نہیں چاہتا کہ یہاں سے جائیں، وہاں ہمارے لئے کیا رکھا ہے .... بمشکل دو تین دن کی کوشش میں اتنا لکھ پائی کیونکہ ہمارا بھی فرض تھا کہ آپ کو لکھیں۔ اللہ صبر دے۔ وہی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

غم نصیب
تہنیت النسا

(مکتوب مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

شعبۂ مطبوعات

اردو کی پہلی کتاب

اسلم فرخی

ترقی اردو بورڈ کی جانب سے مولانا آزاد کی درسی کتابوں کا مشہور سلسلہ یعنی اردو کی پہلی کتاب تا چوتھی کتاب از سرِ نو شائع کیا جا رہا ہے ذیل میں اس کے مقدمے کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ کتاب زیر طبع ہے۔

"بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے اُنھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر اُنہیں بار بار کاٹنا اور بنانا، لکھنا اور مٹانا، بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے، جاگتے، سوتے بچوں کے ہی خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے غرض میرے پیارے اہل وطن! تمہاری خدمت نہ کی۔ تمہارے بچوں کی خدمت کی" .... (محمد حسین آزاد، مکتوبات)

"آقائے اردو آزاد صرف عظیم المرتبت انشا پرداز ہی نہیں اہم تعلیمی مصنف بھی ہیں۔ اُنھوں نے درسی کتابوں میں ادب اور افادیت کو جس خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے وہ ان کے بعد کسی اور سے ممکن نہ ہوا۔ آزاد نے درسی کتابوں کو بے کیفی اور بے رنگی کے دائرے سے نکال کر تخلیق کی صف میں جگہ دی یہ اُن کا بہت اہم کارنامہ ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اب تک اُن کی شخصیت کے اس پہلو کا پورا جائزہ نہیں لیا گیا۔

آزاد کو بچپن ہی سے تعلیمات سے دلچسپی تھی اور علم کی ترویج و اشاعت کو وہ اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہتے تھے چنانچہ اس زمانے کا ایک واقعہ خود انہیں کی زبانی یوں ہے "جب دہلی کالج مرحوم زندہ تھا اور میری تحصیل اُس کے دامنِ تربیت میں پرورش پا رہی تھی تو ڈاکٹر موہٹ صاحب کمشنر مدارس کلکتے سے تشریف لائے۔ جب کالج میں آئے تو میری جماعت کا بھی جزوی سا امتحان لیا اور ہر طالب علم سے پوچھا کہ تم مدرسے سے نکل کر کیا کرو گے۔ ایک ایک نے اپنا خیال بیان کیا۔ اے میرے پیارے اہلِ وطن! تمہارے آزاد کی زبان سے اس وقت بھی یہی لفظ نکلا کہ تحصیل علم کروں گا اور جو کچھ خیالات ذہن افروز ہوں گے، اُنھیں اپنے اہلِ وطن میں پھیلاؤں گا" بظاہر یہ واقعہ معمولی سا ہے لیکن اس سے آزاد کے رجحانِ طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آزاد کی تصنیفی زندگی کا آغاز درسی کتابوں ہی سے ہوا تھا۔ ادبی تصانیف کے وجود میں آنے سے پہلے اُن کی درسی کتابیں قبولِ عام کا خلعت حاصل کر چکی تھیں۔ آزاد یکم فروری ۱۸۶۴ء کو محکمۂ تعلیمات پنجاب میں ۲۵ روپیہ ماہوار پر اہلمد تنخواہ مقرر ہوئے تھے۔ محکمۂ تعلیم کی ملازمت شروع ہی سے اُن کا مطمحِ نظر تھی لیکن ان کا منصب اہلمدی تنخواہ سے بہت بلند تھا۔ اہلمدی کے باوجود وہ اپنے منصب سے غافل نہیں ہوئے اور محکمے سے منسلک ہونے کے چند مہینے بعد یعنی اٹھارہ جون ۱۸۶۴ء کو انھوں نے عربی قواعد کا ایک مسودہ محکمے کے سامنے پیش کیا۔ ۲- جولائی ۱۸۶۴ء کو انھوں نے منطق کی ایک کتاب تالیف کرنے کی اجازت طلب کی۔ محکمے نے آزاد کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا تھا لیکن ۱۸۶۵ء میں آزاد وسط ایشیا کے سیاسی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اور یہ سلسلہ وقتی طور پر ختم ہو گیا۔

۱۸۶۶ء میں آزاد جب واپس آئے کچھ عرصے انجمن پنجاب سے وابستہ رہے اور پھر محکمۂ تعلیمات میں درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف پر

مامور ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۳ر اگست ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔ اردو کی درسی کتابیں، قصصِ ہند، فارسی کی پہلی دوسری اسی دور کی یادگار ہیں۔ ۲ر اگست ۱۸۷۰ء کو آزاد گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوئے لیکن محکمۂ تعلیم کے ارباب حل و عقد تدریس کے علاوہ درسی کتابوں کی تیاری میں بھی ان سے مدد لیتے رہے چنانچہ ۱۸۰۹ء میں محکمے کے حکم پر انھوں نے قواعد فارسی مرتب کی اور ۱۸۸۴ء میں جامع القواعد تالیف کی۔ آزاد کی تعلیمی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ہمیں ان کی مندرجۂ ذیل تعلیمی تصانیف کا علم ہے۔

(۱) اُردو کی پہلی کتاب سلسلۂ قدیم	(۲) اُردو کی دوسری کتاب سلسلۂ قدیم
(۳) فارسی کی پہلی کتاب	(۴) فارسی کی دوسری کتاب
(۵) اُردو کی پہلی کتاب	(۶) اُردو کی دوسری کتاب
(۷) اُردو کی تیسری کتاب	(۸) اُردو کی چوتھی کتاب
(۹) قصصِ ہند حصۂ دوم	(۱۰) ترجمہ عربک انٹرنس کورس (انگریزی)
(۱۱) جامع القواعد	(۱۲) فارسی قواعد
(۱۳) اُردو قواعد	(۱۴) ترکی قواعد
(۱۵) عربی قواعد	(۱۶) قواعد فارسی برائے مڈل اسکول
(۱۷) آئینۂ صحت	(۱۸) نصیحت کا کرن پھول
(۱۹) قندِ پارسی	(۲۰) آموزگارِ پارسی
(۲۱) کائناتِ عرب	(۲۲) تذکرۂ علماء
(۲۳) حکایاتِ آزاد	(۲۴) شہزادہ ابراہیم کی کہانی
(۲۵) لغتِ آزاد	

اس فہرست سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آزاد کے دائرہ مضامین میں زبان، قواعد، تاریخ، جغرافیہ اور حفظانِ صحت سبھی کچھ شامل ہے۔ اُردو کے کسی دوسرے تعلیمی مصنف کے یہاں مضامین کا یہ تنوع ذرا مشکل ہی سے ملے گا۔ یوں تو آزاد نے اپنی ہر کتاب پر محنت کی ہے لیکن قصصِ ہند اور اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتابوں میں اُن کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ قصصِ ہند آزاد کے اسلوب کا نکھار اور ہماری قدیم تہذیب کا وہ حسن ہے جو پوری طرح کاغذ پر منتقل ہو گیا ہے۔ آزاد طرحِ نو کے نقیب اور تہذیبِ کہن کے عکاس تھے قصصِ ہند اُن کی شخصیت کا پہلا رُخ ہے اور اُردو کی کتابیں دوسرا۔

آزاد نے اُردو کی کتابوں کے دو سلسلے مرتب کئے تھے۔ قدیم اور جدید۔ سلسلۂ قدیم پہلی اور دوسری کتاب پر مشتمل تھا۔ اس سلسلے کی کوئی کتاب اب دستیاب نہیں ہوتی۔ سلسلۂ جدید پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب پر مشتمل تھا۔ آغا محمد باقر صاحب کے بقول یہ کتابیں ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک کے زمانے میں مرتب ہوئی تھیں۔ آزاد کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ یہ کتابیں اُس عہد کے ناظمِ تعلیمات کرنل ہالرائڈ کے نام سے شائع ہوئیں۔ کرنل ہالرائڈ کے نام کے باوجود ان کتابوں کو آزاد کی تصنیف ماننے میں کبھی شبہ نہیں کیا گیا۔ اس دعوے کی خارجی شہادت "تاریخِ گورنمنٹ کالج لاہور" مؤلفہ پروفیسر گیرٹ کے یہ جملے ہیں "پروفیسر صاحب (آزاد) کا ایک مضحک پہلو بھی ہے جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا وہ چغہ پہنا کرتے تھے جس کی ایک آستین خالی رہتی تھی اور اُن کے پاس سواری کے لئے ایک گھوڑا بھی تھا لیکن میں نے اُنہیں کبھی گھوڑے پر سوار نہیں دیکھا۔ گھوڑا ہمیشہ اُن کے پیچھے پیچھے آتا تھا۔" یہی اُردو کی پہلی کتاب میں مولوی صاحب کا گھوڑا تھا۔ داخلی شہادت یہ ہیں

---

[۱] تاریخِ گورنمنٹ کالج لاہور از گیرٹ (انگریزی) صفحہ ۴۲

کے وہ مسودات ہیں جو آغا محمد باقر صاحب کے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔ راقم الحروف نے چاروں کتابوں کے مسودے بخطِ آزاد خود دیکھے ہیں (ہر کتاب کے ایک ایک سبق کا عکس اس نسخے میں شامل بھی ہے) بہرحال نام ہالرائڈ کا تھا، کام آزاد کا۔

ابتدائی اشاعتوں میں ان کتابوں کے سرورق کے بعد ایک وضاحتی نوٹ تھا جو بعد کی اشاعتوں سے خارج کر دیا گیا۔ یہ نوٹ ان کتابوں کے نصب العین کو بخوبی ظاہر کرتا ہے چنانچہ اسے یہاں نقل کرنا ضروری ہے۔

• اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری وغیرہ کتابوں میں دو باتوں کا بڑا خیال رکھا ہے۔ اوّل تو عبارت ایسی ہو کہ لڑکے آسانی سے پڑھنے لگیں، ابتدا میں ان چیزوں کا بیان ہو جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں اور بیان اس طرح ہو جس کے پڑھنے سے اُن چیزوں کے باب میں سوچنے کی عادت پڑے تاکہ جب نئی چیزیں دیکھیں تو آگے غور کرنے کا رستہ دلوں میں پیدا ہو۔ اس طرح آہستہ آہستہ حیوانات۔ نباتات۔ معدنیات کا علم حاصل کریں۔ زراعت اور دنیا کے کاروبار کی مفید مفید باتیں معلوم ہوں اور قدرتی ظہور مثلاً صبح، شام۔ سورج۔ چاند۔ ہوا۔ ابر۔ مینہ، برف وغیرہ کے حالات روشن ہوں اور لڑکے سمجھنے لگیں کہ موسم کیوں بدلتے رہتے ہیں دن رات کیوں گھٹتے بڑھتے ہیں۔ بادل کیونکر بنتے ہیں مینہ کیوں برستا ہے؟ ہوا کیوں چلتی ہے؟ اس کے علاوہ جو ملک نہیں دیکھے اُن کے حالات آسان آسان بیانوں سے بتائے جائیں۔ بیان کا ڈھنگ ایسا رکھا ہے جس سے لڑکوں کو راستی کی طرف توجہ ہو اور نیک اور پاکیزہ باتوں کی محبت دلوں میں بیٹھے۔

ان سب کتابوں میں بہت سی تصویریں ہیں کہ آپ اپنے بیان کی حالتیں دکھاتی ہیں۔ یورپ کا بچہ بچہ فقط تصویر کے دیکھنے سے بہت سی باتیں سمجھ جاتا ہے اور جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ گھر بیٹھے تصویروں ہی سے ملکوں کی اصل کیفیت معلوم کر لیتے ہیں لیکن اکثر اہل ہند کو تصویر کی باریکیاں سمجھنی ایسی مشکل ہیں جیسے غیر زبان کی کتابیں۔ ایک بیل یا گھوڑے یا کتے کا صاف صاف خاکہ کھنچا ہو تو فقط اتنا پہچان لیتے ہیں کہ یہ اُس جانور کی تصویر ہے لیکن اگر وہ کسی جگہ کی تصویر ہو تو اتنا نہیں بتا سکتے کہ اس میں زمین کہاں ہے، پانی کہاں ہے، بادل کون سا ہے، پہاڑ کون سا ہے؟ کس کس قسم کے درخت ہیں، کیا چیز پاس ہے۔ کیا دور ہے؟ جب یہاں بھی یورپ کی طرح بچپن ہی میں تصویروں کا رواج ہو جائے گا تو سب اُسی طرح سمجھنے لگیں گے اور اس کا لطف اٹھائیں گے۔

عبارت صاف اور صحیح پڑھنے کے واسطے ان باتوں کی رعایت رکھی ہے۔ ایک ایک لفظ الگ الگ لکھا ہے۔ اپنے اپنے موقع پر وقف کی علامتیں دی ہیں۔ املا میں تمیز رکھی ہے۔ لفظوں پر کہیں کہیں اعراب دئے ہیں۔ مگر اعرابوں کے قاعدے ایسے باندھے ہیں کہ جہاں اعراب نہیں لکھے وہاں بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ گویا سارے حرفوں پر اعراب آگئے ہیں۔"

یہ سارا بیان بہت واضح اور اہم ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد کے ذہن میں تعلیم کا واضح نصب العین موجود تھا۔ ان کی کتابیں اس کی وضاحت کرتی ہیں آج کے دور میں تعلیم باضابطہ اور سائنٹفک انداز کی حامل بن چکی ہے لیکن کوئی واضح نصب العین ہمارے سامنے نہیں رہا۔ ہم پرانی قدروں اور قدیم ضابطۂ اخلاق سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں۔ نئی قدریں اور نئے ضابطۂ اخلاق پوری طرح تشکیل پا کر ظاہر نہیں ہوئے۔ اس لئے ہماری تعلیم فی الحال خلا میں معلق ہے۔ آزاد کے عہد میں تعلیم کا مقصد بہتر انسان کی تشکیل اور ذہن انسانی کو جلا دینا تھا۔ ہمارے عہد میں تعلیم کا سب سے بڑا مقصد (جملہ مقاصد نہیں) روزی کمانا ہے۔ آزاد کے زوال آمادہ معاشرے میں روحانی قدروں پر نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اعتبار کیا جاتا تھا۔ ہمارے ترقی پذیر معاشرے میں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ زندگی کی کسی قدر پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔ اس وجہ سے ہماری موجودہ درسی کتابوں میں کوئی واضح نصب العین نہیں ملتا۔ اس کمی نے اکثر درسی کتابوں کو خشک اور بے جان بنا دیا ہے۔ ہمارے بیشتر تعلیمی مصنف صرف جلبِ منفعت کو مدِنظر رکھتے

ہیں۔ آزاد کے سامنے جلب منفعت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ آن کے عہد میں اسے بنیادی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ بہر حال ان کے دل میں ایک اُمنگ اور لگن تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے اُنھیں تعلیم کی ترویج و اشاعت کا شوق تھا۔ وہ اسی مقصد کو اپنی زندگی سمجھتے تھے اور جب انھیں درسی کتابوں کی ترتیب کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے نصب العین کی وضاحت کے لئے اپنی پوری شخصیت اور فن کو ان کتابوں میں سمو دیا۔ اردو میں درسی کتابوں کے دو سلسلے بہت مشہور ہیں۔ پہلا سلسلہ آزاد کا ہے دوسرا اسمٰعیل میرٹھی کا۔ دونوں کی بنیادی خوبی واضح تعلیمی نصب العین ہے۔

تعلیمی نصب العین کے ساتھ ساتھ آزاد کے تعلیمی اور نفسیاتی اصول بھی بہت واضح ہیں۔ اُنھوں نے اپنے وضاحتی نوٹ میں تین منزلوں تخیل، تعقل اور تجربے کی نشاندہی کی ہے۔ ان منزلوں سے گزرنے کے بعد طلبہ کے ذہن میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ آزاد کی کتابوں میں یہ تینوں منزلیں بڑی خوبی سے پیش کی گئی ہیں وہ قریبی ماحول اور اجسام کے تذکروں سے خیال آفرینی کے عمل کی ابتدا کرتے ہیں۔ قریبی ماحول اور اجسام کے یہ تذکرے خشک اور بے کیف نہیں ان میں زندگی کی حرارت بھی ہے اور زندگی کا سنگھار بھی ہے اردو میں قریبی ماحول اور اجسام کو آزاد کے سوا کسی نے بھی اس خوبی سے پیش نہیں کیا۔ یہ تذکرے دل موہ لینے والے انداز اور دلچسپی کی وجہ سے ننھے ننھے ذہنوں میں غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ پہلی اور دوسری کتاب میں اسی طرح کے نادر اور دلچسپ بیانوں پر مشتمل ہیں ان دونوں کتابوں میں آزاد نے صرف قریبی ماحول کی اشیا سے واسطہ رکھا ہے اور روزمرہ کی جانی پہچانی چیزوں سے خیال آفرینی کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ انہوں نے روزمرہ کی چیزوں میں نیا پن اور دلکشی پیدا کی ہے اور ان کے ذریعے سے تخیل کو بیدار کیا ہے۔

تخیل سے تعقل کی طرف بڑھنے کا عمل بتدریج شروع ہوتا ہے۔ طلبہ پہلے اپنے جانے پہچانے ماحول اور روزمرہ کی چیزوں کو نئے انداز سے دیکھتے ہیں اور پھر انہیں چیزوں کے ذریعے سے بہت سی نئی باتیں سیکھتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر قریبی اجسام، اُن کی صفات اور خواص کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے تجربے کی منزل کا آغاز ہوتا ہے اور اس طرح تخیل، تعقل اور تجربہ کی تینوں منزلیں بہ آسانی طے ہو جاتی ہیں جانور پرندوں، درختوں اور موسموں کے بیان اسی تعقل اور تجربے کی منزل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عمل بتدریج آگے بڑھتا ہے۔ دماغ کی نشوونما کے ساتھ ترقی کرتا جاتا ہے۔ مشاہدے اور تجربے کی کارفرمائی بڑھتی جاتی ہے تاریخی اور جغرافیائی معلومات اسے اور آگے بڑھاتی ہیں اور صحیح معنوں میں ذہن کو بیدار کر دیتی ہیں۔ آزاد کی ان کتابوں میں ادب اور سائنس کا بڑا خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ سائنس کی بنیاد مشاہدات و تجربات پر ہے۔ آزاد نے مشاہدات و تجربات کو اشیا کی صفات و خواص کے سلسلے میں ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اس وجہ سے یہ کتابیں ادب اور سائنس دونوں پر حاوی ہیں۔

آزاد کی ان کتابوں میں اخلاقی تلقین بڑے صاف اور واضح انداز میں ملتی ہے۔ [illegible] کی درسی کتابوں میں بھی یہ تلقین موجود ہے۔ لیکن دونوں میں فرق ہے۔ آزاد کی اخلاقی تلقین خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہے۔ آج کی کتابوں میں یہ تلقین محض ضابطے کی خانہ پری ہے۔ معاشرے کا مزاج اس طرح تبدیل ہو گیا ہے کہ آج اخلاقیات کی تلقین محض ایک کھوکھلا نعرہ معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کے عہد میں اخلاقیات کی تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے اُنھوں نے صاف اور واضح طریقہ اختیار کیا ہے۔ آج اس کی حیثیت بنیادی نہیں ثانوی ہے۔ اس وجہ سے موجودہ دور کی درسی کتابوں میں اخلاقی تلقین کو نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہے۔

ان کتابوں میں نظم کا حصہ بہت مختصر اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ بظاہر تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان میں سائنس کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ نظم کا شامل نہ ہونا اس حیثیت سے نظر انداز نہیں ہوتا لیکن تنوع کے خیال سے نظم کا حصہ بھی ضروری سمجھا گیا اور آزاد نے بچوں کے جانے پہچانے موضوعات پر چند نظمیں لکھ کر شامل کر دیں۔ اُن کی ایک نظم "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" اس قدر مقبول ہوئی کہ آج بھی یہ سننے میں

آتی ہے۔ لیکن آزاد نے ان نظموں میں بچہ بننے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کا انداز ناصح مشفق کا سا ہے اور بچے پند پذیر دانا پر ذرا کم ہی توجہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نظم کا حصہ نثر کے مقابلے میں بہت پھیکا، دربے کیف سا ہے۔ یہ نظمیں بچوں کے تخیل میں گدگدی نہیں کرتیں۔ اُن کے دل پر اثر انداز نہیں ہوتیں بلکہ بیرنگی اور بے کیفی کا ایک مرقع بن کر سامنے آتی ہیں۔

آزاد کی کتابوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کا رچا ہوا اسلوب اور سلیس انداز ہے۔ وہ آزاد جن کی نثر سراپا شعر کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہے یہاں بالکل نئے انداز سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہاں اُن کے انداز میں وضاحت، سادگی اور تخیل ہے۔ آزاد کی رنگینی میں بھی حسن ہے اور ان کی سادگی میں بھی ایک آن ہے۔ لیکن رنگینی کا حُسن مصنوعی ہے اور اس سادگی کی آن میں فطرت کی معصومیت جھلکتی ہے۔ پہلی کتاب کی لفظی تصویریں اُردو میں اب تک عدیم المثال ہیں۔ آزاد نے موضوع سے ہم آہنگ ہو کر جو تصویریں مرتب کی ہیں ان کی سادگی اور دل آویزی پر ہزاروں رنگینیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

اگرچہ ان کتابوں میں آزاد نے تشبیہ و استعارہ سے کنارہ کشی اختیار کی ہے تاہم اُن کی شخصیت یہاں بھی اپنی پوری جھلک دکھا رہی ہے۔ تخیل کی کرشمہ سازی اور رچانے کا جذبہ دونوں پوری طرح نمایاں ہیں۔ آزاد اپنے اسلوب کے زور سے قاری کے تخیل کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں اور وقتی طور پر ذہن کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ کیفیت یہاں بھی موجود ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے رچے ہوئے اسلوب کے زور اور براہ راست تصویر کشی کے سحر سے طلبہ کی تخیل کو اپنی مٹھی میں لے لیتے ہیں۔ یہاں بھی اُن کی نثر میں موسیقیت اور توازن ہے لیکن یہاں وہ تخیل کی بے اعتدالی کا شکار نہیں ہونے پاتے۔ موضوعات کا محدود دائرہ اُنھیں ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سے علیحدہ نہیں ہونے دیتا۔

آزاد نے چھوٹے چھوٹے جملوں اور آسان زبان میں بانکپن پیدا کیا ہے۔ کہیں کہیں اُنہوں نے قافیہ پیمائی سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً "کشتی صاف ہوئی اور کچھ جھگڑا نہ رہا تو لوگ تالیاں بجائیں گے۔ واہ واہ کا شور مچائیں گے۔ جو یہاں پچھاڑیں گے وہ پھولے نہ سمائیں گے۔ جو پچھڑیں گے وہ شرم کے مارے سر نہ اٹھائیں گے۔" "دم ٹوٹ جائے تو غوطے کھائے، بھنور میں آجائے تو ڈوب جائے۔" "ادھر دین زور پر تھا ادھر دھرم مقابلے پر اڑ رہا تھا۔" لیکن اس قافیہ پیمائی میں تکلف اور آورد کا کوئی شائبہ نہیں بلکہ بے ساختگی اور برجستگی نمایاں ہے۔ یہ بے ساختگی اور برجستگی تخیل کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور یہ احساس نہیں ہوتا کہ انشا پرداز نے اس برجستگی کو بڑی کاوش سے وجود بخشا ہے یہ بے ساختگی اور برجستگی قدرتی اور فطری نہیں۔ بڑے غور و فکر اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔ لیکن آزاد کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اسے فطری بنا دیا ہے۔ یہ قافیہ پیمائی کہیں کہیں ملتی ہے ورنہ عام طور پر آزاد نے سادگی کا جادو جگایا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں اکثر وہ بذاتِ خود بچہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ آزاد جو ظہوری، ابو الفضل اور نعمت خان عالی سے پہلو مارتے تھے ان کتابوں میں گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ باکمال انشا پرداز جب گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور ہوتا ہے تو ایجاد کی ٹہنی میں کمال کے وہ پھول کھلاتا ہے جن کی مہک لازوال ہوتی ہے۔ آزاد کی انفرادیت اور ان کے اسلوب کا بانکپن ان کتابوں میں ہر جگہ نمایاں ہے اُنھوں نے تشبیہ، استعارے اور تلازمے سے گریز کرنے کے باوجود اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ جگہ جگہ اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں "خدا جانے رات کتنی اوس پڑی ہوگی، سارے کھیت میں موتی سے شبنم کے قطرے ہی قطرے جھلک رہے ہیں۔ سویرے سویرے جب پھول کھلے ہوتے ہیں۔ ننھے ننھے اودے اودے۔ ان کے چمکتے دمکتے چہرے، ہرے ہرے پتوں میں کیا بہار دیتے ہیں۔ یہ درخت نہروں اور کنوؤں کے پیاسے نہیں۔ شبنم ان کی جان ہے۔ اُس کی بدولت پھلتے پھولتے ہیں۔ دن بدن بڑھتے اور مضبوط ہوتے جاتے ہیں۔ اوس راتوں میں برابر پڑتی رہے تو کسانوں کے گھر بھر دے۔" "[illegible] کے نیچے جہاں زمین آسمان ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں وہاں سے ایک سونے کا تھال ڈھلک ڈھلک کرتا اُبھرتا چلا آتا ہے۔" "ہائے گرمی۔ جوں جوں دھوپ چڑھتی ہے منہ اترتے جاتے ہیں۔ سورج نکلتے ہی کیسی ہوا گرم ہوگئی۔ دھوپ کی چمک آنکھوں

سے دیکھی نہیں جاتی۔ کیا کوئی لکھے۔ کیا پڑھے، ہوش ٹھکانے نہیں۔ پسینے بہتے ہیں۔ مکھیاں ستاتی ہیں۔ زمین آسمان تپ رہے ہیں۔ درخت سُندر ہیں۔ جانور بچاروں کا دم گھٹتا ہے تو چونچیں کھول دیتے ہیں۔ دھوپ سے بچاؤ کے لئے ٹہنیوں میں گھسے جاتے ہیں۔ وہ بہت والا پیس برس تک ایسی لڑائیوں میں پھنسا رہا جن میں اُس کی طاقت اور حریف کے زور میں پاسنگ کی نسبت تھی۔ اس پر بھی کبھی میدانوں میں دھاڑے مارتا اور جو سامنے آتا اُسے فنا کر دیتا۔ کبھی ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ جا نکلتا۔ کہنے کو پہاڑی اناجوں سے پلتا۔ وہ بھی نہ ہوتا تو جنگل کے پھل پیدا ہوتے سے گزارا کرتا۔ یہ مثالیں کسی کاوش کے بغیر جمع کی گئی ہیں۔ چاروں کتابیں اسی منفرد اسلوب سے مالا مال ہیں۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک صاحب طرز انشاپرداز، ایک قادر الکلام ادیب کی تحریر ہے۔ اس تحریر میں جو توازن اور قوت ہے وہ ایک عمر کی محنت اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔ ان کتابوں میں آزاد نے رنگینی اور تشبیہ و استعارہ کے بجائے بیان واقعی کو اپنایا ہے۔ اس طرح وہ بچوں کے دل میں گھر بھی کر گئے ہیں اور درسی کتابوں کے لئے صحیح اسلوب کا راستہ بھی دکھا گئے ہیں۔

آزاد کے اسلوب پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری قوت مُدرکہ کی تسکین نہیں کرتا۔ اس اعتراض کی صحت میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ آزاد کا اسلوب ذہن کو سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ لیکن ان کتابوں میں آزاد کا اسلوب تخیل سے تعلق رکھنے کے باوجود قوتِ مُدرکہ کو تشنہ نہیں رہنے دیتا۔ اگر قوتِ مُدرکہ تشنہ رہ جاتی تو پھر تعقل کی منزل بھی طے نہ ہوتی۔ آزاد عام طور پر نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ اُن کی نثر میں وضاحت تشریح اور تجزئے کے عناصر عام طور پر نہیں ملتے کیونکہ اُن کا طریقہ کار مجازات پر مبنی ہے۔ ان کتابوں میں انہوں نے وضاحت، تشریح اور تجزئے سے کام لیا ہے لیکن یہ تینوں عناصر تخیل میں ڈوب کر ایک نئے حسن کے حامل ہو گئے ہیں۔ ان میں بلاغت اور قوت کے ساتھ ایک خاص طرح کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ اُردو میں بہت سی درسی کتابیں تالیف ہوئی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر معلومات کے ذخیروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان کا اسلوب یکسر خشک اور بے کیف ہوتا ہے۔ اسلوب کا وہ رچاؤ جو آزاد کی کتابوں کی خصوصیت ہے اسمٰعیل میرٹھی کی کتابوں میں بھی موجود نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسمٰعیل کی کتابوں میں نظم کا حصہ بڑا جاندار ہے لیکن نثر میں آزاد کا پلہ بھاری ہے۔ بچوں کی دلچسپی قائم رکھنے اور تخیل کو بیدار کرنے کے لئے اُنہی کی زبان میں باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ آزاد نے بھی کوشش کی ہے لیکن اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسلوب کی دل آویزی میں اُردو کی کوئی درسی کتاب اب تک آزاد کی کتابوں کی حریف نہیں ہو سکی۔

درسی کتابوں کے سلسلے میں مقامی ضروریات کی کفالت کو بھی مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی درسی کتاب اپنے ماحول، مقام اور علاقے سے پوری پوری مطابقت نہیں رکھتی تو اس کا افادی پہلو بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کتابیں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں جو برصغیر کے انگریزی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان میں سے بیشتر کتابیں انگلستان کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں اور وہاں کی خصوصیات کے پیش نظر معرض وجود میں آتی ہیں۔ ہمارے نوعمر طلبہ ان کتابوں کے ماحول اور اپنی روزانہ زندگی میں نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں۔ یہ فرق آہستہ آہستہ ایک ذہنی کشمکش کی شکل اختیار کرتا ہے۔ دل و دماغ مسموم ہو جاتے ہیں اور نتیجہ "ٹیڈی ازم" کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ آزاد کی کتابوں میں مقامی ضروریات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ کتابیں اُس دور میں بھی مقامی ضروریات کی کفالت کرتی تھیں اور آج بھی ان کی افادیت کا یہ پہلو برقرار ہے۔ پہلی کتاب کے بعض مناظر اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ لیکن ان کی شگفتگی میں کوئی شبہ نہیں۔ بعد میں محکمۂ تعلیمات نے تصرف کر کے انہیں زمانۂ حال سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کسی قدر کامیابی بھی ہوئی ہے۔ دوسری کتاب سے قریبی اجسام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی افادیت آج بھی مُسلّم ہے۔

درسی کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کی تدریس میں کم سے کم نگرانی کی ضرورت پیش آئے اور ناتجربہ کار اساتذہ بھی

بادرسے یقین اور اعتماد کے ساتھ اسے پڑھا سکیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی آج بھی ہے اور آزاد کے عہد میں بھی تھی۔ اس وجہ سے یہ مسئلہ ہر دور میں پریشان کن ثابت ہوا ہے۔ مسئلے کی اس اہمیت کے باوجود ایسی درسی کتابیں خال خال ہی نظر آئیں گی جن میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہو۔ آزاد کی کتابوں میں جانے پہچانے ماحول اور دلچسپی کے عنصر نے اس خوبی کو بہت نمایاں کر دیا ہے۔ ان کی تدریس میں کہ سے کم نگرانی کی ضرورت پیش آتی ہے اور ناتجربہ کار اساتذہ بھی انہیں پورے اعتماد کے ساتھ پڑھا سکتے ہیں۔

معنوی حیثیت سے قطع نظر صوری اعتبار سے بھی یہ کتابیں نئی اور انوکھی تھیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کتابوں کی طباعت کے لئے اوقاف وغیرہ کے سائنٹفک اصول وضع کئے گئے تھے۔ اُردو عبارت کو سائنٹفک انداز میں لکھنے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو اس حد تک کامیاب ہوا کہ آج بھی اس کی پیروی کی جاتی ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آزاد کی کتابیں معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے سائنسی بنیاد رکھتی ہیں۔ دوسری خصوصیت ان کتابوں کی خوب صورت اور موزوں تصویریں تھیں جنہیں بڑے اہتمام سے بنوایا گیا تھا۔ راقم الحروف کی نگاہ سے ان کتابوں کے جو قدیم ترین نسخے گزرے ہیں اُن کی تصاویر مشہور انگریزی مصنف ـــ (رڈیارڈ کپلنگ) ـــ کے والد ـــ (جان لاک وڈ کپلنگ) ـــ کی بنائی ہوئی تھیں۔ بچّوں کی کتابوں میں تصویروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آزاد کی کتابیں اُردو کی پہلی درسی کتابیں ہیں جن میں تصویروں کی اہمیت کو مدّ نظر رکھا گیا ہے اور تخیل کو مہمیز کرنے کے لئے ان سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔

اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب اُردو درسیات میں اولیت کا شرف رکھتی ہیں۔ ان کی تاریخی اور افادی حیثیت مسلّم ہے اور اُن کے ساتھ ساتھ نادر اور پُرکار اسلوب کی وجہ سے اُردو ادب میں بھی ان کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ کتابیں ایک جلیل القدر فن کار کے اسلوب کی بے تکلفی ہیں۔ وہ تبسم ہیں جن میں فطرت کی معصومیت اور سادگی جھلکتی ہے۔ ان میں قوسِ قزح کے رنگ اور رنگوں کی خوشبو ہے۔ آزاد نے یہ کتابیں فرائض منصبی کے سلسلے میں مرتب کی تھیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس کام کو معمولی طریقے پر انجام دے سکتے تھے لیکن ایک سچے فن کار کی طرح اُنہوں نے ان کھلونوں کی تعمیر میں بھی اپنی پوری قوت اور فن کا مظاہرہ کیا ہے اسی فن کاری اور خلوص کی وجہ سے یہ کتابیں درسی کتابوں میں کلاسیکی حیثیت رکھتی ہیں اور اُن کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے۔

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ تیسری کتاب آزاد کی تصنیف نہیں ہے۔ راقم الحروف نے یہ بات بعض ایسے ثقہ بزرگوں سے بھی سُنی ہے جن کی علمی دیدہ وری اور دیانت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن تحقیق کی رُو سے تیسری کتاب بھی آزاد ہی کی ملک ٹھہرتی ہے۔ اس دعوے کا پہلا ثبوت تیسری کتاب کا وہ مسودہ ہے جو آج بھی آغا محمد باقر صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے بچشمِ خود اس مسودے کو دیکھا ہے اور اس کے ایک صفحے کا عکس اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ دوسری دلیل محکمۂ تعلیمات پنجاب کی ایک دستاویز ہے جس میں بصراحت مرقوم ہے کہ ..... "اُنھوں (آزاد) نے محکمے کے لئے مندرجۂ ذیل کتابیں تالیف کیں۔

(۱) اُردو کی پہلی کتاب، سلسلۂ قدیم
(۲) اُردو کی دوسری کتاب سلسلۂ قدیم
(۳) فارسی کی پہلی کتاب
(۴) فارسی کی دوسری کتاب
(۵) اُردو کی پہلی کتاب
(۶) اُردو کی دوسری کتاب
(۷) اُردو کی تیسری کتاب
(۸) اُردو کی چوتھی کتاب
(۹) قصصِ ہند حصہ دوم
(۱۰) ترجمہ [illegible] انٹرنس کورس (انگریزی)
(۱۱) جامع القواعد [illegible]

۱۔ یہ دستاویز جس پر ۹ جون ۱۸۷۲ء کی تاریخ درج ہے آغا محمد باقر صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

تیسری دلیل اس کتاب کا اسلوب ہے۔ آزاد کا اسلوب مُشک کی طرح خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے تاریخی حالات بھی لکھے ہیں، جو قصص ہند حصہ دوم کے بعض تاریخی قصوں کا عکس لطیف ہیں۔ یہ بھی ایک بڑی مستحکم شہادت ہے جو آزاد کے حق میں ہے۔ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ تیسری کتاب بھی آزاد ہی کی تصنیف ہے۔ اسے آزاد کی تصنیف نہ ماننا آزاد کے فن کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

زیر نظر اشاعت میں کتابوں کے متن قدیم ترین نسخوں سے مرتب کئے گئے ہیں۔ پہلی کتاب کا متن جس نسخے پر مبنی ہے وہ ۱۸۴۸ء کا مطبوعہ ہے یہ اس سلسلے کا قدیم ترین نسخہ ہے جو راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ دوسری کتاب کا کوئی قدیم نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس کا متن جس نسخے پر مبنی ہے وہ مفید عام پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔ اس پر تاریخ طباعت درج نہیں ہے تیسری کتاب کا متن ۱۸۸۵ء کے مطبوعہ نسخے پر مبنی ہے۔ اس سے بعض دلچسپ باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلی تو یہ کہ یہ اس کتاب کی تیرھویں اشاعت تھی۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں اس کتاب کی قیمت دو آنے نو پائی تھی۔ قیمت کا یہ تصور آج کے عہد میں یکسر محال ہے۔ پہلی اور تیسری دونوں کتابیں چھوٹے سائز پر ہیں۔ کاغذ بادامی ہے اور طباعت بہت روشن ہے۔

اردو کی پہلی کتاب

مولانا آزاد کے قلمی مسودے کا ایک ورق

بابر کا فارسی، ترکی اور اردو کلام

ڈاکٹر محمد صابر

ظہیر الدین محمد بابر[1] پادشاہ غازی بن عمر شیخ بارلاسی[2] نے سرزمین ہند میں آخری ترکی سلطنت کی بنیاد رکھی، جسے غلطی سے "مغل" یا "منگول" بھی کہتے ہیں۔ بابر پایہ کا شاعر اور عظیم فوجی لیڈر تھا یہ تو سب جانتے ہیں، لیکن اس کی تصانیف اور خاص کر شاعری سے بہت لوگ ناواقف ہیں۔

بابر کی شاعری پر مفصل تبصرہ کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے البتہ اس کا فارسی کلام اور چند ترکی اشعار بطور تعارف پیش کئے جا رہے ہیں جو اردو خوانوں کے لئے فرد بنے ہونگے۔ دراصل یہ فارسی کلام آج تک ہند یا پاکستان میں شائع نہیں ہوا۔ چند ترکی اشعار کے ساتھ اردو کا ایک شعر بھی بطور نمونہ شامل کر دیا گیا ہے جو دراصل صنعت ملمع سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک بابر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا تعلق ہے اس پر ان اشعار سے روشنی تو ضرور پڑے گی لیکن صرف انہی چند اشعار کو دیکھ کر اس کی شاعری کی بابت مفصل رائے قائم کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس کے لئے تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ترکی دیوان کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

بابر کو شاعری سے شغف اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی عمر ۱۷ سال تھی اور وہ فرغانہ میں مقیم تھا۔ اس نے اپنی "توزوک"[3] (TUZUK) میں بہ تفصیل تذکرہ کیا ہے کہ ترکستان کے شہر فرغنہ میں محلہ اردو بازار کے بابری (BABURI) نامی ایک بھولے اور خوبرو لڑکے پر فریفتہ ہونے کے باعث اس کا امن و چین سب غارت ہو گیا۔ اس اشتیاق کے باوجود وہ بابری کی جانب مارے شرم کے نگاہ تک نہیں اٹھا سکتا تھا۔ غرض کہ یہی آتش عشق بابر کو سوز و گداز کی وادی میں لے گئی۔

بابری کے خیال میں بابر مرزا کے زبان سے زندگی میں جو پہلا زوردار شعر نکلا وہ یہ ہے[4]:

---

[1] ـ بابر یا ببر غلط تلفظ ہے۔ بابر کے ترکی دیوان نے اس مسئلے کو حل کر دیا ہے جس میں یہ لفظ ہمیشہ "تفکر" "تصور" کے قافیہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ترک اس کا تلفظ بابُر ہی کرتے ہیں املا چاہے کچھ بھی ہو۔

[2] ـ بابر کا تعلق مشہور ترکی قبیلہ "بارلاس" (BARLAS) سے تھا۔

[3] ـ توزوک کے لفظی معنی قانون، قاعدہ، اصول اور نظام کے ہیں اس کا املا توزک، تزوک، تزک بھی ہے لیکن تلفظ ہمیشہ "تُزک" ہی ہوتا ہے۔

[4] ـ ملاحظہ ہو تزک بابری۔ صفحہ ۷۹۔ فرغانہ واقعات از ۹۹ء تا ۱۵۰۰ء)

(ا) جدید ترکی ترجمہ از پروفیسر رحمتی ارات۔ فقرہ ۱۹۴۳ء

(ب) ملاحظہ ہو اردو ترجمہ از نصیر الدین حیدر۔ صفحہ ۱۰۸۔ بک لینڈ کراچی ۱۹۶۲ء

ہیچ کس چوں من خراب و عاشق و رسوا مباد[1] ہیچ محبوبی چو تو بے رحم و بے پروا مباد

اس وقت تک بابر آکا دکا شعر کہہ لیا کرتا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد وہ شعر شاعری کے چمن کا بلبل زار بن گیا۔

ترکی شاعر میر علی شیر نوائی اور ترکی لہجوں پر ریسرچ کے دوران استانبول یونیورسٹی میں بابر کا ایک ترکی دیوان میری نگاہ سے گذرا جو معمولی کتابوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا (دوسرا اہم نسخہ بھی استانبول ہی میں "توپ قاپی کتب خانہ سی" میں موجود ہے) پڑھنے کے بعد میں نے نور الدین بک (مدیر کتب خانہ) سے اس کی اہمیت بیان کی اور فوراً ہی عجائب گھر میں رکھوا دیا تاکہ یہ صاف اور نایاب نسخہ لاپرواہی کا شکار نہ ہو جائے۔ اس دیوان کے شروع میں تیموریوں کے خاندانی پیر حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نقش بندی کی مشہور فارسی کتاب "رسالۂ والدیّہ" (VALIDIYYA)[2] کا منظوم ترجمہ ہے جو بابر نے خود کیا تھا۔

دیوان میں ترکی اشعار کے خاتمہ پر ہی ورق ۹۹ ب سے فارسی اشعار شروع ہوتے ہیں اس دیوان کے علاوہ میں نے دیگر دیوانوں کا بھی مطالعہ کیا ان میں بھی تقریباً کم و بیش یہی اشعار ہیں جنھیں مشہور روسی عالم سامایلووچ SAMAYLOVICH نے ترکی دیوان شایع کرتے وقت شامل کر لیا تھا اس کا ایک نسخہ "کتب خانۂ ترکیات" استانبول میں موجود ہے۔

میں جس دیوان سے ان اشعار کو ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وہ "خاقان ابن خاقان سلطان ابن سلطان خلیفہ عبد الحمید خاں" کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے جس کا پرانا نام ییلدیز (YILDIZ) ہے اور جو آجکل استانبول یونیورسٹی لائبریری کی تحویل میں ہے اس کا نمبر "۳۴۳۷ ت" ہے

رسالۂ والدیّہ کے اختتام اور ترکی اشعار سے پہلے مندرجۂ ذیل سطور تحریر ہیں:

نقلها بلا واسطه فی نسخته الشریفه التی حرّرها المؤلف خلد الله ملکه وارجو من الله ان ینتفع بها الطالبین

اشعار کی تفصیل

فارسی کے معلوم اشعار کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ترکی دیوان میں فارسی اشعار کی تعداد	۶۱
(۲) تزوک میں فارسی اشعار کی تعداد	۱۴
(۳) تزوک و دیوان کے علاوہ اشعار کی تعداد	۸
کل میزان =	۸۳

ان میں سے ۱۱ اشعار دیوان اور تزک میں مشترک ہیں اس لئے ۱۱ اشعار کو کم کرنے کے بعد صرف ۶ درجن (۷۲ عدد) اشعار ہی رہتے ہیں۔
اس سلسلے میں میرا اپنے اساتذۂ کرام پروفیسر علی نہاد تارلان (ترکی میں اقبال کا تعارف کرانے والی ہستی) اور پروفیسر رحمتی ارات کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے چاغاتائی ادب (بابر کی ترکی کو غلطی سے چاغاتائی CHAGHATAY بھی کہتے ہیں) ترکی شاعری اور خاص کر میر علی شیر نوائی اور بابر کے کلام کو سمجھنے میں میری تین سال تک مسلسل رہنمائی فرمائی اور ہر طرح سے مدد کی اس ضمن میں۔۔ جناب شان الحق حقی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ترکیات کے موضوعات میں دلچسپی لیکر مجھے "اردو میں ترکی، منگولی عناصر"، "لفظ اردو کی تاریخ"، "بابر کے علمی، ادبی کارنامے" اور "بابر کے فارسی اشعار" پر مقالات لکھنے کی ترغیب دی۔ اس برصغیر کے لوگوں

---

[1] ترکی دیوان میں یہ شعر ایک غزل کے بعد ہے یعنی نواں شعر ہے۔
[2] افسوس ہے کہ ہندوستان والا نسخہ میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ ہند سے فوٹو کاپی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن آج تک نہیں مل سکی۔

کے سامنے بابرؒ کے فارسی اشعار پہلی مرتبہ ترتیب کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں اور اردو ہی کے ذریعہ جس سے بابر کو گہری دلچسپی تھی اور جس کی ترقی و ترویج میں اس کی اولاد کا زبردست حصہ ہے۔

فارسی اشعار کے قبل بابر کا ایک فارسی مکتوب درج ہے، جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

بابر کا ایک خط

ورق ۹۹ب مکتوب مرغوب کہ مصحوب یکی از اسباب القلوب بود در ایمن اوقاف و اسعد ساعات رسید نہ چندان بہجت و سرور و خرمی و حضور برین دل و جان بجور روی نمود کہ در حیز تقریر آید و یا در حیطہ تحریر گنجد ملتمسانی کہ بدان افتخار داشت و متمنیاتی کہ از آن انتظاری برد از زبان قلم مذکور و بر روی نامہ مسطور بود و التماس و تمنی بر حسب دلخواہ و مدعا بحصول انجامیدہ و بوصول رسیدہ قاصدی بسوی مقصود روانہ کردہ شد مقدار یک کف اشرفی از حامل رقعہ طلب نماید۔
۸۰۲

تحریرانی ۹۳۰ " ۹۹ب

اشعار فارسی

ای ماہ شام وصل تو صبح سعادتست
روز جدائی تو ولے شام محنتست
جانم بکن جراحت و راحت رسان بدل
از تو بجان خستہ جراحت چو راحتست
خالے کہ ماندہ برج لالہ گون خویش
بر جان بیدلان تو آن داغ حسرتست
از کام جام بادہ بگیرید کام دل ...
اکنون کہ وقت بادہ و ہنگام عشرتست

ورق ۱۰۰الف گر ریخت یار خون تو زنہار دم مزن
خوش باش بابرا کہ ہمیں دم غنیمتست
لالہ سا داغ از آن دم کہ بدل حاصل بود
داغ عشق تو مرا لالہ صفت بر دل بود
عمر من رفت و مرا فرقت او ساخت ہلاک
چکنم عمر من دل شدہ مستعجل بود
بابر از عقل فرو مایہ چہ تشویش کشید
ای خوش آن دم کہ زمی بیخود و لا یعقل بود
ہیچ کس چون من خراب و عاشق و رسوا مباد
ہیچ محبوبی چو تو بے رحم و بی پروا مباد
تا چند در فراق تو سوزیم ہمچو عود ...
چون بوی درد ہیچ نداری ازین چہ سود

سلطا۔ تزک میں بھی ہے ملاحظہ ہو تزک میں فارسی اشعار" • فرغانہ میں ۹۹ھ اور ۱۵۰۰ء کے درمیان لکھا گیا۔

خراباتی و رند و می پرستم
بعالم هر چه میگویند هستم

تا به زلف سیهت دل بستم[1]
از پریشانیٔ عالم رستم ....

دل شد اسیر دردی یار جانی
درداکه او نکرد بدل مهربانی ...

هر دم از شوق تو ام میشود افزون گریه
میکنم در هوس لعل لبت خون گریه

ورق ۱۰ اب همه در پیش تو مقبول و مرا رد کردے
بابدان نیک شدی و دل من بدکردی

چوں یار بیوفایم هر دم به عمر د زیدست
کردیم ترک عشقش عاشق شدن چه قیدست

هستیم خوار وزار و اسیر و غریب هم
دور از دیار و یار و به محنت قریب هم

هلاک می کندم فرقت تو دانستم
وگرنه رفتن ازیں شهر می توانستم[2]

آں ماه را ز سوز خود آگاه چوں کنم
امکان دم زدن نه بود آه چوں کنم

از یار و از دیار چوں من بی نصیب نیست
گر یار بنده را بنوازد غریب نیست

آں دل آزاری که باشد در دل آزارم از و
فی المثل حور و پری باشد که بیزارم از و

ز جور دور زماں چند پیچ و تاب خوریم
کجاست یک دو حریفی شراب ناب خوریم

ببیرابه بازار آں کوفته
لبی را ببازار آں کوفته

بسوی که ز تقاضای ددر آمده ایم
مگو بمیل تو مارا بجور آمده ایم

چو یادی چو ما مبتلای تو ایم
به هندوستان از برای تو ایم ....

رباعیات!

من بندهٔ روی میر احمد قاسم . آشفتهٔ موی میر احمد قاسم
ورق ۱۱ الف - هر لحظه بلای دگر آرد بر سر — این شیوه و خوی میر احمد قاسم
- خواهیم که حنفیه غمگسارم باشد — درمان و دوای درد دل زارم باشد

---

[1] تزک میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں موجود ہے دیگر نسخوں میں " بزلف سیاهش " ہے یہ شعر ابوالفضل کو بہت پسند تھا ملاحظہ ہو آئین اکبری)

[2] تزک میں جن حصوں کا اضافہ ہوا ہے اس میں یہ شعر موجود ہے جسکا تذکرہ آئندہ کر دیا جائیگا ابوالفضل کو یہ شعر بھی پسند تھا ملاحظہ ہو اکبر نامہ " بزم تیموریہ " اور " ارمغان پاک " وغیرہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

هر روز و همه شب ز خدا می خواهم — یعنی شب و روز در کنارم باشد
روی چو مهه حنیفه را بنده شوم — موی سیه حنیفه را بنده شوم
خوی تبهش گرچه بلای جانست — خوی تبه حنیفه را بنده شوم
تا صد یمن آورد سلامت ای دوست — خوش حال شدم ز ذکر نامت ای دوست
تا نام سلام باشد اندر عالم — نامی باشی و هم سلامت ای دوست
تو صاحب این مقبره پیر همه دان — در هر غم و غصه دستگیر همه دان
خوانم بتو از من بشنو تا دانی — داند علی بخوانش و میر همه دان
ای ملک مدار معدلت آثاری — باید که فراموش نگردد یاری
در گوشه افتادم از خاطر دور — غم نیست اگر گوشه خاطر داری

مدن ۱۰ ب درویشان را گرچه نه از خویشانیم[1] — لیک از دل و جان معتقد ایشانیم
دور است مگوی شاهی و درویشی — شاهیم ولی بندهٔ درویشانیم

ارمغان پاک میں "شاہی از درویشی" ہے۔ دیگر نسخوں میں "گرچہ" کے بجائے "اگر" ہے۔

ای آنکه بود بکام چرخ فلکت — بر رای تو می کند همیشه حرکت
از تو گله نیست لیک آن نوع بکن — ایمن شود این فقیر از جانبکت
نام تو میان عجم و هم عرب است — وز نامهٔ تو در دل محزون طرب است
هرکس ز معما بدر آرد نامی — نام از تو بر آورده معما عجب است
پندی ز رفیقان نشنودی رفتی — چندی به حریفان ...... رفتی
از تو بدی نبود در خاطر ما — رفتی تو نه نیک هرچه بودی رفتی

مدن ۲۰ الف ایدا ختم لب چه از شست بدست — چون نیست عمل علم چه سود ست بدست
دشتم[2] بگرفتی داری خرسندم — امید که وارسته شوم دست بدست
مده بخویش دگر زحمت ای قرا چهره[3] — میان ما و جوانی ترا چه تشویش است
من و حکایت خود با جوان بی ریشی — تو ده لحیفه خود چون میانجی درویش است

---

[1] تزک میں جو حصے اضافہ کئے گئے ہیں ان میں یہ اشعار موجود ہیں (ملاحظہ ہو۔ جدید ترکی ترجمہ۔ پروفیسر رحمتی آرات جلد دوم صفحہ ۵۳۴ جو میرے خیال میں ترکی دیوان ہی سے لیکر لکھ دئے گئے ہیں کیونکہ دیوان کے دو اور اشعار کو بھی اضافہ والے حصے میں دکھایا گیا ہے:

ہلاک میکندم فرقت تو دانستم — دگر نه رفتن ازین شهر می توانستم
تا بزلف سیاهش دل بستم — از پریشانی عالم رستم

[2] مخطوطہ میں اسی طرح ہے۔
"اکبر نامہ" اور "بزم تیموریہ" میں یہ نقل ہوا ہے۔

[3] قرا کا لفظ ترکی ہی پڑھا جاسکتا ہے جس کے معنی ترکی میں سیاہ کے ہیں۔

بسی اسپان تازی ماندہ لاغر	شدہ کاروان ناصحبا رفتہ بہ
چہ باید کرد کار دہر دون را	جوی طالع ز خر دار ہنر بہ
قرار و عہد بیار آں چنیں بنود مرا[۱]	گزید ہجر و مرا کرد بیقرار آخر
لبعشوہ ہای زمانہ چہ چارہ سازد کس	بجور کرد جدا یار را زیار آخر
سیمیا جستہ ام نیافتہ ام	مگر ایں علم کیمیا دارد ...
رفت از یاد جملہ از افلاس	مگر ایں علم سیمیا دارد ...

(حاشیہ: وقت بوب)

اس میں "سیمیا" اور "سیم یا" ملاحظہ ہو۔

یا ترک دلیری مکن اے میر بیانہ	چالاکی و مردانگی ترک عیالت
گرز و دنیائی ولفیحت نکنی گوش	آنجا کہ عیالت چہ حاجت بہ بیانت[۲]
در ہوائے نفس گمرہ عمر ضایع کردہ ایم[۳]	پیش اہل اللہ ز افعال خود شرمندہ ایم
یک نظر با مخلصان خستہ دل فرما کہ ما	خواجگی را ماندہ ایم و خواجگی رانیدہ ایم[۴]
بندہ در حلقہ اشراف دگر	نرود گر ہمہ سر حلقہ کنی
بندۂ حلقہ بگوش تو شدم	زاں میاں نام من از حلقہ کنی

اس میں "حلقہ کنی" کے معانی پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تزک میں فارسی اشعار

ترکستان　(واقعات فرغنہ از ۹۰۵ ہجری مطابق ۱۴۹۹ء تا ۱۵۰۰ء)

اردو بازار کے ایک لڑکے پر عاشق ہونے کے بعد ترکی و فارسی شاعری کا آغاز ہوا اور بابر کی زبان سے پہلا شعر یہ نکلا۔

ہیچ کس چوں من خراب و عاشق و رسوا مباد　　　　ہیچ محبوبی چو تو بے رحم و بے پروا مباد

ترکی دیوان میں یہ تو اں شعر ہے جس کے قبل ایک غزل ہے جو اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے ترکستان میں قیام کے دوران بابر نے فارسی کا صرف یہی شعر نقل کیا ہے۔

افغانستان　[کابل کے واقعات از ۹۲۵ ہجری مطابق ۱۵۱۹ء]

کابل میں قیام کے دوران بابر نے اپنے مصاحب خواجہ کلاں کو یہ قطعہ لکھکر روانہ کیا جبکہ وہ بجور (BAJOR) میں مقیم تھے۔

---

[۱] تزک میں بھی ہے۔ ۱۵۰۶ اور ۱۵۰۷ کے درمیان کابل میں احاطۂ تحریر میں آیا۔ ملاحظہ ہو تزک کے فارسی اشعار

[۲] یہ آخری مصرع بابر کا نہیں بلکہ کسی دوسرے فارسی شاعر کا ہے جو ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہے یہ اشعار تزک میں بھی ہیں۔

[۳] اس دیوان میں "نفس کہ" ہے بزم تیموریہ میں "نفس گمرہ" ہے جسے زیادہ صحیح سمجھتا ہوں

[۴] بزم تیموریہ میں "خواجگی رابندہ ایم" ہے لیکن میں "خواجگی رانیدہ" کو زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

قرار وعہد بیاران چنیں بنود مرا[1] — گزید ہجر و مرا کرد بیقرار آخر
بہ عشوہ ہائے زمانہ چہ چارہ سازد کس — بجور کرد جدا یار را زیار آخر

لفظ "بجور" پر بھی غور کی ضرورت ہے بجور علاقے کا نام ہے اور "جور" بمعنی ظلم۔

ہندوستان

(واقعات از ۹۳۲ ہجری مطابق ۱۵۲۵ تا ۱۵۲۶ء)

بابر کی ایک مجلس میں محمد صالح کا مندرجہ ذیل شعر:

محبوبی ہر عشوہ گری را چہ کند کس — جائی کہ تو باشی دگری را چہ کند کس

پڑھا گیا جس کے مطابق شعرا کو شعر کہنے کی اجازت ملی لوگوں نے کہنا شروع کر دیا۔ ملا علی خاں سے بابر کا کافی مذاق ہوتا تھا اس نے اس کے منہ سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا:

مانند تو مدہوش گری را چہ کند کس[2] — نر گاؤ کسے مادہ خری را چہ کند کس

بابر نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن بہت شرمندہ ہوا کیونکہ ان دنوں مشہور کتاب "مبیّن" کو لکھ رہا تھا جو فقہی مسایل کے متعلق ہے۔

بابر نے اس شعر کے بعد ہزلیات سے توبہ کر لی۔ بابر کی ہزل کے نمونے ہم تک نہیں پہونچے۔ کیونکہ بابر نے ان سب کو ضایع کر دیا تھا۔

ہندوستان میں ہندوؤں کے خلاف جنگ کے موقع پر بابر کی فوج کا عجیب عالم تھا نہ ہندوستان کی زبان سمجھتے اور نہ بابر ان کی زبان کو جانتا تھا اس موقع پر اس نے یہ شعر چست کیا:

پریشان جمعی و جمعی پریشان . . . . — گرفتار قومی و قومی عجائب

اس بات کا بھی امکان ہو سکتا ہے کہ بابر نے اس موقع پر کسی دوست کا یہ شعر نقل کیا ہو۔

بابر نے امیر بیانہ نظام خاں کو اپنے آدمی قلندر پیادہ کے ذریعہ فرمان تہدید روانہ کیا اور اسی میں مندرجہ ذیل قطعہ بھی لکھ کر دشمنوں کے ساتھ ساز باز نہ کرنے کی تلقین کی:

با ترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ[3] — چالاکی و مردانگی ترک عیانست
گر زود نیائی و نصیحت نکنی گوش — "آنجا کہ عیانست چہ حاجت بہ بیانست"

اس میں بابر نے اپنی ترکیت کا اظہار کھلم کھلا کر دیا ہے جو لوگ اسے مغل کہتے ہیں وہ اس شعر پر ضرور غور کریں یہی نہیں بلکہ دیوان اور تزک میں کئی جگہ ترک ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

واقعات از ۹۳۳ ہجری مطابق ۱۵۲۶ء تا ۱۵۲۷ء

جنگ خانوہ سے قبل ہی بابر نے شراب نوشی ترک کر دی تھی اور ساغر و مینا کو چکنا چور کر کے ایک گڑھے میں دفن کروا دیا تھا۔ مندرجہ بیت توبہ کے متعلق ہے:

---

[1] دیگر نسخوں میں "این چنیں" ہے یہ قطعہ دیوان میں بھی ہے۔

[2] جدید ترکی ترجمہ (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸۹) میں یہ شعر اس طرح ہے کہ — مانند تو مدہوش گیرا چہ کند کس۔ ہر گاؤ کن مادہ خر یرا چہ کند کس
اصل ترکی نسخے سے معلوم ہوا کہ موصوف نے اسی سے لے لیا ہے (ملاحظہ ہو چغتائی نسخہ صفحہ ۲۵۲ ب۔ حیدرآباد دکن۔

[3] دیوان میں "با ترک دلیری مکن" ہے۔

چند باشی ز معاصی مزہ کش[1] | توبہ ہم بے مزہ نیست بچش

جب بابر کے بیگ اور سردار ہند کی گرمی سے پریشان ہو کر اور عرصۂ دراز تک مادر وطن ترکستان سے جدا رہنے کے باعث محزون و مغموم ہو کر واپسی کا ارادہ کر رہے تھے تو بابر نے اس طرح خطاب کیا:

ہر کہ آمد بہ جہاں اہل فنا خواہد بود[2] | آنکہ پاینده و باقیست خدا خواہد بود

اس شعر کے متعلق بھی شک پیدا ہو سکتا ہے کہ بابر کا ہے یا نہیں کیونکہ اس نے تزک میں فردوسی، امیر خسرو، شیخ سعدی، خواجہ حافظ وغیرہ کے تقریباً ۲۰ اشعار اور اسکے قریب فارسی ضرب الامثال بھی نقل کئے ہیں۔ ہم نے بابر کے کلام میں صرف ان کو شمار کیا ہے جن کے متعلق قطعی دلیل موجود ہو۔ تزک میں صرف مندرجۂ بالا دو اشعار ایسے ہیں جن پر شک کیا جا سکتا ہے۔

رانا سانگا کے زیر کمان جنگ خانوہ میں ہندوستیا کی شکست کے موقع پر بابر کے زبان سے بے اختیار یہ اشعار نکل پڑے:

بآں فیلہا ہندواں ذلیل | شدہ غرہ مانند اصحاب فیل
چو شام اجل جملہ مکروہ تم | سیہ تر ز شب بیشتر از نجوم
ہمہ ہمچو آتش ولیکن چو دود | کشیدہ سر از کیں بہ چرخ کبود
چو مور آمدند از یمین و یسار | سوار و پیادہ ہزاراں ہزار

ان بیتوں میں تشبیہات کی بھرمار ہے جو نہایت ہی دلچسپ ہیں۔

دشمن کی تباہی کے موقع پر یہ اشعار ذہن میں آئے:

ہمہ ہندواں کشتہ زار و ذلیل | بہ سنگ تفگ[3] ہمچو اصحاب فیل
ز تنہا بسی کوہ باشد عیاں | بہر کوہ ازاں چشمۂ خوں رواں
ز سہم سہام صف پر شکوہ | گرازاں گریزاں بہر دشت و کوہ

جنگ پانی پت اور خانوہ کے بعد بابر بادشاہ غازی نے قلعۂ چندیری کی فتح کے موقع پر یہ قطعۂ تاریخی کہا:

بود چندے مقام چندیری | پر ز کفار و دار حرب ضرب
فتح کردم بہ حرب قلعۂ او | گشت تاریخ "فتح دار الحرب"

(واقعات از ۹۳۴ھ مطابق ۱۵۲۷ء تا ۱۵۲۸ء)

یہ تزک میں بابر کا آخری شعر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بابر نے سب سے زیادہ اشعار ہندوستان میں کہے یہی نہیں بلکہ اس کی تقریباً ساری تصانیف ہندوستان ہی میں پایۂ تکمیل کو پہونچیں۔

---

[1] اس بیت کے بعد ۸ ترکی اشعار میں توبہ کا واقعہ مذکور ہے۔

[2] اس بیت کے بعد بھی دو ترکی اشعار ہیں۔ [3] عام طور سے ترک تفنگ کو تفک کہتے ہیں اور پشتو میں ٹوپک کہتے ہیں۔

دیوان و تزک کے علاوہ بابر نے کابل میں ایک مرغزار میں پتھر کا ایک حوض بنوایا تھا جہاں اپنے مصاحبین کے ساتھ وہ مے پیتا تھا۔ ایک شعر اس حوض پر کھدوا دیا جو حسب ذیل ہے۔

نوروز و نو بہار و مئے و دلبرے خوش است[1] — بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

بابر پر تصوف کا گہرا اثر تھا وہ بزرگوں کی بڑی قدر کرتا تھا، پیر یا شیخ کو مخاطب کرکے مندرجۂ ذیل اشعار کہے ہیں :

اخلاص و عقیدہ کو روشن شدہ است[2] — حالات و طریقہ ات مبرہن شدہ است

مایل چو نماند ز دو برخیز و بیا — دل خواہ تو تربیت معین شدہ است

تذکرۂ مرأۃ الخیال (ص ۹۸) میں یہ غزل منقول ہے :

در دور بار کنند سواراں یکے است — واں کو دم از قبول بی زند نے است

ایں سلطنت کہ ما ز گدا یش یافتم . . . . — دارا نداشت ہرگز و کاؤس را کے است

دانی کمان ابروے جاناں سیہ چرا است — کز گوشہ ہاش دود دل خلق در پے است

دارد بزلف او دل زنار بند ما — سودای کفر و کافری و ہرچہ در وے است

بابر رسید نالۂ زارت بگوش یار — مجنوں دتوف یافت کہ لیلی درین رہ است

غلط مثال : — بزم تیموریہ[3] میں مندرجۂ ذیل شعر کو بابر کا کہا گیا ہے :

باز اے ہمائے کہ بے طوطی خطت — نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

حالانکہ بابر کا خود کہنا ہے کہ یہ اس کا نہیں بلکہ یعقوب بیگ کا شعر ہے[4]

اردو کا شعر بابر کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ ہندی بھاشا بھی جانتا تھا۔ قطعی رائے مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ بابر نے تزک میں تقریباً ۱۵۰ ہندی بھاشا یا اردو کے الفاظ استعمال کیے ہیں مثلاً کٹھل، چمگادڑ، چنبیلی، سارس، مینڈرا، تاڑی وغیرہ بہت ممکن ہے بابر کو آگرہ میں اس زبان سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہو کیونکہ اس کے دیوان میں مندرجۂ ذیل عجیب و غریب اردو۔ ترکی مخلوط شعر بھی موجود ہے[5]

مج کا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی — نقرا ھلی غہ بس بولخوسی دور پانی و روتی

سے اس طرح ترجمہ کرتا ہوں :

---

[1] اس کو فرشتہ نے نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو بزم تیموریہ)

[2] ملاحظہ ہو بزم تیموریہ

[3] بزم تیموریہ از سید صباح الدین عبدالرحمن دارالمصنفین ۱۹۴۸ء

[4] تزک۔ جدید ترکی ترجمہ انقرہ ۱۹۴۳ء (صفحہ ۱۴)

[5] دیوان ترکی بابر پادشاہ غازی۔ ورق ۲ ۵ ب۔ استانبول یونیورسٹی لائبریری۔

مغربی پاکستان کا مشترک رسم الخط

سید انوار الحق

اس دوسری عالمگیر جنگ سے کچھ ہی پہلے راقم نے لدھیانے کے رسالہ "اتحادِ افغان" میں ایک طویل اور مبسوط مضمون پشتو رسم خط کے سلسلے میں دیا تھا کہ ارباب ذوق ادھر متوجہ ہوں اور اس بارے میں کچھ مفید مشورے دیں۔ مگر رسالے کی زبان اردو تھی اس لئے اس کی اشاعت زیادہ تر اردو داں طبقے میں تھی۔ اور ان دنوں ابھی پشتو زبان کی جانب خود اہل زبان پشتون بھی کچھ ایسے ملتفت نہیں تھے۔ بات یوں ہی رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں دہلی کے مشہور پشتو کے رسالہ "تخ پرون" میں مولانا عبد القادر کی طرف سے تحریک کی گئی۔ انہوں نے علی الخصوص پشتو رسم خط کے سلسلے میں ساری قوم کو ایک عام دعوت غور و فکر دی جس کی غرض و غایت یہی تھی کہ پشتو رسم خط میں اگر کچھ خامی کی یا دقت ہے تو باہمی صلاح و مشورے اور متحدہ کوششوں سے اس کی اصلاح کر لی جائے۔ اور اسے عام کتابت اور پریس کے لئے ایک معیار پر لا کر زیادہ سے زیادہ سہل، عام فہم اور ہر دلعزیز بنایا جائے۔ اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ لوگ متوجہ ہوئے۔ بہت سے اہل قلم حضرات نے اپنا اپنا خیال پیش کیا۔ مسلسل دو سال تک تنقید و تبصرے کا سلسلہ اطراف ملک و ملت کے منتخب اور نمائندہ مبصروں اور ناقدوں کی جانب سے قائم رہا۔ مگر بعض ناگزیر صورت حالات و واقعات کی بناء پر سلسلہ بغیر کوئی مفید اور تعمیری نتیجہ برآمد ہوئے منقطع ہو گیا اور بات پھر وہیں رہ گئی۔

شاید کہ انہی دنوں جامعہ عثمانیہ میں اردو رسم خط کے لئے ایک پریس ٹائپ وضع کیا گیا۔ جو اب تک پریسوں میں عثمانی ٹائپ کے نام سے چل رہا ہے۔ مگر باوجود اختصار و جامعیت، اس میں دیدہ زیبی نہیں۔ اور نگاہ کو اس سے عادی ہوتے ہوتے بھی نسبتاً زیادہ دقت درکار ہوتا ہے۔ خصوصاً جلی ٹائپ تو ذرا اچھا نہیں لگتا۔ اس طرح قیام پاکستان کے بعد اردو پریس ٹائپ اور ٹائپ رائٹر دونوں کے سلسلے میں بعض اہل ذوق نے کچھ معقول اور مفید تجویزیں پیش کیں۔ جن پر آج تک مختلف رسالوں میں خیال آرائی کی جا رہی ہے۔ مگر جس قدر تجاویز پیش کی جاتی رہی ہیں۔ وہ صرف اردو سے متعلق ہیں۔ دوسری علاقائی زبانوں کی طرف خود وہاں کے اہل زبان نے بھی کوئی دھیان نہیں دیا۔

[illegible] میں پشاور یونیورسٹی کے زیر سایہ پشتو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا اور اس کی تاسیس کے تین سال بعد اس میں ایک شعبہ راقم کی نگرانی میں پشتو زبان کی ایک لسانی لغت کی تالیف و تدوین کے لئے کھولا گیا۔ چنانچہ یہاں بھی اس وقت سے لے کر اب تک وہی ایک خیال پشتو ٹائپ کے متعلق ذہن میں سمائے رہا۔ مگر گذشتہ پانچ چھ سال کے دوران تحقیق و تلاش میں اور بہی کئی مشرقی اور مغربی زبانوں کے مطالعے سے نظر میں کسی قدر وسعت پیدا ہو گئی۔ اور بات صرف پشتو رسم خط کی حدود سے آگے نکل گئی۔ اب یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ پاکستان بھر کے لئے ایک مشترک بین العلاقائی رسم خط کے مسئلے پر غور کیا جائے جس کے باعث یہ ساری مشکلات حل ہو جائیں۔ [illegible] رسم خط کی ایک [illegible] سے آپس کی اجنبیت اور بھی کم ہو جائے۔ مثلاً سندھی، بنگالی، پشتو، پنجابی [illegible] سادی [illegible] ہے، کہیں وہ ب لکھی جاتی ہے تو کہیں ت یا ث۔ ویسے ہی کہیں کچھ [illegible]۔ مگر [illegible] کچھ [illegible] آئے [illegible] بالکل غیر ضروری طور پر مشکلات بن کر درمیان میں حائل ہو رہے ہیں۔

رفع ہو جائیگی اور ٹائپوگرافک پریس اور ٹائپ رائٹر دونوں میں بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔

گذشتہ تیس پینتیس سال سے بہی خواہانِ ملک و ملت نے اس قسم کی اصلاح کی طرف تو کوئی توجہ دی نہیں۔ البتہ ان اختلافی جھگڑوں سے تنگ آکر اُردو کے لئے بجائے عربی فارسی حروف تہجی کے رومن رسم خط کی موزونیت کی بحث چھیڑ بیٹھے۔ ان کا کہنا ہے کہ لیتھو گرافی کے مقابلے میں ٹائپوگرافی کے ذریعے چھپائی میں سہولت کے علاوہ ٹائپ رائٹر مشین کے ذریعے بھی رومن حروف مقابلتاً تیزی اور آسانی سے چھاپے جاتے ہیں۔ (۲) رومن حروف تہجی بہت تھوڑے ہیں یعنی کُل ۲۶ ہیں۔ پھر انہی ۲۶ کے مجموعے میں حروف صحیح، حروف علت اور اعراب و حرکات یعنی ”واولز“ بھی شامل ہیں۔ (۳) لفظ کے لکھنے کے لئے ہر جگہ وہی ایک سالم حرف لکھا جاتا ہے۔ عربی فارسی کی طرح ہر حرف کی دو دو تین تین یا چار چار شکلیں نہیں ہیں۔ (۴) رومن حروف چھاپتے وقت دونوں ہاتھوں کی دس میں سے الگ الگ ایک انگلی کو قدرتاً ٹائپ رائٹر کی صرف دو گھنڈیوں پر قابو پانا اور ان کو برتنا ہوتا ہے اور انگلیوں کے عضلات و اعصاب پر یہ اتنا تھوڑا بوجھ ہے کہ تھوڑی۔ مشق سے یہ مہارت حاصل ہو جاتی ہے — اور انہی آسانیوں کے سبب سے انگریزی ٹائپ رائٹر پر چھاپنے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔

دوسری جانب عربی فارسی رسم خط کے طرفدار رومن کیریکٹر کو قبول نہ کرنے کے جواز میں جو دلیلیں پیش کرتے ہیں وہ کہیں زیادہ اہم اور وقیع ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔ (۱) عربی کے حروف تہجی کی تعداد ہے ۲۸۔ فارسی کے حروف ۳۳، اُردو کے ۳۶، پشتو کے ۴۰ اور سندھی کے ۵۲ ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ علی الترتیب ہر زبان کے حروف تہجی بتدریج ایک دوسرے سے تعداد میں بڑھتے چلے گئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھی الفاظ اپنی ساخت میں کچھ حروف ایسے رکھتے ہیں جن کی آواز پشتو زبان میں نہیں پائی جاتی۔ پشتو کی مخصوص آوازوں کے حروف فارسی یا سندھی میں نہیں۔ اُردو والے فارسی اور عربی میں نہیں۔ اور ایسے ہی اِن کے برعکس۔ (۲) پاکستان کی ساری علاقائی زبانوں میں دو باتیں ہر جگہ مشترک پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان تمام بولیوں کی اساس یا نیو سنسکرت اور پراکرت ہے۔ اور اس میں تانا بانا عربی اور فارسی کا ہے۔ اس لئے پانچ میں تین الفاظ تو ان تینوں زبانوں سے متعلق ہوتے ہیں اور باقی دو میں ایک اپنا اور ایک کہیں دُور باہر کا ہوتا ہے۔

عربی کے مخصوص حروف آٹھ (۸) ہیں۔ ث۔ ح۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ جس لفظ میں ان آٹھ میں سے کوئی حرف آجائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ لفظ عربی زبان کا ہے۔ چاہے اُسے اختیار کرنے اور اپنانے والی زبان نے اُسے کتنا ہی مسخ کر دیا ہو یا بدل ڈالا ہو۔ عربی کے مقابلے میں فارسی کے مخصوص حروف ۴ ہیں:۔ پ۔ چ۔ ژ۔ اور گ۔ اُردو میں ۱۴ یعنی بھ۔ پھ۔ تھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ جھ۔ چھ۔ دھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڑھ کھ۔ گھ۔ اور نون غنہ (ں) ہیں۔ پشتو میں آٹھ ہیں یعنی ټ۔ ځ۔ څ۔ ډ۔ ړ۔ ښ اور ګ ہیں۔

ان میں چار صُوری اختلاف رکھتے ہیں۔ اور سوائے عربی کے پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں میں کسی قدر بدلی ہوئی شکلوں میں ملتے ہیں۔ مگر ان کی آواز ہر جگہ ایک سی ہے۔ جیسے ټ (ٹ۔ ت) ډ (ڈ۔ ذ)۔ ړ (ڑ۔ ڑ)۔ ګ (گ) اور دوسرے چار حروف آواز کی مناسبت سے مختلف ہیں۔ جو دوسری زبانوں میں اتنی وضاحت سے نہیں پائے جاتے اُن کا ذکر آگے اپنے موقع پہ آئے گا۔ اسی طرح سندھی میں ۲۱ حروف مخصوص ہیں۔ ان میں سے کل ۶ صوتی اختلاف رکھتے ہیں اور ۱۵ حروف صُوری۔ تفصیل آگے آئے گی۔

(۲) عربی فارسی میں یہ خصوصیت بھی قابل لحاظ ہے کہ حروف کے ساتھ اعراب و حرکات کی علامتیں یعنی مد۔ زبر۔ زیر۔ پیش۔ جزم۔ ہمزہ۔ تشدید۔ چھوٹا الف۔ کھڑا پیش اور تنوین یعنی دو زبر۔ دو زیر۔ دو پیش بھی لازم ہیں۔ یہ علامتیں ۱۲ ہیں۔ اور سب کی سب ضروری ہیں۔ جیسے مُتوِر اور مُور یا مُصَوِّر اور مُصَوَّر کا فرق بغیر ان علامتوں کے نہیں معلوم کیا جا سکتا۔ یہاں اس سلسلے میں ایک لطیفہ بے موقع نہ ہوگا۔ اگلے وقتوں کی تحریر میں اعراب چھوڑ لکھتے بھی پابندی سے نہیں لگائے جاتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں کا ایک مقولہ بھی اب تک چلا آرہا ہے، کہ ”عاقلاں از نقطہ نکتہ می دانند“ چنانچہ کسی طبیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا اسی قسم کا ایک نسخہ ایک عرب نے پڑھا۔ وہ اور تو کچھ سمجھ نہیں سکا۔ البتہ گل بنفشہ کو گُلِ بَنَفْسِہٖ اور دانہ الائچی

کوئی اِنّہ اِلّا اِیّجی پڑھ کر بولا، تحریر تو عربی کی ہے مگر کسی نے اِملا غلط لکھی ہے۔ مطلب یہ کہ اعراب وغیرہ کی علامتیں بذات خود حروف ہجی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ ایسے ہی اردو میں بھی اِن اور اُن یا اِدہر اور اُدہر کا فرق یا پشتو میں آس یا اَس اور اُس میں تمیز بغیر زیر، زبر اور پیش وغیرہ کے نہیں کیا جا سکتا۔ اِلّا اگر یہ الفاظ عبارت میں مستعمل ہوئے ہوں اور ایک اہل زبان، سیاق و سباق سے خود ہی اندازہ لگالے۔ گویا اس مناسبت سے عربی کے ۲۸ حروف کیساتھ ۱۲ علامتوں کو ملانے سے وہ ۴۰ ہو جاتے ہیں۔ فارسی کے ۳۳ کے ساتھ ان کے ملانے سے کل تعداد ۴۰ ہو جاتی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس اُردو کے ۳۶ سے ۴۸ پشتو کے ۴۰ سے ۵۷۔ سندھی کے ۵۲ سے ۶۴ اور ہندی بلکہ بنگالی اور گجراتی کے بھی ۳۶ سے ۶۵ ہو جاتے ہیں۔

(۳) پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ علاقائی زبانوں میں ب۔ ت۔ ث۔ خ۔ پ۔ ځ۔ چ۔ ح۔ خ۔ د۔ ڈ ذ ڑ ژ ز س ص ض ط ظ ع غ ق گ اور ں (یعنی نون غنہ)، ملا کر ۲۶ حروف ایسے ہیں جو رومن کے موجودہ حروف میں سے کسی ایک کے ذریعے بھی کما حقہ' نہیں ادا کئے جا سکتے۔ کیونکہ رومن میں ث، ځ، س اور ص سب کے لئے ایک ایس (S) ہے۔ خ ذ ز ض اور ظ یعنی پانچ حروف کے لئے ایک زیڈ (Z) ہے۔ یا ت اور ط کے واسطے ایک (T) ٹی استعمال کی جاتی ہے۔ اس لئے کسی خاص لفظ کی ہجا میں ان حروف کے الٹ پھیر یا بے جگہ استعمال سے مطلب خبط ہو جاتا ہے، یعنی صوتی اِشتباہ کے ساتھ ساتھ معانی کی غلطی یقینی ہے۔ اس لئے ہماری علاقائی زبانیں رومن کیریکٹر میں نہیں لکھی جا سکتیں۔ اور اگر پھر بھی اس پہ اصرار کیا جائے تو ہر واول میں تین تین چار چار قسم کا ایس، چار قسم کا زیڈ، پانچ طرح کا، ٹی دو طرح کی اور ایسے ہی کتنے مرکب حروف کے پنڈ من بنانا پڑیں گے۔ مگر اس کے بعد اس میں وہ اختصار قائم نہیں رہے گا۔ اور اردو ٹائپ سے بھی زیادہ طویل اور مشکل ہو جائے گا۔ پھر اس سے وہ غرض پوری نہیں ہو سکے گی۔ جس کی خاطر اس میں اتنی ترمیم تنسیخ کی جائے گی۔ غرض ان مشکلات کے باعث جیسے "مور ناچتا ہے مگر اپنے پیروں کو دیکھ کے رو دیتا ہے"، ہماری ساری بحثا بحثی بھی آں شور اشوری شروع ہوتی ہے اور ہر بار بہ ایں بے نمکی یہاں آن کے ختم جاتی ہے۔ اس لئے ہم یہ رومن ٹائپ کی اس غیر مفید بلکہ لا حاصل بحث میں پڑ کر تضیع اوقات کی بجائے اپنے قدیم رسم خط کے ایک ایسے اصلاحی پہلو کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جو ضروریات و مقتضیات وقت کے عین مطابق ہے اور جس میں سب کا یکساں بھلا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے اہل ہنر جنھوں نے ٹائپ اور ٹائپوگرافی کی بنیاد آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے رکھی ہے جو آج سے صدیوں پہلے ہزاروں میل کی بحری اور برّی مسافتیں طے کر کے تمام روئے زمین پر پھیلے۔ امریکا، افریقہ اور سارے ایشیا کا کونہ کونہ چھانا۔ ملک ملک کی زبانیں سیکھیں۔ ان کی کتابوں کے ترجمے کئے، خود اُن زبانوں میں کتابیں لکھیں اور اس صورت سے اپنے علم اور مشاہدات اور تجربوں میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ انھوں نے جب ہی معلوم کر لیا تھا کہ مشرقی یا ایشیائی زبانوں کے لئے رومن ٹائپ ناموزوں ہے اور ناکافی۔ اس لئے انھوں نے آج سے مدتوں پہلے خاموشی کے ساتھ ہر زبان کا پریس ٹائپ الگ الگ وضع کر کے بازار میں لا کر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ عربی جیسی زبان کے مکمل ٹائپ کے علاوہ فارسی نستعلیق ٹائپ بھی بنایا جس کے لئے آجکل یہ کہا جا رہا ہے کہ نہیں بنایا جا سکتا، اور حقیقت یہ ہے کہ آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے اس میں موٹی موٹی کتابیں چھاپی جا چکی ہیں۔ ایسے ہی پریس ٹائپ کے علاوہ اکثر بڑی بڑی مشرقی زبانوں کے لئے ٹائپ رائٹر مشینیں بھی بنائی جا چکی ہیں۔

مگر ان مختلف ٹائپوں کی وضع اور شکل میں بہ لحاظ اشتراک، اتصال و موانست کم اور انفصال و مغائرت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً پشتو ٹائپ میں آپ اُردو نہیں چھاپ سکتے۔ سندھی پریس پشتو کے لئے بیکار ثابت ہوتا ہے۔ اگر ایک ادارے میں چار علاقائی زبانوں سے کام لینا پڑ جائے تو چاروں زبانوں کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ پریس ٹائپ اور علیٰحدہ علیٰحدہ ٹائپ رائٹر مشینیں مہیا کرنا پڑیں گی۔

اس مسئلے پر بہرحال سنجیدگی سے غور کرنا ہے۔ خصوصاً پاکستان کی بین العلاقائی یک جہتی و یگانگت، اتفاق و اتحاد کے پیش نظر ہمیں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہونا چاہیے۔ ہمیں کوشش کر کے ایک ایسا مشترک ٹائپ وضع کرنا چاہیے جس کے حروف کا مکمل سیٹ ہمارے ہر علاقہ کی ضرورتوں کی کفالت کر سکے۔ اس سلسلے میں ہر علاقے کے قدامت پسند و ضد دار طبقے کو ٹھنڈے دل سے سوچنا اور کافی رعایت اور فراخدلی سے کام لینا پڑے گا کہ جہاں تک کسی زبان کی ان خصوصیات کا تعلق ہے جن کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ضرور قائم رکھا جائے۔

اور جتنی خصوصیات بغیر کسی ہرج یا دقت کے ترک کی جا سکیں گی، انھیں ترک کر دیا جائے، ضد پر اڑے رہنا سوائے اختلاف کے کسی لحاظ سے بھی مفید نہیں رہے گا۔ کیونکہ ایک طرف تمام معاشرے کے طور طریقوں اور تہذیب میں تو اس غضب کی جدت پسندی! اور رسم خط کے معاملے میں اس بلا کی رجعت پسندی کہ بغیر کسی ہرج کے ایک نکتے کا رد و بدل بھی گوارا نہیں، آپس میں کوئی جوڑ نہیں کھاتی۔

پاکستان کی زبانوں میں ہم اردو کے حروف تہجی کو بوجہ اس کے مقابلتہً زیادہ وسیع اور معیار کی حد تک مانی ہوئی زبان ہونے کے بطور اساس اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ پھر باری باری متعلقہ زبانوں کے حروف تہجی کو لیتے ہیں جنکا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ پاکستان کی علاقائی زبانوں سے ہے۔ ہر زبان کے حروف کا تجزیہ کر کے اس میں ترمیم و تنسیخ کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ پہلے عربی کو لیجئے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ عربی کے مخصوص حروف آٹھ ہیں اور آٹھوں کے آٹھ بعینہٖ اردو میں شامل و مستعمل ہیں۔ اور ساتھ ہی عربی کے تمام اعراب و تنوین وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس لئے یہاں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسری فارسی ہے۔ اس کے خصوصی حروف بھی سب اردو میں شامل ہیں۔ تیسری پشتو ہے۔ اس کے آٹھ مخصوص حروف ہیں۔ ان میں سے پہلے چار جو صرف صورت و شکل کا معمولی سا اختلاف رکھتے ہیں، ورنہ آواز اور لہجے کی مناسبت سے ان میں کوئی فرق و اختلاف نہیں۔ مثلاً ایک پشتون ٹمٹم اور ٹمٹم، وکاڑ اور ڈ کا ڈکر اور کڑی اور کمان اور گمان کو ایک ہی جیسا تلفظ کرے گا۔ اس لئے پشتو کے، یہ آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے کے وضع شدہ چار حروف اگر اب موجودہ اردو کے مروجہ حروف کی شکل میں لکھے جائیں تو اس میں معنوی لحاظ سے پشتو زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ آخر اردو میں خود بھی آج سے لگ بھگ سوا سو سال پہلے کے وضع شدہ چار حروف اگر اب موجودہ اردو کے مروجہ حروف کی شکل میں لکھے جائیں تو اس میں معنوی لحاظ سے پشتو زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ آخر اردو میں خود بھی آج سے لگ بھگ سوا سو سال پہلے ٹ، ڈ، ڑ، کو ٹ، ت، ڈ، د، ڑ، اور ز، ڑ کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ مگر آخر موجودہ شکل تسلیم کر لی گئی اور اب بغیر کسی تامل کے مروج ہیں۔ باقی رہے پشتو کے چار مخصوص حروف۔ یہ چونکہ صوتی اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کی آوازیں مخصوص ہیں اور دوسرے حروف کے ذریعے ان کا ادا کرنا محال ہے جیسے ځ کے عوض (خ) (دزیم) مثلاً جان سے خان — (دزان)۔ جاتے سے خاتے (دزائے) اور جوان سے خوان (دزوان)۔ یہاں (د) کی آواز کو ابتداہی میں (ز) کے اندر مدغم کیا جاتا ہے۔ دوسرا حرف چ کے عوض (تسے) ہے مثلاً چادر کو څادر (تسادر) چہرہ کو څیرہ (تسیرہ)۔ تیسرا حرف ږ کے بدلے ژ (گے) ہے یہ کہیں گ کی آواز دیتا ہے اور کہیں ج کی۔ مثلاً ژالہ (فارسی) بمعنی اولا کو خٹک ژلئی بولتے ہیں اور یوسفزئی زلئے (گلئے) اور زمستان (فارسی) کو کوئی ژمے بولتے ہیں اور کوئی جمے۔ ایسے ہی چوتھا حرف ښ ہے جس کے عوض ښ (خین) بنایا گیا ہے۔ یہ خ کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً ښهر یا ښار (خہر یا خار) یا ښاخ کو ښاخ (خاخ) بولتے ہیں۔ اور اگر انہی مخصوص حروف کو اپنے ادھورے متبادل حروف کے ذریعے ادا کیا جائے تو بجا معانی اور آواز سب کچھ بگڑ جائے گا اور مطلب بھی خبط ہو جائے گا۔ اس لئے ان چار مخصوص پشتو حروف کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

اب سندھی حروف تہجی کو لیجئے۔ ان میں اکیس حروف مختلف یا مخصوص ہیں۔ ان میں سے پندرہ یعنی ڀ (بھ)۔ ٿ (تھ)۔ ٽ (ٹ) — ٺ (ٹھ)۔ ڄ۔ ڃ (جھ)۔ ڌ (دھ)۔ ڏ (ڈ)۔ ڊ (ڈ)۔ ڙ (ڑ)۔ ڦ (پھ)۔ ڪ (ک)۔ ک (کھ)۔ گھ اور ڻ (ن) صرف صوری اختلاف رکھتے ہیں۔ جو اردو کے مروجہ حروف تہجی کے متبادل حروف سے بہ آسانی بدلے جا سکتے ہیں۔ اور ان کی آوازیں کوئی فرق نہیں آتا جیسے (۱) ڀ (بھ) سے ڀنڀور = بھنبھور (ایک مقام کا نام)۔ (۲) ٿ (تھ) سے ہٿ = ہتھ۔ (ہاتھ) (۳) ٽ (ٹ) سے ڪٽ = کھٹ (کھٹن یا گری) یا ٽِٽ = وٹ (ٹبا۔ پتھر وزن یا تول کا)۔ (۴) ٺ (ٹھ) سے مٺو = مٹھو (میٹھا)۔ (۵) جھ سے سمجھائی = سمجھانڑی دینا۔ تفسیر)۔ (۶) ڃ (جھ) سے چيڙ = چھیٹر۔ (۷) ڌ (دھ) سے انڌو = اندھو (اندھا) یا ٺنڌو = ٹھنڈو (ٹھنڈا)۔ (۸) ڏ (ڈ) ڏپ = ڈپ (خوف۔ اندیشہ) یا ڏول = ڈول (صورت۔ شکل) (۹) ڊ (ڈ) سے انڊا = انڈا (تقلید۔ نقل)۔ (۱۰) ڙ (ڑ) سے جهڙا = جھڑا۔ یا چيڙ = چھیڑ۔ (۱۱) ڦ (پھ) سے ڦٽن = پھٹن (جاگین) یا ڦل = پھل (پھول)، (۱۲) ک (ک) سے

= کنڑک دیکھوں) ۔ (۳) ٹ (کھ) سے لیکن = کھنٹر دیکھیں) ۔ (۴) گھ = گھ ۔ (۵) ٹ (نٹ) سے کھرٹ = کرنٹر دکریں) گویا بھنبھو
ہتھ ۔ گھٹ ۔ وٹ ۔ مٹھو ۔ سمجھاڑی ۔ چھیٹر ۔ تھدھو ۔ ڈول ۔ انڈھا ۔ جھڑا ۔ چھیٹر ۔ چھتر ۔ پھل ۔ کنڑک ۔ کتاب ۔ کھنٹر ۔ گھر ۔
کرنٹر کو سندھی کے موجودہ متبادل حروف کے ساتھ درست تلفظ کر سکتے اور بہ آسانی پڑھ سکتے ہیں۔

باقی رہے چھ حروف یعنی (۱) ب (۲) ج ۔ (۳) ڃ ۔ (۴) ڊ ۔ (۵) ڳ ۔ (۶) ڱ ۔ ہیں۔ مثلاً (۱) ب ۔ اس حرف کے ذریعہ
کی ایک مخصوص سی آواز نکالی جاتی ہے جو کسی قدر منہ دبے کی سی ہوتی ہے جس میں دونوں ہونٹوں کو بغیر زور دیئے ملا کر ذرا آگے بڑھا کر اور کسی قدر
اندر کی جانب سانس کھینچ کر بولی جاتی ہے۔ جیسے پاپا = بابا یا بکری = (بکری) میں ۔ (۲) ۔ یہ جیم کی ایک مخصوص آواز ہے جو زبان کو جڑ کی طرف
سے تالو کے ساتھ بغیر زور دیئے لگا کر ادا کی جاتی ہے۔ جیسے جاجو (جھاجو = جھاج) یا اوج (اوج = ترقی) میں ۔ (۳) ڃ ۔ یہ نون غنہ کے
کے ساتھ جیم کی ملی جلی آواز ہے ۔ جیسے جنج (جنب = برات) یا ونجن (ونجنٹر = جائیں ۔ (۴) ڊ ۔ یہ ڈ کی ایک مخصوص آواز جو پ ج اور گ
کی طرح زبان کے سرے کو بیچ تالو سے لگا کر اوپر سے آواز کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ جیسے ڈسٹ (ڈسٹر) یا اڈوت (اڈادت) یا اڈپ
(اڈپ) میں (۵) ڳ ۔ یہ گ کی ایک مخصوص آواز ہے جو ج کی طرح زبان کے مؤخر حصہ کو بیچ تالو کے ساتھ ملا کر نرمی سے نکالی جاتی ہے جیسے
گالہ ۔ (گالہ) یا لگن (لگنٹر) میں ۔ اور (۶) ڱ ۔ یہ نون غنہ کیساتھ گ کی ملی ہوئی آواز ہے جیسے اگونو (انگوٹھو) یا سگ (سنگ) میں
جیسے کہ آپ نے دیکھا ان چھ حروف میں ڃ = ہنج اور ڱ = نگ کی آوازیں بھی دوسرے متبادل حروف کے ذریعے بہ آسانی ادا کی جا سکتی ہیں ۔ اس
لحاظ سے سندھی کے مخصوص حروف کل چار رہ جاتے ہیں جو کسی دوسرے حروف کے ساتھ مکمل طور پر نہیں بدلے جا سکتے ۔

یوں تو سنسکرت والوں کا دعویٰ ہے کہ حرف کا تلفظ کھ ، خ ، اور ہ کے درمیان ایک مخصوص آواز کیساتھ کیا جاتا ہے ۔ جو بہت مشکل
ہے ۔ قندھاریوں کا کہنا ہے کہ پشتو میں ژ کی دو آوازیں ہیں ، ایک عام اور ایک خاص آواز سوائے خود اُن کے اور کوئی بہ آسانی ادا نہیں کر سکتا ۔
نتیجہ یہ نکلا کہ چار حروف پشتو کے اور چار سندھی کے ایسے ہیں جنہیں قائم رکھے بغیر پشتو اور سندھی زبان کی خصوصیت قائم نہیں رہتی ۔ چنانچہ اس بنا
پر بین العلاقائی مشترک حروف تہجی یہ ہوئے ۔

ا ب ٻ پ ت ٹ ث ج ڄ چ ځ ح خ ڇ د ڈ ڊ ذ ر ڑ ږ ز ژ س ش ښ ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ڳ ل م ن و ہ ھ ی ے =
۵۸ ۔ ان حروف میں دو چشمی ھ ہے (ھ) یوں ضروری ہے کہ اردو اور سندھی ترکیب کے مطابق دس مرکب حروف دو چشمی ھ سے مل کر بنتے ہیں ۔
جیسے بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ کھ گھ ۔ چنانچہ پریس ٹائپ یا ٹائپ رائٹر مشین کے لئے ان حروف کی دو دو تین تین اور چار چار (مختلف صورتیں)
شکلیں ذیل میں دی جاتی ہیں :

اِبتدائی	درمیانی	آخری	اِبتدائی	درمیانی	آخری	ابتدائی	درمیانی	آخری
ا	-	ا	جـ	-	ج	د	-	-
بـ	ـبـ	ب	چـ	-	چ	ڈ	-	-
ٻـ	ـٻـ	ٻ	ڄـ	-	ڄ	ڊ	-	ـڊ
پـ	ـپـ	پ	ڇـ	-	ڇ	ذ	-	-
تـ	ـتـ	ت	ځـ	-	ځ	ر	-	-
ٹـ	ـٹـ	ٹ	حـ	-	ح	ڑ	-	-
ثـ	ـثـ	ث	خـ	-	خ	ز	-	-

ابتدائی	درمیانی	آخری	ابتدائی	درمیانی	آخری	ابتدائی	درمیانی	آخری
ڑ	-	-	عـ	ـعـ	ع	لـ	ـلـ	ل
ژ	-	-	-	-	ع	مـ	-	م
سـ	-	س	غـ	ـغـ	غ	نـ	ـنـ	ن
شـ	-	ش	-	-	غ	و	-	-
صـ	-	ص	فـ	-	ف	ہ	-	ہ
صـ	-	ص	قـ	-	ق	-	-	ھ
ضـ	-	ض	کـ	-	ک	یـ	ـیـ	ی
ط	-	-	گـ		گ	-	-	ے
ظ	-	-	گھـ	-	گ	-	-	لا

ان کے علاوہ اعراب وحرکات وغیرہ کی علامتیں بلا اختلاف ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ البتہ ڈکشنری میں الفاظ کے صحیح تلفظ کے لئے کچھ مخصوص علامتیں درکار ہوتی ہیں وہ حسب ضرورت نئی بنوائی ڈھلوائی جاسکتی ہیں۔

اب انہی مذکورہ بالا حروف کی بنا پر ہم نے ایک ٹائپ رائٹر کا نقشہ بھی مرتب کیا ہے۔ اس سلسلے میں دو غیر ملکی کمپنیوں سے خط وکتابت کی جارہی ہے کہ آیا موجودہ اردو ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ - - - - - - - میں اتنی گنجائش نکالی جاسکتی ہے کہ اس میں مزید چار گھنڈیاں (KEY S) بڑھادی جائیں۔ کیونکہ جو عبارت آپ کے پیش نظر ہے، یہ جرمنی کے "ایڈلر" نامی پشتو ٹائپ رائٹر کے ذریعے چھاپی گئی ہے۔ اس میں ٹ ڈ ڑ گ اور ے، ہاتھ سے بنانا پڑی۔ اگر یہ اور اسی قسم کی دو چار دوسری ترمیمیں کرلی جائیں تو یہ ایک ہی ٹائپ رائٹر ہر جگہ پورا کام دے گا۔ ٹائپ رائٹر کے موضوع پر انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے موقع پر بالتفصیل عرض کیا جائے گا۔

اردو نامہ، شمارہ اوّل

اردو نامہ کا پہلا شمارہ بابت ماہ اگست ۱۹۶۰ء نایاب ہے جن اصحاب کے پاس اس شمارے کی فاضل کاپیاں موجود ہوں وہ منیجر اردو نامہ کو قیمتاً ارسال فرماسکتے ہیں۔ شکریہ کے ساتھ لی جائیں گی۔

مراسلات

" اردو نامہ " کے شمارۂ نہم میں ' پہلا مضمون ' ریاض الفردوس سے متعلق ہے ۔ بعض اعتبارات سے یہ مضمون توجہ طلب ہے ۔ مقالہ نگار نے ایک قابل ذکر کتاب کا تعارف کرایا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس تالیف کے کئی اجزا مختلف اعتبارات سے اہم ہیں ، لیکن اس سلسلے میں ، مقالہ نگار اگر زیادہ توجہ سے کام لیتے ، تو اس اچھے مقالے کی افادیت میں واقعی اضافہ ہو جاتا ۔ مقالہ نگار نے ، ریاض سے کئی تحریریں نقل کی ہیں ، اس خیال کے تحت ، کہ یہ کم‌یاب یا نایاب ہیں ۔ لیکن ان میں سے بیش تر عام طور سے دست‌یاب ہوتی ہیں ۔ اس طرح اہم اور غیر اہم تحریریں یکساں ہوگئی ہیں اور افادیت کا وہ پہلو نمایاں نہیں ہوا ، جو بصورت دیگر نمایاں ہوتا ۔ مقالہ نگار نے ان تحریروں کے ضروری متعلقات پر بھی توجہ نہیں کی ہے ۔ اور ضروری حواشی کا اصول مدنظر نہیں رکھا ہے ، اس طرح وہ معلومات سامنے نہیں آسکیں جن کے اضافے سے ، اس مضمون کی اہمیت و افادیت کا دائرہ وسیع ہوتا ۔ نقل کردہ تحریروں کا متن بے حد غلط ہے ، اس طرح ان کی افادیت بڑی حد تک مجروح ہوگئی ہے ۔ مولف ریاض نے کتاب کے آخر میں اپنے حالات بھی درج کیے ہیں ، مقالہ نگار نے ، اختصار کے ساتھ ان کو اپنی عبارت میں پیش کیا ہے ۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے ، کہ اس میں کئی باتیں مولف ریاض کی تحریر کے خلاف ہیں ۔ ریاض الفردوس کوئی نایاب کتاب نہ سہی ، کم‌یاب ضرور ہے ۔ اچھا ہوتا اگر اس کی کم‌یابی کا لحاظ رکھتے ہوئے ، صحت و جامعیت کا اصول مدنظر رکھا جاتا ۔ ایسی کچھ فرو گذاشتوں کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

(۱) مقابلہ نگار نے مولف ریاض ، محمد حسین کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے :

" محمد حسین کے بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوچکا تھا "۔

یہ صحیح نہیں ۔ مقالہ نگار نے مولف ریاض کی ولادت کے متعلق لکھا ہے " وہ ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۴۰ ہجری میں پیدا ہوئے تھے "۔ مولف ریاض نے اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔ " آخر بوقت معین تیرھویں جمادی الاول سنہ ایک ہزار دو سو چھیاسٹھ ہجری میں بعمر شصت سالگی اس جہان فانی کو پدرود فرما گئے "۔

گویا جب مولف ریاض کے والد کا انتقال ہوا ' تو ان کی عمر تقریباً اکیس سال کی تھی ۔ اس لیے یہ لکھنا درست نہیں کہ ان کے بچپن میں والد کا انتقال ہوچکا تھا ۔

محمد حسین نے اسی ذیل میں یہ بھی لکھا ہے۔ " تا ایام بلوغ کامل ظل عاطفت والدین ماجدین میں پرورش‌یاب رہا ' چنانچہ سنت ختنہ ' و عقد مناکحت مجھ از خود رفتہ کی ' کہ دختر ہمشیرۂ چچا زاد جناب والد سے منعقد ہوا تھا ، زمان حیات والدین مکرمین میں ادا ہوئی " ۔ یہ ظاہر ہے کہ " بلوغ کامل " تک بچپن میں رسائی نہیں ہوتی ہے۔

(۲) تحصیل علم کے ذکر میں ' مقالہ نگار نے لکھا ہے۔ " اب حدیث وفقہ مطولات حکمت و کلام میں درک حاصل کرنے کا خیال آیا ' تو پھر دھلی کی راہ لی " ۔

اس عبارت میں لفظ " فقہ " مقالہ نگار کا اضافہ ہے ۔ مولف ریاض کی عبارت یہ ہے : "پھر مکرراً بضرورت تکمیل علم حدیث و بعض مطولات حکمیہ و کلامیہ کے دھلی کو گیا۔"

(۳) مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "انہیں طالب علمانہ زندگی کے خاتمے کے ساتھ ھی تلاش معاش میں گھر سے نکلنا پڑا ۔ مختلف شہر و دیار سے ہوتے ہوئے ، ضلع محمدی متعلقۂ اودھ میں پہنچے ۔ "

" مختلف شہر ، دیار سے ہوتے ہوئے " مقالہ نگار کا قیاسی اضافہ ہے ۔ مولف ریاض کی عبارت یہ ہے ۔ "ناچار کچھ مدت وطن میں رہ کر ، بہ‌تلاش مایحتاج سفر اختیار کیا اور ضلع محمدی متعلقۂ اودھ میں کہ اس زمانہ میں . . . . . سرشتۂ کلکڑی میں بعوض نائب سرشتہ دار تا میعاد شش‌ماہ مقرر ہوا " ۔

مولف ریاض کے وطن شاہجہاں‌پور اور محمدی کی سرحد ملی‌ہوئی ہے ۔ درمیان میں کوئی دریا یا پہاڑ بھی نہیں ہے ۔ محمدی تک پہنچنے کے لیے نہ اس زمانے میں "مختلف شہر و دیار " کے سفر کی ضرورت پیش آتی تھی نہ آج پیش آتی ہے ۔

(۴) مقالہ نگار نے لکھا ہے ۔ "اس میں غالب اور معاصرین غالب کی بعض ایسی تحریریں اور اشعار ملتے ھیں ، جو شاید اب تک عام نظروں سے اوجھل رہے ھیں اور بعض کے متعلق میرا خیال ہے کہ سوائے ریاض‌الفردوس کے کسی اور کتاب سے دستیاب ھونا ممکن نہیں " ۔

مقالہ نگار نے تفحص سے کام نہیں لیا ' ورنہ ان کو معلوم ھوجاتا کہ آزردہ و غالب کے مکاتیب کے علاوہ ' اور کوئی خط یا اشعار ان کی مفروضہ تعریف پر پورے نہیں اترتے ھیں ۔

(الف) مقالہ نگار نے مولانا صہبائی کی جو فارسی غزل نقل کی ہے ، وہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے معروف ترین مضمون " دھلی کا ایک یادگار مشاعرہ " میں موجود ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ ، رنج و راحت ھر دو . . . . . یہ شعر یادگار مشاعرہ میں نہیں ہے۔ یادگار مشاعرہ

کا یہ شعر ریاض میں نہیں ہے ، '' جرم عشقم را جزاشد حورومن از ہجر دوست ۔ داغ بردل بردم و خلدش جہنم ساختم ''۔ مولانا صہبائی کا کلیات بھی چھپ چکا ہے (جس کا اعتراف مقالہ نگار نے بھی کیا ہے) اور وہ کچھ ایسا کم یاب بھی نہیں ہے ۔

(ب) مومن کے فارسی کلام کے متعلق لکھا ہے ۔ '' ان کا فارسی کلام نایاب ہے '' ۔ غالباً مقالہ نگار کے نزدیک نایاب اور کم یاب میں کوئی معنوی فرق نہیں ہے ! ۔ مقالہ نگار نے مومن کی جو فارسی غزل نقل کی ہے ، وہ مومن کے دیوان فارسی میں نہیں ہے ، البتہ '' انشائے مومن '' میں موجود ہے ۔ انشائے مومن میں ، شیخ غلام ضامن کرم تخلص کے نام جو پہلا خط ہے ، اس میں یہ غزل موجود ہے ۔ مقالہ نگار اگر کوشش کرکے ضروری مجموعے دیکھ لیتے ، اور یہ تصریح کردیتے کہ یہ غزل دیوان میں نہیں ہے ۔ بلکہ '' انشا '' میں ہے ، تو واقعی ایک کام کی بات ہوتی اور اس صورت میں اس غزل کو نقل کرنے کا جواز بھی نکل آتا ۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے ، کہ انشائے مومن میں اس غزل میں دو شعر ایسے ہیں ، جو ریاض میں نہیں ہیں ۔

(ج) شیفتہ کی ایک فارسی غزل بھی نقل کی گئی ہے ۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے : ''شیفتہ کا فارسی کلام چونکہ اس وقت کم دستیاب ہوتا ہے اس لیے ان کی غزل ضیافت طبع ناظرین کے لئے پیش کی جاتی ہے '' ۔ عین ممکن ہے کہ پاکستان میں کلیات شیفتہ کم دستیاب ہوتا ہے ، لیکن مجھے یقین ہے ، کہ نایاب نہیں ہوگا ۔ مقالہ نگار اگر ریاض کے ان اشعار کا مقابلہ ، کلیات سے کرلیتے ، تو بعض کام کی باتیں لوگوں کے سامنے آجاتیں ، اور غزل کو نقل کرنے کے جواز کی ہی نہیں لازمی ضرورت کی صورت نکل آتی ۔

شیفتہ کی اس غزل میں دو شعر ایسے ہیں ، جو ریاض میں ہیں ، لیکن مطبوعہ کلیات شیفتہ میں نہیں ہیں ، وہ شعر یہ ہیں :

اے طفل شوخ این خم و پیچ سلاسل است — زود آ بہ بند بند در آرد ادیب را (کذا)
این مایہ کین بمد عیانم نداده اند — ہرگز عدوے خویش نخوانم حبیب را

مندرجۂ ذیل شعر بہ لحاظ متن ، ریاض اور کلیات میں مختلف ہے :

بر حال خستگان تو جائے ترحم است — رنجور می کنی بہ نگاہے طبیب را (ریاض)
دیگر زحال خستہ دلانش مگو کہ او — رنجور می کند بہ نگاہے طبیب را (کلیات)

(د) مفتی آزردہ ، نیر رخشاں اور شیفتہ کی اردو غزلیں ، مقالہ نگار نے اس نوٹ کے ساتھ نقل کی ہیں ۔ '' انہیں ان کی کمیابی کے باعث یہاں نقل کرنا مناسب ہوگا '' ۔

کم یابی کا حال یہ ہے کہ شیفتہ کا دیوان اردو ایک بار ان کی زندگی ہی میں مطبع آئینۂ سکندری میرٹھ سے شائع ہوا تھا ، دوسری بار اردو فارسی کلام اور رقعات پر مشتمل

کلیات، ان کے بیٹے نواب اسحاق نے نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۱۶ء میں چھپوا کر شائع کیا۔ پھر ۱۹۵۹ء میں دیوان اردو، مولانا صلاح الدین احمد نے لاہور سے شائع کیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ اس کے بعد بھی شیفتہ کے اردو کلام کو کمیاب کیسے کہا جاسکتا ہے؟

مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور نواب ضیاء الدین خاں نیر کی غزلیں، "دھلی کا ایک یادگار مشاعرہ"، میں موجود ھیں۔ اور یہ مجموعہ ھرگز کمیاب نہیں ہے۔

(س) مقالہ نگار نے فارسی کے حصۂ نثر کے ذیل میں لکھا ہے۔ "بلکہ گمان غالب ہے کہ مومن خاں اور مفتی آزردہ کے رقعات کا وجود سوائے ریاض الفردوس کے کہیں اور نہ ہو"۔

مومن کا جو خط ریاض میں ہے اور جس کو مقالہ نگار نے نقل کیا ہے، وہ "انشائے مومن" میں موجود ہے۔ مقالہ نگار اگر انشائے مومن کو دیکھ لیتے، تو ان کو معلوم ہوتا کہ ریاض اور انشا میں مکتوب الیہ مختلف اشخاص ھیں۔ اور یہ قابل ذکر بات تھی۔ ریاض میں مکتوب الیہ کا نام شیخ کرم علی ہے۔ انشا میں سرنامہ یہ عبارت ہے۔ "رقعہ بنام ھمیں بزرگوار"۔ یعنی اس سے پہلا خط جن صاحب کے نام ہے، یہ خط بھی انھیں کے نام ہے۔ اور اس سے پہلے والے خط پر یہ عبارت درج ہے۔ "بنام شیخ غلام علی ضامن کرم تخلص کہ از اجلۂ شاگردان آنجناب است[1]"۔ گویا یہ خط جو ریاض میں درج ہے اور جس کو مقالہ نگار نے نقل کیا ہے، دراصل مومن کے شاگرد، شیخ غلام ضامن کرم تخلص، کے نام ہے۔

(۱) میرے پیش نظر مومن کا کلیات فارسی قلمی (کتاب خانہ رام پور) ہے، اس میں "غلام علی ضامن" لکھا ہوا ہے۔ لیکن "علی" کا اضافہ، غالباً سہو کاتب ہے۔ تذکروں میں "غلام ضامن" ھی ہے، ملاحظہ ھو، گلشن بےخار، سخن شعرا، صبح گلشن، طور کلیم۔ شیفتہ نے ان کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے "وبا راقم آشناست"۔ انھوں نے بھی "غلام ضامن" ھی لکھا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور مسامحت بھی قابل ذکر ہے۔ مولوی ممتاز علی صاحب (سررشتہ دار محکمہ منصفی بھوپال) نے، تو شعرائے بھوپال کے حالات پر مشتمل ایک تذکرہ مرتب کیا تھا، جس کا تاریخی نام آثارالشعرا ہے (۱۳۰۴ھ) مطبع شاہجہانی بھوپال میں چھپا تھا۔ کرم کے تذکرے میں لکھا ہے۔ "کرم تخلص، منشی غلام ضامن صاحب مرحوم، خلف الرشید منشی غلام سبحانی عرف عبدالسبحان خاں صاحب، خال حقیقی مدارالمہام محمد جمال الدین خانصاحب بہادر مرحوم، ابتدائے آغاز جوانی سے تا بست و ھفت سال، سرکار نظام الملک حیدرآباد دکن میں، بماھوار پانصد روپیہ ملازم رھے، بعدہ، بھوپال میں آکر عہدہ ھائے جلیل پر ممتاز رھے۔ دواوین ان کے غدر ھند میں تلف ھوگئے۔ چند اوراق منتشر سے یہ دو غزلیں ان کی نقل کرتا ھوں۔ شعروسخن میں مرزا لطف علی خاں لطف دھلوی کے شاگرد تھے۔ تاریخ سیزدھم شعبان المعظم ۱۲۶۵ ھجری کو ان کا انتقال ھوا"۔

کرم کا شاگرد لطف ھونا، اور مدارالمہام جمال الدین خانصاحب کا اتنا قریبی رشتہ دار ھونا، دونوں باتیں قابل توجہ ھیں۔ آثارالشعرا کی مندرجۂ بالا عبارت کی بنیاد، غالباً "صبح گلشن" کے امر

(بقیہ اگلے صفحے پر

(ط) شیفتہ کے خط کے متعلق مقالہ نگار نے لکھا ہے، '' مجھے علم نہیں کہ ان کے کلیات میں یہ رقعہ نقل ہوا یا نہیں ''۔ میں عرض کروں کہ کلیات شیفتہ میں یہ رقعہ موجود ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس میں بھی مکتوب الیہ کا اختلاف ہے۔ ریاض میں یہ خط غالب کے نام ہے۔ لیکن کلیات شیفتہ میں مکتوب الیہ مفتی صدرالدین خاں آرزدہ ہیں۔ نیزج خط کے آخر میں یہ مطلع در ہے :

'' مطلع قصیدہ۔

زیں بعد ماو درغم دل نا گریستن   گشت آشنائے نرگس شہلا گریستن ''

مقالہ نگار نے ریاض کے حصہ نظم اردو کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے '' غالب کے مشہور قصیدے ع '' سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار '' کے (۲۵) اشعار ہیں۔ آخر میں چکنی ڈلی والا قطعہ اور ایک رباعی درج ہیں، جو ان کے دیوان میں موجود ہیں ''۔

مقالہ نگار نے غالباً سرسری جائزہ لیا ہے۔ اس حصے میں غالب کی وہ غزل بھی موجود ہے، جس کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے، '' مدت ہوی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے ''

بیان پر ہے۔ '' کرم تخلص منشی غلام ضامن، خلف منشی غلام سبحانی، متوطن قصبۂ کوتانہ، حوالی شاہ جہان آباد ست، مردے خوش فکر و رنگین مزاج، کریم الاخلاق و نیکو نہاد، ودرمشق سخن از لطف و کرم مرزا علی خاں لطف حظے وافی برداشت و سنہ خمس و ستین ازمائتہ ثالث عشر، در شہر بھوپال قدم برجادۂ عدم گذاشت '' (صبح گلشن ص ۳۳۸، مطبوعہ مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۸۷۸ء) ۔ کرم حقیتہ مومن کے شاگرد تھے، نیز ان کا '' خال حقیقی مدارالمہام ''، ہونا یوں محل نظر معلوم ہوتا ہے کہ سید علی حسن خاں (خلف نواب صدیق حسن خاں) نے اپنے تذکرے صبح گلشن کی مندرجہ بالا عبارت میں، اور ان کے دوسرے فرزند، سید نورالحسن خاں نے اپنے تذکرے '' طور کلیم '' میں جن الفاظ میں، کرم کا ذکر کیا ہے، وہ کسی تعلق خاص کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ نیز طور کلیم میں بہ صراحت مذکور ہے، کہ یہ مومن کے شاگرد تھے۔ اس کی عبارت یہ ہے :

'' کرم، شیخ غلام ضامن، از اہالی کوتانہ بود۔ یکچندبہ شاہ جہاں آباد بسربردہ۔ ومدتے در حیدرآباد گذرانیدہ۔ در بھوپال وفات یافت۔ از تلامذہ مومن خاں بود۔ بہ ہر دوزبان ریختہ و پارسی فکر میکرد۔ وقوت نظمیہ بسیار داشت '' (طور کلیم۔ ص ۸۲۔ سال ترتیب ۱۲۹۷ھ) مندرجۂ بالا تذکروں کے اقتباسات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کرم آخری زمانے میں بھوپال میں تھے اور وہیں وفات ہوی۔ لیکن گلشن بےخار اور سخن شعرا کی عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آخری زمانے میں دہلی ہی میں تھے۔ سخن شعرا کی عبارت یہ ہے۔ '' کرم تخلص، غلام ضامن، شاگرد مومن، متوطن کوتانہ۔ مدت تک حیدرآباد میں تھے، آخرالامر دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ فارسی بھی کہتے تھے '' (ص ۳۹۷) شیفتہ نے لکھا ہے۔ '' بالفعل در شاہجہاں آباد بسرمی برد . . . . باوجود کہن سالی مردشگفتہ و ظریف ست ''۔ یہ ممکن ہے کہ وفات بھوپال میں ہوئی ہو۔ بہر حال اس کے متعلق میں فی الوقت کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتا ہوں۔

مقالہ نگار نے شیفتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ " ان کے پایۂ علم اور شعر فہمی و سخن سنجی کے غالب بہت معترف تھے، وہ اپنا تازہ کلام نواب شیفتہ کو سنا کر مطمئن ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

غالب زحسرتی چہ سرایم کہ در غزل　　چوں او تلاش معنی و مضمون نہ کردہ کس

میرا خیال ہے کہ اس شعر کو، مقالہ نگار کے آخری جملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ غالباً موصوف کی مراد غالب کے اس شعر سے ہو گی، جس کا مصرع ثانی یہ ہے:

ننوشتہ در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

ریاض الفردوس میں کئی مقامات اور بھی قابل توجہ ہیں۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ اس میں ایک واسوخت خواجہ آتش کے نام سے درج ہے۔ آخری بند میں آتش تخلص بھی موجود ہے۔ لیکن یہ دراصل آتش کے ایک شاگرد، مرزا علی خاں خلف نواب رمضان علی خاں شیدا تخلص کا ہے۔ آتش کا دیوان ان کی زندگی ہی میں مطبع محمدی سے شائع ہوا تھا یہ اس میں نہیں ہے۔ مصطفائی پریس سے واسوختوں کا ایک مجموعہ ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ واسوخت اس مجموعے میں مرزا علی خاں شیدا کے نام سے موجود ہے۔ واسوختوں کا ایک اور مجموعہ شعلۂ جوالہ دو جلدوں میں، نولکشور پریس میں چھپا تھا، اس کی دوسری جلد میں بھی یہ واسوخت شیدا کے نام سے درج ہے۔ مرتب شعلۂ جوالہ نے اس واسوخت کے شروع میں، اس کی صراحت بھی کر دی ہے:

" یہ واسوخت جو درج مجموعہ ھذا ہے، خواجہ صاحب مرحوم کے نام سے مشہور ہے، مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال یہ واسوخت نواب صاحب ممدوح کا تصنیف فرمایا ہوا ہے"۔

اس واسوخوت میں ۲۶ بند ہیں۔ ریاض، اور مجموعۂ مصطفائی پریس دونوں میں یہی تعداد ہے۔ لیکن شعلۂ جوالہ میں صرف ۱۷ بند ہیں۔ ریاض میں اس طرح ہے:

غیر معشوق کا نکلا ہے زباں سے جو نام　　چھیڑنے کے لیے صاحب کے فقط تھا یہ کلام
حرف حق کہہ کے یہ واسوخت کو کرتا ہے تمام　　مت برا مانیو اس بات کا آتش ہے غلام

دوستی غیر سے واللہ جو منظور بھی ہو
آنکھ اٹھا کر نہ کبھی دیکھیں اگر حور بھی ہو

مجموعۂ مصطفائی پریس اور شعلۂ جوالہ میں بند کا دوسرا شعر اس طرح ہے:
نہ برا مانیو اس بات کا شیدا ہے غلام　　حرف حق کہہ کے یہ واسوخت کو کرتا ہے تمام

سب سے زیادہ محل نظر بات یہ ہے ، کہ اس مقالے میں صحت متن کا پوری طرح لحاظ نہیں رکھا گیا ہے ۔ اشعار اور عبارتوں کی نقل میں جگہ جگہ اختلاف پایا جاتا ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ غلطیاں ارباب پریس کی کارگذاری کا کرشمہ ہوں ۔ (کیونکہ ایسے کرشمے عموماً دیکھنے میں آتے رہتے ہیں) ۔ بہر صورت موجودہ صورت میں یہ پہلو نمایاں ہے ۔ اس کے علاوہ مقالہ نگار نے کئی مقامات پر معمولی تصحیح سے بھی سروکار نہیں رکھا ہے ۔ اور نقل مطابق اصل سے کا م لیا ہے ۔ نہ ایسے سقیم مصرعوں یا جملوں کے آگے حسب قاعدہ سوالیہ نشان بنایا ہے ۔ ایسی چند مثالیں درج ذیل ہیں :

مقالے میں	ریاض الفردوس میں
— باھمہ درگفتگو باھمہ با ماجرا	بے ھمہ با ماجرا
— محرم خورشید گشتم باشباں کم ساختم	باخساں کم ساختم
— کفردرکیشم سپاس نعمت دیدار دوست	دیدار اوست
— یارب شبہ (؟) است اینکہ ندارد سحرامشب	یارب چہاست (۱)
— اے روز تو خوش باد کہ . . . . گذر امشب	ریاض میں نقطہ دارجگہ پر " گردی " بالکل صاف لکھا ہوا ہے ۔
— پیش بہ ضبط گریہ بکوشم ز رشک غیر	پیششں بہ ضبط گریہ بکوشم . . . .
— نگریستن بحال من ناگریستن	ریاض میں یہ مصرع اسی طرح درج ہے لیکن بہ ادنیٰ تامل محسوس کیا جاسکتا تھا کہ یہاں ایک ' و ' کی کمی ہے اور اس کو قوسین میں لکھا جاسکتا تھا ۔
— از اشک ریزی مژدہ خالی نشدالم	خالی نہ شد دلم
— آزوده خیر آمده عرفی و "طالبا"	ریاض میں بھی خیر ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہاں خیز کا محل ہے ۔ ریاض میں طالبا واوین میں نہیں ہے ۔ مقالہ نگار کا اضافہ ہے اور بے وجہ ۔
— ایں نوازش بر نیافتی	بر نتافتی
— از وادی نثر صد مرحلہ دوارم انگندہ ۔	ریاض بھی ' دوارم ' ہے ۔ یہاں بھی محض نقل مطابق اصل سے کام لیا گیا ہے ، ' دورم ' ہونا چاہیے ۔

---

(۱) کلیات مومن میں یہ مصرع اس طرح ہے " یارب چہ شب است اینکہ ندارد سحر امشب "
(کلیات مومن قلمی رضالائبریری رامپور)

مقالے میں	ریاض میں
۔ بنشستن پرواز گفتن یابد	یہ نبشتن پرداز گفتن یابد ۔
۔ کہ از انتخاب ریختہ فراغت است و بہم دادہ	فراغت دست بہم دادہ
۔ نازم برم گیری و نفس با اثر ۔	نازم بدم گیرا و نفس با اثر
ع شکراللہ کہ چو بطوف حرم آوردند	شکر للہ چو بطوف حرسم آوردند
ع خوش است باتو بزمے بہ نہفتہ ساز کردن	ریاض میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ موجودہ صورت میں یہ ساقط الوزن ہے۔ یا تو کلیات شیفتہ سے اس کی تصیح کرنا چاہیے تھی ، یا اس کے آخر میں نشان استفہام ہونا چاہیے تھا ۔ کلیات میں یہ مصرع اس طرح ہے : چہ‌خوش است باتوبزمے بہ نہفتہ ساز کردن
ع ساقیو لیجیو سنبھال ہمیں	ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں ۔

محض چند اغلاط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ایسی غلطیاں بکثرت ہیں ۔

پرانی بیاضوں ، تذکروں ، اور بعض قابل ذکر کتابوں میں ، کسی شاعر کا جو کلام درج ہوتا ہے، کبھی کبھی مطبوعہ دیوان میں اور اس میں اختلاف ہوا کرتا ہے، جو عام طور سے نظروں کے سامنے نہیں آپاتا ہے۔ اگر اس طرف بھی توجہ کی جائے اور مطبوعہ دواوین کو سامنے رکھ کر ، اختلاف کی نشاندھی کر دی جائے ، تو یہ ایک نہایت مفید اضافہ ہوسکتا ہے۔ مقالہ نگار نے اس طرف بھی توجہ نہیں کی ہے۔ یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ کسی مطبوعہ کتاب سے ، جو دستیاب بھی ہوتی ہو ، عبارتوں یا غزلوں کا اس صورت میں نقل کر دینا واقعی مفید ہو سکتا ہے، جب کہ اس کے جملہ متعلقات کا احاطہ کرلیا جائے ۔ جیسے شیفتہ کی جو اردو غزل ریاض میں ہے، اس کے بعض اشعار میں ، مطبوعہ دواوین سے خاصا اختلاف ہے۔ مثلاً :

ریاض میں	مطبوعہ دواوین میں
بے اشک لالہ گوں بھی مری آبرو نہیں	بےاشک لالہ گوں بھی میں بےآبرو نہیں
گریہ میں رنگ کیا ہو کہ دل میں لہو نہیں	آنسو میں رنگ کیا ہو . . . .
شکر ستم ہی راس نہ آیا ہمیں کہ اب	شکر ستم بھی . . . .
بدنامیوں سے ہائے گذار ایک سو نہیں	گذر ایک سو نہیں
کیا جوش انتظار میں ہر سمت دوڑیے	. . . . . . دوڑ ہے

مرزا ہادی رسوا کی مثنوی "امید و بیم" پر جو مضمون ہے ، اس کے تمہیدی حصے میں بھی کئی باتیں توجہ طلب ہیں ۔

مقالہ نگار نے لکھا ہے ، "اس عہد میں اردو زبان پر فارسیت کا غلبہ تھا، چنانچہ میر و درد کی مثنویوں کی زبان میں وہی تراکیب الفاظ اور محاورات ملتے ہیں " ۔

مجھے اس کا اعتراف ہے ، کہ میں خواجہ میر درد کی کسی اردو مثنوی سے واقف نہیں ہوں ۔ موصوف نے یقیناً درد کی مثنوی یا مثنویاں پڑھی ہوں گی ، اور ان کو پڑھ کر ہی ، یہ رائے قایم کی ہو گی ۔ اگر مقالہ نگار مثنوی یا مثنویات میر درد کی بھی اسی طرح نشان دہی کردیں ، تو بہتوں کے علم میں اضافے کا سبب ہوگا ۔

ایک جگہ مثنوی سحرالبیان لکھ کر قوسین میں (بدرمنیر) لکھا گیا ہے ، غالباً مقالہ نگار نے مثنوی سحرالبیان کے کسی قدیم ایڈیشن میں اس کا نام (بدرمنیر) بھی دیکھا ہوگا ۔ اس ایڈیشن کا علم بھی میرا خیال ہے ، بہتوں کو نہیں ہوگا ۔

مثنوی "بحرالمحبت" کا مصنف "خواجہ مصحفی" کو لکھا ہے ۔ میرے خیال میں عام طورسے لوگ شیخ مصحفی سے واقف ہیں ، خواجہ مصحفی سے نہیں ۔

"ترانۂ شوق — منشی شوق قدوائی لکھنوی" ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی ، اور شوق قدوائی ، تو آج تک پڑھا بھی تھا اور سنا بھی ، یہ " منشی شوق قدوائی " بالکل نئی ترکیب آج ہی دیکھی ، بہر حال یہ بھی ایک اضافہ ہے ، کیونکہ اس میں جدت کے علاوہ، غلطی کوئی نہیں ہے ۔

حصۂ لغت میں ، کمپوزیٹر صاحب نے مندرجۂ ذیل دو مصرعوں کی صورت بگاڑدی ہے :

دم بخشش کیوں نہ ہو گوہر افشاں (ص ۴۴)
ہیں جو مردان خدا آفت میں راحت ہے انہیں (ص ۴۶)

لفظ ابرا کے ذیل میں جان صاحب کا ایک شعر سند میں درج کیا گیا ہے ۔ اور حوالہ مہذب‌اللغات کا دیا گیا ہے ۔ یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوئی کہ ایک ثانوی اور بڑی حد تک ناقابل اعتبار ماخذ سے کام لیا گیا ۔ دیوان جان صاحب (مطبوعہ) میں یہ شعر موجود نہیں ہے ۔ میں اس وقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ شعر جان صاحب کا ہے یا نہیں ۔

رشید حسن خاں

★★
★★

ش۔ح۔ح

کرخنداری اردو (بزبان انگریزی)
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،
۸۰ صفحات (مجلد) قیمت ۵۰۔ ۷

جناب مصنف نے اپنے دیباچے میں بجا طور پر تعجب کیا ہے کہ اگرچہ اردو زبان دنیا بھر میں مطالعے اور لسانی تحقیق کا موضوع رہی ہے، خود اس زبان میں اس کی فرعی بولیوں پر علمی مواد بالکل موجود نہیں۔ دراصل ایسے تعجب کے مقامات اور بھی بہت ہیں۔ اس تالیف سے موصوف کا مقصد ''کرخنداری اردو'' کا ایک لسانی تجزیہ پیش کرنا، نیز اردو داں اہل علم کو اردو کی مختلف بولیوں کے لسانی مطالعے کی طرف راغب کرنا ہے۔

اب سے پہلے ''کرخنداری اردو'' کے جستہ جستہ نمونے صرف افسانوی ادب کے مکالموں میں ملتے تھے، یا طنز و مزاح کے طریق پر بعض مصنفوں نے اس دلچسپ بولی سے کچھ لطف لیا۔ ایم۔ اے۔ مغنی صاحب کے دلچسپ خاکے جو ''نرالی اردو'' کے نام سے شائع ہوئے تھے، اس لحاظ سے زیادہ دلچسپ تھے کہ ان میں دلی کی اس مخصوص بولی کے بھر پور نمونوں کے ساتھ، اسکے بولنے والوں کا ایک سماجی مطالعہ بھی ملتا تھا۔ یہ کتاب محفوظ رہنے کے قابل تھی مگر اب نایاب ہے۔

ڈاکٹر نارنگ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اس بولی کو لسانی مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ وہ اسے اصطلاحی طور پر اردو زبان کی ایک شاخ یا dialect قرار دیتے ہیں۔ اور اسی حیثیت سے انہوں نے اس کا تجزیہ کیا ہے، لیکن اس تجزیے سے ان کا یہ مفروضہ پوری طرح ثابت نہیں ہوتا۔ اصطلاحاً ''ڈایا لیکٹ'' سے مقامی بولیاں مراد ہوتی ہیں، جن کی حدود عموماً جغرافیائی ہوتی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے متوازی رہتی بستی ہیں۔ ایک مرکز کے ارد گرد زبان کی مختلف شاخیں پھیلی ہوتی ہیں جو مرکزی بولی کی ہمرشتہ اور اسکے ساتھ ایک ہی حلقہ میں شامل ہوتی ہیں۔ ''ارنٹ وسل'' (W. J. Erntwistle) کے بقول، ہر بڑی زبان کی ایک ''کھڑی'' تقسیم ہوتی ہے اور ایک ''پڑی''۔ وہ لکھتا ہے ''ڈایا لیکٹوں کی جغرافیائی یا افقی تقسیم کے علاوہ، زبان کی ایک عمودی تقسیم (یا عمودی مدارج) بھی ہوتے ہیں۔ ہر زبان در اصل ایک ڈایا لیکٹ ہے، جس کے تحت ایک مقامی محاورہ (parler) بھی ہوتا ہے۔ جس میں کچھ نہ کچھ وحدت ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی جداگانہ کیریکٹر نہیں ہوتا۔ یہ کسی محدود علاقے میں بھی بولا جاسکتا ہے اور کسی گروہ مثلاً پیشہ وروں سے بھی مخصوص ہو سکتا ہے، بلکہ بعض اوقات افراد سے بھی''۔
(Aspects of Language : صفحہ ۳۱) -

اسی لحاظ سے، ایک دوسرے مصنف ''ایرک پارٹرج'' نے اپنے مقالے Slang & Standard English میں انگریزی زبان کے حسب ذیل مدارج قرار دیئے ہیں:

(1) Cant, (2) Slang, (3) Colloquial English, (4) Vulgarism, (5) Standard English : اور اس کے تین اعلیٰ مدارج، یعنی:

(1) *Familiar English (2) Ordinary Standard English, (3) Literary English.*

وہ لکھتا ہے کہ ''dialect بالکل الگ چیز ہے۔ اسے اس heirarchy میں شامل نہیں کیا جا سکتا،

کیونکہ یہ یا تو ابتدائی ہوتا ہے یا مقامی ۔ ''

ڈاکٹر نارنگ کے تجزیے کی روشنی میں ''کرخنداری اردو'' نہ ''ابتدائی'' ثابت ہوتی ہے، نہ مقامی یا جغرافیائی تقسیم میں شمار کی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ اسی کے دوش بدوش وہ زبان بھی موجود ہے جسے مذکورۂ بالا تقسیم میں عام فہم زبان کہا گیا ہے ۔ ہر بڑی زبان کا ایک وہ لہجہ اور محاورہ بھی ہوتا ہے جسے جہلا کی زبان یا Low language کہتے ہیں ۔ لسانی تقسیم میں اصل اختلاف لہجے محاورے یا تلفظ کا نہیں بلکہ گرامر کا اختلاف ہے ۔ اگرچہ ڈاکٹر نارنگ نے ''صوتیات'' اور ''لغت'' کے ساتھ ایک عنوان ''قواعد'' کا بھی قائم کیا ہے، لیکن اس کے تحت جتنے اختلافات معیاری اور کرخنداری اردو کے گنائے گئے ہیں وہ قواعدی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ صرف لہجے یا تلفظ کے فرق کو ظاہر کرتے ہیں ۔ مثلاً ''اس'' کی جگہ ''وس''، ''کسی'' کی جگہ ''کسو'' ''بنا ہوا'' کی جگہ ''بنا وا'' کبھی کی جگہ ''کدھی'' ''رہا'' کی جگہ ''ریا''، نیچے کی جگہ ''نیچو'' ۔ ان مثالوں سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کرخنداری اردو کے قواعد یعنی صرف اور نحو، معیاری اردو سے کیونکر مختلف ہیں کہ اسے ایک علیحدہ شاخ شمار کیا جائے ۔

البتہ یہ ثابت ہے کہ معیاری اور کرخنداری اردو کی صوتیات ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ ایک ہیں ۔ اسی طرح لغت میں بھی گنے چنے مخصوص الفاظ کو چھوڑ کر (مثلاً ناواں، دھیانگی، جمادگی) جو فصیح اردو شمار نہیں کئے جاتے، کوئی اختلافات نہیں ۔ جن پیشہ وروں کی یہ زبان ہے ان کی ذہنی سطح تک اردو کے جو الفاظ آتے ہیں، وہ سب اس کے تصرف میں ہیں، اور جو اس کے استعمال سے خارج ہیں، وہ کسی علیحدہ بولی کی نشان دہی نہیں کرتے ۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اس بولی کا تجزیہ خاص کاوش سے کیا ہے، لیکن یہ بیشتر خود اردو زبان ہی کا صوتیاتی اور لسانی تجزیہ ہے ۔ بعض خصوصیات جو انہوں نے ''کرخنداری'' سے منسوب کی ہیں، اردو زبان یعنی اس کے بولنے والوں کی خصوصیات ہیں، اور زبان اپنے بولنے والوں ہی سے شناخت ہوتی ہے نہ کہ لغتوں (خصوصاً غیر زبانوں کے لفظوں) کے ذریعے ۔ مثلاً کلمہ کے شروع میں دو حروف صحیح کا جمع نہ ہونا، یعنی: پیار کا پیار ۔ پیاس کا پیاس ۔ پرساد کا پرشاد ۔ کرشن کا کرشن ۔ برہ منتر کا بریہ من ۔ سٹیشن کا اسٹیشن ہو جانا، یا عمر کا عمر ۔ اصل کا اصل ۔ صدر کا صدر ۔ دفن کا دفن ۔ بدر کا بدر ۔ عقل کا عقل پلیٹ کا پلیٹ بن جانا ۔ (ڈاکٹر صاحب کا یہ گمان صحیح نہیں کہ خیال بروزن خال تھا جو خیال بن گیا، اسی طرح خواب، خواہ و غیرہ کا تلفظ وا و کے اعلان کے بغیر ہی درست ہے ۔)

لہذا یہ اختلاف اسی ''عمودی تقسیم'' کی ذیل میں آتا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ۔ اور اس بنا پر کرخنداری اردو کوئی علیحدہ بولی قرار نہیں پاتی ۔ بعض الفاظ کا تلفظ جو کتاب میں درج ہے وہ معیاری کرخنداری سے مختلف معلوم ہوا ۔ مثلاً ٹپو (ٹوپی) کا کرخنداری تلفظ ۔ ضمہ ٹ شدپ اور واو مجہول کے ساتھ ہے، نہ کہ فتحہ ٹ اور واو معروف کے ساتھ ۔ اسی طرح ''بازدان'' (د کے ساتھ) بعد ازاں کا بگاڑ ہے، نہ کہ بازواں (بالواو) ۔ چبلا کسرہ چ، ب اور تشدید ل کے ساتھ درست ہے، فتحہ چ سکون ب کے ساتھ نہیں ۔ رپیٹا (چپت) سکون پ کے ساتھ ہے رپیٹا (بروزن لپیٹا) نہیں ہے ۔

بعض الفاظ جو کرخنداری سے منسوب کئے گئے ہیں دراصل اردو روز مرہ میں شمار ہوتے ہیں ۔ مثلاً ھلہلہ، ڈھوڈھا، کیا کو تک، فروٹ، قسما دھرسی، بجار (بیل) گما (اینٹ)، کو لکی، تڑی، کھپا، جھانپڑ، پنڈا، لگ ماتر، لوگ باگ ۔ اسی طرح بعض محاورات اور مثلیں بھی، مثلاً : ''مالک کی اگاڑی سے اور گھوڑے کی پچھاڑی سے ڈرنا چاہئے، سمجھے سو گدھا اناڑی کی جانے بلا، لکڑی کے

ہل سکڑی ناچتی ہے ، ہوائی دیدہ ہونا ، دیدے پٹم ہونا ، بھولی بھولی کھانا ، وغیرہ ۔

ہمیں یہ تجزیہ اس لحاظ سے کسی قدر تشنہ معلوم ہوا کہ اس میں اس زبان کے بولنے والوں کی تخلیقی صلاحیت کا کوئی ذکر نہیں ۔ پیشہ وروں کی بے شمار اصطلاحیں ، جو اردو کا بہت بڑا لغوی سرمایہ ہیں ، بلا شبہ اسی طبقے کی تخلیقی قوت کی پیداوار ہیں جو کرخندار کہلاتا ہے ۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس زبان کے بولنے والوں میں بہت سے پیشوں اور ہنروں کے نام گنوائے ہیں ، لیکن ان کی مخصوص اصطلاحات کو یکسر نظر انداز کیا ہے ۔ اس طرح اس کا دائرہ صرف بگڑی ہوئی اردو تک محدود ہوجاتا ہے ۔ لیکن یہ بات قرین واقعہ یا قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی ۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے کہ کرخنداری اردو یا کوئی بھی بولی علم اللسان کے نزدیک غیر اہم نہیں بلکہ سنجیدہ مطالعے کی دعوت دیتی ہے ۔ بازاری زبان میں بہت سے الفاظ کی اصل صورت محفوظ ہوتی ہے ۔ جو الفاظ ایک وقت میں مبتذل یا ٹکسال باہر سمجھے جاتے ہیں ، وہ زمانے کے انقلاب سے فصاحت کا درجہ بھی پالیتے ہیں ۔ روما کی بازاری زبان کا اصطلاحی نام آج تک Vulgar Latin یا مبتذل لاطینی ہے ، اور اپنے وقت میں فصحا کے لئے باعث عارتھی ، لیکن آگے چل کر اسی زبان نے بڑا عروج پایا اور رومانوی زبانوں کے پورے سلسلے کی ماں بنی ۔

ڈاکٹر صاحب نے اس حقیقت کی طرف بھی بجا طور سے توجہ دلائی ہے کہ لہجے ، تلفظ اور صرفی قواعد میں آج تک عوامی یا فطری رجحانات کو وہ اعتبار حاصل نہیں جو فرسودہ و بے گانہ (اگرچہ اصلی و قدیمی) اصولوں کو ۔ اسی باعث اردو کی فصیح بولی کلاسکیت کے درجہ پر پہنچتی جارہی ہے ، جو اس کی بقا کے حق میں مفید یا امید افزا آثار نہیں ۔ اسی طرح ہندی میں تت سم کی طرف رجعت الٹی گنگا بہانے کے مرادف ہے ۔ بعض لوگ انگریزی الفاظ کو بھی اصلی لہجے اور مخرج کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مثلاً حرف اول کو ساکن کرنا ۔ یہ خصوصیت فرانسیسی زبان میں بھی ہے کہ شروع میں دو حروف صحیح نہیں آتے اور اردو کی طرح یا تو پہلے حرف کے شروع میں یا اس کے بعد ایک حرف علت در آتا ہے ۔ ہمیں اپنی لسانی عادات پر جھینپنے کی ضرورت نہیں ، لیکن ابھی تک اس بارے میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوسکی ۔

قیاس ہے کہ اگر اردو کو زندگی کے کاروبار میں انگریزی ہی کی طرح رواں دواں ہونے کا موقع ملا اور یہ صرف نظم و نثر کی زبان نہ رہی تو فطری رجحانات رفتہ رفتہ غالب آجائیں گے ، کیونکہ تاریخ میں ہر زندہ ، توانا ، چلتی پھرتی زبان کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے ۔   ش ۔ ح ۔ ح

نمونۂ لغات اردو

ضمیمہ اردو نامہ شمارۂ پنجم پر تبصرہ

ڈاکٹر آمنہ خاتون

صول لغت : " یہ ان صول کا خلاصہ ہے الخ "

اردو میں کسی ایسے لفظ کی جمع بنانی ہو جس کے بعد کوئی حرف عامل نہ ہو تو پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ مذکر ہے یا مونث ، اگر مذکر ہے تو کس حرف پر ختم ہوا ہے اور اگر مونث ہے تو کس حرف پر ، کیونکہ ہر لفظ کے آخری حرف پر اس لفظ کی جمع بنانے کا قاعدہ منحصر ہے۔ مثلاً (مذکر) لڑکا لڑکے بندہ بندے ، کنواں کنوئیں ، ردیاں رویئیں۔ لفظ لفظ (مونث) ، لڑکی لڑکیاں ، کتاب کتابیں ، فاختہ فاختائیں ، بہو بہوئیں ، ماں مائیں ، لیکن ایسے لفظوں کی جمعیں بنانی ہیں جن کے آخر میں حروف عامل ہیں تو نہ لفظ کی تذکیر و تانیث معین کرنے کی ضرورت ہے اور نہ لفظ کے آخری حرف پر نظر ہونا ضروری ہے ، سب کی جمعیں آخر میں وں بڑھانے سے بنتی ہیں ۔

" اصول لغت " میں اصول فارسی ترکیب میں واقع ہوا ہے ، اور اصل کی جمع ہے ، لیکن اردو میں اصل مونث ہے اور اس کی جمع اصلیں ہے یعنی " اصول لغت " کا اردو میں ترجمہ ہوا " لغت کی اصلیں " لیکن اس ترجمے میں وہ مفہوم نہیں ہے جو اصول لغت میں ہے ، یعنی لغت کے بنیادی قانون اور قاعدے ، ——— اردو میں اصول واحد مذکر ہے اور آخری حرف کے اعتبار سے واحد اور جمع میں مشترک ہے ۔ چنانچہ سر سید کے اس جملے میں " ملا اپنی قدیم لکیر پر فقیر ہیں ، اس زمانے کے جوان جدید اصول پر مرتے ہیں صفحہ ۳۸ ۔ قدیم لکیر کے مقابلے میں جدید اصول واحد ہے اور اس جملے میں " انسان اپنی تمام خوشیوں اور خواہشوں کو زندہ رکھے اور ان اصولوں پر استعمال کرے جو اصول کہ ان کے پیدا کرنے والے نے ان کے استعمال کے لئے پیدا کئے ہیں " صفحہ ۳۸ ۔ اصول جمع ہے اور حرف عامل کی موجودگی میں اصول کی جمع اصولوں آتی ہے اور اس کی مثال اسی جملے میں موجود ہے اس لئے لغات اردو میں " اصول لغت " کے تحت " یہ ان اصول کا خلاصہ ہے الخ " کی بجائے " یہ ان اصولوں کا خلاصہ ہے الخ " چاہیئے ۔

اصول لغت ۔ اصول نمبر ۵ ۔ " ...... لیکن چونکہ الف کی حرکت کلمے کے درمیان یا آخر عموماً بذاتہ واضح ہوتی ہے ، لہٰذا ایسی صورت میں الف پر فتحہ لگانا زائد اور بے سود ہوگا "

" لگانا " میں دو الف ہیں ایک درمیان کلمہ میں اور دوسرا آخر کلمہ میں لیکن دونوں صورتوں میں طویل حرکت الف پر نہیں بلکہ اس کے حرف ماقبل گ اور ن پر ہے ، سنسکرت کے برخلاف اردو میں سب حروف کی آواز قصیری ہوتی ہیں اور کوئی آواز مثلاً آ आ اِی ई اُو उ ایک اکیلے حرف سے ظاہر نہیں کی جاسکتی ، زبر ، زیر ، پیش کی طویل آوازوں کو کتابت میں ظاہر کرنے کیلئے حرف کے بعد ا ، ی ، و لکھ دیتے ہیں ، لیکن خود ا ی و میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت نہیں ، کیونکہ ان پر بھی طویل و قصیر حرکات کا وہی اثر ہوتا ہے جو دوسرے حروف ہجی پر ہوتا ہے ۔ اردو کے قواعد نویس بھی ا و ی کو حروف علت اسی وقت کہتے ہیں جب کہ یہ ساکن ہوں ۔ اب اگر زبر یا پیش کی طویل یا ممدود آواز عربی کے لہجے کے مطابق ہے تو وہ عربوں کیلئے

جانی پہچانی آواز یعنے معروف ہے اور اگر عجمی لہجے کے مطابق ہے تو وہ مجہول یعنے اجنبی اور نامانوس آواز ہے اور درازئ حرکت سے پیدا ہونے والے ان حروف کو عربی میں حروف مدّہ کہتے ہیں "حرفِ علت جب ساکن ہوں اور حرکت ماقبل ان کے موافق ہو تو مدّہ کہلاتے ہیں اور جب حرکتِ ماقبل موافق نہ ہو تو لین"۔ زیر اور پیش ممدود ہوتے ہیں تو ان کی آوازیں معروف بھی ہو سکتی ہیں اور مجہول بھی لیکن جب زبر ممدود ہوتا ہے تو اس کی آواز معروف ہی رہتی ہے۔ اس لئے مذکور جملہ اگر یوں ہوتا تو مفہوم صحیح طور پر ادا ہوتا، "لیکن چونکہ الف کی حرکت ماقبل کلمے کے درمیان یا آخر زبر ہی ہوتی ہے اس لئے ایسی صورت میں الف کے ماقبل حرف پر فتحہ لگانا زائد اور بے سود ہوگا"

اشارات: واوٗ مجہول بفتحہ (جیسے قوؔل میں)، یائے مجہول بفتحہ (جیسے سُہَیل میں)

واؤ کے معروف یا مجہول ہونے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کا ماقبل مضموم ہو اور حرف "ی" معروف یا مجہول ہوتی ہے جس کا ماقبل مکسور ہوتا ہے، اس لئے "وجِ ضم" جیسے ڈھول اور "ی جِ کس" جیسے تیل میں ضم اور کس زائد اور بے سود ہیں۔ وہ "و" اور "ی" جن کا ماقبل مفتوح ہوتا ہے مجہول نہیں ہو سکتے کیونکہ قول اور سہیل دونوں عربی کے لفظ ہیں اور ان دونوں کی آوازیں عربوں کے لئے معروف ہیں اور خود بابائے اردو نے قواعد اردو طبع چہارم میں لکھا ہے "بعض اوقات مختلف حرکتیں جمع ہو جاتی ہیں مثلاً زبر اور واؤ ایک جگہ آجاتے ہیں جیسے قوم میں ایسی حالت میں یہ مختلف حرکتیں ایک ہی آواز دیتی ہیں، یہی حالت "ی" کی بھی ہے جیسے خیر میں، ایسی "و" یا "ی" کو قبل فتح کہتے ہیں" صـ ۱۱ اس لئے "وجِ فت" کی جگہ "و ماقبل فت یا "و لین" اور "ی جِ فت" کی جگہ "ی ماقبل فت" یا "ی لین" درست ہے۔

اشارات: یائے مجہول. یائے معروف" ہوائے میکدہ ص ۲ سطر ۵، اثنائے ابد اور ازل ص ۴ سطر ۱۶ (نمونۂ لغات اردو میں ایسے بے شمار مقام ہیں)

جن فارسی اور عربی الفاظ کے آخر میں الف ہوتا ہے ان میں مرکب اضافی کی حالت میں جب کہ ترکیب فارسی ہے جو تغیر ہوتا ہے اس کے بارے میں مرزا غالب لکھتے ہیں: "اقسام یائے تحتانی: یاد رکھو تحتانی تین طرح پر ہے۔

۱۔ جزو کلمہ ع ہمائے برسر مرغان ازاں شرف دارد ——— ع اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشائے را، یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے جزو کلمہ ہے، اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے" (برائے تلفظ "علامات" میں چھٹے جگہ۔ خیال یا رائے کا، رائے عالی، اصابت رائے غلطی رائے صفحہ ۱۶ کالم ۲۔ برائے اور رائے میں یا جزو کلمہ ہے اس پر ہمزہ نہیں چاہیئے۔ نور اللغات (۱۹۲۹ء) رائے کے تحت دو بار رائے اور چار بار رائے لکھا ہے۔ عربی لفظ رأی ہے اور فارسی اور اردو میں رائے بلا ہمزہ)

۲۔ تحتانی مضاف ہے صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی فعل ہے، جیسے آسیائے چرخ، یا آشنائے قدیم توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے شوم، رہنمائے تو شوم یہ بھی اسی قبیل سے ہے" دارُو میں دامن ابر سپر ص ۶، گلہائے اصفری ص ۲۵ سوائے مکر و فریب ص ۱، فصحائے شیراز ص ۲۵، مرتبہ افزائے اقوم ص ۲۴۔ میں ہمزہ نہیں چاہیے، اور خود مرزا غالب کا یہ جملہ انھیں کے اصول کے خلاف لکھا گیا ہے۔ ص ۳۵ کالم ۲ سطر ۱۳۔ ۱۴ وہ تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ یائے اصلی (بجائے یائے اصلی) کیا ہے اور یائے زائدہ (بجائے یائے زائد) کیا ہے۔

۳۔ فارسی رسم خط میں اور اس کے تتبع میں اردو رسم خط میں بھی عربی الفاظ کے آخر کا ہمزہ نہیں لکھتے، طبقات الشعراء اور تاج الاولیاء کے آخر کا ہمزہ درست ہے کیونکہ ترکیب عربی ہے۔ طبقۂ شرفا اور تاج اولیا کو جن کی ترکیب فارسی ہے میسور کی طرف مضاف کریں تو یا کو لانا پڑے گا جیسے طبقۂ شرفائے میسور اور تاج اولیائے میسور اور اگر طبقات الشعراء اور تاج الاولیاء کو میسور کی طرف مضاف کریں تو ہمزہ کو صرف کسرہ دے دینا کافی ہے جیسے طبقات الشعراءِ میسور اور تاج الاولیاءِ میسور، اسی طرح افضل علمائے میسور اور افضل العلماءِ میسور کی اضافی ترکیبیں قیاساً درست ہیں۔

ﻋـ بابائے اردو لکھتے ہیں "ہر ایک ی پر جو آخر میں آتی ہے تو لکھنا درست نہیں جیسے رای، رائے، میں ی کی آواز کافی ہے" قواعد اردو ص ۱۲

"سراپائے سخن" اور "بجائے سخن" میں خواہ یا کو جزوِ کلمہ تسلیم کریں یا برائے اضافت دونوں صورتوں میں ہمزہ غلط ہے، سراپاے سخن اور بجاے سخن بلا ہمزہ چاہیئے تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں میری تصنیف "تحقیقی نوادر" سنہ ۱۹۴۹ء میں مضمون نمبر ۴ "قواعد اردو رسم خط")

"دو طرح پر ہے یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی، دوسری توحیدی و تنکیری وہ مجہول ہوگی مثلاً مصدری آشنائی یہاں ہمزہ ضرور بلکہ نہ لکھنا عقل کا قصور، توحیدی، آشنائے یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا، یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا نہ کہلاؤ گے۔" (خط نمبر ۶۲ ادبی خطوط غالب از مرزا عسکری)

غیاث اللغات، مطبع منشی نول کشور کانپور ۱۸۷۳ء

برہان قاطع " " " ۱۸۸۸ء

ان دونوں لغتوں کے رسم خط مرزا غالب سے متفق ہیں لیکن غیاث میں شاذ و نادر حروف تہجی کا عربی تلفظ بحال رہ گیا ہے جو یقیناً غلط ہے مثلاً "ادبیر بکسر اول و کسر بای موحدہ دیائے مجہول املاء دار و گاہے برای رعایت قافیہ بیای معروف نیز خوانند" اس میں با، موحدہ کی جگہ بای موحدہ صحیح ہے لیکن یہ کاتب کی چوک ہے کیوں کہ "باب بای عربی" کی سب فصلوں میں "فصل بای موحدہ مع ......" ہی لکھا گیا ہے اور اسی طرح سب جگہ تای فوقانی وثای مثلثہ وجای مہلہ وخای معجمہ ورای مہملہ وذالے معجمہ وطای مہملہ وظای معجمہ وہای ہوز ویای تحتانی بغیر ہمزہ لکھا ہے۔

نفائس اللغات، مطبع نولکشور کانپور ۱۸۶۹ء اس میں کاتب اکثر و بیشتر باء، راء، حاء وغیرہ لکھتا ہے، جو غلط ہے لیکن کہیں کہیں باے راے، حاے بھی لکھ دیتا ہے مثلاً "آبرو۔ بضم رای مہملہ لغت فارسی ست در اردوی ہندی مستعمل بمعنی شرف و بزرگی ...... بعربی آنرا عرض بکسر عین مہملہ و سکون را مہملہ و ضاد معجمہ در آخر......"

نور اللغات (سنہ ۱۹۲۴ء) میں بیچ سے بیڑا تک صفحہ ۳۰۷ تا ۳۵۷ پندرہ جگہ یاے اور ایک جگہ یائے لکھا ہے (بیچی، بکسر اول و سکون یائے معروف الخ) جو غلط ہے۔

گلشن فیض از سید ضامن علی جلال، مطبع نولکشور ۱۸۸۰ء، یہ اردو لغات رسم خط کا کامل نمونہ ہے۔ دو مثالیں یہ ہیں، مٹی پکڑنا۔ پاے فارسی دکاف ہر دو مفتوح راے ہندی زدہ نون والف مصدری کنایہ از جاگزیدن بود مثل میم مفتوح فوقانی ساکن لام تحتانی معروف تقاضاے طبیعت برائے دفع کردن غذا یا خلط موذی از معدہ بود مجلہ شیلپور (در چاپخانہ تیمس آف انڈیا بمبئی برای نشریات متحدہ، چاپ شدہ) کے چند شمارے ۱۳/۱۹۴۲ ۲۱، ۲۴، ۲۹ اس وقت پیش نظر ہیں، ان کی مندرجات سے چند عنوان علی الترتیب ذیل میں درج ہیں۔ یک فرمانروای جدید، زیبائی ہای لندن نیروی ہوائی ہندوستان، تراشہ کاری ہای معماری ہندو، شہرہای بزرگ امپراتوری، اسلحہ ہای امپراتوری، بازیہای استرالیا، افریقای خاوری محصول چاہای ہندوستان، لباس ہای دریائی مختلف برای کنار دریا، ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے یائے تحتانی کے رسم خط کی جو قسمیں بیان کی ہیں وہ بین الاقوامی اور عام ہیں۔

بیتش نقط: ص ۲ سطر ۶ رفقا کار، انشا ص ۳۶، آباؤ اجداد ص ۳۸، ان کا صحیح رسم خط رفقاے کار، انشا اور آبا و اجداد ہے صحت حضور حق سے چلانے کے لوے لالہ، یہ ایک مقام مجھے درست نظر آیا۔ اسی طرح انشا کا املا درست بھی لکھا ہے مثلاً ص ۱۲ کالم ۲ سطر ۱۲ اور ۲۵

ع ہوئے زنداں میں ہم اب کے برس بند ص ۳ کالم ۲ یہاں "ہوے" چاہیئے

ع کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے، ص ۹ ہوے ص ۵

سے بابائے اردو نے یائے معروف اور یائے مجہول میں کہیں ہمزہ نہیں لکھا، قواعد اردو سنہ ۱۹۴۰ء مثلاً ص ۱۰

ع داڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو، ص ۳۲ — " بڑھے ہوئے "
ع بہ رہزنِ قافلۂ دل ہوئیں جب وہ پلکیں ، ص ۱۴ — " ہوئیں "
ع وہ برق وش ہوئے آزار کھینچ کر معدوم ، ص ۵ — " ہوئے " ؎۱

قاعدہ : جس دو حرفی امر یا مادے کا دوسرا حرف واؤ ہوتا ہے اس کے بعد کبھی الف اور کبھی یا بڑھا کر ماضی مطلق بناتے ہیں مثلاً چھو، چو (چھونا، چکیدن) اور ہو سے چھوا، چوا اور ہوا اور بو، رو اور سو سے بویا، رویا اور سویا اور اسی طرح دھویا، ڈھویا، کھویا بھی ۔ مادے کے دو حرفی ہونے کی قید اس لئے ہے کہ مادے میں جب دو سے زیادہ حرف ہوں گے تو ہمیشہ یا بڑھائیں گے مثلاً سمونا، بلونا، بھگونا، پرونا، ڈبونا سے ڈبویا، پرویا، بھگویا، بلویا، سمویا۔ چھوا، چوا، ہوا ہندی کے لفظ ہیں جمع میں الف یائے مجہول سے اور مونث میں الف یائے معروف سے بدل جاتا ہے۔ جیسے چھوے، چوے، ہوے (دس آم چھوے، دس قطرے چوے، آٹھ دن ہوئے) اور چھوی، چوی اور ہوی جیسے سنا، کہا، رہا سے سنے کہے رہے اور سنی کہی رہی۔ اب نہیں معلوم کہ ہوا سے ہوئی یا ہوی میں ہمزہ کہاں سے آگیا۔ ایک قاعدہ یہ ہے کہ جب دو یائیں جمع ہو جاتی ہیں تو پہلی یا ہمزہ سے بدل جاتی ہے مثلاً سینا، جینا، پینا، کرنا سے سیے جیے پیے کیے سے سئے جئے پئے کئے (کپڑے سئے، ہم جئے، پیالے پئے، کام کئے) لیکن نہیں معلوم کہ ہوا کے الف کو یا سے خواہ مجہول ہو یا معروف بدلنے سے اس سے پہلے ایک ہمزہ کیسے نمودار ہو گیا۔ ایک قاعدہ یہ ہے کہ آخری الف یا واو کے بعد یا بڑھائیں تو اس سے پہلے ایک ہمزہ (ہمزہ وقایہ) بڑھ جاتا ہے مثلاً خدائی، ہوائی، خدائے، ہوائے، تاریخ گوئی، یک سوئی، لیکن ہوا میں الف کے بعد یا نہیں بڑھی بلکہ الف ہی یا سے بدل گیا ہے، حاصل یہ کہ ہوئی یا ہوئی روا بھی اور غیر قیاسی رسم خط ہے، قواعد کے لحاظ سے ہُوِی صحیح اور قیاسی ہے، دیوان غالب اردو مرتبہ مخدومی امتیاز علی خاں عرشی میں ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ——— اور ع ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے ——— میں ہوی کو ہوئی لکھا ہے لیکن ع ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟ میں اور ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ——— اور ع ہے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے ۔ کی سب ردیفوں میں ہوئے کے رسم خط میں ہمزہ نہیں ہے۔ حالانکہ ہوئی میں ہمزہ ہے تو ہوئے میں بھی ہمزہ ہونا چاہئے ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں صحیح ہیں یا یہ دونوں غلط۔

ایک اور امر قابل غور ہے ہُوِ تاخ فعلاتن میں ی گر گئی ہے اور ہندی الفاظ کی ی کا گرنا عیب نہیں، لیکن ہوئی مدت مفاعلین میں ی بحال ہے اور اچھی بات ہے، اسی طرح ہُوِ مرکِ فعلات اور ہم ہوئے فاعلن میں دونوں صورتیں صحیح ہیں۔

ع ادھر اودھر جائے مثل ابر بہمن آب میں ، ص ۶ — یہاں د جاے ، چاہئے
ع عکس پر جائے تو چاندی بھی ابھی زر ہو جاے ، ص ۷ — دونوں جگہ جاے
ع کہئے تو چار گھڑی دن سے اندھیرا ہو جائے ، ص ۷ — جاے

؎ دھنی جو چھپیں علم کا بجھرین آئے ٭ اور نے بھی ترے پاس صلاح پائے — د آے اور پاے، چاہئے

جائے اور جاے، آئے اور آے ، پائے اور پاے سب درست ہیں، غالب ع کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے پوری غزل میں ردیف آئے ہے، بعد کی غزلوں میں یہ مصرع قابل توجہ ہیں ع جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے ۔ ع اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا۔ ان مصرعوں میں آئے بروزن فاع کی یا ے موقوف کو متحرک کر دیا ہے۔ اور آنا فاعلاتن رہن لے آ فعلاتن ہے۔ اگر ٹو فعلاتن ٹ گیا فعلن ۔ آئے بروزن فعلن کی مثال حالی کے اس شعر میں ملتی ہے، مرثیۂ غالب ؎ لوگ کچھ پوچھنے کو آتے ہیں ٭ اہل میت جنازہ ٹھہرائیں فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔ حاصل یہ کہ آئے کا تلفظ تین طرح درست ہوا۔ فاع آئے ۔ فعَل آئے ۔ فعلن آئے ۔ غالب نے بھی آئے بروزن

؎۱ بابائے اردو نے یائے معروف اور یائے مجہول میں کہیں ہمزہ نہیں لکھا۔ قواعد اردو سنہ ۱۹۱۴ء مثلاً ص ۱۰

فعلن باندھا ہے جیسا اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔ اس پہ بن جا فاعلاتن ہے کہ کچھ بھی سی لفظوں کب بتائے فعلاتن ان سے فعلن (دیوان غالب مرتبہ مخدومی عرشی) اسی طرح نسخہ عرشی میں ہے قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے ۔ ۔۔۔

قول فیصل، انشا دریائے لطافت میں لکھتے ہیں " وقافیۂ صدائے باہمزہ دیائے مجہول جائے وقافیہ دعائیں کہ جمع دعاست جائیں آرند مثال ہر دو شعرہ۔

کیا قہر ہے تو نعش پہ بھی اس کے نہ آئے	گر کشتہ شود در رہ تو بے سر و پائے
اگر تنہا تجھے ہم دیکھ پائیں	تمنا ہے کریں تیری بلائیں

...... وجائے یا یائے مجہول بغیر ہمزہ ...... "

عشق بتاں میں اپنا نکالیں گے نام ہم	جی جائے یا نجائے کریں گے یہ کام ہم
بود بہ دیدۂ من ایکہ جائے تو بہتر	مری نظر سے پرے تو نجائے تو بہتر

(دریائے لطافت سنہ ۱۹۱۶ء صفحہ ۱۱۰ ۔ ۱۱۱)

" دو حرفی کلمے یا دو دو حروف کے مجموعے جن میں پہلا متحرک اور دوسرا ساکن ہو" ص ۱۵ حروف کی جگہ حرف چاہیئے

" قرآنی اصطلاح میں نیک اشخاص جن کے اعمال نامے قیامت کے دن ان کے دائیں ہاتھ میں دیے (دئیے) جائیں گے" ص ۲۱ " نیک اشخاص " کی جگہ " نیک شخص " چاہیئے

" وہ لفظ یا الفاظ جو نظم یا نثر کے غلط لفظوں کے بجائے (کی بجائے) لکھے جائیں" ص ۳۲ ۔ " وہ لفظ یا الفاظ " کی جگہ صرف " وہ لفظ " کافی ہے ۔

" جو الفاظ پوری طرح نہیں ابھرے انھیں لکھنا " ص ۳۳ ۔ " جو الفاظ " کی جگہ جو لفظ چاہیئے ۔

" پراکرت کے صدہا الفاظ اپنی اصل کے خلاف ہماری زبان میں مستعمل ہیں " ص ۳۷ " صدہا لفظ " کافی ہے ۔

" رسوم و رواج " ص ۳۸ کی جگہ " رسم و رواج " چاہیئے

" بنیادی قوانین " ص ۳۸ کی جگہ " بنیادی قانون " چاہیئے ۔

لفظ خواہ کسی زبان کا ہو جب وہ اردو میں مستعمل ہو اور اس کی جنس مذکر ہو اور اس کے آخر میں آ ہ ان نہ ہو اور اس کے بعد کوئی حرف ربط یا عامل نہ آیا ہو تو وہ واحد اور جمع میں یکساں رہتا ہے مثلاً آرٹ ، دیس ، بیل ، لڈو ، ہاتھی ، افعی ، سپاہی ، لفظ ، حرف ، ورق ، درخت ، سنگ ، سینگ وغیرہ اور ان الفاظ کے آگے پیچھے جو عدد یا حرف ربط یا فعل وغیرہ آتے ہیں ان میں سے ان لفظوں کا واحد یا جمع ہونا معلوم ہوتا ہے ، مثلاً " دو دو حرف " میں دو کا عدد اس بات کا قرینہ ہے کہ " حرف " جمع ہے مثلاً حرف بے حرف ہیں ، لفظ کہا لفظ لکھے ، ورق الٹا ورق الٹے ، ایک سینگ دو سینگ ، ایک بیل کے دو سینگ اور چار بیلوں کے آٹھ سینگ ہوتے ہیں ، ہرن کا سینگ ، ہرن کے سینگ وغیرہ میں ان مذکر لفظوں کے واحد یا جمع ہونے کا قرینہ موجود ہے اور ان مثالوں سے اردو کا سلیقہ اور کفایت شعاری ظاہر ہے ، اسی طرح " نیک اشخاص جن کی بجائے الخ " میں " جن " کا قرینہ موجود ہے تو " نیک شخص جن " لکھنا کافی ہے ، اسی طرح " وہ لفظ یا الفاظ جو نظم یا نثر کے غلط لفظوں کے بجائے لکھے جائیں " اس عبارت میں فعل " لکھے جائیں " اور " غلط لفظوں " جمع ہے اس لئے " لفظ " بھی بطور جمع استعمال ہوا ہے اور " یا الفاظ " زائد اور بے سود ہے ، یہ موضوع تفصیل چاہتا ہے ، اس کے بارے میں ایک علیحدہ اور مستقل مضمون ملفوف ہے اس کو براہ کرم ترقی اردو بورڈ کے مجلے میں شائع فرمائیں ۔ اس کا عنوان ہے " تعداد و حالت " ۔

لہ بلیٹ اردو نے جائے بغیر ہمزہ ہی لکھا ہے ۔ قواعد اردو ص ۵ سطر ۴ ۔ ۱۵ ، ص ۱۱ سطر ۲۰ ، ۲۳ ، ۲۶ وغیرہ

تمہارے گھر کا اجالا، ص ۱۰ کالم ۲

ع آگے تمہارے رنگ گلوں کا اداس ہے، ص ۱۲ کالم ۱

ع انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ص ۱۵ کالم ۱ — جنہیں بروزن فعولُ - ج ہ ن ی ں -

تمھارا بروزن فعولن میں ہا مخلوط ہے نہ کہ ملفوظ بروزن مفعولن، اسی طرح تمھیں اور جنھیں میں ہا مخلوط ہے، اس کو ہائے ملفوظ سے لکھیں تو رسم خط اور تلفظ میں مطابقت نہیں رہتی -

ع پہنے رہتے ہیں اتیت اکثر کپڑے فولاد کے، اس میں رہتے کا املا رہتے غلط ہے لہٰذا اس مصرع میں

ع جنم جگ رہنے کا منگے دانچہ من، رہنے بروزن فعلُ صحیح ہے، یہ تلفظ دکھنی ہے -

بابائے اردو لکھتے ہیں "اردو میں رھ، لھ، مھ، نھ کی آوازیں بھی ہیں …… مثالیں ان کی یہ ہیں، تیرھواں، کولھو، تمھارا، ننھا……

یہ احتیاط بہت ضروری ہے - قواعد اردو ص ۵ (۱۹۴۰ء)

رسم خط اور تلفظ میں عدم مطابقت کی مزید مثالیں :-

۱۔ ع نہ کوئی پات ملتا تھا بن بہار، ص ۲ — کوئی

" نہ کوئی پا - فعولن، نہیں معلوم کہ گلشن عشق" (۱۶۵۷ء) میں اس کا رسم خط کیا ہے - اردو شہ پارے جلد اول ص ۱۹۱ پر "قطب مشتری" کے اشعار میں اس کا املا تین طرح لکھا ہے ؎

نکوئی یار دلسوز محرم ہے منج		نکوی ہم نفس ہور ہمدم ہے منج

جکوی یار یاراں منے نیک ہے		زباں ہور دل دونو اس ایک ہے

اس میں تیسرا املا کوی درست ہے -

۲۔ اَبْرَن : اس کے چار مزید تلفظ لکھے ہیں -

(۱) اَبھْرَن (۲) آبھ رَن (۳) اَبْ رَھَنْ (اس میں شوشے والی ہ چاہئے) (۴) آبْ رَھَ نْ - اس میں بؔ پر الٹا جزم ہے جو حرف مخلوط کی علامت ہے، حالاں کہ اردو میں کبھی بؔ مخلوط نہیں ہوئی (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں میری تصنیف "تحقیقی نوادر" ۱۹۴۹ صفحہ ۱۴۲-۱۴۱) اور اگر الٹا جزم اگر کمپوزنگ کی غلطی ہے تو تیسرے اور چوتھے لفظ میں کوئی فرق نہیں رہا -

۳۔ آتاروں بیتا اِندرَ کی اچھرا، ص ۹ میں اندر میں نون مخلوط ہے بروزن فَعْلُ - تقطیع، آتارو فعولن بیتا اند فعولن رکی اپ فعولن چھرا فَعَلْ - اور اس مصرع میں ع کنویں کے گرد اِندرؔ کی سنبھاتی - اندر بروزن فعلن ہے -

۴۔ ع نہ جانیا میں اس دھات ہوئیگا لکر

ہوئیگا نہیں بلکہ ہوتئیگا لکر، یہ دکھنی تلفظ ہے

۵۔ (۱) دیے جائیں گے ص ۲۱ کالم ۱ — دئے

(۲) مقرر کرلیے ہوں ص ۲۳ کالم ۱ — کرلئے

کسی صیغے میں دو یائیں جمع ہوجاتی ہیں تو پہلی یا ہمزہ میں بدل جاتی ہے مثلاً دیا سے دیے کی بجائے دئے اور لیا سے لیے کی بجائے لئے، کنواں سے کنویں ہمزہ کے بغیر لیکن دایاں سے دایں کی بجائے دائیں، ہمزہ کے ساتھ -

متفرق : ؎

ہلوں کو ٹھڑی سلتی نکلی (وو) ۹ بجار ارانحت کو بیٹھی انیندی کی سار، ص ۱۴

پہلے مصرع میں غالباً نکلی کے بعد وو (وہ) حذف ہوگیا ہے یعنے فعولن فعولن فعولن فعول میں فعول کی فا حذف ہوگئی ہے۔

حضرت نیاز۔ "صیل کے سلسلے میں ناصر نذیر فراق دہلوی کا ایک جملہ سند کے طور پر درج کیا گیا ہے:۔

"نوکریں، چاکریں، اصیلیں اِدھر اُدھر ہیں"۔ اس میں اصیلیں کہنا تو درست ہے لیکن نوکریں چاکریں البتہ غور طلب ہے کیوں کہ نوکر اور چاکر دونوں مذکر ہیں ان کی جمع نوکریں، چاکریں نہیں ہوسکتی اور بصورت تانیث نوکر کو نوکرنی کہیں گے" نگار بابت مارچ سنہ ۶۲ء

فراق دہلوی نے نوکر اور چاکر کی مونث جمعیں نوکریں اور چاکریں بنائیں لیکن حضرت نیاز فتحپوری نے فرمایا کہ نوکر کی جمع مونث نوکریں نہیں ہوسکتی اور یہ بھی فرمایا کہ بصورت تانیث نوکر کو نوکرنی کہیں گے یعنی نوکر کی جمع مونث اردو میں نوکرنیاں ہی ہوسکتی ہے نوکریں ہرگز نہیں ہوسکتی، حضرت نیاز نے چاکر کے مونث ہونے کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں، ایک یہ کہ چاکر کا مونث اردو میں نہیں آتا۔ دوسرا یہ کہ چاکر کا مونث اردو میں آئے گا تو نوکر سے نوکرنی کے قیاس پر چاکر سے چاکرنی آئے گا اور اس کی جمع چاکرنیاں ہوں گی۔

برہان قاطع:۔

کنیز۔ پرستار و خدمتگار زنان باشد و بہ عربی جاریہ خوانند۔

پرستار۔ غلام و کنیز خدمتگار و خادم و فرماں بردار و مطیع و منقاد۔

غیاث:۔

پرستار بمعنی مطلق خدمتگار خواہ غلام باشد خواہ کنیز خواہ مرد یا زن کہ بخدمت گاری نوکر باشد۔

پرستار کے معنوں سے ظاہر ہے کہ فارسی میں انگریزی کی طرح صفت کی جنس نہیں ہوتی بلکہ اس کی جنس موصوف کی جنس کے مطابق ہوتی ہے مثلاً ـــــ وائٹ کیپ اینڈ وائٹ کوٹ ـــــ کے معنی ہیں سفید ٹوپی اور سفید کوٹ، سفید کوٹ کی صفت ہے تو مذکر ہے اور ٹوپی کی صفت ہے تو مونث، اسی طرح خدمت گار اور خادم اور فرماں بردار اور مطیع اور منقاد اور نوکر اگر کنیز کی صفتیں ہیں تو مونث ہیں اور اگر غلام کی صفتیں ہیں تو مذکر۔ صفت کو موصوف کے بغیر مذکر استعمال کریں تو ظاہر ہے کہ اس کا موصوف مذکر ہے اور اگر مونث استعمال کریں تو موصوف مونث ہے مثلاً "محل کی اصیلوں نے" (یعنے اصیل لونڈیوں نے) ص ۴۰ کالم ۱ سطر ۱۲) میں اصیلیں جمع مونث ہے اور "زنگ دیتا ہے چھپا جوہر شمشیرِ اصیل" میں اصیل واحد مونث ہے۔

"پشتوں کے اصیلوں سے" (ص ۴۰ کالم ۲ سطر ۲) میں اصیل جمع مذکر ہے۔ اور "بڑا اصیل تھا" میں اصیل واحد مذکر ہے۔

اسی طرح دانا، شاعر، رقاص، غریب نواز، مردم شناس وغیرہ مذکر بھی ہیں اور مونث بھی مثلاً دانا تھا اور دانا تھے، شاعر تھا اور شاعر تھے رقاص تھا اور رقاص تھے، نوکر تھا اور نوکر تھے اور چاکر تھا اور چاکر تھے یا دانا تھی اور دانائیں تھیں، شاعر تھی اور شاعریں تھیں، رقاص تھی اور رقاصیں تھیں، نوکر تھی اور نوکریں تھیں اور چاکر تھی اور چاکریں تھیں، اردو کے مزاج کے عین موافق ہیں اور ان میں کوئی قباحت نہیں۔

مصباح القواعد (۱۹۳۲) میں ہے:۔

"بعض اسم مذکر اور مونث دونوں کے لئے یکساں بولے جاتے ہیں جیسے بچہ، نوکر، دار وغیرہ۔ ص ۱۵۵

اہلِ اردو لکھتے ہیں:۔

"اردو میں (یعنے ہندی الفاظ میں) صرف انھیں صفات میں تذکیر و تانیث یا واحد و جمع کا امتیاز ہوتا ہے جن کے واحد کے آخر میں الف یا ہ (جو الف کی آواز دیتی ہے) ہوتی ہے (اچھا، سانولا، ممیرا، کلکتے والا، قیامت کا، چاند سا وعلیٰ ہذا القیاس) .... وہ فارسی اور

عربی لفظ جو کثرت استعمال سے اردو میں گھل مل گئے ہیں اس قاعدے کے تحت آجاتے ہیں۔ جیسے سادہ سے سادی، تازہ سے تازی، دیوانہ سے دیوانی، جدا سے جدی لیکن عمدہ سے عمدی فصیح نہیں سمجھا جاتا" قواعد اردو (۱۹۴۰) ص ۶۲

میری ناچیز رائے میں سادہ غذا اور سادہ لباس، تازہ ہوا اور تازہ پانی، ہمسایہ بھائی اور ہمسایہ بہن، دیوانہ مرد اور دیوانہ عورت، جدا اسلوب اور جدا تحریر، عمدہ رواج اور عمدہ رسم کا استعمال اردو قواعد میں یکسانی اور باقاعدگی کو فروغ دے گا۔

قول فیصل:-

انشا لکھتے ہیں "وہر چہ آخر آں واے یاے معروف از حروف اردو افتد جمع آں بشرط تانیث با یاے مجہول ونون غنہ آید مانند نائکائیں اور مائیں .... اور دائیں اور رقاصیں اور مرتاضیں اور محتاطیں اور طماعیں اور کم ظرفیں اور بد طریقیں اور نازکیں اور بدرگیں اور محرمیں ...... اور بے راہیں"

دریائے لطافت (۱۹۱۶ء) صفحہ ۱۳۳-۳۴

لغت کی مجمل اشاعت کے سابقہ اجزاء

لغت کے اجزاء جو سابقہ شماروں کے ساتھ شامل تھے علٰحدہ طور پر پچاس پیسے فی جزو کے حساب سے منگائے جا سکتے ہیں جو اصحاب منگانا چاہیں وہ پاکستانی ڈاک کے ٹکٹ یا پوسٹل آرڈر بھیج کر پچھلی تین اقساط طلب کر سکتے ہیں۔

مینیجر

دلکش چہرہ
جاذبِ نظر
شخصیت !
ایک دلکش و دِل آویز خاتون جو استقبالیہ کے
کام کو حُسن و خوبی سے انجام دیتی ہیں اور ہر ایک کی
معاونت میں پیش پیش رہتی ہیں، صرف اِس لیئے ناکام ہیں کہ
انھیں ظاہری نمود کی پروا نہیں۔ ان کا لباس تو خوبصورت
ہوتا ہے لیکن بدن پر درست نہیں ہوتا۔ اور
جگہ جگہ سے سُکڑ جاتا ہے ! انھوں نے یہ نہ سوچا کہ
صرف وہ سُوتی پارچہ جات جن پر 'سینفورائیزڈ'
لکھا ہوتا ہے، دُھل دُھل کر سُکڑنے کی بجائے
موزوں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پارچہ جات خریدتے وقت
اپنے روپے کا صحیح مصرف پیش نظر رکھیئے۔
ہمیشہ
آدم جی پارچہ جات
خریدیئے !
جن پر
SANFORIZED
'سینفورائیزڈ'
لکھا ہو،
سینفورائیزڈ
پارچہ جات کبھی نہیں سُکڑتے
پاکستان میں سینفورائیزڈ پارچہ جات
آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
تیار کرتے ہیں جو اس ٹریڈ مارک کو استعمال کرنے کے مجاز ہیں
* کلوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ نیویارک یو. ایس. اے کا رجسٹرڈ شدہ ٹریڈ مارک

روپیہ ہماری معاشیات میں روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے
اسکی قیمت
کو برقرار رکھیے
ONE RUPEE
منظور شدہ ــــــــ ۲,۰۰,۰۰,۰۰۰
جاری شدہ ــــــــ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
ادا شدہ ــــــــ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
زر محفوظ ــــــــ ۳۰,۰۰,۰۰۰
زر امانت ۳۰ جون ۱۹۶۲ء تک ۲۳,۵۴,۰۰,۰۰۰
موزوں اور مستعد خدمت
روپیہ بچائیے اور
یونائیٹڈ بنـ — لمیٹڈ
میں جمع کیجئے
رجسٹرڈ آفس میکلوڈ روڈ کراچی

No. 5070/3F

1962

PIF

12th Oct. to 20th Nov.

Organised By : EXPORT & EXHIBITION CELL Deptt TP&CI

SEASON TICKET
30 Coupons
Rs. 10/-

۱۲ اکتوبر سے
۲۰ نومبر ۱۹۶۲ء تک
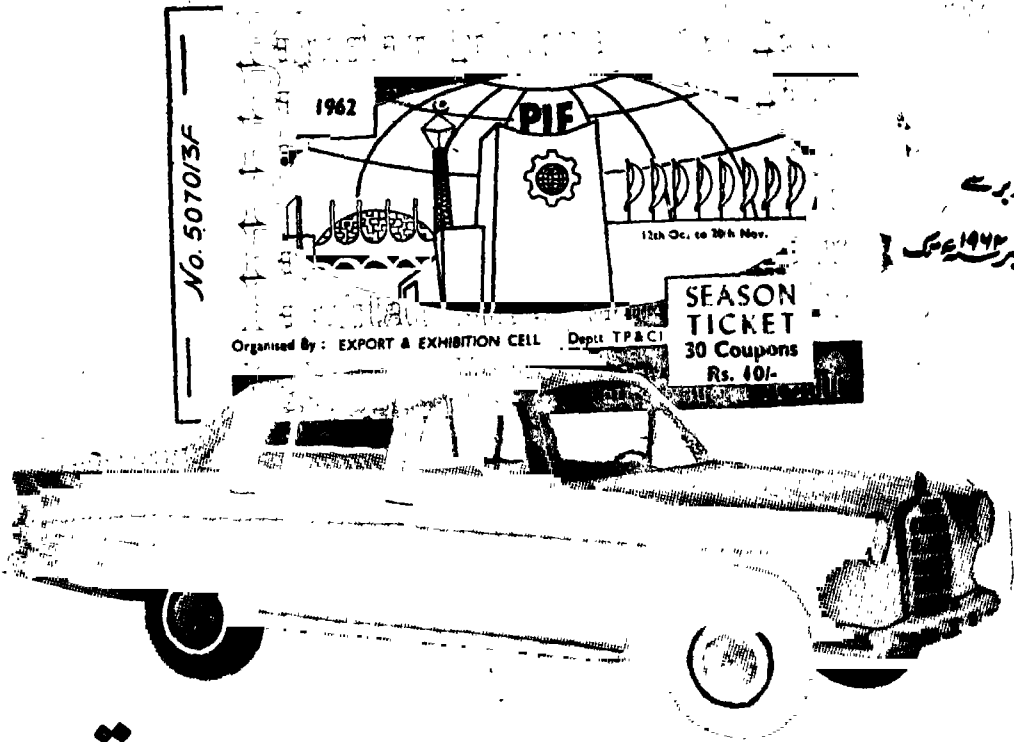
قسمت آزمائی کا سنہری موقع

صنعتی ترقی کی ایک نئی دنیا

پاکستان کے بین الاقوامی میلے میں سیر و تفریح کے علاوہ بے شمار ممالک کی مصنوعات پیش کی گئی ہیں، جنہیں دیکھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ دنیا نے کتنی ترقی کر لی ہے — نیز پاکستان کی ترقیوں کا منظر دیکھ کر آپ دنگ رہ جائیں گے۔

ایک لاکھ روپے سے زائد کے انعامات

اس بین الاقوامی میلے کے سیزن ٹکٹ میں داخلے کے تیس ٹکٹوں کے علاوہ ایک انعامی کوپن بھی شامل ہے۔ انعامی کوپنوں پر ایک لاکھ روپے کی مالیت کے ڈیڑھ سو سے زائد قیمتی انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔

سیزن ٹکٹ کی قیمت صرف دس روپے ہے۔ آپ اپنے لئے سیزن ٹکٹ ضرور خریدیئے۔ کیا خبر پہلا انعام آپ ہی کے نام نکل آئے۔

میلے کے دلفریب باغات، جگمگاتے ہوئے پل، رنگ برنگی حوض اور ایگزیبیشن کلب کی مخصوص فضا آپ کا دل موہ لیگی۔

PAKISTAN INTERNATIONAL FAIR

Organised by: Export & Exhibition Cell,
Deptt. of Trade Promotion & Commercial Intelligence.

ڈبلیو-پی-آئی-ڈی-سی
کی
کیمیاوی مصنوعات
قوم کی بیش بہا خدمت بجالاتی ہیں!
صنعت و زراعت کی ترقی اور صحتِ عامہ کی حفاظت
کے لئے پی-آئی-ڈی-سی کی کیمیاوی مصنوعات بکثرت
استعمال کی جاتی ہیں۔
اعلیٰ ترین معیار کی ان مصنوعات سے ملک کو بہت بڑی
مقدار میں زرمبادلہ کی بچت ہو رہی ہے۔
SANTONIN B.P.
SANTONIN
Penicillin
کیمیاوی کھادیں:-
امونیم سلفیٹ ، سوپر فاسفیٹ
یوریا ، امونیم نائٹریٹ
دیگر کیمیاوی مصنوعات:-
سنٹونین ، پنسلین ، روسن
اور ترپنٹائن ، ڈائیز
مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

ترقی اُردو بورڈ کی جامع تاریخی و تحقیقی

اُردو لغت

(مختصر جلی نسخہ)

جلد اول : الف مقصورہ

لغت کی مجمل اشاعت کے سابقہ اجزاء

لغت کے اجزاء جو سابقہ شماروں کے ساتھ شامل تھے علحدہ طور پر پچاس پیسے فی جزو کے حساب سے منگائے جاسکتے ھیں۔ جو اصحاب منگانا چاھیں وہ پاکستانی ڈاک کے ٹکٹ یا پوسٹل آرڈر بھیج کر پچھلی تین اقساط طلب کرسکتے ھیں۔

تصحیح

غلط	صحیح
ص ٦٣ کالم ۱ سطر ۴ ادم	آدم
ص ٦۴ کالم ۲ سطر ۲ راہ گبر	راہ گیر
ص ٦٥ کالم ۲ سطر ۲۴ ان الوقت	ابن الوقت
ص ٦٦ کالم ۲ سطر ٥ یمن میر	یمن میں
" " " سطر ۹ ـــ ع جس	ـــ ے/ئے جنس
" " " سطر ۲٦ ـــ ع جہاں	ـــ ے/ئے جہاں
ص ٦٧ کالم ۱ سطر ۱ دو	دور
ص ٦٨ کالم ۲ سطر ۱۰ جیے	جیسے
ص ٦۹ کالم ۱ سطر ۸ ابو الاواح	ابو الارواح

۵۔ **پھد پھدانا، آبسنا**

نان بائی کی کیا کروں تقریر
بدن ابلے ہے اب بہ شکل خمیر

۱۸۱۰ — جرأت، مثنوی گرما، ۲۰۲

۶۔ **(مجازاً) کم ظرفی دکھانا، اترانا**
پھولنا، ابھرنا

ابلے تھوڑی سی ہی کر نہ ابلتے پھرتے

۱۸۸۱ — منیر، د، ۳۱۸

۷۔ **طیش میں آنا، غصے میں آنا،**
پیچ و تاب کھانا

نشے میں شراب کے بلبلا رہا ہے، ابلا ہوا بیٹھا ہے۔

۱۹۰۱ — قمر، طلسم ہوشربا، ۶: ۳۲۸

اگرچہ شیخ و برہمن ان کے خلاف اس وقت
ابل رہے ہیں
نگاہ تحقیق سے جو دیکھو انہی کے سانچے میں
ڈھل رہے ہیں

۱۹۲۱ — اکبر، گاندھی نامہ، ۱۹

۸۔ **بکنا جھکنا**

کیا منہ ہے جو اخبار لکھیں تو یہ ابل جائیں
یا طعن کے الفاظ زبانوں سے نکل جائیں

۱۹۲۷ — فروغ ہستی، ۶۳

۹۔ **پھولنا، سوجنا، ابھر آنا**

وہ تھوتھنی وہ ابلی ہوئی انکھڑیاں وہ بال
گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال

۱۸۷۴ — انیس، ۱: ۵۹

غصے سے چہرہ سرخ آنکھیں ابلی ہوئی۔

۱۸۹۲ — قمر، طلسم ہوش ربا، ۶: ۶۸

بڑی بڑی ابلی ہوئی آنکھیں، لمبا قد
شانوں پر سے ذرا جھکا ہوا۔

۱۹۴۳ — دلی کی چند عجیب ہستیاں، ۱۵۴

۱۰۔ **مستی، جوش یا جذبے کے اثر میں ہونا، ولولے یا جوش سے بھر جانا، پھٹ پڑنا**

پریاں جوش میں آ ابلنے لگیاں

۱۶۴۵ — قصۂ بے نظیر، ۴۳

یہ ابلتی عورتیں، اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

۱۹۳۶ — نقش و نگار، ۴۸

[س: اُدْوَل उद्वल پ: اُبَل उब्बल = اوپر کو جانا]

اُبْلْواں (ضم ا، فت ب، سکن ل، غنہ) صف

۱۔ **ابلا ہوا، ابلی ہوئی حالت یا صورت میں**

۲۔ **باہر کو نکلا ہوا، پیٹ دار، مدور،**
(بر آمدہ، چھجہ، کگر وغیرہ)

۳۔ **ابلا ہوا سا، نیم جوش دادہ،** م:

اتنا جوش دو کہ ابلواں ہو جائے، ابل نہ جائے۔

[ار: حالیہ ناتمام، مصدر ''ابلنا'' سے]

اَبْلُوج (فت ا، سکن ب، و مع) امذ

آبلوچ، آبلوج

قند سفید، مصری

تری اس آنچ تھے دل ہے جیسا ابلوچ کا کلا

۱۶۱۱ — قلی قطب شاہ، ۲۴۴

[ف: آبلوچ کا مخفف]

اَبْلَہ (فت ا، سکن ب، فت ل) صف

کم عقل، بھولا، سیدھا، احمق

مشتاق عاشقی کا عاقل کوئی نہ ہوگا
ابلہ کسو کو ہوگی اس بد بلاکی خواہش
۱۸۱۰ میر، ک، ۷۷۹

دمنہ نے کہا میں ایسا ابلہ نہیں ہوں
کہ دوست کی مضرت کو جائز رکھوں۔
۱۸۵۰ گویا، بستان حکمت، ۱۳۳

آب و گل تیری حرارت سے جہان سوز و ساز
ابلۂ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
۱۹۳۸ ارمغان حجاز، ۲۰۰

[ع : صفت مشبہ (ب ل ہ) وزن اَفعَل]

ـــ طرازی اسث

۱۔ بیوقوف بنانا

وہ ---- ابلہ طرازی اور گربزی اور لوگوں کے مال مارنے سے ---- عوام الناس میں مشہور ہوگیا۔
۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان، ۳: ۳۵۰

۲۔ بناؤ سنگار، ابلہ فریبی کے لئے
۱۹۲۱ (وضع اصطلاحات، ۱۰۲)

ـــ فریب صف

بھولے بھالے کو دھوکا دینے والا، مکار، فریبی

وہ اس کی نسبت ایک نہایت عمدہ مگر ابلہ فریب تقریر کرتے ہیں۔
۱۸۹۰ تہذیب، ۲: ۱۰۴

دنیا طلب کو چاہئے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی
۱۹۱۴ حالی، د، ۲۹

غرض یہ کہ اور سیکڑوں ایسی ہی دلفریب بلکہ ابلہ فریب باتیں تھیں۔
۱۹۱۵ سجاد حسین، کائنات، ۲۲

[ع : ابلہ + ف : فریب، اسم فاعل ترکیبی]

ـــ فریبی امث

بہکانا، پھسلانا، سبز باغ دکھانا، بیوقوف بنانا

کبھی ابلہ فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔
۱۸۸۰ نیرنگ خیال، ۳۵

میں ایسا بچہ نہ تھا کہ بڑے حضور کی ابلہ فریبیوں میں آجاتا۔
۱۹۳۵ اودھ پنچ، ۲۰: ۲۰، ۶

[ع : ابلہ + ف : فریب + ی (مصدری)]

اَبلَہی (فت ا، سکن ب، فت ل) امث

سادہ لوحی، بیوقوفی، حماقت، احمق پن

تری ابلہی کا دیکھیا یاں نشان
۱۶۳۹ غواصی، طوطی نامہ، ۴۹

زاہدا نطق گہر بار پہ واعظ کے نہ جا
ابلہی بیچے ہے بیٹھا دُر ادراک کے مول
۱۷۸۰ سودا، ک، ۹۲

ابلہی سے دعوئ عقل و شعور
اپنے نزدیک آپ کو جانے ہے دور
۱۸۵۱ مومن، ک، ۳۷۳

شاکی نہ ہو یہ کہ وقت کم ہے
ہے ابلہی اس طریق کا غم
۱۹۲۷ صفی، تنظیم الحیات، ۲۵

اِبلیس (کس ا، سکن ب، ی مع)

(الف) امذ

آتشی مخلوق کا ایک اعلیٰ فرد جو آدم کی پیدائش سے پہلے عبادت و ریاضت کی

بدولت فرشتوں کے زمرے میں شامل اور ان کا معلم ہوگیا تھا۔ پھر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کی بنا پر معتوب ہوا اور آدم و اولاد آدم کا دشمن ہوگیا۔ سب سے پہلے آدم و حوا کو گناہ پر مائل کیا۔ انسانوں کو بہکانے اور راہ راست سے ہٹانے والا، شیطان، اہرمن۔

پانچواں تن واحدالوجود، اس کا فرشتہ ابلیس، او خدا کے دروازے پر رہتا ہے۔

۱۳۱۲ معراج العاشقین، ۲۱

اگر ابلیس کو دیتا میں ساغر
سلام آدم کو کرتا سر جھکا کر

۱۸۶۳ طلسم شایاں، ۶۸

حریص جرم کیا ہے یہ عفو نے تیرے
کہ مانگ لوں اگر ابلیس سے گناہ ملے

۱۸۹۶ صنم خانہ، ۲۳۰

شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے، اس کا کوئی وجود خارج عن الانسان نہیں ہے۔

۱۹۰۱ حیات جاوید، ۲: ۲۵۷

(ب) صف۔ ۱۔ (استعارۃً) شیطانی خواص رکھنے والا، خبیث، مفسد، سرکش، ملعون و مردود

جو باطن میں اس کے کروں میں نظر
تھا شیطان سے بھی وہ ابلیس تر

۱۸۰۳ آرائش محفل، افسوس، ۷

اس ابلیس زادے نے کہا آج کل مخلوق کو ہم اپنا دیدار دکھائیں گے۔

۱۸۸۹ طلسم ہوش ربا، ۳: ۹۳۱

۲۔ چھل فریب کرنے والا، مکار، حیلہ گر، فریبی

رفتہ رفتہ محفل محبوب میں پہنچا رقیب
دخل اس ابلیس کا جنت میں کیوں کر ہوگیا

۱۸۸۱ اسیر، د، ۷

[ع : ابلیس از یونانی Diobolos (دایا = دور + بولوس = پھینکنا) قب لاطینی Diabolvo، انگ : Devil۔ عرب لغت نویسوں کے نزدیک ابلاس (مایوس ہونا) سے مشتق]

ــ پرست

اٹھارویں صدی کی داستانوں میں باطل پرستوں کا ایک فرضی گروہ جو حق پرستوں سے لڑتا رہا۔

ابلیس پرستوں کی وضع پر آلات سرہنگی سے آراستہ تھا۔

۱۸۹۹ بوستان خیال، ۳: ۲۸۶

ابلیسی (کس ا، سکن ب، ی مع)

(الف) امث۔ ابلیسیت، شیطنت۔

(ب) صف۔ شیطانی، باطل (پرست)؛ ملعون و مردود

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

۱۹۳۸ ارمغان حجاز، ۲۱۵

شور ابلیسیوں میں تھا کہ عقاب آتا ہے
سر پہ تیغ آتی ہے یا تیر شہاب آتا ہے

۱۹۵۱ خمسۂ متحیرہ، ۱: ۹۶

[ع : ابلیس + ی (مصدری یا نسبتی)]

ابلیسیت (کسرِ ا، سکن ب، ی مع، کس س، فت ی به شد)

شیطان کے خواص بد نفسی، سرکشی وغیرہ اور ان کا اتباع؛ باطل پرستی

افزائش نسل ابلیسیت نے گنجفے کی بوجھ کی طرح آخری ورق کی بوجھ نکالی۔

۱۹۳۴　　اودھ پنچ، ۱۹: ۲، ۶

تحریک ترک موالات کو درجۂ قبول صرف اس وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اس ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمۂ عبودیت ہو نہ کہ اس کی بنا خود بینی پر ہو کہ یہ تو عین ابلیسیت ہوئی۔

۱۹۴۴　　مقالات ماجد، ۴۳

ابن (کس ا، سکن ب) امذ

۱۔ پوت، بیٹا، لڑکا، ولد

اللہ کریم اور تو کریم ابن کریم
یہ گو کہ گنہگار ہے پر تیرا ہے

۱۸۰۰　　دیوان اثر، ۴۸

کہ نہیں آج کوئی ان کا نظیر
وہ ہیں بیشک امیر ابن امیر

۱۸۸۶　　ک، ترکی ۹۶

۲۔ (گاہے ترکیب میں) بندہ، غلام، پرستار، جیسے: ابن الغرض، ابن الوقت

[ع : بَنَو (ب، ن، و) تھا۔ شروع کا الف ''و'' کا قائم مقام ہے۔]

ــ الخطّاب علم

مسلمانوں کے خلیفۂ دوم حضرت عمر جو خطّاب کے بیٹے تھے (ولادت ۵۸۲ع وفات ۶۴۴ع)

ــ السبیل/سبیل امذ۔ **۱۔ راہ گیر، مسافر**

گائے دودھ کثرت سے دیتی تھی، وہ مرد جاہل وقف ابن سبیل کردیتا تھا۔

۱۸۴۷　　سرور سلطانی، ۱۵

عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

۱۹۳۵　　بال جبریل، ۱۲۸

۲۔ اجنبی، راہ چلتا

۳۔ (فقہ) وہ شخص جو مال کا مالک ہو لیکن اس پر قبضہ نہ رکھتا ہو۔

جو شخص اپنے مال کا مالک ہوتا ہے اور اس کا قبضہ اٹھ جاتا ہے، اس کو فقیر نہیں بلکہ ابن السبیل کہتے ہیں۔

۱۹۱۴　　شبلی مقالات، ۱: ۱۴۰

ــ الغرض امذ

بندۂ غرض، مطلبی، گون کا یار

او بد عہد ابن الغرض شاید میری جانفشانی و کار گذاری کا یہی انعام تھا۔

۱۸۷۹　　بوستان خیال، ۶: ۲۲۶

ــ اللہ علم

۱۔ اللہ کا بیٹا حضرت عیسیٰ جو عیسائیوں کے نزدیک خدا کے بیٹے ہیں۔

حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ یعنی خدا کا بیٹا سمجھنا عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

۱۸۹۸　　سر سید، مضامین، ۲: ۳۴۲

ــ الوقت امذ

۱۔ زمانے کے ساتھ پلٹ جانے والا، وقتی

مصلحت کے مطابق عمل کرنے والا، فائدے کی خاطر بدل جانے والا

تونے اپنے آپ کو اس قابل ھی نہیں رکھا کہ ھم تیری عزت کریں، تو پورا پورا ابن الوقت ھے۔

۱۹۲۶ شرر مضامین، ۱: ۱۶۴

بعض مخالفوں نے انہیں (سرسید کو) ابن الوقت تک کہہ دیا۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۲۱۷

۲۔ وقت کے تقاضے پر عمل کرنے والا، زمانے کے ساتھ چلنے والا، مصلحت بین، موقع شناس

مسلمان خناس دوسرے باھر کریں اور ابن الوقت بن کر رھیں۔

۱۹۰۶ حقوق والفرائض، ۳: ۱۱۰

۳۔ وقت کا جنم دیا ھوا، وقتی حالات یا ماحول کی پیداوار، جو حالات کا تابع ھو اور حالات کو اپنا تابع نہ کرسکے۔

نیچری ابن الوقت ھیں یعنی اس زمانے کی پیدا وار۔

۱۸۹۹ رویائے صادقہ، ۱۸۲

الہ آباد کے سہدی صاحب جو ابوالوقت بھی ھیں، ان بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ھیں جو ابن الوقت کہلاتے ھیں۔

۱۹۲۱ چٹکیاں، ۳۶

۴۔ (تصوف) صوفی جو وقت کا تابع ھو اور حالات کو اپنا تابع نہ کر سکے۔

مرد وہ جو اپنے وقت کرے کُل وقت، ابوالوقت اچھے نہ ابن الوقت۔

۱۶۳۴ سب رس، ۱۵۳

[ع : ابن + الوقت (زمانہ)]

— سبیل رک : ابن السّبیل

— عم امذ۔

۱۔ چچا کا بیٹا، چچیرا بھائی، ھم جدی بھائی

حضرت خدیجہ نے کہا کہ اے ابن عم اپنے بھتیجے کا ماجرا سنئے۔

۱۹۲۸ سیرۃ النبی، ۳: ۳۱۴

۲۔ رشتہ دار، عزیز

میں کیوں اس سے دبوں مجنوں نہیں کچھ ابن عم میرا

۱۸۲۴ مصحفی، ۶

انسان کے ابن عم کو فقط اس لئے پیدا کیا ھے کہ لوگوں کو ھنسایا کرے۔

۱۹۴۴ ایرانی افسانے، ۲۳

— مادر

بھائی، اخیافی بھائی، ماں جایا بھائی جس کا باپ اور ھو۔

به تحقیق موسیٰ سے اس نے کہا
کہ اے ابن مادر تری قوم کا

۱۸۶۵ لوح محفوظ، فیروز علی، اثر ۱۰۹

— مریم کس اضا

۱۔ مریم کا بیٹا، مراد حضرت عیسیٰ ع،
۲۔ مسیحائی کرنے، مردوں کو جلانے والا

تو مرے حال سے غافل نہ ہوا تھا سو ہوا
ابن مریم کبھی قاتل نہ ہوا تھا سو ہوا
۱۸۷۹ دیوان مہر، ۷

متقی ایسا کہ سلمان و ابوذر جیسے
پاک طینت وہ کہ جس طرح سے ابن مریم
۱۸۹۶ خانۂ خمار، ٦

ـــ مقنع کس اضا ۔ امذ

ایک قدیم حکیم جس نے دھات کا مصنوعی چاند بنایا تھا جو، بہ روایت قدیم نخشب سے برآمد ہوتا تو میلوں تک اجالا کردیتا تھا۔

ـــ ملجم کس اضا ۔ امذ

عبدالرحمن ثانی کی کنیت جس نے حضرت علی کو شہید کیا۔

یا رویہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارہ
شیرخدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا
۱۷۸۰ سودا، ک،

اَبنا (فت ا، سکن بہ) امذ ۔ ج

۱ ۔ آل، ذرّیات، بیٹے بیٹیاں، نیز ان کی پشت در پشت نسل

اہل ہند اہل عرب ہیں سب کے سب ابنائے سام
ہم نسب ہم جنس ہندو کیا کبھی ہوتے نہ رام
۱۹۳۷ نظم اردو، ۸۹

۲ ۔ (نسبت رکھنے) والے، صاحبان، اہل (اضافت کے ساتھ)

نہیں دیکھا کوئی ایسا زمانہ کے ان ابنا سے
وہ پانی کا پیاسا لوگ اس کے خون کے پیاسے
۱۷۸۰ سودا، ۲: ۳۱۳

ابنائے وطن ہم کو معاف کریں گے۔
۱۹۳۲ ریاض، نثر، ۲۰۱

۴ ۔ فارس کے امرا و اشراف جو یمن میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔

یمن میں فارس کے جو رؤسا قیام پذیر ہوگئے تھے ان کو ابنا کہتے ہیں۔
۱۹۱۴ شبلی، سیرۃ النبی، ۲: ۲۸

[ع : ابنا جمع ابن وزن آفعال]

ـــ ء جِنس کس اضا

۱ ۔ انسان، آدمی

آدمی ابنائے جنس خصوصاً امثال و اقران پر ہر طرح کی برتری اور بہتری چاہتا ہے۔
۱۹۰٦ حقوق و فرائض، ۳ : ۸۷

اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سلوک اور بھلائی کی جائے۔
۱۹۱۴ مکتوبات حالی، ۲: ۵۲

۲ ۔ ہم پیشہ، ہم مشرب لوگ، ایک طرح کا مشغلہ یا شوق رکھنے والے۔

ابنائے جنس سے بہ لطف پیش آتے ہیں۔
۱۸۵۰ گویا، بستان حکمت، ۱٦

۳ ۔ ایک گروہ یا قوم کے لوگ، ہم وطن، اپنے آدمی

کارتوس بنانے والے خود ان کے ابنائے جنس، ہم مذہب اور ہم عقیدہ لوگ تھے۔
۱۹۲۳ بہادر شاہ کا مقدمہ، ۱٦۸

ـــ ء جہان کس اضا

دنیا کے لوگ، دنیا والے، اہل جہان

قرب حق سے، سبب وہم و گماں، دور رہے
کس قدر عقل سے ابنائے جہاں دور رہے
۱۸۵۴ صبا، غنچہ آرزو، ۱۶۷

—ے/ئے دنیا کس اضا

۱- رک: ابنائے جہاں ۲- دنیا دار لوگ

نہیں ابنائے دنیا دیکھ سکتے اپنے ھمسر کو
بجا ہے ہم سے روپوشی اگر ھمزاد کرتے ھیں
۱۸۳۶ ریاض البحر، ۱۲۷

—ے/ئے دھر کس اضا

زمانے والے- موجودہ وقت کے لوگ، آج کل کے انسان

تنگ تر ہے دست حاجت سے دل ابنائے دھر
کس کے آگے ظاھر اپنی تنگ دستی کیجئے
۱۷۹۳ قائم، ۱۵۱

بے خود عبث شکایت ابنائے دھر ہے
یوسف کو بھائیوں نے گرایا تھا چاہ میں
۱۸۷۳ بیخود لکھنوی، ۶۷

—ے/ئے روزگار کس اضا رک: ابنائے دھر

تلون ایسا ان ابنائے روزگار میں ہے
کہ صبح ملئے تو ہے چر پری سلام علیک
۱۸۱۸ اظفری، ۵

—ے/ئے زماں کس اضا- رک: ابنائے دھر

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی
۱۸۶۹ غالب، د، ۱۳۶

آبرو تو نے ھمیں دنیا میں دی، اور امتیاز
پر نہ ایسی جس سے ھوں محسود ابنائے زماں
۱۹۱۴ حالی، د، ۱۸۴

کہاں تک شکوۂ بے مہری دور فلک لکھئے
کہاں تک قصۂ بیداد ابنائے زماں کہئے
۱۹۳۷ بہارستان، ۳۴۳

—ے/ئے زمانہ کس اضا- رک: ابنائے دھر

چاہ میں یوسف مقصد کی ہے دل ڈانوا ڈول
کنویں جھکوائیں گے ابنائے زمانہ کب تک
۱۸۵۴ صبا، غنچہ آرزو، ۷۷

—ء السبیل مرکب اضا

رک: ابن السبیل، جس کی یہ جمع ہے

ان میں سے کون سی چیز ہے جو غیر مستحق ابناء السبیل اور مہذب گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں۔
۱۹۳۸ سیرۃ النبی، ۵: ۲۶۸

—ے/ئے عصر کس اضا- رک: ابنائے دھر

ابنائے عصر سے اپنی زباں آوری کی داد آج سے بہتر طریقہ پر پائی تھی۔
۱۹۵۴ ھندوؤں کی تعلیم، ۷۰

—ے/ئے وطن کس اضا

اھل وطن، وطنی برادر

گویا قدرت نے دولت مندی کے عوض جو حقوق ابنائے وطن ان کے ذمہ لگائے تھے، وہ سب پورے ھوچکے۔
۱۹۲۵ اودھ پنچ، ۱۰: ۲، ۱۰

اے ابنائے وطن! اپنی ملکی زبان کے لیے ہم سے جو کچھ ھوسکا وہ ھم نے کیا۔
۱۹۳۷ فرحت، مضامین، ۳: ۲۱

ـــ ے/ ئے وقت امذ

۱۔ رک: ابنائے دھر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت انہیں نہ مسلماں کئے بغیر

۱۹۱۴ حالی، ۸۶

اُبنا (ضم ا، سکن ب) ف ل آ گنا (رک)

آگنا، زمین سے پھوٹ کر نکلنا

[س: اُد+ و پ ن उत्पन ب: آ بْ و نَ

उच्छलन = بکھیرنا، پھیلانا]

اُبنہ (ضم ا، سکن ب، فت ن) امث

ایک بیماری جس کے مریض کو اغلام کرانے کی خواہش ہوتی ہے۔

علت الشیوخ، علت المشائخ، بھیس

دخول فی الدبر والی کے گھر میں اگر بیٹا
پیدا ہوگا تو بے شک علت اُبنہ میں گرفتار ہوگا۔

۱۸۴۰ احوال الانبیا، ۱: ۲۸۳

[ع: اُبنۃ ا (مد: اب ن= عیب، لکڑی کی گرہ) وزن فُعلۃ]

اِبنیت (کسر ا، سکن ب، کسر ن، ی شد بہ فت) امث

ولدیت، فرزندی، بیٹا ہونا، بیٹا ہونے کی حیثیت

لاوارث بچوں کا پالنا حکومت کا فرض ہے
لہٰذا اگر وہ اپنی ابنیت میں داخل کر کے
ہندوستانی ترکے سے کچھ دینا چاہے تو اسے
اختیار ہے۔

۱۹۳۰ اودھ پنچ، ۱۵: ۹۰۳

[ع: ابن + ی (نسبت) + ۃ (مصدری)]

اَبنیہ (فت ا، سکن ب، کسر ن، فت ی) امث

بنائیں، آثار، عمارتیں

[ع: ج بناء (مد: ب ن ی) وزن اَفعِلۃ]

آبو (فت ا، و مع) امذ

۱۔ باپ، والد

۲۔ (لقب میں) مالک، صاحب، والا

جیسے: ابوالخیر (نیکی والا)

ـــ الاجساد امذ ۱۔ گندھک

۲۔ (تصوف) ابو البشر حضرت آدم

نورانی،سو ابوالارواح، ہور روحانی سو ابوالاجساد۔

۱۴۲۲ معراج العاشقین، ۲۲

ـــ الاجسام امذ۔ رک: ابو الاجساد

دانا صیاد ازل سٹ جو اپنے دام رکھیا
صید سنپڑیا د کھت اس نام ابو الاجساد رکھیا

۱۶۶۹ غواصی، ک، ۱۷۵

ـــ الارامل امذ

محتاجوں اور بیواؤں کا باپ یا سر پرست (آنحضرت کا لقب)

محمود وحید ابو الفضائل
یسین و یتیم ابو الارامل

۱۹۳۵ عزیز، صحیفہ ولا، ۹

—— الأرواح امذ۔ رک: اب الارواح

سو دونوں عالم نورانی ہوئے روحانی یعنی نورانی سو ابو الارواح۔

۱۴۳۲ معراج العاشقین، ۲۲

کیا حق اس ابوالارواح خاطر
مرتب چار دیوار عناصر

۱۷۰۷ ولی، ۳۷۸

کہتے ہیں اسی واسطے تجھ کو ابو الاواح
تھا نور نرا مظہر ارضین و سماوات

۱۹۳۵ عزیز، صحیفۂ ولا، ۱۹

—— الآبا امذ

۱۔ جد اعلیٰ، پرداداء سکڑ دادا یا اگلی پیڑھیوں میں کوئی اور بزرگ فرد

اپنے ابوالآبا کے بوڑھے غلام کو آپ نے کیوں شرمایا۔

۱۸۶۹ غالب، خطوط، ۶۰۸

۲۔ بزرگ ترین فرد، سرخیل، امام، مراد: ابوالبشر، حضرت آدم

میر صاحب مرحوم شاعروں کے ابوالآبا تھے۔

۱۸۸۰ آب حیات، ۲۰۱

رودکی جو فارسی شاعری کا ابو لآبا سمجھا جاتا ہے، اسی دربار کا دست پرور تھا۔

۱۹۰۷ شعر العجم، ۱: ۲۲

اگر افسانہ چھیڑیں اقتصادیات عالم کا
توھومعلوم ابو الآبا کوئی لینن کے پٹھے ہیں

۱۹۳۰ اخترستان، ۱۳۹

—— الأنبیا امذ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب، آذر بت تراش کے بیٹے

(وفات ۲۱۰۰ ق م)

حضرت ابراهیم علیه السلام جو ابو الانبیا کہلاتے اور جن کو سب اہل کتاب بالاتفاق مانتے ہیں۔

۱۹۰۶ الحقوق والفرائض، ۱: ۱۹۳

—— البشر امذ

حضرت آدم علیہ السلام کا لقب

کیا زمین نے آخر کو پاس جنسیت
سنبھل سکا نہ فلک سے ابو البشرکابوجھ

۱۸۷۰ الماس درخشاں، مہر، ۱۸۷

وہ کعبہ عالم امکاں میں ہے جو پہلا گھر
ابوالبشر نے رکھا جس کی نیو کا پتھر

۱۹۳۵ عزیز، صحیفۂ ولا، ۲۲۷

—— الجان امذ۔ ۱۔ جنات کا جد اعلیٰ
۲۔ جنوں کا بادشاہ

—— الحارث امذ۔ شیر

جنگل کا بادشاہ ابوالحارث کسی تنگ وادی میں سو رہا ہے۔

۱۹۲۶ شرر، ایام عرب، ۲: ۲

—— الحسن امذ۔ حضرت حسن کے والد، حضرت علی کی کنیت۔

—— الخراب امذ۔ ویرانیوں کا باپ، مراد: بوم، آلو

ابوالخراب (آلو) چوھیوں کا شکار کرتا ہے۔

۱۹۲۶ شرر، مفتوح فاتح، ۲۲

—— الخیر امذ۔ ۱۔ صاحب نیکی
۲۔ فارسی زبان کے مشہور رباعی گو شاعر اور صوفی، ابو سعید ابوالخیر۔

(ولادت ۱۳۲۷ء، وفات ۱۳۶۹ء)

ـــ الفضل امذ۔ **فرزند شیخ مبارک، علامی کے لقب سے ملقب، فاضل عصر، طباع، مصنف اور شاعر تھا۔** (ولادت آگرہ ۱۵۵۱ع)

۱۵۷۴ع میں اکبر کے نورتنوں میں شامل ہوکر چار ہزاری منصب اور مدار المہامی کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچا۔ ''آئین اکبری'' مرتب کی جو اکبری احکام و قوانین کا مستند ضخیم مجموعہ ہے، جس کی کئی دفعات ملکی و مالی انتظامات میں عرصے تک ہندوستان میں رائج رہیں۔ ۱۶۰۲ع میں شاہزادۂ سلیم نے جو بعد میں جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا اس کو قتل کرادیا۔

ـــ القاسم امذ۔ **قاسم کا باپ، پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی کنیت، قاسم آپ کے ایک فرزند کا نام تھا جو صغر سنی میں فوت ہوگئے تھے۔**

ابوالقاسم محمد شہ سوار عرصۂ ایماں
کہ جن کی خاک پا ہے چشم دل کو کحل بینائی

۱۹۳۵ — عزیز، صحیفۂ ولا ۲۷

ـــ المنصور امذ۔ **(لفظاً) منصور کا باپ، فاختہ کی کنیت**

عشق دار سرو پر کھینچے تو پھر کیا ہے عجب
ہو ابو المنصور گر یارو خطابِ فاختہ

۱۸۹۶ — چمنستان سخن، ۱۷۱

ـــ الوقت صف۔ **(تصوف) صوفی کامل یا قطب الاقطاب، صوفی جس نے وقت (زمانہ) کو اپنا تابع کرلیا ہو۔ (ابن الوقت کی ضد)**

مرد وہ جو اپنے وقت کرے کل وقت،
ابو الوقت اچھے نہ ابن الوقت۔

۱۶۳۴ — سب رس، ۱۰۳

ابو الفضل یاں اٹھے سراج کتنے
ابو الوقت یاں گزرے حلاج کتنے

۱۸۷۹ — مسدس حالی، ۱۰۸

ـــ الہول امذ۔ **مصر کے ایک عظیم الجثہ، مہیب المنظر قدیم بت کا نام جس کا بدن شیر کا ہے اور چہرہ عورت کا۔**

خود ابو الہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو
وہ ابو الہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم

۱۹۳۶ — ضرب کلیم، ۱۳۶

ـــ بکر ۱۔ **حضرت صدیق رضؓ، مسلمانوں کے خلیفۂ اول، مردوں میں سب سے پہلے شخص تھے جو ایمان لائے۔ ہجرت کے وقت آنحضرتؐ کے ساتھ تھے۔** (وفات ۶۳۴ع)

۲۔ **سعد بن زنگی، حاکم شیراز جو شیخ سعدی کا ممدوح تھا۔ گلستان اس کے نام پر معنون ہے۔** (وفات ۱۲۶۰ع)

ـــ تراب امذ۔ ۱۔ **خاک والا، خاک آلودہ، خاکسار، حضرت علی کی کنیت، جنہیں ایک بار خاک آلودہ دیکھ کر آنحضرتؐ نے اس نام سے پکارا**

ـــ جہل امذ۔ ابن ابی الحکم، **حضرت محمدؐ**

کا چچا اور آپ کا مخالف، قریش کا سردار تھا۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ۶۲۴ع میں مارا گیا۔

ـــ حنیفه امذ۔ نعمان ابن ثابت نام، ابوحنیفه کنیت، سنی مسلمانوں کے چار بڑے فرقوں میں سب سے کثیر فرقے کے امام جو ان کی نسبت سے حنفی کہلاتا ہے۔ امام اعظم کے لقب سے ملقب۔ (ولادت ۶۹۹، وفات ۷۶۷ع)

ـــ ذر امذ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیه وسلم کے صحابی کا لقب، جندب بن جناد الغفاری نام (وفات ۶۵۳ع)

بڑھائی اس نے یه دین رسول کی رونق
که خلد میں ہیں ثنا خوان ابو ذر و سلمان
۱۸۸۱ اسیر، مجمع البحرین، ۲ : ۱۱۰

ـــ طالب امذ۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیه وسلم کے چچا اور حضرت علی رضه کے والد جو عبدالمطلب کے بعد آپ کے ولی اور مربی رہے۔ ہجرت سے تین سال پہلے وفات پائی۔

ـــ ظفر امذ۔ سراج الدین محمد بہادرشاہ ثانی، دلی کے آخری مسلمان بادشاہ کی کنیت۔ (پیدائش دہلی ۱۷۷۵ع، وفات رنگون، ۱۸۶۲ع)

اکبر شاہ ثانی کے فرزند تھے۔ ان کے بعد ۱۸۳۷ع میں تخت نشین ہوئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ع کے بعد معزول اور قید ہوکر رنگون بھیج دئے گئے۔ اردو کے معروف شاعر، ظفر تخلص، چار مطبوعہ دیوان ان سے یادگار ہیں۔

ـــ لہب امذ۔ ۱۔ عبدالعزا نام، حضرت محمد کا حقیقی چچا مگر آپ کے اور آپ کے دین کا سخت مخالف۔ جنگ بدر کی شکست کے غم میں فوت ہوا۔ (وفات ۶۲۴ع)

۲۔ (مجازاً) دشمن اسلام

یاں کفر بھی ہے لازم، دوزخ کسے جلائے
روز اس کو گر میسر اک بو لہب نہیں ہے
۱۹۳۵ نادان (ق)

ـــ ہریرہ امذ۔ آنحضرت کے ایک صحابی، عبدالرحمان ابن صخر یا عمیر ابن عامر نام تھا۔ ان سے بکثرت احادیث مروی ہیں۔ (ولادت ۶۰۲ع، وفات ۶۷۶ع یا ۶۷۸ع)

اَبُّو (فت ا، شد ب، و مع) امذ

۱۔ ابو کا بگاڑ، م: مرزا ابو

۲۔ ابا، ابّا جان

[ع : ابو کا بگاڑ]

اَبْواب (فت ا، سکن ب) امذ

۱۔ دروازے، کئی یا بہت سے باب

افتتاح ابواب عدالت کے واسطے اس شہزادے سے بہتر دوسرا شخص نه ملے گا۔
۱۸۵۰ گویا، بستان حکمت، ۵۰۶

گنج استقلال پر ہے قفل اگر تیری سہر
وقت پر شمشیر ہے مفتاح ابواب سہام
۱۸۵۴ ذوق، د، ۲۷۶

۲۔ روپیه جو مقررہ مال گذاری سے زائد

سڑکوں کی تعمیر، چوکیداروں کی تنخواہ وغیرہ کی بابت مالگزاروں سے وصول کیا جاتے۔ مدِ ابواب

یہ ابواب بعض جاگیردار و مقطعہ داروں سے وصول ہوتے ہیں۔
قوانین مال گزاری، ۵ : ۹۰

۳۔ کتاب کے حصے جو مضمون کے اعتبار سے ایک عنوان کے تحت آئیں یا کسی اور بنا پر ایک منزل قرار دئیے جائیں۔

آخر اک پادشہ نے لے کے کتاب
غور سے دیکھے اس کے سب ابواب
۱۸۸۳ قدر، ک، ۷۶

وہ ابواب و فصول نئے ڈھنگ سے مقرر کرتا ہے۔
۱۹۱۳ حالی، مقالات، ۳ : ۱۶۶

اس کتاب کے ابتدائی ابواب ---- بالاقساط شایع ہوچکے ہیں۔
۱۹۳۹ افسانۂ پدمنی (دیباچہ)، ۱

۴۔ اخراجات کی مدیں۔ م: رئیسوں کے موازنے میں اکثر ابواب محض نمائشی ہوتے ہیں۔

۱۔ (مجازاً) راستے، وسیلے، ذریعے

تجارت، زراعت، پیشۂ نوکری سارے ابواب معاش مسدود ہیں۔
۱۸۹۱ فغان بے خبر، ۳۵

ابواب جلب زر کے جہاں اور ہیں وہاں
چکلے بھی ہیں شراب بھی ہے اور جوا بھی
۱۹۳۷ بہارستان، ۳۹۰

[ع : باب (مسسس) = دروازہ کی جمع، وزن اَفعال]

اُبوانا (ضم ا، سکن ب) ف م

اگانا۔ اگوانا (رک)، کاشت کرانا، بوانا

[ار : اپانا کا متعدی المتعدی]

اُبوت (ضم ا ب، فت و به شد) امث

باپ ہونا، رشتۂ پدری

اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا تو بھی ہے تیری ابوت سے شرف
۱۸۹۳ دیوان حالی، ۱۲۰

عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا۔
۱۹۱۱ سیرۃ النبی، ۱ : ۲۰۷

[ع : آب (باپ) کا اسم کیفیت]

ابوتی (کس ا، و مع، ی مع) امث

جنگلی گائے کے گوبر کی راکھ۔ سیل کھڑی کے ساتھ ملی ہوئی جسے ہندو فقیر بدن اور چہرے پر ملتے ہیں۔ بھبوت

[س : وبھوت विभूति]

دھری ہے کان میں مدری چڑائی ہے ابوتی تن
۱۶۱۱ قلی قطب شاہ، غزلیات، ۳۰۱

ابوجک (فت ا، و مع، فت ج) صف۔ (قدیم)

بے سمجھ، نادان، بھولا

کہیا تب اسے اے ابوجک سکی
توں کام اپنا کچ تو نیں کر سکی
۱۶۳۹ غواصی، طوطی نامہ، ۲۶۷

[ار : ا (نافیہ) + بوج (= بوجھ) + ک (صفتی)]

ابوجھ (فت ا، و مع، سکن جھ) صف
ابوج (قدیم)

۱۔ جسے بوجھا نہ جاسکے، نا قابل فہم، لا ینحل

یو ہوتا نہیں فام تمنا کوں کوچھ
کھڑے دیکھتے سب دیوانے ابوجھ
۱۶۳۸ چندر بدن، ۱۱۵

۲۔ بے سمجھ، نادان، جاہل

پورے کو پچھانتے ہیں پورے
ناہم سے ابوج ہور ادھورے
۱۷۰۰ من لگن، ۱۵

۳۔ نا سمجھ، ننھا، بالا (سیانا کی ضد)

میں گھر میں ہوں اکیلی گھر میں بڑا نہنا نیں
چھوریاں ابوجھ ہیں دونی باندی کوئی سیانی
۱۶۹۷ ہاشمی، ۲۲۸

[ار : ا (نافیہ) + بوجھ (= سمجھ) مرکب وصفی]

ابولا (فت ا، و مج ضم) صف

گم صم، خاموش، کم سخن

اپس تو روز آکر یوں خرابیاں کرکے جاتی ہے
دیکھو ووی رات میرے سوں ابولا رہی ہے جھٹلا کر
۱۶۹۷ ہاشمی، ٦٦

کیں لڑکر آ ابولے منجہ سات بات یاں ہے
۱۷۱۷ بحری، ک، ۲۰۰

[ار : ا (نافیہ) + بولا (= بولنے والا)]

اِبہام (کس ا، سکن ب) امذ

۱۔ مگھم پن، عدم وضاحت، اشتباہ

اے اہل نظر ذرہ میں پوشیدہ ہے خورشید
ایضاح سے حاصل بجز ابہام نہ ہوگا
۱۸۹٦ شگفتہ، ک، ۲۲

اپنا نام یا لقب یا کنیت جو مزیل ابہام ہوتے ان میں سے کچھ ذکر نہیں کیا۔
۱۹۰٦ الحقوق و الفرائض، ۳: ۱۹۴

کسی سورۃ میں بھی باقی نہیں جائے تاویل
کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں
۱۹۴۵ سیف و سبو، ۲۲۱

۲۔ ہاتھ کا انگوٹھا

آرسی تھی جو روکش ابہام
بن گئی تھی وہ نم سے داغ تمام
۱۸۱۰ مثنوی، مصحفی، ؟

غضب طرفہ ٹوٹا بد انجام پر
ورم آگیا اس کے ابہام پر
۱۸۴۰ معارج الفضائل، ۹٦

غذا پائے گا جو انگشت ابہام محمد سے
اسی بچے کی دنیا میں ولادت ہونے والی ہے
۱۹۳۵ عزیز، صحیفہ ولا، ۱۶۸

۳۔ (عوام) بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی چھاپ یا اس کی لکیروں کا نقش

م: ابہام سے مدعا علیہ کیسے انکار کرسکتا ہے۔

[ع : مص (ب ہ م) وزن اِفعال]

۔۔۔ کرنا ف م انگوٹھا لگانا، انگوٹھے کا نشان

کرنا، م: ابہام کرنے سے تحریر پکی ہوگئی۔

اُبہت (ضم ا، شد ب بہ فت ہ) امث
شان و شوکت، بڑائی، بزرگی

رکنِ بنائے جاہ وثروت، معراجِ عروجِ آبہت
۱۸۳۶ تذکرۂ اہل دہلی، ۱۲۷

یہ ہے شمع سلطنت تو وہ چراغ آبہت
مالکِ اقبال روشن صاحبِ رائے منیر
۱۹۰۰ داغ، مہتاب، ۲۶۲

[ع : آبہۃ اسم (مد : اب ہ) وزن فعلۃ = عظمت]

ابہل (فت ا، سکن ب، ضم ہ) امذ
سرو کوہی کی قسم سے ایک درخت، جس کا پھل بیر کے برابر ہوتا ہے۔ آبھو بیر، ادرس، یہ درخت دو قسم کا ہوتا ہے: کلاں، جس کے پتے سرو کی مانند اور شاخیں خار دار ہوتی ہیں؛ خورد، جھاؤ کے پتوں کی مانند

بارِ خم سے کے دن پورے ہوئے اس کوجنا
عسر ہو اس کو اگر دے چرچٹا ابہل سمیت
۱۸۶۴ حافظ ہندی، د، ۱۸

اَبّی دُبّی (کس ا، شد ب، ی مع، ضم د، شد ب، ی مع) امث
(پورب) گلی ڈنڈا، گلی پر ڈنڈے کی ضربیں۔ پہلی ضرب اَبّی ہے دوسری دُبّی، مراد ف: ایک، دو، پہلا، دوسرا انّس

ناقۂ جوانی سے ابی دبی کھیلتی اٹکھیلیوں کی چال چاتی آن موجود ہوئی۔
۱۹۳۵ اودھ پنچ، ۲۰: ۱۸، ۴

[ار: اک + بیر (بار) پہلی بار د (= دو) + بیر (= بار) دو بار]

اَبے (فت ا، ی مج بہ کس)
۱۔ کلمۂ خطاب وندا بجائے اے، ارے، او (تحقیر یا بے تکلفی کے موقع پر)

ابے مسخرے تو کیا جانے ناحق بک بک کے مغز پھرایا ہے۔
۱۸۹۰ طلسم ہوش ربا، ۴: ۳۲

۲۔ کلمۂ تحقیر و تصغیر

شور محشر کو یہ کہہ بیٹھے خرام اس کا صاف
دال فے عین، ابے دور، پرے ہو، چل ہٹ!
۱۸۱۸ انشا، ک، ۲۴۸

ابے ہم ان کا منہ تاکتے ہیں یا وہ ہمارا منہ تاکتے ہیں۔
۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۳: ۸۶

۳۔ کلمۂ فجائیہ۔ مراد ف: ارے، ایں، م: ابے یہ پتھر کدھر سے آیا!

[ار: اے (ندا) + بھائی < اے بھئی < اے بے < ابے، یا اپ :ابے، अबे پالی :ام بھو अम्भो س : ہنہبو हंहो]

— تبے (فت ت، ی مج، بہ کس) امذ
بازاری بول چال، ناشایستہ گفتگو، بد تہذیبی کے کلمات

بھلے آدمی بھلے آدمی کو گالی نہیں دیتے، ابے تبے سے منع نہیں کرتے۔
۱۸۹۱ فغان بے خبر، ۱۱۷

شور، ہو حق، ابے تبے، ہے ہے
اوکھیاں، گالیاں، دھماکے، قے
۱۹۵۲ سرود وخروش، ۱۴۱

ابے تبے (فت ا، شد ب، ی مج، فت ت، شد ب، ی مج) امذ (لکھنؤ)

آن بان، شان و شوکت، ٹھاٹ باٹ

کروروں روپیہ قرض لیا اور یورپ میں
ابے تبے دکھانے چلے آئے۔
۱۹۳۳ ضمیمہ، اودھ پنچ، ۱۸ : ۸، ۱۶

اف : دکھانا

ابیات (فت ا، سکن ب) امذ، نیز امث، ج، نیز واحد (شاذ)

۱۔ مسلسل اشعار مثنوی یا قصیدے کی صورت میں

چھوڑوں نہ اس کنے کچھ اس ابیات کا صلا
لے کھود کر زمیں کو گنج نہاں تلک
۱۷۸۰ سودا، ۲۴۸

اس کے ابیات سر تا پا بامزہ و نمکین۔
۱۸۰۴ آرائش محفل، افسوس، ۹۵

۲۔ اشعار (قصیدہ، مثنوی، غزل کے)

اب شاد غزل اور کہو قید روی میں
اس کے تو سب ابیات میں ایطائے جلی ہے
۱۸۷۶ سخن بے مثال، ۱۴۱

میں نے چھ ابیات ان کی شان میں لکھی تھیں۔
۱۹۱۴ حالی، مکاتیب، ۱۱۱

۳۔ملک فارس کی ایک راگنی کا عربی نام
۱۸۶۲ غنچۂ راگ، ۴۵

[ع : ج بیت (=لفظاً گھر) وزن أفعال]

ابیج (فت ا، ی مع) آبج

(الف) امذ۔ برا بیج، ناقص تخم، نہ پھوٹنے والا تخم

(ب) صف۔ ۱۔ جس کا تخم ماردیا گیا ہو، ہیجڑا، زنانہ

۲۔ جس کا بیج نہ ہوتا ہو

[س : ا (نافیہ) + بیج (अबीज)]

ابیر (فت ا، ی مج) امث۔ رک : **اوبر**

ابیر (فت ا، ی مع) امذ۔ **عبیر**

زعفران کی آمیزش سے تیار کردہ خوشبو یا گلال؛ ایک خوشبو دار لال سفوف جو ابرک کے برادے یا سنگھاڑے کے آٹے وغیرہ میں لال گلال اور خوشبوئیں (صندل وغیرہ) ملاکر بنایا جاتا ہے، ہولی کے تہوار میں ہندو ایک دوسرے پر چھڑکتے اور چہرے پر ملتے ہیں۔

لے لے ابیرو ابرک ہر سو اڑا اڑا کر
ہر شخص بولتا ہے بے اختیار ہولی
۱۸۰۱ دیوان جوشش، ۲۳۹

وہ انگلیاں ہیں کہ پچکاریاں شہاب کی ہیں
ابیر رنگ کفک سے گلال ہوتا ہے
۱۸۳۶ ریاض البحر، ۲۲۸

[ع : عبیر، زعفران کی آمیزش سے تیار کردہ خوشبو۔ ہ : ابھری अभरी =باس، پ : آور अबर]

ابیری (فت ا، ی مع)

(الف) صف۔ابیر کی طرف منسوب، ابیر کے رنگ کا، سیاہی مائل لال رنگ کا۔

(ب) امث (موسیقی) اساوری ٹھاٹھ کی راگنی، اسے ابھری بھی کہتے ہیں۔

بھیک مانگنے والے بھیک بھی کسی دھن میں مانگتے ہیں
مال سری، کال سری، ابیری، بھنبیری۔
۱۹۲۵ اودھ پنچ، ۱۰: ۲، ۱۰

ابیض (فت ا، سکن ب، فت ی) صف

۱۔ سفید، اجلا

کیا چھٹی کیا پستی کیا اخضر و احمر
کیا سوسنی کیا کشمشی کیا ابیض واصفر
۱۸۳۰ نظیر، ک، ۲: ۱۷۹

ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں
تشریف جا نماز پہ لائے شہ زماں
۱۸۷۴ انیس، مراثی، ۱: ۳۲۸

شاید زر ابیض علیہ السلام کے فیض صحبت سے چہرے کی کلونس چھٹے۔
۱۹۳۸ اودھ پنچ، ۱۳: ۶۰، ۴

۲۔ گورا چٹا، اسود کی ضد

نہ کچھ تخصیص مذہب کی نہ کچھ تعیین ملت کی
جو اسود کو وہ ابیض کو جو ابیض کو وہ اسود کو
۱۹۰۹ نظم بے نظیر، ۸۴

تمام اعراب اور اعجام اور سب ابیض و اسود
جہاں میں جس قدر ہیں قائل توحید و یکتائی
۱۹۳۵ عزیز، صحیفۂ ولا، ۸۸

[ع: صفت مشبہ (ب ی ض) وزن افعل]

۔ منقوش کس صف۔ (کنایہ) چاندی کا روپیہ جس پر نقش ہوتے ہیں۔ مراد: دولت

ان سے ابیض منقوش کس طرح اگلوائے جائیں، اس کی تدبیر ان بڑے میاں سے پوچھی جائے جنہوں نے لاٹری کی۔
۱۸۹۵ لکچروں کا مجموعہ، ۱: ۲۵۱

قوم کی جیب دل سے ابیض منقوش اصفر ضیاع کے نکالنے کی فکر میں ہے۔
۱۹۰۹ نظم بے نظیر، ۱۵۰

[ع: ابیض + منقوش = نقش کیا ہوا، ٹھپے والا، (مرکب وصفی)]

ابیل دبیل (فت ا، ی لین فت د، ی لین) صف

مقابلے میں ہیٹا، دبو، دبنے والا، تابع، غلام، (کسی کا) م: یہاں کوئی تمہارے ابیل دبیل نہیں بستے جو کہو وہ سن لیں۔

[ار: ابیل (تابع) + دبیل (دب، دبنا + یل (کلمۂ صفت)]

ابین (فت ا، سکن ب، فت ی) صف

زیادہ واضح، بہت روشن، نمایاں تر

عبارت سے ہیں معنی صاف روشن
جو عالم ہیں وہ یوں کرتے ہیں ابین
۱۸۷۷ ریاض المسلمین، ۵

اف: بنانا، کرنا، ہونا

ابیورد (فت ا، ی مع، فت و، سکن ر) امذ

دی بنک آف بہاول پور لمیٹیڈ

(حکومت مغربی پاکستان حاوی حیثیت میں حصہ دار ہے)

رجسٹر شدہ صدر دفتر — بہاول پور (مغربی پاکستان)

مرکزی دفتر — پی آئی ڈی سی ہاؤس، کچہری روڈ، کراچی

سرمایہ

منظور اور ادا شدہ سرمایہ — ۲۵۰۰۰۰۰ روپے

محفوظ سرمایہ — ۱۳۲۵۰۰۰ روپے

شاخیں

۱- احمد پور شرقیہ
۲- بہاول پور (صدر دفتر)
۳- بہاول نگر
۴- چشتیاں
۵- گوجرانوالہ
۶- گجرات
۷- ہارون آباد
۸- حاصل پور
۹- حیدر آباد
۱۰- جیکب آباد
۱۱- کراچی، ایکسچینج بندر روڈ
۱۲- کراچی، لیاقت بازار
۱۳- کراچی، جوڑیا بازار
۱۴- کراچی، پی آئی ڈی سی ہاؤس
۱۵- کراچی، لالوکھیت برانچ
۱۶- کاموکے
۱۷- قصور
۱۸- خانپور
۱۹- لاہور
۲۰- لیاقت پور
۲۱- لائل پور، کچہری بازار
۲۲- لائل پور، میونسپل کمیٹی
۲۳- ملتان
۲۴- رحیم یار خان
۲۵- راولپنڈی
۲۶- صادق آباد
۲۷- سرگودھا
۲۸- سکھر
۲۹- وزیر آباد

۱- بنک کی تمام شاخیں ہر قسم کے بینک کے کاروبار کرتی ہیں جن میں بیرونی مبادلہ زر کا کام بھی شامل ہے۔

۲- امانتیں مقابلۃً بہترین شرحوں پر جمع کی جاتی ہیں۔ منظور شدہ ضمانتوں پر قرضے دئے جاتے ہیں۔

نہایت تجربہ کار نمائندوں کے ذریعے دنیا بھر میں جائز مبادلۂ زر کے جملہ کام انجام دئے جاتے ہیں۔
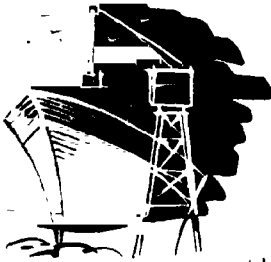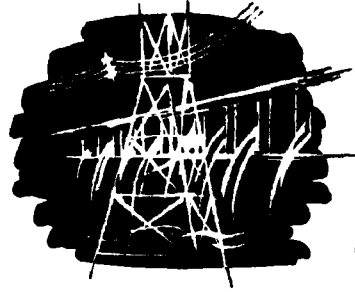
نیشنل بینک آف پاکستان کی ترقی، مالی استحکام اور کامیابی
کا سہرا قوم ہی کے سر ہے۔

یہ بینک ملک بھر میں اپنی ۲۲۴ شاخوں۔ ۵ بیرونی شاخوں
اور دنیا بھر میں اپنے نمائندوں کے توسط سے
پاکستان کے معاشی نظام کے ہر شعبہ اور سوسائٹی کے
ہر طبقہ کی بینکنگ کی ضروریات پوری کرتا ہے۔

رقوم امانت تا ۳۰-۶-۱۹۶۲ء
۱۲۰٫۵۰ کروڑ روپے

بیرونی شاخیں:۔ لندن - بغداد - کلکتہ - ہانگ کانگ - جدہ

خدمت اور تحفظ کا ضامن:۔

نیشنل بینک آف پاکستان

ہیڈ آفس:۔ بالمقابل بولٹن مارکیٹ - کراچی

اُردو نامہ

شمارہ یازدهم

مع

اردو لغت

قسط نمبر ۵

تاجکستان کے فارسی ادیب آقائی الغ زادہ ، صدر ادارہ جناب ممتاز حسن سے مصافحہ کر رہے ہیں -

نیچے ۔ آقائی الغ زادہ اور چند مقامی مہمان (داہنی طرف سے) ۔ ڈاکٹر صابر ، شان الحق حقی ، ڈاکٹر سرور ، موسیو مرادوف ، ممتاز حسن ، الغ زادہ ، موسیو بروکاوف (روسی سفارت خانہ)

ترقی اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

اردو نامہ

شمارہ ۱۱ - جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء

ترقی اردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون نمبر: ۲۲۱۶۳

چندہ سالانہ ★ فی پرچہ
چار روپے ★ ایک روپیہ

اردو منزل جمشید روڈ، کراچی-۵
(مغربی پاکستان)

مضامین

سرورق: حسرت موہانی (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۴۱)

سید یوسف بخاری منیجر "اردو نامہ" نے ترقی اردو بورڈ کی جانب سے شائع کیا۔

[illegible] پریس، کراچی

بیدل کی اردو شاعری

میمن عبدالمجید سندھی

قدیم زمانے میں سر زمین سندھ سے ایسے بلند پایہ شاعر اور ادیب پیدا ہوئے، جو اپنی زبان کے علاوہ کئی اور زبانوں کے بھی قادرالکلام شاعر تھے. ابو عطا سندھی نے عرب میں جاکر عربی شاعری میں ایسا بلند مرتبہ پایا کہ عربی شعرا نے ان کی تعریف کی، یہاں تک کہ ابو تمام نے اپنی مشہور کتاب "الحماسہ" میں ان کا تذکرہ کیا. سندھ کے شعرا نے تو فارسی میں ایسے بلند پایہ شعر کہے، جو بڑے بڑے ایرانی شعرا کے مقابلے میں پیش کئے جاسکتے ہیں. اس کے علاوہ سندھی شعرا نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے. سندھ میں اردو کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ اردو کی بنیاد ہی سندھ میں پڑی. ان محققین میں سے مولانا سید سلیمان ندوی اور سید حسام الدین راشدی کے نام قابل ذکر ہیں. مولانا موصوف نے اس طرح اس بات کا اعتراف کیا ہے :—

"جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا"(۱)

ان محققین نے ثابت کردیا ہے کہ سندھ میں ۷۵۱ھ کے بعد سے برابر اردو کے نمونے ملتے ہیں۔ سید سلیمان صاحب ندوی لکھتے ہیں :—

"ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی لیکن تہذیب اور سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا."(۲)

جہاں تک تحقیق ہوئی ہے قدیم اردو میں شاعری کا آغاز قطب شاہی دربار میں ہوا. محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ تا ۱۰۲۰ھ) پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا گیا ہے، جس نے مختلف اصناف پر دکنی اردو میں طبع آزمائی کی لیکن ادھر سندھ میں ٹھیک اسی زمانے میں ایک اردو شاعر کا سراغ ملتا ہے. وہ ہیں میر محمد فاضل بکھری، جو میر معصوم بکھری کے چھوٹے بھائی تھے۔ شیخ فرید بکھری نے "ذخیرۃ الخوانین" میں میر فاضل کے بارے میں لکھا ہے:—

"شعر بزبان ہندی از قسم کافی بکمال فصاحت می گفت و قبولیت داشتہ."

جب اردو اپنے ارتقائی ادوار سے گزر کر

(۱) نقوش سلیمانی، ص۳۱ (۲) نقوش سلیمانی، ص۸۷

"ریختہ" یا اردو کے نام سے جداگانہ زبان بنی تو اس وقت بھی سندھ کے شعرا اردو میں شعر کہتے تھے. محققین نے سندھ میں قدیم اردو کے تین ادوار قائم کئے ہیں. پہلا دورہ (۱۷۰۰ء مطابق ۱۱۱۲ھ) سے لے کر (۱۷۴۷ء مطابق ۱۱۶۰ھ) تک ہے. اس زمانے میں سندھ پر کلہوڑوں کی حکمرانی تھی لیکن پھر بھی دھلی سے گورنر آتے رہتے تھے. ان میں سے بعض اردو شعرا بھی تھے، مثلاً سید محمود، صابر، رضوی استرآبادی، جو دلی میں پیدا ہوئے اور ٹھٹھہ میں مستقل سکونت اختیار کی. "مقالات الشعرا" میں میر علی شیر قانع نے ان کے بارے میں لکھا ہے:—

" بزبان هندی و فارسی دیوانها متعدد در مرثیه و بعضی در غزلیات و مناقب درست کرد. "

ان کے علاوہ اردو کے یہ شاعر بھی هندوستان سے سندھ آئے:— محمد سعید راهبر، میر جعفر علی بےنوا، سید فاضل خان بےقید، محسن الدین شیرازی، عمادالملک نواب غازی الدین خان فیروز جنگ۔

سندھ میں اس زمانے میں بہت سے اردو شعرا موجود تھے. صرف "مقالات الشعرا" میں پچاس کے قریب اردو شعرا کے نام ملتے ہیں. معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی بہت سے اردو شعرا اس زمانے میں ہوں گے. اس دور کے ایک شاعر شیخ درد کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

الا یا ایها المفتی شده ریش تو جنگلها
اکھاڑوں بال پک پک کر بنالوں خوب کمبلها

دوسرا دور (۱۷۴۷ء مطابق ۱۱۶۰ھ) سے (۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ) تک ہے. وہ کلہوڑوں کا آخری اور تالپوروں کا شروعاتی دور تھا. سچل سرمست اس دور کا عظیم شاعر تھا. اس لافانی شاعر کا اردو کلام ملاحظہ ہو:—

حیران کیا حیران مجھ کوں سجن حیران کیا
دل کوں مورے کس واسطے کیا پریشان کیا

تیسرا دور (۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ) سے (۱۹۰۰ء مطابق ۱۳۱۸ھ) تک ہے. یہ دور انگریزوں کا شروعاتی دور ہے. اس دور کے ایک بڑے شاعر قادر بخش بیدل روہڑی کے رہنے والے تھے. ان کی شخصیت اس دور میں وهی تھے، جو پہلے اور دوسرے دور میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کی تھی. ان کے کئی دیوان فارسی اور سندھی میں موجود ہیں. آپ کا ایک دیوان اردو میں بھی موجود ہے. آپ کی حیات اور اردو شاعری پر کچھ لکھا جاتا ہے۔

بیدل (۱۸۱۲ء مطابق ۱۲۳۰ھ) میں روہڑی میں پیدا ہوئے. آپ کا تعلق روہڑی کے خاندان قریش سے تھا. جب آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو والد بزرگوار نے مکتب میں بھیجا۔ ۱۲ سال کی عمر میں بہت کچھ علم حاصل کرلیا. اسی سال حضرت محمد عثمان قلندر لعل شہباز کے جذبۂ کشش سے سیوہن چلے گئے. وہاں سے آپ کو شعر کہنے کی اجازت ملی اور آپ نے دو غزلیں فارسی اور اردو میں کہیں، اردو غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:—

دل وحدت طلب فارغ زقید جسم و جاں ہوگا
کہ بیٹھک عاشقاں دائم بہ ملک لامکاں ہوگا
اڑ جا چھوڑ کے پنجرا جسم کا گھر پیا چاہیں
کہ اوپر عرش اعظم کے تمہارا آشیاں ہوگا
الھا اس فرش خاکی سے قدم چڑ جا فلک اوپر
کہ سات آکاس ھست کے اگے پک نردباں ہوگا

چھوڑے جسم کے مت رہ ، اسم کی بات یوں مت کہہ
صفت کوں چھوڑ آگے چل کہ بیچوں بے نشاں ہوگا
طلب مطلوب طالب کوں ھکو کر جان وحدت میں
کہ بحر ذات بے رنگی محیط بے کراں ہوگا
جوئی اول سوئی آخر جوئی ظاھر سوئی باطن
خودی کے ترک میں جلدی مخفی سب عیاں ہوگا
دوئی کے وہم سے بیدل تری، دل گر ہوئے فارغ
ظہورا ذات مطلق کا جہاں چاہیں آہاں ہوگا

بیدل نے روہڑی واپس آکر وہ دونوں غزلیں اپنے استاد کو دکھائیں. انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا کہ "یہ دونوں غزلیں تو پنجاب کے ایک شاعر بیدل کی ہیں . اتنا سنتے ہی آپ وجد میں آگئے اور دوسری تین غزلیں عربی، فارسی اور اردو میں اسی وقت کہیں ۔ اردو کی غزل یہ ھے :۔

ھمیں اسرار وحدت کا نفی اثبات میں دیکھا
سراسر نور بے رنگی ظہور ذات میں دیکھا
نفی جب تک نہ ہو، ہرگز نہ پاوے ذوق اثباتی
اسی شطرنج کا ہم جیتنا اب مات میں دیکھا
کوئی جو ہورہا عاشق الکھ بیچوں منزہ پر
اروپ اور روپ کا اس نے لقالمعات میں دیکھا
نہ ہو اے بوالہوس راغب نہ پیالے کا بہ پنداری
کہ جام و تیغ و اللہ اب سجن کے ھاتھ میں دیکھا
کسی منصور سے پوچھا سبب انشائے معنیٰ کا
کہا میں مطلب والا ابھی اسمات میں دیکھا
یہ بیدل سن و فی انفسکم اسی معشوق ھمدم سے
کہ ہم مصباح احدیث اسی مشکات میں دیکھا

آپ حضرت سچل سرمست کے معتقد تھے، جو سندھ کے زبردست اردو شاعر تھے. لیکن آپ کے مرشد میر جان‌اللہ شاہ دوم تھے، جو میر جان‌اللہ شاہ رضوی خلیفہ شاہ عنایت شہید جھوک والے کے پوتے تھے . دادا اور پوتے دونوں فارسی شاعر اور صاحب دیوان تھے. حضرت بیدل ابھی چودہ سال کے ھی تھے کہ والد نے رحلت کی .

والد کی وفات کے بعد آپ نے گھر کو خیرباد کہہ کر سندھ کی سیر و سیاحت شروع کردی. بزرگوں اور فقیروں سے ملنے اور مشہور اولیائے کرام کی زیارت کی. کچھ عرصہ پیرگوٹھ میں قیام کیا. دوران قیام میں پیر پاگارو حضرت صبغت اللہ شاہ کے بیٹے سید علی گوھر شاہ کو فارسی اور عربی کی تعلیم دی، مثنوی مولانا روم پڑھائی اور تصوف کے اسرار و رموز بتائے . سیر و سیاحت سے فارغ ھوکر آپ نے پھر روھڑی میں مستقل قیام کیا، جہاں ہر وقت آپ کے گرد عقیدت مندوں کا ھجوم رھتا تھا. مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ھندو بھی آپ کے معتقد تھے.

۱۶ ذوالقعدہ ۱۲۸۹ ھ میں آپ نے وفات پائی. آپ کے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام محمد محسن تھا . وہ بھی ایک بلند پایہ اور آتش‌نوا شاعر تھے اور بےکس تخلص کرتے تھے. انہوں نے عین جوانی میں وفات پائی .

حضرت بیدل زبردست عالم اور عظیم شاعر تھے. عربی، فارسی، سندھی، اردو، سرائکی اور ھندی نظم اور نثر میں آپ کی اٹھارہ (۱۸) تصانیف ھیں . "مصباح الطریقت" کے نام سے آپ کا ایک دیوان ھے، جو درحقیقت دو دیوانوں کا مجموعہ ھے، ایک فارسی اور دوسرا اردو.

محترم سید حسام‌الدین راشدی نے "سندھ کے اردو شعرا" نامی مقالے میں لکھا ھے کہ "حضرت قادر بخش اردو میں طالب تخلص کرتے تھے." لیکن یہ صحیح نہیں ھے . آپ اردو میں بھی بیدل تخلص فرماتے تھے، جیسا کہ اوپر کی غزلوں سے

واضح ہوگا۔ صرف فارسی کے ایک چھوٹے دیوان "سلوک الطالبین" میں آپ نے طالب تخلص کیا ہے۔

بیدل کا اردو کلام قدیم اردو شاعری سے بہت ملتاجلتا ہے۔ اردو کے پہلے شاعر ولی گجراتی(۱) اور دوسرے قدیم شعرا کے کلام میں "سوں" اور "سیں" کے الفاظ ملتے ہیں۔ بیدل کے اردو کلام میں بھی یہی الفاظ ملتے ہیں، مثلاً

جب سوں زاہد نے سنی اس رخ پرنور کی بات
بھل گئی اس سیں ترے شوق سوں سب حور کی بات
(بیدل)

بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر
جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
(ولی)

رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پر روا اے ظالم
محشر میں تجھ سیں آخر، میرا حساب ہوگا
(ولی)

نین سیں نین جب ملائے گیا
دل کے اندر مرے سمائے گیا
[شاہ مبارک آبرو (۱۷۴۷ء)]

سندھ کے دوسرے قدیم اردو شعرا کے یہاں بھی یہی الفاظ ملتے ہیں۔ سید حیدرالدین کامل (المتوفی ۱۷۵۰ء مطابق ۱۱۶۴ھ)، جو سندھ کے تیسرے اردو شاعر ہیں، کا ایک شعر ملاحظہ ہو:—

عشق اب دھول ہے زلیخا کا
اس سوں آگے ہے چاہ میں یوسف

زبان کے لحاظ سے بیدل کا مقابلہ اردو کے پہلے دور کے شعرا سے کیا جاتا ہے، لیکن مضمون، فکر، اور خیالات کی بلند پروازی وہی ہے جو آپ کے سندھی اور سرائکی اشعار میں ملتی ہے۔ آپ کا اردو کلام زندگی کا آئینہ دار، سوز و ساز سے بھرپور اور نہایت مؤثر و پُردرد ہے۔ مسائل تصوف اور خصوصاً توحید وجودی کے بارے میں اکثر اشعار ہیں۔ حسن اور عشق کے بھی آپ نے خوب مضامین باندھے ہیں۔ محبوب کی تعریف مندرجۂ ذیل اشعار میں ملاحظہ ہو:—

حیران ہوں کہ قد تمہارے کوں کیا کہوں
طوبا کہوں کہ سرو کہ نخل وفا کہوں
تیرے حسن کی دیکھ تجلی اے رشک حور
سورج کہوں کہ چاند کہ نور خدا کہوں!
مشکیں زلف تیرے کوں اے غیرت ختن
مار سیہ کہوں کہ کمند وغا کہوں
ابرو تمہارے کوں جو ہے مشکل ہلال عید
محراب سجدہ طاعت اہل صفا کہوں!
تیرے نین پر خمار کو سرمست بادہ ناز
یا بے خودی کا جام یا سحر بلا کہوں
مژگان تیرے کوں جو ہیں چنگل عقاب کے
ناوک کہوں کہ نوک سنان جفا کہوں
غمزے ترے کوں جو ہے ستمگر غریب کش
جلاد خلق جانوں کہ آفت سما کہوں!
خال سیہ ترے کوں جو ہے عکس داغ دل
اسود حجر کہ دانۂ مرغ ہوا کہوں!
لب لعل تیرے سے در دنداں چمکتے ہیں
میں اس شفق کے رنگ کو پرویں نما کہوں!
تیری گلی کی خاک کوں بیدل کے واسطے
غالیہ کہوں، عبیر کہوں، توتیا کہوں!

محبوب کے فراق میں انتظار کا نقشہ اس انداز سے کھینچا ہے کہ دنیا کی ہر چیز محبوب کی منتظر دکھائی دینے لگتی ہے، فرماتے ہیں:—

رات تجھ بن پکار رکھتے ہیں
دن سبھو انتظار رکھتے ہیں

---

(۱) ولی کے گجراتی ہونے کی ابھی تک تصدیق نہ ہوسکی (ادارہ)

لعل لب کی قسم کہ گوہر اشک
محض بہر نثار رکھتے ہیں
نزہت وصل یاد کر کے مدام
چشم کوں آبدار رکھتے ہیں
برق رخسار کے تماشا میں
دیدہ ابر بہار رکھتے ہیں
محفل درد عشق میں بیدل
عزت و افتخار رکھتے ہیں

محبوب کی آنکھوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :۔

بسکہ ہیں نین تیرے ناز کے ساغر میں مست
کیا کروں اس کے آگے نرگس مخمور کی بات

حسین اور غمگین نظارے تو سب دیکھتے ہیں لیکن شاعر کے دل میں کسی اچھے یا برے منظر کے دیکھنے سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں ان کو وہ الفاظ کا جامہ پہنا کر دوسروں کے سامنے رکھتا ہے. منظرنگاری کو فن شاعری میں بلند مرتبہ حاصل ہے. بیدل نے بھی نہایت پراثر اور دلکش انداز میں منظرنگاری کی ہے. باغ کا ایک منظر ملاحظہ ہو:۔

آج گلشن میں چلو دیکھو کہ چرچا اور ہے
باغ میں گل رخ کے آنے سے تماشا اور ہے

محبوب کا ناز و انداز عاشق کے دل کو گھائل کرتا ہے. بیدل اس کیفیت کا بیان اس طرح کرتے ہیں :۔

مرتا ہوں تیرے ناز کا آغاز ہے ہنوز
خونی کفن پہ ناوک انداز اور ہے

آپ مجازی عشق میں مشہور تھے. آپ اس نظریہ کے قائل تھے کہ مجازی عشق سے حقیقی عشق کا راستہ ملتا ہے. آپ نے بہت سے سندھی، فارسی، سرائکی اور اردو اشعار میں اپنی مجازی کیفیت کا ذکر کیا ہے. ایک اردو شعر میں اپنی اس حالت کا بیان اس طرح کرتے ہیں :۔

میں ہوں مشہور عشق بازی میں
خاصہ درد و غم مجازی میں

مجازی عشق سے ترقی کرتے کرتے آپ اس منزل پر پہنچتے ہیں جہاں آپ کو عاشق و معشوق ایک نظر آتے ہیں :۔

بالیقیں عاشق و معشوق حقیقت میں ہیں ایک
لوگ کہتے ہیں عبث ناظر و منظور کی بات

آپ وحدت الوجودی صوفی تھے اور ہمہ اوست کے قائل تھے، جس کی رو سے کثرت میں وحدت کا جلوہ ہے. سندھ کے صوفی شعرا نے اس نظریے کا ذکر اپنے کلام میں کثرت سے کیا ہے. سچل سرمست تو بیباک صوفی تھے. انہوں نے تو کھلے الفاظ میں اناالحق کا نعرہ لگایا ہے. بیدل بھی سچل کے تتبع میں کھلم کھلا اس نظریے کا بیان کرتے ہیں. فرماتے ہیں :۔

اناالحق آپ کہتا ہے وہی منصور کے اولے
جو مارے دم اناالله کا درخت طور کے اولے
بنے انسان کی صورت، برھم کے واسطے آیا
نیاز و ناز کرتا ناظر و منظور کے اولے
نہیں بندہ حقیقت میں سمجھ اسرار معنی کا
خودی کا وھم برھم زن پیچھے بےخود خدائی کر

اس نظریے کے تحت کہ ہر چیز میں اسی وجود کل کا نور ہے، بیدل اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہیں :۔

کہاں عارف کہاتا ہے کہاں رندی بتاتا ہے
حقیقت کا ظہورا دیکھ سو دستور کے اولے

وحدت الوجودی صوفیوں نے مذہب کے ظاہری قیود سے اپنے آپ کو بری رکھا ہے. بیدل نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے. فرماتے ہیں :۔

بہت مذہب ہیں کثرت میں نہ جا بیدل مشقت میں
ہوا جو غرق وحدت میں، اسے ملت سوں کیا مطلب

وہ اپنا مذہب عشق بتاتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں ۔ سچل سرمست فرماتے ہیں :-

عشق عجب آفات ہے ، ناکشف کرامات ہے
تقویٰ نہ کوئی طاعت ہے تن میں نہ مرجوعات ہے

بیدل عشق کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

دوجگ کا بادشاہ ہے مست شراب عشق
اعلیٰ ہے ہر جناب سے لا شک جناب عشق

آپ نے اس نظریے پر بہت زور دیا ہے کہ وجود مطلق ایک ہے اور یہ کثرت اسی ایک ذات کا مظہر ہے، فرماتے ہیں :

وجود ایک ہے بس لااله الا ھو
نہ کر دوئی کی ھوس لااله الا ھو

اس لئے آپ کو لیلیٰ و مجنوں، بلبل و گل، شکر اور مگس ایک ہی نظر آتے ہیں : -

وہی ہے لیلیٰ و مجنوں وہی ہے بلبل و گل
وہی ہے شکر و مگس لااله الاھو

منصور پہلا صوفی ہے جس نے اناالحق کا نعرہ لگایا تھا . اس لئے صوفی شعرا منصور کا ذکر اپنے کلام میں کرتے رہتے ہیں . بیدل اس طرح منصور کا ذکر کرتے ہیں : -

محفل بخت میں ممتاز ہیں ارباب علوم
محکمہ عشق میں منظور ہے منصور کی بات

غرض آپ کا اردو کلام تصوف کے باریک مسائل سے پر ہے ، جس میں نفی و اثبات ، فناوبقا "ذکروفکر حال وقال ہمہ اوست اور وحدت الوجود" جیسے دقیق مسائل نہایت آسانی سے طالب کو سمجھائے گئے ہیں . اس کے علاوہ حسن وعشق کا بیان ، ہجر و وصال کا ذکر اوردرد و محبت کی باتیں دلگداز انداز میں آپ کے کلام میں ملتی ہیں۔

زبان کے میکانکی پہلو

ٹن ... ! ٹن .... ! ! ٹن .... ! ! ! بگو چپراسی نے سکول کی گھنٹی بجائی . جماعت میں بیٹھے ہوئے ننھے منے بچوں نے کان کھڑے کئے . ان کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور وہ ماسٹر جی کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے . ماسٹر جی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو الماری میں رکھا اور لڑکوں سے یہ کہتے ہوئے جماعت سے نکل گئے کہ دس سے پندرہ تک سوال گھر سے نکال کر لانا. ماسٹر جی کے دروازہ سے باہر قدم رکھتے ہی لڑکوں نے بستے بغل میں دبائے اور ہو.. ! ہو ... ! ! کرتے کمرے سے باہر کی طرف بھاگے . ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ پہلے وہ باہر نکلے .

اس ٹن ٹن کی آواز میں ایک پیغام پوشیدہ تھا جوکہ گھنٹی کے ارتعاش سے پیدا ہوا اور فضا میں لہروں کی شکل میں سفر طے کرتا ہوا کان کے پردوں سے ٹکرایا . یہاں سے اعصابی ریشوں کے ذریعہ دماغ میں پہنچا جہاں دماغی خلیوں نے اس ٹن ٹن کے سگنل کو چھٹی کے مفہوم میں سمجھ لیا .

انسانی آواز اور اس ٹن ٹن ! میں بظاہر کوئی فرق نہیں. دونوں آوازیں ایک ہی قانون فطرت کے تحت پیدا ہوتی ہیں . ایک ہی طرز سے فضا میں مرتعش لہروں کی صورت میں سفر کرتی ہیں اور ایک ہی طرح سے انسانی اعضائے سماعت کو متاثر کرتی ہیں. ان کے ساتھ کسی مفہوم کے وابستہ ہونے کے لئے پہلے سے باہمی ربط کے ذریعہ ایک طے شدہ فیصلہ موجود ہونا لازمی ہے . مثال کے طور پر شام کے وقت تین گھنٹیوں کا بجنا یا ایک لمبی سیٹی کا لگنا بھی اسی طرح سے چھٹی کا مفہوم دے دیتا ہے جس طرح سے کہ خود چھٹی کا لفظ کیونکہ جس طرح سے چھٹی کے لفظ کے معنی آپس میں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں ایسے ہی گھنٹی یا سیٹی کے بارے میں بھی طے کر لیا جاتا ہے .

زبان کیا ہے ؟

اگر ایک عام انسان سے یہ سوال کیا جائے کہ زبان کیا ہے تو وہ بلا جھجک جواب دے گا کہ "جناب ! جس واسطے سے ہم دوسروں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ زبان کہلاتی ہے". اگر یہی سوال آپ کسی انشاء پرداز سے کردیں تو وہ

ہوا بنا سنوار کر جواب دے گا کہ " حضرت ! زبان ایک ایسا مجموعۂ الفاظ ہے جس میں ایک خاص ترتیب جاری و ساری ہو اور اس سے کوئی خاص مطلب اخذ ہوتا ہو ." لیکن ماہرین کے نزدیک اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے .
اس بارے میں کئی ایک متضاد نظریات پیش کئے جاتے ہیں. ایک گروہ کا خیال ہے کہ "زبان ایک ایسے صوتی سلسلہ کا نام ہے کہ جو انسان کے اعضائے نطقی کے ذریعہ ظہور میں آتا ہے اور اعضائے سماعی کے ذریعہ سماعت پذیر ہوتا ہے".
ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ "زبان کا حقیقی مقصد صرف اظہار مطلب ہے . اس کے لئے آواز کا ہونا کوئی ضروری شے نہیں بلکہ چہرے کے تاثرات اور اشاروں کے ذریعہ سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا جاسکتا ہے . یہ صوتی پہلو تو زبان کا محض ایک ثانوی جز ہے" اس موخرالذکر گروہ کے ایک انتہا پسند حامی مسٹر سٹورٹ وانٹ [E.H. Sturte Vant] نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ "چونکہ حقیقی جذبات اور احساسات کا اظہار فطرتی اشاروں ، چہرے کے تاثرات اور موقع محل کے مطابق حلق سے خود بخود پیدا ہونے والی آوازوں (اوہ، آہ، وغیرہ) کے ذریعے بےساختہ طور پر سامنے آجاتا ہے لیکن گندم نما جو فروشانہ ذہنیت رکھنے والے انسان نے محض دوسروں کو دھوکہ اور فریب دینے کے لئے زبان کے صوتی پہلو کی ایجاد کرلی تاکہ اس طرح حقیقی احساسات کو آسانی سے چھپایا جا سکے .
بہرحال زبان کا صوتی پہلو گو انسان کی ریا کاری کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہو لیکن یہی انسان کی معراج ترقی کا زینہ بھی ثابت ہوا ہے. یہ الفاظ کی اکائیاں ہی تو ہیں کہ جس صورت میں ہم اپنے تجربات اور احساسات کو اپنے دماغ کی گہرائیوں میں محفوظ رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت کام میں لاتے ہیں. انہی الفاظ کے ذریعے ہم اپنے تجربات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں . تحریر بھی حقیقت میں انہی الفاظ کو ظاہر کرنے کا ایک دوسرا طریقہ ہے. اسی ذریعہ سے ہم آج بھی سقراط، افلاطون اور ارسطو کے مکالمات سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں وگرنہ ان کے چہروں کے تاثرات اور ہاتھوں کے اشارے صدھا سال قبل ان کے ساتھ ہی ختم ہوچکے ہیں .
نظریۂ ارتقاء کے بانی چارلس ڈارون نے زبان کے اشاراتی پہلو کے ہمہ گیر حیثیت اختیار نہ کر سکنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اشاراتی زبان کے لئے ہاتھوں کا استعمال ضروری ہے جہاں کہ صوتی زبان کی صورت میں ہاتھوں کو دوسرے کاموں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے . اشاراتی زبان کے لئے روشنی اور ایک دوسرے کے مد مقابل ہونا لازمی ہے . اس کے برعکس صوتی زبان کو اندھیرے اور دیوار وغیرہ کی اوٹ کی صورت میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے."
یہی وجہ ہے کہ آج جب بھی زبان کی اصلیت کے بارے میں بحث کی جاتی ہے تو اس کی شروعات ہمیشہ قوت گویائی اور قوت سماعت کے جائزہ سے کی جاتی ہیں . فلاسفر جان ڈیوی (John Dewy) نے کہا ہے کہ " زبان کے وجود کا

دارومدار صرف بولنے والے پر ہی نہیں بلکہ سننے والے پر بھی منحصر ہے"۔

زبان کا تجزیہ

ہم بات کیوں کر کرتے ہیں ؟ سب سے پہلے انسانی دماغ کے ایک مخصوص حصہ میں ایک قسم کا ہیجان سا پیدا ہوتا ہے۔ بعض محققین اس ہیجان کو منفیہ برقی (Electronic) مہیجات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس پہلو میں ابھی تک بہت کچھ تحقیق کرنا باقی ہے۔ اس ہیجان سے خاص قسم کی برقی روئیں پیدا ہوجاتی ہیں جوکہ اعصابی ریشوں کے ذریعہ قوت گویائی کے اعضا (پھیپھڑا، نرخرہ، منہ، زبان، جبڑے اور ہونٹ وغیرہ) پر اثرانداز ہوکر ان میں مطلوبہ حرکات کا باعث بنتی ہیں۔ ان اعضا کی مختلف حرکات کے نتیجہ میں فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوجاتا ہے اور شش جہت میں ایک قسم کی لہروں کی شکل میں پھیل جاتا ہے۔ یہی مرتعش لہریں مختلف آوازوں کے تسلسل کی شکل اختیار کر کے الفاظ کو جنم دیتی ہیں۔ لیکن یہ آواز کہاں پیدا ہوئی اور الفاظ نے کہاں جنم لیا؟ یہ مرتعش لہریں بذات خود کچھ شے نہیں جب تک کہ یہ کسی انسان کے اعضائے سمعی کو متاثر نہ کریں۔ کیوں کہ جب یہ لہریں انسانی کان کے پردوں سے ٹکراتی ہیں تو ان پردوں میں بھی ایک مخصوص ارتعاش پیدا کردیتی ہیں۔ یہی ارتعاش آخر میں برقی روؤں کی شکل اختیار کر کے سننے والے کے دماغ میں ایک خاص قسم کا ہیجان پیدا کردیتا ہے۔ یہی ہیجان بالآخر آوازوں کے تسلسل کی شکل میں انسانی فہم کے پردہ پر الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوجاتا ہے: بس ایسے ہی کہ جیسے سنیما کے سفید پردہ پر صرف روشنی اور سائے کی سرعت سے بدلتی ہوئی حالتیں لاوجود متحرک اجسام کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

غرضیکہ لسانیات کا مطالعہ ہمیں علم الحیات کی حدوں سے نکال کر نفسیات کے گوشوں کو چھوتا ہوا علم الطبعیات کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے اور ہم یہ محسوس تک نہیں کر پاتے کہ نفسیات کی حدیں کہاں ختم ہوئیں اور علم الطبعیات کس مقام سے ساتھ ہولیا۔ نہ ہی ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آیا علم الحیات ان دونوں قسم کے عناصر پر حاوی ہے یا ان دونوں کے ملاپ سے حیاتیاتی پہلو ظہور پذیر ہوتا ہے۔ پھر بعض نظریات کی رو سے انسانی حسیات کے دماغ تک پہنچنے اور وہاں اثر پذیر ہو کر مفہوم کی شکل اختیار کرنے کے اثنا میں انسانی نظام اعصابی میں خاص قسم کی کیمیاوی تبدیلیاں رونما ہوجاتی ہیں جو کہ ہمیں علم الکیمیا کے مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں۔ لیکن زیر بحث موضوع میں ان تمام پیچیدہ مسائل کی بھول بھلیوں کی عقدہ کشائی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے ہم یہاں صرف کچھ حد تک زبان کے طبعیاتی پہلو کا جائزہ لینے پر ہی اکتفا کریں گے۔

آواز اور زبان

اگر زبان کا مقصد صرف اظہار مطلب ہے

لیا جائے تو اس کے لئے ہم صوتی اور غیر صوتی (۱) دونوں پہلو استعمال کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں ۔ جہاں تک صوتی پہلو کا تعلق ہے اس میں گو انسانی آواز کو ایک حد تک فوقیت ضرور حاصل ہے لیکن یہ کوئی استثنائی حیثیت کی حامل نہیں ہے ۔ جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں سکول کی گھنٹی صبح سے لے کر شام تک کئی ایک پیغامات نشر کرتی رہتی ہے ۔ صبح حاضری کی گھنٹی ، سکول لگنے اور تفریح کی گھنٹی پھر آخر میں چھٹی کی گھنٹی ۔ علاوہ ازیں سکول کے مختلف اوقات میں یہی گھنٹیاں حساب ، انگریزی ، اردو ، فارسی اور تاریخ وغیرہ کے پیغامات لے کر آتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی پنڈت سری نواس ، مولوی سردار عالم اور ماسٹر سادھو سنگھ کے گھنٹوں کے تصورات بھی وابستہ ہوتے ہیں ۔ افریقہ کے حبشی صرف ڈھول کی مختلف تالوں کے ذریعہ آن واحد میں سینکڑوں میلوں تک طرح طرح کے پیغامات پہنچا دیتے ہیں ۔ تار گھر میں تار برقی ابجد کی گٹ گر ، گر گر گٹ کو بھی یہی شرف حاصل ہے ۔

جھینگر جیسا ننھا سا کیڑا اپنی ٹانگوں کی رگڑ سے ہی محبت کے پیغامات نشر کرتا رہتا ہے ۔ مرغی کی کٹ کٹ کی تیز آواز کو سنتے ہی ننھے منے چوزے چیل کے حملہ سے بچنے کے لئے دوڑ کر فوراً ہی ادھر ادھر جا چھپتے ہیں ۔ کوا کوئی کھانے کی چیز دیکھ کر کائیں کائیں کا نعرہ بلند کرتا ہے اور اس کی سیاہ پوش برادری ہر چہار طرف سے اڑتی ہوئی چلی آتی ہے ۔ پرندوں کے محبت کے نغموں ، خطرے کے الارم اور خوراک کی دعوت کی صداؤں میں واضح فرق موجود ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر مرغی جب خطرے کا الارم دیتی ہے تو چوزے جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں لیکن جب یہی مرغی کھانے والی چیز کو دیکھ کر مخصوص انداز میں کٹ کٹ کرتی ہے تو تمام چوزے بھاگ کر اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں ۔ بندر کی ایک قسم گبن (Gibbon) کی آوازوں کے تجزیہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ موقعہ محل کے مطابق تو مختلف قسم کی بامعنی آوازیں نکال سکتا ہے پہلی آواز " آؤ اہم پھلوں کی تلاش کو چلیں " ۔ دوسری آواز " میری بیوی کے نزدیک مت آؤ " وغیرہ وغیرہ ۔

خود انسان بھی اکثر صرف تالی بجا کر اپنی پسندیدگی یا خوشنودی کا اظہار کرتا ہے ۔ بعض اوقات وہ محض زبان کے مختلف چٹخاروں کی مدد سے ہی نفرت ، افسوس ، ناپسندیدگی ، نفی اور مذاق کا اظہار کردیتا ہے ۔ گڈریئے اور گلہ بان

---

(۱) زبان کے غیر صوتی پہلو :۔ تتلیوں کا غیر محسوس قسم کی بو کے ذریعہ کوسوں دور واقع اپنے محبوب کو محبت کا پیغام پہنچانا ۔ چیونٹیوں کا اپنے سینگ نما بالوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے گفتگو [؟] کرنا ۔ شہد کی مکھیوں کا رس کی سمت اور فاصلہ بتلانے کے لئے زبان رقص سے کام لینا ۔ پرندوں کا اپنے محبوب کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لئے رقص کناں ہوجانا ۔ بلی کا اپنے آقا کو دیکھ کر مجسم انکسار کی صورت اختیار کر لینا اور کتے کا دشمن کو دیکھتے ہی تن کر کھڑے ہوجانا ۔

اسی طرح انسان کا بعض موقعوں پر اظہار مطلب کے لئے محض اشاروں اور کنایوں سے کام لینا اور بعض تاثرات کا فطرتی طور پر خود بخود ظہور میں آجانا جیسے کہ آنکھوں کا خوشی سے چمک اٹھنا یا مایوسی اور غم سے ان میں مردنی چھا جانا ۔ چہرے کا خوشی سے دمک اٹھنا ، غم سے اتر جانا ، ڈر سے زرد پڑجانا اور غصے کی حالت میں پھول جانا وغیرہ وغیرہ ۔

بھیڑ بکریوں اور گائے بھینسوں کی اکثر چٹخاروں کی مدد سے ہی مختلف طرح سے رہنمائی کرتے ہیں۔ چٹکی بجانے سے مراد "بس فوراً ہی" ہے۔ بہت زیادہ غصہ کی حالت میں انسان اکثر بغیر کچھ بات کئے صرف غراتا اور چنگھاڑتا ہی ہے۔ منہ سے سیٹی بجا کر وہ کئی ایک پیغامات کسی مخصوص انسان تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کا باتیں کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

اشارہ ہائے لب

انسانی زبان جو کہ بامعنی الفاظ پر مشتمل ہے شروع میں صرف بے ربط آوازوں یا یک رکنی الفاظ تک محدود تھی۔ ڈاکٹر جے رائے [J.Rae] ہونولولو، یونیورسٹی، نے ۱۸۶۲ء میں اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں اس امر کا دعویٰ کیا کہ "بولے جانے والے الفاظ کی قدیم ترین صورت محض کسی سرزد ہونے والے فعل کا چربہ ہوتی تھی جس میں ہونٹ زبان اور منہ کے ذریعے کسی شے یا فعل کی نقل اتارنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ قدیم ترین زبان صرف یک رکنی الفاظ پر مشتمل تھی جن سے قوت، شکل یا حرکت کا اظہار ہوتا تھا" اسی طرح پروفیسر الیگزینڈر جاھنسن [Alexander Johannesson] چانسلر آئسلینڈ یونیورسٹی نے ۱۹۴۳ء میں ماہرین لسانیات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں گہرے مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے سرمایہ الفاظ کے ایک بڑے حصہ کا ماخذ منہ کے وہ اشارے ہیں جن میں کوئی فعل سر انجام دیتے وقت ہاتھ کی حرکات و سکنات کی نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ہوتی ہے"۔ خود ہماری زبان بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنا نہیں ہے۔ اگر ہم غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں بھی ایسے الفاظ کا ایک بڑا حصہ موجود ہے جو کہ ہونٹ اور زبان کے ذریعہ ہاتھ کی حرکات یا دوسرے افعال کی نقل اتارنے کی کوشش کے نتیجہ میں فطرتی طور پر خود بخود تشکیل پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً جب آپ کسی دور کھڑے ہوئے انسان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مخاطب کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے کے لئے نرخرہ سے قدرتی آواز پیدا کرتے ہیں تو اس اشارہ میں ہاتھوں کا ساتھ دیتے ہوئے ہونٹوں سے جو آواز باہر نکلتی ہے وہ فطرتی طور پر "وہ" کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اسی طرح تو کہتے وقت ہونٹ اشارہ کرتی ہوئی انگلی کی نقل میں لمبوتری تھوتھنی کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور پھر زبان بھی اس اشارہ میں ان کا ساتھ دیتی ہے۔ اس طرح منہ سے قدرتی طور پر نکلنے والی آواز "تو" کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ "یہ" کا بھی یہی حال ہے کہ زبان، نیچے کا جبڑا اور اوپر والے ہونٹ نیچے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "میں" میں بھی نیچے کا جبڑا اپنی طرف ہی اشارہ کررہا ہوتا ہے (یعنی اگر آپ نے منہ سے بات نہ کرنی ہوتی اور کسی کے استفسار پر یہ بتانا مقصود ہوتا کہ یہ کام آپ نے کیا ہے تو آپ بعینہ سر سے اسی طرح کا اشارہ کرتے جیسا "میں" کہتے وقت کرتے ہیں)۔ ایسے ہی بعض افعال کی صورت ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "کاٹ" کو لیجئے۔ جب ہم اس

کے پہلے حصے 'کا ، کی آواز نکالتے ہیں تو جبڑا اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے. 'ٹ ، کی آواز کے ساتھ نیچے گرتا ہے اور زبان تالو کے اگلے حصہ سے ٹکراتی ہے جیسے کہ کلہاڑے کو پہلے ہوا میں اچھالا اور پھر کھٹ سے درخت کے تنے پر دے مارا.

یہ موضوع کافی تفصیل طلب ہے اس لئے اسے کسی آئندہ مجلس کے لئے اٹھا رکھتے ہیں. فی الحال ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پتھروں کے لڑکھنے ، پرندوں کے چہچہے اور انسانی قوت گویائی میں جو فرق ہے وہ صرف اس قوت کا ہے جو کہ ان آوازوں کے پس پردہ کام کررہی ہے . ایک طرف کمان کی وہ ڈوری ہے جس کی لرزش باوجود فضا میں ارتعاش پیدا کرنے کے محض ایک ایسی آواز کی تخلیق کرتی ہے جس کا کوئی خاص مقصد نہیں جس میں کوئی گہرائی نہیں . بس ایک اندھی قوت کا مظاہرہ ہے جس نے کہ تیر چلانے کے لئے تانت کو کھینچا اور چھوڑ دیا . لیکن جب یہی ڈوری! یہی تانت !! ایک بربط میں لگادی جاتی ہے تو اس سے ایک فن کار کی پیدا کی ہوئی لرزش فضا کو نغموں سے معمور کردیتی ہے . کیوں؟ کیونکہ اب اس ڈوری کی لرزش کے پس پردہ چند خاص ذہنی قوتیں سرگرم عمل ہیں اگرچہ ان دونوں کی لرزش کا سرچشمہ وہی بےجان ڈوری ہے.

آلات صوت انسانی

بولی جانےوالی زبان انسانی صوتی اعضاُ سے ظہور میں آتی ہے : اور انسانی کانوں کے ذریعہ سماعت پذیر ہوکر دماغ کے ایک مخصوص حصہ میں ایک ہیجان کی صورت میں پہنچنے کے بعد کسی مفہوم کی شکل اختیار کرتی ہے .

انسانی آواز بھی دوسری قدرتی اورغیر قدرتی آوازوں کی طرح مخصوص فطرتی قوانین کی پابند ہے. صوتی لہریں ایک معینہ رفتار کے مطابق سفر کرتی ہیں جو کہ آواز کی نوعیت اور واسطہ سفر (Medium) کی ماہیت کے مطابق کم و بیش ہوتی رہتی ہے . علاوہ ازیں یہ تمام صوتی لہریں مخصوص تعداد ارتعاش کی حامل ہوتی ہیں .

انسانی آواز کی پیدائش میں مندرجہ ذیل اعضا مل کر صوتی آلات کے فرائض سرانجام دیتے ہیں: پھیپھڑے ، حلقوم ، بلعوم ، حنجرہ ، اعصاب نطقی ، منہ ، ناک ، تالو ، زبان ، دانت اورہونٹ (ملاحظہ ہو خاکہ الف اعضاُ صوتی)

اعضائے صوتی

خاکہ (الف)

آسانی کے لئے انہیں تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پھیپھڑے ، حلق اور منہ ۔ حلق میں حنجرہ (نرخرہ) اور اعصاب نطقی خاص طور پر اہم ہیں ۔

پھیپھڑے دھونکنی کا کام کرتے ہیں اور یہ ہوا کے بہاؤ کو مطلوبہ دباؤ یا رفتار سے حلق میں سے گذارتے ہیں اور اس تسلسل کو ضرورت کے مطابق قائم رکھتے ہیں ۔ آواز کا اصلی سرچشمہ حلق ہے جس میں واقع اعصابی ریشے اس ہوا کے دباؤ سے متاثر ہوکر تھرتھرانے لگتے ہیں جس سے اس ہوا کے بہاؤ میں ایک ارتعاش پیدا ہوجاتا ہے۔ اس ارتعاش کو آپ دوسرے معنوں میں آواز سے تعبیر کرسکتے ہیں ۔ منہ میں پہنچ کر یہ مرتعش ہوا مختلف دباؤ کے اثرات کے ماتحت مخصوص صوتی اکائیوں کے تسلسل کی صورت میں مطلوبہ الفاظ کو جنم دیتی ہے ۔

گلو انسانی گلا محض ایک سیدھی سادی نالی نہیں بلکہ ایک پیچدہ قسم کا آلہ ہے جوکہ کئی ایک کل پرزوں سے مل کر بنا ہے اور مختلف قسم کے فرائض بجا لاتا ہے ۔ اس میں ضرورت کے مطابق خود بخود کھلنے اور بند ہونے والے سوراخ ہیں۔ اس میں ایسے اعصاب موجود ہیں جن سے موقع محل کے مطابق کسی خاص حصہ کو ابھارا، دبایا یا پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے ۔ اس کے ذریعہ ہم کھاتے، پیتے، سانس لیتے اور باتیں کرتے ہیں۔ اس کے کسی حصہ کو ذرا سا بند کردو تو زندگی کے لالے پڑجائیں اور کسی حصہ کو ذرا سا نقصان پہنچادو تو گو آواز باقی رہ جائے گی مگر الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکے گی. عام حالات میں حلق سے گذرتے وقت ہوا کی رفتار قریباً دس میل فی گھنٹہ ہوتی ہے لیکن چھینک اور کھانسی کے وقت یہ ہوا ایک طوفان سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے اور اس کی رفتار دوسو میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے. یہ ہے انسانی گلا جس کے ذریعہ ایک عام انسان اگر اس نے چپ کا روزہ نہیں رکھا ہوا تو ایک دن میں باتیں کرتے ہوئے قریباً پچیس ہزار الفاظ ادا کرتا ہے ۔ اب اندازہ لگائیں کہ دن میں کتنی دفعہ گلے کے مختلف اعصاب تنتے اور ڈھیلے پڑتے ہوں گے ؛

باوجود اس پیچدہ ساخت کے ہمارا گلہ الفاظ کو جنم نہیں دیتا یہ تو صرف آواز پیدا کرنے کا ایک آلہ ہے ۔ اگر دوسرے متعلقہ کل پرزے (منہ، زبان ، دانت ، ہونٹ وغیرہ) اس کے سا[illegible] تعاون نہ کریں تو انسانی آواز محض غاؤں غاؤں او[ر] غوں غوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے ۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ بعض پرندوں کا گ[لا] انسانی گلے سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے ۔ ان [illegible] طوطا اور مینا بھی شامل ہیں جو کہ انسانی آواز ہو بہو نقل اتارنے پر قادر ہیں ۔ اکثر پرندے ا[پنے] گلے کی مدد سے اتنی سریلی قسم کے نغمے الاپ[تے] ہیں کہ نہ تو انسانی آواز اور نہ ہی کوئی ساز ان[کی] صحیح نقل اتار سکتا ہے ۔ لیکن یہ سب نغم[ے] محض ایک وقتی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں [illegible] میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی ۔ نہ ان کا ماضی شریں یادوں سے تعلق ہوتا ہے اور نہ مستقبل سنہرے سپنوں سے ۔ یہاں وہ ذہنی قوتیں بھی مف[قود] ہیں جو کہ ان آوازوں کو کسی نظم اور ضبط

تحت لاکر ان سے مطلوبہ صوتی اکائیوں کو جنم دے سکیں۔ اس بھری دنیا میں یہ خصوصیت صرف حضرت انسان کو ہی حاصل ہے۔

منہ: زبان کا مبنع | آپ نے دیکھ لیا کہ جب دل (درحقیقت دماغ) میں بات چیت کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تو سینہ معمولی سا ابھرا۔ پھیپھڑوں کو کچھ خلا مل گیا اور وہ پھیل گئے۔ اس سے پھیپھڑوں کے اندر بھی ایک قسم کا خلا پیدا ہوگیا جسے بھرنے کے لئے ناک اور منہ کے ذریعہ ہوا اندر داخل ہوگئی۔ یہی ہوا انسانی زندگی کا باعث بھی ہے اور اسی ہوا سے انسانی آواز جنم لیتی ہے۔ اب غیرارادی طور پر سینہ نے پھیپھڑوں پر معمولی سا دباؤ ڈالا اور وہ کچھ سکڑ گئے۔ کھلے منہ کے غبارے کی طرح ہوا حلق کے راستے باہر کو دوڑی۔ اب اگر آپ آرام کی حالت میں ہیں اور کوئی باتیں وغیرہ نہیں کررہے تو یہ ہوا آپ کے آرام میں خلل ڈالے بغیر چپکے سے باہر نکل جائے گی۔ لیکن اگر آپ باتیں کرنے پر تلے ہوئے ہوں تو غیرارادی طور پر گلے کے بعض پٹھوں کی مدد سے اعصاب نطقی میں تناؤ پیدا ہوجاتا ہے (ملاحظہ ہو خاکہ ب)۔ اب جیسے ارغنوں کی مہین پتیوں میں ہوا کا دباؤ ارتعاش پیدا کرکے آواز کا باعث بنتا ہے ایسے ہی حلق سے گزرنے والی ہوا ان تنے ہوئے اعصابی ریشوں میں ایک تھرتھراہٹ پیدا کردیتی ہے جس سے خود اس ہوا میں بھی ایک قسم کا ارتعاش سا پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ مرتعش ہوا جو کہ اب آواز کا روپ دھار چکی ہے گلے سے نکل کر منہ میں پہنچ جاتی ہے۔

خاکہ (ب)

اعصابِ نطقی اور حلقومِ خورد مختلف حالتوں میں

منہ انسانی آلات صوتی کا تیسرا اور سب سے اہم آلہ ہے۔ یہاں گلے سے آنے والی آواز کو ضرورت کے مطابق موڑ توڑ کر مختلف قسم کے الفاظ گھڑ لئے جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زبان کی مدد سے ہوا کے اس بہاؤ کو روک کر یک دم اس طرح سے چھوڑدیں کہ زبان کا سرا تالو کو دانتوں کے اوپر والے حصہ کو چھو جائے تو زبان کے سرے کے مختلف طریقوں سے تالو کے مخصوص حصوں کو چھونے سے ت، ٹ، د، ڈ، ج، چ، ل، ن وغیرہ قسم کے الفاظ کی آوازیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اگر اس مرتعش ہوا کے بہاؤ کو زبان اور تالو کی مدد سے بنے ہوئے تنگ راستہ سے گزارا جائے تو ث، ذ، ز، س، ش، ص، ض، ظ اور یائے صوتی کی قسم کی سیٹی نما آوازیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اگر یہ تنگ راستہ ہونٹوں کی مدد سے بنایا

جائے تو پھر یہ مرتعش ہوا ف اور واؤ صوتی قسم کی آوازوں کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اگر زبان ساکت رہے اور ہونٹوں کو یک۔دم کھول کر رکی ہوئی مرتعش ہوا کو چھوڑدیا جائے تو ہونٹوں کے مختلف اندازوں کے مطابق ب، بھ، پ، پھ م وغیرہ قسم کی آوازیں جنم لیتی ہیں۔ اگر آنے والی آواز پر حلق کے اگلے اور زبان کی جڑ والے سرے پر دباؤ ڈالا جائے تو خ، غ، ق، ک، گ وغیرہ قسم کی آوازیں تشکیل پاتی ہیں۔ اگر آواز کو بغیر کسی رکاوٹ کے آزادانہ گزرنے دیا جائے تو منہ اور ہونٹوں کے مختلف اندازوں کے مطابق یہ حروف علت اور ع، ح، ہ وغیرہ قسم کی آوازوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

پھول کا سفر

(خاکہ ج)

باتوں باتوں میں پھول کا ذکر بھی آگیا۔ گو اس وقت کوئی پھول آنکھوں کے سامنے نہ تھا پھر بھی متکلم کے دماغ میں ایک نیم شگفتہ پھول کا تصور سا کھنچ گیا۔ اس کے دماغ کے کسی مخصوص حصہ کے خلیوں میں ایک خاص قسم کا ہیجان سا پیدا ہوا اور انہوں نے ماضی کے طاقچوں میں سے اس لفظ اور اس سے متعلقہ افعال کو ڈھونڈھ نکالا۔

اب اعضائے صوتی کو علیحدہ علیحدہ احکام صادر کردئے گئے۔ پھیپھڑوں نے سینہ کی مدد سے ہوا کو حلق کی طرف خارج کردیا۔ حنجرہ میں واقع اعصاب نطقی میں ایک تناؤ سا پیدا ہوگیا جس نے اس آنے والی ہوا میں ایک ارتعاش کا عالم پیدا کردیا۔ جب یہ مرتعش ہوا کا بہاؤ منہ میں پہنچ گیا تو ہونٹوں نے ایک بند شگوفے کی شکل بناتے ہوئے اس مرتعش ہوا کے بہاؤ کو تھام دیا۔ پھر یک دم ایک کھلتے ہوئے شگوفے کی طرح ہونٹ تھوڑا سا کھل گئے۔ ہوا کے تھمے ہوئے بہاؤ نے ہونٹوں کے اس تنگ راستے سے باہر کا رخ کیا اور اس طرح خارج ہوتے ہوئے "پھ" کی آواز پیدا کردی۔ اب ان نیم وا ہونٹوں نے تھوڑا سا اور آگے بڑھ کر تھوتھنی کی صورت اختیار کرلی جیسے یہ کنول کے پھول کی صوری نقل اتارنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس طرح مرتعش ہوا کا بہاؤ کچھ دیر اور جاری رہا اور "آ ... و" کی آواز ظہور میں آگئی۔ اب ہونٹ تھوڑا کھل گئے اور کچھ پیچھے ہٹ گئے زبان جو اب تک آرام سے لیٹی ہوئی تھی خلیوں کی حکومت سے حکم پاتے ہی حرکت میں آگئی اور مقررہ احکام کے مطابق اٹھ کر اپنے اگلے سرے سے تالو کو دانتوں کے اوپر والے حصہ پر مس کردیا۔ اس طرح سے "ل" کی آواز کی تشکیل ہوکر "پھول" کا لفظ مکمل ہوگیا۔

لیکن قصہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ جنگل میں پھول کھلا کس نے دیکھا؟ یعنی پھول کھلنے کے ثبوت کے لئے دیکھنے کی شرط لازمی ہے ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ آیا پھول کھلا بھی یا نہیں۔

اسی طرح جب تک کوئی سننے والا اس بات کی شہادت نہ دے تو صرف منہ کی حرکات ہی اس امر کا ثبوت نہیں ہیں کہ آیا کسی نے پھول کہا بھی یا نہیں ۔ ممکن ہے کہ ظاہرا طور پر منہ ان تمام حرکات کو عمل میں لاتا رہا ہو جو پھول کہنے کے لئیے ضروری ہیں لیکن اعصاب نطقی نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو ۔

گوش برآواز پھول کہتے وقت متکلم کے منہ سے نکلتی ہوتی مرتعش ہوا کے اس سلسلے نے فضا میں بھی لہروں کی شکل میں ایک قسم کے ارتعاش کا تسلسل سا پیدا کر دیا جو کہ قریباً بارہ سو فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے ہر شش جہت میں پھیل گیا ۔ یہ مرتعش لہریں سفر کے دوران میں مخاطب کے کانوں کے پردوں سے بھی جا ٹکرائیں ۔ (ملاحظہ ہو خاکہ د)

اعضائے سماعت
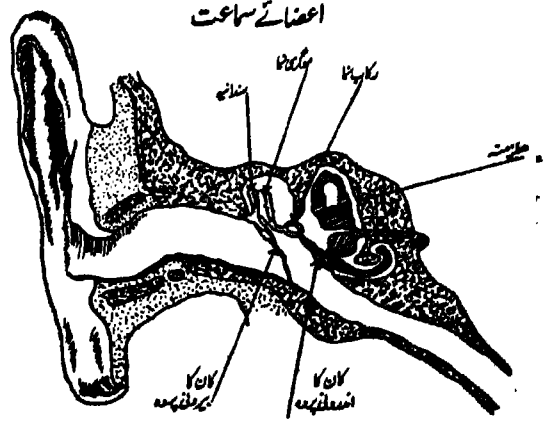
خاکہ (د)

کان کا یہ پردہ اتنا نازک واقع ہوا ہے کہ ان لہروں کے ٹکرانے سے اس میں بھی اسی طرز کا ارتعاش پیدا ہوگیا ۔ یہاں سے یہ ارتعاش ملحقہ نرم ہڈیوں ہوگری نما ، سندانیہ اور رکاب نما کے ذریعہ کان کے اندرونی حصہ کے دہن بیضوی تک پہنچ گیا ۔

صحیح معنوں میں کان کا یہی اندرونی حصہ قوت سماعت کا سب سے اہم عضو ہے ۔ گھونگھے کی شکل کا ہونے کی بنا پر اسے کن گھونگہ یا ملزونہ کہتے ہیں (ملاحظہ ہو خاکہ ذ)

خاکہ (ذ)

علاوہ قوت سماعت کے یہ انسانی توازن کو قائم رکھنے میں بھی مدد دیتا ہے ۔ یہ مختلف پیچیدہ سی نالیوں سے مل کر بنا ہے ۔ یہ نالیاں ایک قسم کے مادہ سیال سے بھری ہوتی ہیں ۔ آنے والے ارتعاش کی وجہ سے اس مادہ سیال میں بھی لرزش پیدا ہوجاتی ہے ۔ یہ لرزش ایک ملحقہ لچکدار پردہ (غشاء زیریں) میں چھوٹے سے پیمانہ پر ایک جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ۔ (ملاحظہ ہو خاکہ س)

کان کے اندر خلیات حس

خاکہ (س)

اس پردہ پر مہین مہین بالوں کی طرح اعصابی ریشے واقع ہیں جو کہ پردہ کی اوپر نیچے کی حرکت کے ساتھ اوپر نیچے ہوتے ہیں اور اس طرح سے اوپر ڈھکنے کی طرح واقع پردے (غشاء سقفی) کے ساتھ چھوتے ہیں۔ لچک‌دار پردے کے مہین ریشوں کا لمس اعصابی ریشوں کے ذریعے تلغراف کے 'گٹ گر، 'گٹ گٹ گر، کی طرح دماغ میں اپنے مخصوص حصہ میں واقع قوت سماعت سے متعلق بھورے مادہ کے خلیوں تک پہنچ گیا۔ یہاں ان مخفی حروف کو ان کی صحیح آوازوں کی صورت میں سمجھ لیا گیا۔ پھر ان آوازوں کو ذہن کے طاقچوں میں سے پہلے سے محفوظ شدہ ہزارہا آوازوں (۱) کے تصورات سے موازنہ کرکے متکلم کے صحیح مفہوم کا پتہ لگا لیا۔ یعنی مخاطب کو معلوم ہوگیا کہ متکلم نے پھول کا ذکر کیا ہے۔

بظاہر متکلم کے دماغ میں ' پھول ' کے لفظ کے اظہار کرنے کے تصورات پیدا ہونے سے لےکر سامع کے دماغ میں ' پھول ' کے مفہوم کے تصورات کی تخلیق ہونے تک نفسیاتی، برقی، کیمیاوی اور طبعیاتی افعال کا ایک نہایت ہی پیچیدہ اور طویل سلسلہ عمل پذیر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن انسانی دماغ کا وہ حصہ جو قوت گویائی، قوت سماعت اور قوت یاد داشت کے لئے مخصوص ہے ایک اعلیٰ پایہ کی خودکار مشین کی طرح یہ سب فرائض آن واحد میں سر انجام دے دیتا ہے۔ یعنی جب ہم گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں محسوس تک نہیں ہو پاتا کہ اس دوران میں ہمارے جسم کے مختلف حصوں میں کیا کیا کیفیات اور کیا کیا حرکات پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں واقع کروڑہا خلیے لکھوکھا سال کے تجربات کی بنا پر اپنے فرائض میں اتنے ماہر ہوگئے ہیں کہ وہ بس پلک جھپکنے سے بھی کم وقفہ میں بالکل صحیح نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ یہاں لاکھوں سالوں کا تجربہ کوئی مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ خلیے نسل درنسل اپنے کام میں مہارت حاصل کرتے رہے ہیں اور اپنی حاصل کی ہوئی خصوصیات آنے والی نسلوں کو ودیعت کرتے چلے آرہے ہیں اور پھر ہر آنے والی نسل اس مہارت میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ اور ثبوت موجودہ انسان کا دماغ اور اس کے کارنامے ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں زیادہ تر مندرجہ ذیل کتابوں اور مضامین سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے :—

Wells, H. G; Wells G. P; Huxley, J. S; The Science of Life.

Halliburston, W. D; McDowell, R. J. S; Handbook of Physiology and Biochemistry.

Ranson, S.W; The Anatomy of the Nervous System.

(۱) ماہرین کے اندازہ کے مطابق ایک عام چار سالہ بچے کا سرمایہ الفاظ کوئی پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں یہ سرمایہ چودہ ہزار الفاظ تک جا پہنچتا ہے۔ ایک عام بالغ انسان کا سرمایہ الفاظ پینتیس ہزار (۳۵۰۰۰) سے ستر ہزار (۷۰۰۰۰) الفاظ تک ہوتا ہے جبکہ کالج کے ایک طالب علم کا سرمایہ الفاظ ڈیڑھ لاکھ (۱۵۰۰۰۰) سے بھی زیادہ تک جا پہنچتا ہے۔ اب ان الفاظ کی صوتی اکائیوں کا اندازہ خود لگالیں۔

Mario Pei; The Story of Language.
Language for Everybody.

Paget, R. A. S; The Origin of Language.
[Penguin, Science News Series No. 20]

Pruce, D. J; Speech Engineering.
[Penguin, Science News: 44]

Rushton, W. A. H; How Messages are Transmitted Along Nerves.
[Penguin Science News 5]

Even Wylie; All About Your Sore Throat
[Reader's Digest, January 1959]

لسانیات کی تاریخ ('امروز، ۱۴ اگست ۱۹۶۱ء)

عین الحق
فرید کوٹی

رباعیات

جوش ملیح آبادی

میں نے نہ کسی کا سر پہ احساں لیا — رازِ عالم کو خود بخود جان لیا
انساں کی معرفت ہوئی جب حاصل — اک آن میں اللہ کو پہچان لیا

حُبِ نوعِ بشر ہے میرا ایماں — ہر چہرۂ زشت و خوب میرا قرآں
قربِ یزداں نے خود پکارا مجھ کو — حاصل جو ہوئی دولتِ قربِ انساں

اقوام کے لفظ میں کوئی جان نہیں — اک نوع میں ہو دوئی یہ امکان نہیں
جو مشرکِ یزداں ہے وہ بھولا ہے فقط — جو مشرکِ انساں ہے وہ انسان نہیں

ہر سانس میں حوروں کے پیام آتے ہیں — چھلکے ہوئے فردوس کے جام آتے ہیں
بندوں کو جو سینے سے لگا لیتا ہوں — اللہ کی جانب سے سلام آتے ہیں

جب غرفۂ غور و فکر کھولا میں نے — اپنے کو نئے باٹ سے تولا میں نے
میں ہوں کہ نہیں، یہ جانچنے کی خاطر — اپنے کو کئی بار ٹٹولا میں نے

ٹیکسلا

جعفر طاہر

یہ ٹکشلا ہے
گراں سرشت و گل تمنائے چشم گیتی
یہ شہرِ فیروزہ جو زرِ سرخ میں تلا ہے
دوازدہ گوشہ کاخِ رنگیں
یہ خطِ کردار کی طرح صاف راستے
یہ دوار پالوں کی ہر طرف گونجتی صدائیں
یہ شیشموں کے خنک خنک مست مست سائے

یہ بدریاں ناچتی ہوئی تتریاں
خمِ زلف زلف کو چومتی گھٹائیں
ہے دیدنی یہ نگار خانہ
تھرتھرک راگ رنگ رس راؤ چاؤ

یہ خواب در خواب سلسلے
سرخیٔ خم و جام، حسنِ ایّام
روپ کا تاپ
دیوتاؤں کا بَل
منو کامنا کی لہریں

یہ دھرم تیرتھ
یہ خانقاہوں میں سجدہ مہاتما
یہ بھگوے برن میں بھکشو
مگر یہ چندن کی تیز خوشبو

ہوائے زلف و صبائے گیسو
یہ دست و بازو کہ جن پہ چوگانِ عزم قرباں
یہ قدِ زیبا قیام آموزِ سرو و شمشادِ بوستاں
نور و نار کے بیقرار دریا
وہ نقرئی گھنٹیوں کی آواز معبدوں سے اُبھر رہی ہے
پہاڑیوں کی سیاہ ریخوں میں پھول کھلنے لگے ہیں
بہنے لگے ہیں چشمے
یہ رام تلسی کے جھومتے پیر، گُن کلی کی اُبھرتی تانیں
سُروں کی لہروں پہ ننھی کلیوں کی طرح بہتی ہوئی چٹانیں
وہ خوابگاہوں میں کتنی کرنوں کے ہار کھل کر بکھر گئے ہیں
یہ دھوپ ——— سُر سندریوں کا سونا دمک رہا ہے
مکان کا ایک ایک کونا چمک رہا ہے۔
کئی پری وتیاں، رشی پتنیاں حنائی ہتھیلیوں پہ
چمن کھلائے، کنول سجائے!
ستی للت دیویوں کے درشن کو جا رہی ہیں
کہیں کرم مور ناچتے ہیں
کہیں کبوتر گٹک رہے ہیں
یہ تال، تالاب، شوخ چنچل، سُریلی سکھیاں
یہ بانکا، یہ اشوک باڑی
یہ پدمنی، موہنی، سدا روپ رانیاں
کہ بختی گرمتی جوانیاں
جن کی داستانیں، کہانیاں، مر کے بھی امر ہیں

مگر وہ کیا ہے؟
وہ حشر سا کس لئے بپا ہے؟

مہنت، پنڈت، فقیر، بھکشو، کوی
دکاندار، کھیت مزدور سینہ زن ہیں
کماریاں بال نوچتی باندیاں کھڑی گال پیٹتی ہیں
وہ کون ہے کون؟ پاؤں میں بیکڑے، پر سنکال!
کس جواں کو گھسیٹتے جا رہے ہیں سمراٹ کے سپاہی
(الٰہی! یہ دورِ کم نگاہی)
اشوک سمراٹ شاہی رتھ پر اُڑے چلے جا رہے ہیں
پہلو میں راج رانی کھڑی ہوئی مسکرائے جاتی ہے
اس طرف دیکھئے! اُدھر! ایک بھیڑ سی لگ رہی ہے توبہ!
طویل سرگوشیوں کے دامن سمٹ رہے ہیں!
لبوں پہ خاموشیوں کے پہرے سے لگ رہے ہیں!
وہ راج سینا کے نوجوان گاڑتے ہیں سولی
یہی وہ زینہ ہے جس پہ چڑھ کر
خدا کے گھر میں بھی جھانکتے ہیں!
مگر سنو تو،
سنو کہ سمراٹ کہہ رہے ہیں!

اشوک اعظم اے تکشلا نگر کے پری توش ونیتو!
اے دھرم کے پجاریو! اے نر ناریو سنو!
پُرلو بھنا ہے پاپ، مہا پاپ جان لو!
ماتا پہ آنکھ پُتر کی اٹھے یہ قہر ہے
یہ وہ کنول ہے جس کے کٹورے میں زہر ہے
جو بھی کہے گی رانی وہ دیں گے اسے سزا
سولی ہو یا چتا

ایک شہری اے ناتھ اے جگت کے اجالے، مہابلی
اپنا کمار ہے ابھی کچی کنول کلی

کوئی گواہی دے تو کنالا کے باپ کی
ورنہ جو آگیا ہو مہاراج آپ کی

دوسرا شہری: اک استری کی بات پہ جائیں نہ بھاگوان
رانی کے من میں ماتا کی پیڑ بھی کہاں
پھر ہر بیاہتا نہیں ہوتی شریف ماں
بیٹے کی آنکھ ہو کہ مہاراج باپ کی
دونوں میں اک جھلک ہو اوپات جاپ کی

اشوک اعظم: سچ ہے مگر نہ رانی کو جھوٹا کہیں گے ہم
وہ کیا کہیں گی لاج کے بیری ہیں خود ورات
اندھوں کے ہاتھ آیا ہے بھارت کا راج پاٹ!

تیسرا شہری: کٹیلے بڑھ کے راج بھون میں اندھیر ہے!
مکھڑے پہ جوت من میں سیاہی! مہابلی
جیسے کسی چٹان پہ چونا پھرا ہوا
سرگوشیاں بچھاتی ہیں بدنامیوں کے جال
تکنا بھی ہے وبال نہ تکنا بھی ہے وبال
اندھی، اپیت ہوتی ہیں الھڑ جوانیاں
نردھن کی بیٹیاں ہوں کہ راجہ کی رانیاں!

اشوک اعظم: مترو! مہانگر کے وشیشی نواسیو!
(پریشان ہوکر) راجہ کی بات پر تمہیں وشواش چاہیے
کوئی بھی اب کنال کے بارے نہ کچھ کہے
پاپی کو اپنا پتر بنانے سے ہم رہے
جو چاہے راج رانی ادھری کو دے سزا

مہارانی: آنکھوں پہ ہے کمار کو اپنی بہت غرور
دیکھیں تو ہے تو کنال کی آنکھوں کا سب قصور
اچھا ہے راج دیو کی آنکھیں نکال دو

کنال　　ماتا جی! ایک بار پھر اک بار دیکھنا
آنکھیں تو ٹھیک رہے ہیں کہاں ان میں روشنی
من کی بھی آنکھ ہوتی ہے منھارد یکھنا

اشوک اعظم　　آنکھیں نکال دو

دگرج کر)　　دکنال کی آنکھیں نکال دی جاتی ہیں۔ وقفہ)

مہارانی　　لے جاؤ راج تال میں آنکھوں کو ڈال دو

(کنال کی آنکھیں شاہی حوض میں تیرتی پھر رہی ہیں سیکڑوں
لوگ آنکھوں کی زیارت کے لئے جمع ہو گئے ہیں)

لوگ　　انیائے کا شکار ہوا نوجواں کمار!

اور　　راج کہاں یہ کوئی سنبھالے ساتھیو

اور　　نینوں میں اب تو پھرتی رہیں گی سلائیاں

اور لوگ　　تیرتے پھرتے ہیں کیا تال میں دونوں ہیرے
جس طرح نیل کمل بہتے ہوں دھیرے دھیرے

اور　　جس طرح سپنوں کی چادر میں کسی بالک کی
ایک پل کے لئے کھل جاتی ہوں سوتی آنکھیں
دیکھ کر ماتا کا سندر مکھڑا
مسکرا دیتی ہوں، مُند جاتی ہوں چپکے چپکے

اور　　ادھ کھلی، سوچتی، مخمور، نشیلی آنکھیں
جیسے پھولوں سے بھرے رستے میں اک سادھو نے
خون سے اپنے امر دیپ جلا رکھے ہوں

اور　　کانپتے نینوں پہ جھکتے ہوئے رہ رہ کے کنول
جیسے انیائے پہ شرما کے جھکی جاتی ہوں
آج بھگوان کی سندر آنکھیں

دیکھنے والوں نے پھر وہ بھی زمانہ دیکھا
لوگ اس تال کے پانی سے جو آنکھیں دھوتے
کم نگاہی پہ نصیبے کی نہ پھر وہ روتے
طرفتہ العین میں اک تازہ بصارت کا سراغ
اک نئی جوت سے جل اٹھتے نگاہوں کے چراغ

○

بات مغرب کے جو صاحب نظراں تک پہنچی
چل کے اس چشمۂ انوار تلک آپہنچے
(روشنی یوں بھی تو مشرق سے ملی ہے ان کو)
اک شفاخانہ وہاں آج بنا رکھا ہے
ہم سے پوچھو تو شفاخانے میں کیا رکھا ہے
ورنہ اکسیر تو خاکِ شہدا ہے کہ جو تھی
سرمۂ اہلِ نظر خاکِ شفا ہے کہ جو تھی

○

دوستو! دیدہ ورو کور نگاہی کیسی
شہر در شہر یہ اعجازِ کنالہ دیکھو
ہو گیا اب تو شبِ غم کا اجالا دیکھو

شاعری — سماجی ترکہ

عبد الرؤف عروج

ہندوستانی افواج کی بغاوت شعلۂ مستعجل نہیں تھی۔ اس نے نقطوں کو متصل کر کے لکیر بنا دیا تھا۔ ہندو اور مسلم دونوں اپنی رقابتوں کو بھول کر مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو گئے تو کارل مارکس نے انہیں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ ہر آنے والی ساعت اس کے اس دعوے پر حجت بن گئی کہ ہندوستانی افواج کی بغاوت عظیم ایشیائی اقوام کی بے اطمینانی کی اٹھتی ہوئی لہر تھی۔ پھر زمانے نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس میں اور چینی اور ایرانی لڑائیوں میں کتنا قریبی تعلق تھا۔ ہندوستانی عوام قدیم جاگیرداری نظام سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اس عفریت در و امن نئے نظام کا خیر مقدم کیا۔ لمحوں کی ناکامی صدیوں کا تجربہ بن گئی۔ دنوں کے فاصلے، سالوں کی ساخت ہو گئے۔ یکم نومبر ۱۹۵۸ء کو لارڈ کیننگ نے وفاداران انل کو مخاطب کرتے ہوئے ہندوستانی صنعت و حرفت کی ترقی کے پیمان باندھے تو دیسی خام مال برطانوی منڈیوں میں استعمال ہونے لگا۔ دست کاروں کی فگار انگلیاں اور ہنروروں کے بریدہ انگوٹھے ہندوستانی معیشت کی تباہی کا سرنامہ بن گئے۔ غلامی ذہنوں سے گزر کر دلوں تک در آئی تو لارڈ میکالے کا تیار کردہ اصول تعزیرات موت کا پھندا ہو گیا۔ لمحہ لمحہ نت نئے بڑھتے ہوئے ٹیکسوں نے نوشتے پر بدنصیبی کی مہر لگا دی۔

حالی کے سامنے اس بھیانک استحصال کا دائرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ انگریزوں کے وفادار تھے۔ اس کے باوجود ان کی وفاداری سماجی ترقی کی خواہش مند تھی۔ وہ عالم آزادگاں کو اس زمین اور اس آسمان سے الگ سمجھتے تھے۔ ان کی گرہ میں آزادئ فکر و نظر کی جنس نایاب بھی تھی لیکن گاہکوں کی بے خبری نے ان کی دوکان کو چمکنے نہیں دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کا انحطاط اور مسلمان شریف خاندانوں کی پستی مستقل سکرات بن جائے۔ انہوں نے اس جذبے کے زیر اثر مسدس مد و جزر اسلام لکھا تو معاملات طنز و تعریض تک جا پہونچے۔ دوستوں نے فقرہ دیا کہ اس کا خطاب مسلمانوں تک محدود ہے۔ دشمنوں نے بات بنائی کہ جاگیرداری عہد کے زوال کی تصویر اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ حالی نے ماضی کی غلاظت اور گندگی کے خلاف جدوجہد کی تھی، ہندوستان کی غلامی پر آنسو بہاتے تھے۔ ان کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ جو آسائش برطانوی حکومت کی بدولت ملی ہے کسی عہد میں ممکن نہیں۔ حالی کے اس ذہنی تضاد کو ان کے اپنے معاشرے کا تضاد سمجھنا چاہیے۔ ہندوستانی سرمایہ کار، برطانوی کارخانوں کے زیر اثر افیون کی تجارت میں شریک ہو گئے۔ یہ افیون چین بھیجی گئی تو وہاں کے محنت کشوں کی رگ رگ میں خون کی بجائے زہر دوڑنے لگا۔ حالی نے شروع ہی میں ان زلزلوں کی دھمک محسوس کر لی تھی جو اگلے وقتوں کے نشان زیر و زبر کر رہے تھے۔ انہوں نے سودیشی کی بڑھتی ہوئی تحریک کا خیر مقدم کر کے اس کی ہم نوائی کی تو عوام ان کے ساتھ ہو گئے۔

کہ ترقی کی چلی آتی ہے مٹتی مارتی
دستکاروں کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی

اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی غافلوں کو موت کا پیغام پہونچاتی ہوئی

وہ لوگ حالی ہی کے نہیں، اپنی تہذیب اور معاشرے کے بھی دشمن ہیں جن کو ان کی شاعری میں انفعالی جذبوں کی تلاش رہتی ہے۔ حالی نے ایک ایسے گزرتے ہوئے لمحے کو مسخر کیا تھا جس میں ان کے ملک و قوم کی تقدیر زندہ و توانا ہو سکتی تھی۔ وہی گزرتا ہوا لمحہ مثنوی حب وطن کی صورت میں گنگنایا تو شاعری کے دھارے بنجر اور ویران میدانوں سے نکل کر سرسبز اور شاداب نخلستانوں کی طرف مڑ گئے۔ غزل کا جان بلب روایاتی مریض مادّہ کو خیال کی اصل تخلیق مان کر صحت مند ہو گیا۔ یہ صحت، یہ تازگی، یہ نمو اور یہ زندگی حالی ہی کی حقیقت نگاری کی دین تھی۔ اس حقیقت نگاری کے بعض متنوع گوشے ان شعروں میں صاف طور سے نمایاں ہوں گے ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
تم میں کچھ اتفاق ہوتا اگر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی جو نہ آئی تھی وہ بلا آئی!
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا کبھی درّانیوں نے زر لوٹا
سب سے آخر کو لے گئی بازی ایک شائستہ قوم مغرب کی
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے چین کس کو ملا ہے غیروں سے

حالی کی وطن پرستی کی اس سے بڑھ کر اور کیا معراج ہوگی کہ وہ بغیر کسی ذہنی تعصب کے محمود غزنوی، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور انگریزوں کو لٹیروں کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور پھر ان کے ہاتھوں انہیں ملک و قوم کا چین رخصت ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ انہوں نے ادب کے مورچے پر بھی آزادی کی جنگ لڑی ہے۔ محکوم و آزاد کا مکالمہ لکھا ہے۔ یہ مکالمہ انگریزوں کے حد سے بڑھے ہوئے غلبہ اور ہندوستانیوں کی حد سے گری ہوئی پستی کا بدترین مظہر ہے ؎

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنہیں قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
سن کے اک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا ہے سقر موری کے کیڑے کے لئے باغِ ارم

یہ شعر قلم سے نکل کر شہر بہ شہر گونجے تو دانش وروں نے پہلی مرتبہ ہندوستانی حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ غیر ملکی آقاؤں نے پھر ایک بار اٹھنے والی بغاوت کی آہٹ سنی۔ اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا تجربہ بے جا طور میں آتا، انڈین کونسل ایکٹ نافذ ہو گیا۔ اس نے مجلس قانون ساز میں ہندوستانی ممبروں کی گنجائش پیدا کی ہی تھی کہ برہمو سماج نے طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبے کے پس منظر میں کیشب چندر سین کی نابالغ لڑکی مہاراجہ کوچ بہار سے بیاہی گئی تو اس تحریک کے حامی [illegible] سے آزاد ہو گئے۔ رانا ڈے، چندرا ورکر اور دیال سنگھ نے اس کے جاری رکھنے کی کوشش کی تو دستور اساسی [illegible] الٰہ آباد میں سوامی دیانند کی تعلیمات نے برہمنوں سے ویدوں کے پڑھنے کے حقوق چھین کر عوام میں تقسیم کئے تو [illegible] بہت بڑا حصہ [illegible] ثابت ہو گیا۔ برہمو سماج اور آریہ سماج کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک نئی [illegible] کے [illegible] ہو گیا۔ [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کی صحت [illegible] [illegible]

کہ مذہب نے اپنی قوم کے گھروں کو بدکاری کا اڈا بننے سے بچایا ہے۔" یہ بات بظاہر معمولی تھی، اپنی حدود میں اس کے نتائج بڑے دُور رس ثابت ہوئے۔ حالی نے قوم کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے خطاب کیا تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے پیش نظر تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کے مطالبے نہیں تھے۔ برہمو سماج، آریہ سماج اور دیو سماج کے وابستگان کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جائے تو حکومت کی پھول مالا مشرقی تہذیب و تمدن کے سہارے بڑھنے والی لڑکیوں کا سامان جہیز بن جاتی ہے ؂

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نام رکھا ہے سائنس کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز

رُخ سے پردہ کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

پُوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا
اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

حالی کا مشن تاریخی فریضہ تھا۔ سرسید کا اندازِ فکر جُداگانہ تھا۔ انہوں نے انگریزوں کی طرف اتحاد اور دوستی کا ہاتھ بڑھا کر محمود خاں کو نامحمود خاں بنا ڈالا۔ سرسید جُداگانہ ہندو مسلم قومیت کے حامی تھے۔ ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سنگِ بنیاد رکھا تو نئی تعلیم اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تحفظ کی خاطر بیرونی اقتدار سے تعاون کرنا لازم ہو گیا۔ تاج اور ہلال، امن اور وفاداری کا نشان بن کر نیم واکالروں پر چمکایا تو آدابِ قومی پر زبانِ اعتراض دراز ہونے لگی —————— تحریک علی گڑھ کے اس کمزور پہلو کو اکبر الٰہ آبادی نے پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ان کی کلیات میں ایسے شعروں کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک جا پہنچتی ہے جو سرسید اور ان کی تحریک کے خلاف لکھے گئے ہیں، اکبر الٰہ آبادی کو سرسید سے عناد نہیں تھا، دشمنی بھی نہیں تھی، وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے سرسید کے انتقال پر پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا کہ "خدا بخشے ہزاروں خوبیاں تھیں مرنے والے میں"۔ اکبر الٰہ آبادی سرسید کے مخالف نہیں درحقیقت اس رجحان کے مخالف تھے جو مغربی تعلیم کی اشاعت کی بدولت ملک و قوم کے لئے سخت گیر ہوتا جا رہا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اس رجحان کی نمائندہ تھی اس لئے انہیں کہنا پڑا ؂

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے، امیر زادے شریف زادے

کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمالِ غیرت سے بڑھ رہے ہیں
سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے

نظر بھی آئے جو زلف پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالیسی ہے
الکٹرک لائٹ اس کو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے

نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنام تہذیب و درد مندی
یہ کہہ کے لیتے ہیں سب سے چندہ ہمیں جو تم دو تو ہیں خدا دے

دلوں میں ان کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے

۱۹۰۱ء میں ملکۂ وکٹوریا آنجہانی ہوئیں تو ہندوستانی رؤسا، امراء اور حکام نے اس کے بڑے لڑکے ایڈورڈ ہفتم کے آگے گردنیں جھکا دیں۔ اس نے دلی میں دربار کے نام پر اپنی ہیبت و اجلال کا مظاہرہ کیا تو والیانِ ریاست کٹھ پتلیوں کی طرح ان کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ ابھی اس تاج کا جادو بھی نہیں ٹوٹا تھا کہ لارڈ کرزن کی پالیسی، ملک و قوم کے ڈھانچے میں تقسیم بنگال کا زہر چھڑک گئی، اس سے پہلے کہ اتحاد و وحدت دوگلی کا شکار ہو، برطانوی مال کے بائیکاٹ کے نعرے بلند ہو کر بسیط و عریض فضا پر پھیل گئے۔

ان ہی عوامل کے زیر اثر محمد حسین آزاد نے اپنی نظموں کو تمثیل بنا دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے کلام میں کہیں امید کی

کہیں شاہِ امن کے دربار اور کہیں شہنشاہِ انصاف کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اُن کی فکر، فلسفہ، منطق اور سائنس کی فکر تھی، اُن کے نزدیک اس کا کام خیال کی ترسیل اور پیغام کا ابلاغ تھا۔ وہ وقت کے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہم آہنگ ضرور تھے، لیکن ان کی سیاسی بصیرت اتنی عظیم اور شاندار نہیں تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے شانہ بہ شانہ چل سکیں۔ حالات کے ریگستان میں اُن کی شاعرانہ حیثیت گم شدہ مسافر کی نہیں، اُس حدی خواں کی ہے، جس کی آواز پر قافلے مرغزاروں میں پہنچ کر کسی چشمۂ شیریں کے کنارے دم لیتے ہیں۔ یہ آواز بلند بھی ہوتی ہے تو حالات کی سختی اور ماحول کا دباؤ اس کی صوتیات کو مدہم کر دیتا ہے اور وہ اپنے گرد و پیش میں گم ہو کر ایک ایسا ہی نعرہ بن جاتی ہے ؎

ہے سامنے کھُلا ہوا میداں چلے چلو — باغِ مُراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو — ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو!

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے — دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائیں گے
طوفان مُبلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے — نیکی کے زور اُٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو!

آذ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے — چمکایا چہرۂ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتح یاب ہے — اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو!

۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ ہفتم نے وفات پائی تو تاجِ شاہی اُس کے بڑے لڑکے جارج پنجم کی جبیں پہ آگیا اُس نے اپنی ملکہ میری کے ہمراہ دلّی میں قیام مینت لزوم رکھے تو حدِ نظر تک پھیلی ہوئی وسعت خیموں کا جنگل بن گئی۔ اکبر الٰہ آبادی اس جنگل میں جنگل کے تماشائی تھے۔ ان کی سماجی رجعت پرستی نئی تعلیم اور سائنس کا مذاق اڑاتی تھی۔ اس کے باوجود یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ وہ انگریزی حکومت کا بھی مذاق اُڑاتے رہے، اس کے بطن سے جنم لینے والی برائیوں پر ان کا جذبۂ تنقید بڑا سخت گیر تھا۔ انھوں نے دلی دربار دیکھا تو سیکڑوں اندیشہ ہائے دُور دراز جاگ اٹھے ؎

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہے — شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے — قصۂ ماضی حال ہوا ہے
ہے مشہور کوچہ و برزن — بال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائرِ ہوش تھے سب کے پرزن — ٹھٹکے دیکھ رہی تھی ہر زن
پہنچے پھاند کے سات سمندر — تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوجِ بخت ملاقی ان کا — چرخِ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا — آنکھیں میری باقی ان کا
ایک کا حصہ من و سلوا — ایک کا حصہ تھوڑا حلوا!

ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا   میرا حصہ دُور کا جلوا

اس دلی دربار کا پس منظر بڑا عبرت ناک تھا۔ عزت خواہوں کے ذنگل میدان میں اُترے تو ہندوستان دستِ دریوزہ میں کاسۂ سوال بن گیا۔ وکٹوریا کراس کے تمغوں کی بھیک، دل میں پلنے والی شکایتوں کو خاموش کر گئی۔ یہ خاموشی کس قدر دلفریب اور خوشنما تھی اسے اکبر الٰہ آبادی ہی کی ایک اور نظم 'برٹش راج' میں دیکھئے۔ برٹش راج کے فیضان کی اس سے زیادہ مکمل تصویر کسی اور نے نہیں کھینچی۔ اس کا سب سے بڑا رنگ کار ان کا جذبۂ صداقت ہے، اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی ؎

بہت ہی عمدہ ہے لے ہم نشیں یہ برٹش راج — کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو — کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبلی کی — جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
طرح طرح کے بنالو لباس رنگا رنگ — علاوہ روئی کے ریشم بھی اور اول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی — کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر — تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

شبلی کو ایک محکوم ملک کا جمہوری مبصر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ انھوں نے ماضی کے بارود خانے سے آنے والی نسلوں کے لئے ان ہی اسلحہ کا انتخاب کیا جو شکوہِ ملک و دیں کے لئے ناگزیر تھے۔ اس زمانے میں جب کہ ایران پر مسلمانوں کی لاشیں تڑپ رہی تھیں بلقان میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا، برطانوی استبداد پسند ایک اور مشہد اکبر کی تلاش میں تھے۔

کانپور کے مچھلی بازار میں ایک مسجد سر راہ تھی۔ ارباب اختیار کو راستہ نکالنے کی سوجھی تو اسے منہدم کر دیا۔ عوام برہنہ سر، برہنہ پا، ایک سیاہ علم کے نیچے صف ایستادہ ہوئے اور کئی سو بچّوں نے مل کر سنت ابراہیم کی تجدید کی تو ٹائلر ان کا قاتل بن گیا۔ اس کی سرکردگی میں پیدل فوج اور سوار آگے بڑھے تو خاک و خون میں تڑپتی ہوئی دو سو لاشیں نظر آئیں۔ شبلی نے اس مشہد اکبر کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ وہ لاشوں کے ہجوم میں اس درندگی اور بہیمیت سے بھی واقف تھے۔ جو مردہ جسموں کا ہسپتالوں میں صرف تجربہ کرتی ہے، جسے زندگی سے زیادہ موت اور موت سے زیادہ اس کا پیدا ہونے والا کرب عزیز تھا۔ اسی کرب نے ان کو مضطرب کر دیا تو وہ مفرطِ غم میں گلوگیر ہو گئے۔ ان کی فریاد، چالیس کروڑ انسانوں کی آواز بن کر اس برطانوی دعوے کی تکذیب کرتی رہی کہ ہمارا فرض اولیں رعایا کے مذہب کا احترام ہے ؎

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار — کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو — فیر کا حکم دیا آپ نے جب بپھرا ہجوم
یہ حقیقت بھی مگر قابلِ انکار نہیں — کہ بیک چشم زدن موت کو تھا اذنِ عموم
جا بجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک — یہ وہ صنعت ہے کہ تا حشر نہ ہوگی معدوم
واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی — آپ ظالم نہیں زنہار ، یہ ہم ہیں مظلوم

یہ واقعہ اپنی تفصیل میں کتنا دردناک ہوگا، صوبۂ متحدہ کے گورنر جیمس مسٹن کو اس سے دلچسپی نہیں تھی، وہ اس مشہد اکبر کو جامعہ اسلامیہ کی طرح تضیع کا نتیجہ سمجھ کر مسلمانوں کی ہنسی اڑاتا رہا۔ جب اس کے خادموں نے اس خونی تماشے میں ہلاک ہونے والوں کی گنتی کی تو آخری تعداد شمار سے زیادہ نہیں ہو سکی۔ دس پندرہ ہزار کے مجمع میں صرف اٹھارہ لاشیں! اکبر نے اس واقعے کے مناظر کی [illegible]

کی تو جوٹ ہر دو سے نیا مذہب پاک ہو گیا ابو الکلام آزاد نے اس تانہ قرأت پر آنسو بہائے تو شمر کی نسل مکمل کر سامنے آگئی۔ تاریخ کی سفاک آنکھوں سے ٹپکا ہوا ایک قطرۂ اشک ہر ابن زیاد کا سفینہ ڈبو گیا۔ شبلی کے دامن پر برصغیر اسلامیاں کے آنسو تھے۔ انہوں نے ان آنسوؤں کو سمیٹ کر مورخوں کے آگے ڈال دیا تو ان کا ظالم سے ظالم نقاد اُن کی سیاسی بصیرت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ان کی زندگی رنگین بھی تھی اور سنگین بھی، وہ اپنے خیالوں میں کسی عطیہ کی بدولت مسلمان تھے، اس کے باوجود ان کا جوش ایمانی "بتان کا فرگر" کی دین نہیں تھا، ان کی طرزِ فغاں خطابت سے عبارت سہی، پھر بھی اس سے تاریخ تصویر ہو جاتی ہے۔ اور انہیں ایک عظیم حقیقت نگار تسلیم کرنا پڑتا ہے

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے　　　دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خرد سال جو چپ چپ ہیں خود مگر　　　بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر　　　نیند آگئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب　　　ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ　　　مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار　　　از بس کہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم اپنا آپ کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر　　　لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا　　　جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم، آئی یہ ندا　　　ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں!

اس سراسیمگی میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک تھے۔ برطانوی استبداد نے آج مسلمانوں کی تذلیل کی تھی، کل وہ ہندوؤں کو بھی رسوا کرنے میں دریغ نہیں کرے گا۔ اس خیال کے تحت دونوں طبقوں کے زعما متحد ہو گئے تو حالات نے ایک اور رُخ اختیار کیا۔ برطانوی سیاست کے بازی گر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہم نوالہ و ہم پیالہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ آستین اور دامن کا ساتھ اپنے اندر پھوٹ کے سانپ چھپائے اپنا اثر پھیلانے لگا۔ اس داخلی اور اندرونی خلفشار نے ایک خوفناک صورت پکڑلی تو قریہ قریہ اور بستی بستی فساد کی آگ دھواں دینے لگی۔ ڈپٹی نذیر احمد، قرآن پاک کے مترجم بھی تھے توبۃ النصوح، بنات النعش، فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت کے مصنف بھی، ان کے نزدیک پیدا ہونے والی نسل کا اصل گہوارہ ماں کی گود تھی۔ انہیں خبر تھی کہ آج کی عورت کی خام کاری کل کی قوم کو خام بنا دے گی۔ ان کے کرداروں نے گھریلو موضوعات پر رفاہی موضوعات کی ترجمانی کی۔ شاعری میں ان کا رتبہ حالی اور شبلی کا ہم پلہ نہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے قوم پرستی اور وطن دوستی کے جذبات عام کرنے کے لئے اس سے موثر ترین ہتھیار سے کام لیا۔ ان کے لیکچروں کی مجلسوں اور صحبتوں سے نکل کر ہندوستان بھر میں پھیلے تو عوام نے اپنے حقیقی دشمن کو پہچان لیا ہے

کچھ نہ پوچھو آج ہم کچھ بیں کیا کہنے کو ہیں　　　قوم کو خود قوم کے منہ پر بُرا کہنے کو ہیں
الغرض اسلام پر جو کچھ کہ گزرا نیک و بد　　　اس کو ہم از ابتدا تا انتہا کہنے کو ہیں
کتنی چیزیں ہیں کہ خارج میں نہیں جن کا وجود　　　جیسے عنقا و ہما و کیمیا کہنے کو ہیں
آدمی کی عادتوں میں بھی علیٰ ہٰذا القیاس　　　الحذر الفت وہ مہر و وفا کہنے کو ہیں

۱۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو مچھلی بازار کانپور کی مسجد کی عمارت [illegible] مکمل ہوئی۔ [illegible] کا جلوس [illegible]
[illegible] تاریخ [illegible] ناآشنا ہے۔

اس کے باوجود اس کا یہ کارنامہ ایسا نہیں کہ فراموش کر دیا جائے۔ لارڈ ہارڈنگ نے عفو و درگذر سے کام لیا تو عوام گرو تعزیر کی زنجیروں میں اور بھی زیادہ کس گئے۔ اس کی عفو و درگذر ان کے استیصال کا ایک بہانہ تھی۔ ادھر قیصر جرمنی نے اپنی بڑھتی ہوئی آبادیوں کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش میں اس درجہ فوجی طاقت بہم پہنچائی تھی کہ سربیا، روس، فرانس، بلجیم، انگلینڈ اور اٹلی، آسٹریا، جرمنی، ترکی اور بلغاریہ کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یاران وفادار نے دس لاکھ ہندوستانی سپاہیوں کو موت کے جہنم میں جھونک دیا۔ ۳۶ ہزار ۶ سو ۹۶ سپاہی، شدید سردی، دلدل کی کثرت اور راستوں کی عدم واقفیت کی بنا پر سامراجی طاقتوں کا نشانہ بن گئے اور ۶۹ ہزار ۸ سو ۹۸ مجروح اور خونچکاں سپاہیوں نے ہندوستان کی راہ لی تو اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جنگ کے ختم ہوتے ہی شبلی نے ایک بار پھر ہندوستان کے تعلق سے، ملک و قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑا

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور	آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم	اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل	آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٔ غرور	دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے	تم کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور	پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا	لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

جنگِ عظیم سے پہلے انسان دوستی طبقاتی حدود میں اسیر تھی، سامراج دشمنی میں سمجھوتہ بازی کا زہر ملا ہوا تھا۔ جنگِ عظیم کے خاتمے نے قومی تحریکوں کو درمیانی طبقہ سے نکال کر عوام میں لا کھڑا کر دیا۔ اور پھر بنگال کے مشہور گوشہ نشین شاعر ٹیگور بھی شانتی نکیتن سے نکل کر عوام کے سامنے یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ انھوں نے سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں غلطی کی ہے۔ اُن کے نزدیک وہ ادب ناکام اور نامراد ہو گیا جو انسانیت سے شرابور اور حب الوطنی سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کو اپنی قدر و قیمت کا احساس ہوا تو انہوں نے ہوم رول کی تحریک عام کی، ان کی پیشوائی کو تلک اور بسنت آگے بڑھے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر چکبست نے آوازۂ قوم لکھی ہوم رول کا مطالبہ ایسا آوازۂ قوم تھا جس کے نقارۂ خدا ہوتے دیر نہیں لگی ؎

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار	ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابرِ گوہر بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار	ہوئی ہیں خاک کے پردہ میں ہڈیاں بیدار

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

ہیں آجکل کی ہوائیں وفا کی بربادی	سنے جو کوئی تو سارا چمن ہو فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے عادی	اڑا ہے باغ سے زیور کے رنگِ آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بکھر نہیں سکتے
ہمارے پھول ابھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی	ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی	چلے ہیں سب زیارت وفا کے سودائی

وطن سے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفق پہ نیا آفتاب نکلا ہے!

۱۹۱۹ء میں لارڈ چیمسفورڈ نے رولٹ ایکٹ منظور کیا تو اس کے خلاف ہندوستان گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ ستلج، چناب، راوی، بیاس اور جہلم کی سرزمین آگ اور خون اگلنے لگی۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، سب ماہیا کی خوبصورت وادیوں سے نکل کر انگریزوں کی طرف لپکے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، اور لائلپور کے اضلاع میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ مارشل لا اپنی نوعیت میں سخت ہونے کے باوجود آزادی کے ابھرتے ہوئے جذبے کو شکست نہیں دے سکا۔ اس ابھرتے ہوئے جذبے کی ہر تصویر ولولہ انگیز اور حوصلہ بڑھاتی۔ نتیجہ میں انگریزوں ہی پر قاتلانہ حملے نہیں ہوئے بلکہ کئی مقامات پر ریلوے کا مواصلاتی نظام بھی بگڑ گیا۔ بدترین مارشل کا بھیانک ترین انجام جو بھی ہو کم تھا۔ ڈوائر نے جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ اکٹھا کرنے والوں کو موقع دیئے بغیر گولی چلا دی۔ اس کا حقِ نمک ادا کرنے والے وقائع نگار، دو ہزار بے گناہوں کی ہلاکت کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس عوام دشمن ڈوائر نے اس سے کئی گنا زائد آدمیوں کی جان لی تھی۔

ظفر علی خاں کو دکن کی داستانیں حیدرآباد لے گئی تھیں، وہ محبوب علی خاں نظامِ ششم کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے الزام میں، چوبیس گھنٹے کی مدت میں نکالے گئے تو پنجاب ان کے سامنے عالم آشوب بن کر صورت پذیر ہو گیا۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ، انتہائی مہلک ہتھیاروں سے مسلح سامراج کے مقابلے میں ایک محکوم قوم کی ابھرتی ہوئی تحریک آزادی کی لہر تھا۔ انہوں نے اس کو اپنی شاعری کا طاقت ور اور صحت مند لہجہ دیا تو اس میں سیلاب کا پھیلاؤ اور آبشاروں کی روانی آ گئی۔ شرر سے ستارے، ستاروں سے آفتاب پیدا کرنے کی خواہش نے بیداریٔ پنجاب کو نوشتۂ تقدیر کر دیا۔ قومی سماجی اور سیاسی آزادی کے جو رجحانات ذہن کے پس منظر میں دبے ہوئے تھے۔ جلیانوالہ باغ کے حادثے نے ان کو پوری قوت کے ساتھ اچھال دیا۔

توانا ؤں کے بس میں ہے سراپائے حقارت سے
کروڑوں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا

دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینہ میں
کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خون کے رُلوانا

ہے جن کے دل میں آزادی کی دھن ان نوجوانوں کو
وطن کے عشق کی پاداش میں سُولی پہ لٹکانا

بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی خاکِ اٹک کے پار خاک و خوں میں تڑپانا

ملوکیت پرستوں کے لئے یہ سب کچھ آساں ہے
مگر دشوار ہے قانونِ قدرت کا بدل جانا

زوال ان سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے جن کا ہے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہو جس کو ٹکرانا

ظفر علی خاں کی شاعری 'زمیندار' کا اداریہ نہیں تھی۔ ان کے تذکرہ نویس ان کی صحافت ہی کو سامنے رکھ کر ان کی شخصیت کو سہ کالمی سرخیوں میں تو کھینچ لیتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کو جانچتے وقت ان کی شاعری کو نظر انداز کر دینا ہمیں تو عجیب ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو انگریزی سامراج کے خلاف جنگ کرنے کا موثر ترین ہتھیار سمجھتے تھے۔ انھوں نے شہیدان پنجاب کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تو ان کی شخصیت کو تنقیدی لفظوں سے مجروح کرنے والے محتسب خاموش ہو گئے ؎

زندہ باد اے انقلاب اے شعلۂ فانوس ہند
گرمیاں جس کی فروغِ مشعلِ جاں ہو گئیں

بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی تاریکیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں

جن بلاؤں سے کہ رہتے تھے سہمے صبح و شام ہم
تیرے تنتے ہی وہ انگریزوں کی دہاں ہو گئیں

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں

مرحبا اے گرفتارانِ بیدادِ فرنگ
جن کی زنجیریں خروشِ افزائے زنداں ہو گئیں

زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے　　جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں

بھی نہیں، ان کی طنز و تعریض سے وہ لوگ بھی نہیں بچ سکے جن کی قوم دوستی پر ذرا سا بھی شبہ کیا جا سکتا ہو۔ ظفر علی خاں اپنی زندگی میں پکے مسلم قوم پرست اور ایک مخلص آزادی نواز تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی قوم کا ہر شخص ان ہی کی طرح سچا قوم پرست اور آزادی نواز ہو، انھوں نے امرتسر کے ایک خواجۂ بزرگ کو کس کس انداز سے مخاطب کیا ہے۔ کیا اس خواجۂ بزرگ کے لباس میں وہ قوم فروش افراد نظر نہیں آتے جن کے ہاتھ جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کے خون میں ڈوبے ہوئے نہیں تھے؟ کیا یہ وہی خواجۂ بزرگ نہیں ہے، جس کی نسل کوڑیوں کے نام سے پھلتی اور پھولتی جا رہی تھی؟

میں نے امرتسر میں اک دن اپنے خواجہ سے کہا　　پیٹ کے بل رینگیے بندہ پرور آپ بھی
ایک تہہ آماس کی تا فربہی پر جائے چڑھ　　کھائیے ہر روز صبح و شام ہنٹر آپ بھی
ناک سے کچھ دن زمیں پر کھینچتے رہیے لکیر　　پھیریے کوچی سفیدی کی بدن پر آپ بھی
بعد مغرب جائیے مسجد کو اور اس جرم میں　　پیٹھ پر کھچوا لیجئے چابک سے سطر آپ بھی
لیجئے جا کر جیل میں اور کھائیے ارہر کی دال　　میہماں بن جائیے ذرا سرکار کے گھر آپ بھی
پھر یہ کہئے مارشل لا حشر تک قائم رہے　　ورنہ ہوں گے منکر جنرل ڈوائر آپ بھی

اقبال نے وطن دوستی اور سامراج دشمنی کے جذبے کو اپنی شاعری کا آغاز بنایا تھا۔ ان کے یہاں ماضی پرستی بھی ہے اور اصلاح پسندی بھی، وہ جلیانوالہ باغ کے حادثے پر خود آنسو بہانے کی بجائے کسی زائر چمن سے نم پاشی کی توقع کرتے ہیں تو ان کا فکری تضاد پوری شدت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے غالباً اسی باعث ظفر علی خاں نے "انگریز کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال" کہہ کر ان پر چوٹ کی تھی، اس چوٹ کا جواب اقبال سے ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے جلیانوالہ باغ کے حادثے پر وہ ہی شعر لکھے ہیں ؎

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ پاک　　غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم　　تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

——— ◆ ◆ ◆ ———

"اُردو نامہ" کے خریداروں کی خدمت میں.

عرض ہے کہ ہر شمارہ پتے کی پوری احتیاط کے ساتھ ۱۵ پیسے کے ٹکٹ لگا کر روانہ کیا جاتا ہے جن حضرات کو نہ ملے وہ اپنے ڈاک خانے کو اس طرف متوجہ کریں اور اگر بذریعہ رجسٹری منگانا چاہیں تو فی پرچہ ۴۰ پیسے کے حساب سے پیشگی رقم ہمارے پاس جمع کرا دیں۔ پرچے کا معمولی محصول بدستور ہم ادا کریں گے۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

منیجر

——— ◆ ◆ ◆ ———

حسرت موہانی کی بعض غزلوں کا ابتدائی متن

سید ابو الخیر کشفی

حسرت موہانی نے اردو غزل کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دیا ، حسرت نے معاملات غزل کے سوا بنیادی طور پر کسی اور چیز کو اپنی غزل کا سہارا نہیں بنایا اور بقول رشید احمد صدیقی غزل گوئی خواہ کوئی کرتا رہے، غزل کا معیار حسرت ھی رھیں گے. ان باتوں سے شاید ھی کسی کو اختلاف ھو اور یہ بات بھی بڑی حد تک مسلم ھے کہ حسرت کی ذات میں اردو غزل گوئی کی دو صدیوں نے اپنے آپ کو دھرایا ھے اور حسرت کی آواز میں ھماری غزل نے اپنے خط وخال کا جائزہ لیا ھے. حسرت کی شاعری کو جس نے بھی "انتخابی شاعری" کہا ھے وہ مرد معقول ایک بڑی حقیقت کا اظہار کر گیا ھے.

حسرت موھانی ایک بالغ اور پختہ تنقیدی شعور کے مالک تھے ، اگر وہ شاعر نہ بھی ھوتے تو اپنے انتخاب سخن کی وجہ سے زندہ رھتے . سید سجاد حیدر یلدرم نے خافی خاں کے نام سے حسرت کا ایک بہت ھی خوبصورت خاکہ لکھا تھا ، جس سے ان کے زمانۂ طالب علمی پر بڑی دلچسپ روشنی پڑتی ھے . اسی خاکہ میں کسی مقام پر انہوں نے لکھا ھے کہ زمانۂ طالب علمی میں جب علی گڑھ کے طالب علم ھاسٹل اور بیت الطعام کی مانیٹری کے لئے سرگرداں رھتے تھے ، حسرت موھانی اساتذہ کے قدیم دیوانوں کی تلاش میں منہمک رھتے اور کتنے ھی اساتذہ کے دواوین کی خشک ھڈیوں پر انہوں نے 'قم باذنی' پڑھ کر انہیں زندہ کر دیا. وہ شروع ھی سے اردو شاعری کے عاشق تھے، شاعری کے اسالیب ، محاسن اور معائب کا مطالعہ بڑی حد تک زمانۂ طالب علمی میں مکمل ھوچکا تھا اور "متروکات سخن" و "معائب سخن" کے کئی حصے انجمن اردوئے معلیٰ کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے . حسرت کی شاعری کا آغاز بھی اسکول کے زمانے ھی سے ھوچکا تھا . اساتذۂ قدیم اور فن شاعری کے اس گہرے مطالعے کا سب سے اھم نتیجہ یہ مرتب ھوا کہ حسرت نے بعض ایسے شعرا کے کلام کو درجۂ تکمیل تک پہنچایا جو ادھورے تھے. رنگ کا احساس قدیم شاعروں میں مصحفی کے یہاں شدت سے ملتا ھے ، اسے حسرت نے مکمل کیا ــــ حسرت کی ادبی شخصیت کا اھم ترین پہلو یہ ھے کہ روایات کے سائے میں بھی ان کی شخصیت ابھری، حسرت کے یہاں رنگ مصحفی بھی ھے اور

اسلوب جرأت و انشا بھی ـ ہر رنگ ان کی ذات میں چھن کر سامنے آتا ہے اور یوں حسرت کسی کی صدائے بازگشت نہیں ہیں : وہ خود ایک مکمل آواز اور لہجہ ہیں ـ اساتذہ ٔ قدیم اور فن شعر سے والہانہ وابستگی کا دوسرا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ حسرت نے اپنے زمانہ ٔ طالب علمی اور آغاز شاعری کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی اور اس میں ترمیم و اصلاح کی .

حسرت ہماری ادبی تاریخ کا ایک باب بن چکے ہیں . بعض اہم شاعروں کے کلام کے ابتدائی متن پر ہمارے یہاں کچھ نہ کچھ ضرور کام ہوا ہے : باالخصوص کلام اقبال پر ـــ اس نقطہ ٔ نظر سے حسرت کے کلام کا کسی نے مطالعہ نہیں کیا ہے . پرانے رسالوں اور اخباروں کے فائلوں سے حسرت کی بعض غزلوں کے ابتدائی متن (یا ابتدائی صورت) تک میری رسائی ہوئی ہے . اس تحریر کا مقصد اپنے مطالعے میں آپ کو شریک کرنا ہے .

حسرت ان چند غزل گو شعرا میں سے ہیں جن کے ذہنی ارتقا کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہا جاسکتا ہے . ان کی کلیات کے مختلف حصے زندگی کے مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہیں . حسرت نے کلیات کے ہر حصہ کی تاریخ کو ہمارے لئے محفوظ نہیں کیا بلکہ ان کی غزلوں کی تصنیف یا اشاعت کی تاریخیں بھی محفوظ ہیں. کہیں کہیں کلیات میں غزلوں کی تاریخ تصنیف یا تاریخ اشاعت یا رسالہ کے نام کے اندراج میں حسرت سے سہو ہوگیا ہے . ان کی غزلوں کے ابتدائی متن سے بعض ایسی اغلاط کی تصحیح بھی ہوجاتی ہے . مزید برآں بعض نئے وضاحتی اشارے بھی دستیاب ہوتے ہیں. ایک بات اور عرض کردوں کہ میں نے تقابلی مطالعے کے لئے کلیات حسرت مطبوعہ کتاب منزل لاہور کو اپنے سامنے رکھا ہے ، کیونکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس نسخہ ٔ کلیات کا حصول آسان ہے . حسرت کے تیرہ دیوانوں کو حاصل کرنا دشوار ہے. مطالعہ میں تاریخی ترتیب سے کام لیا گیا ہے .

مکرمی جناب مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی۔ اے۔
اڈیٹر "اردوئے معلی" کانپور
کے
دست وقلم کی لکھی ہوئی تحریر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقیر حسرت موہانی

۲

مولانا حسرت موہانی کی مندرجۂ ذیل غزل ضمیمۂ الف "کلیات حسرت" میں موجود ہے :

آشنا ہیں جلوہ ہائے ساقیٔ مخمور سے
کیا غرض ہم کو بیان ماجرائے طور سے
(کلیات صفحہ ۲۰۲)

اس ضمیمہ کی "عبارت خاتمہ" میں مولانا حسرت لکھتے ہیں ۔

"طبع اول کے دیباچہ میں بیان ہوچکا ہے کہ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۲ء تک کی شاعری کا ایک بڑا مجموعہ نظموں، قصیدوں، غزلوں اور نظم انگریزی کے ترجموں کی شکل میں راقم حروف کے پاس موجود ہے ، جس کی نسبت گمان یہ تھا کہ نظر ثانی کے بعد قابل اشاعت ہوجائے گا. لیکن بعدمیں کچھ تو اس خیال سے کہ ابتدائی کلام کی اصلاح و ترقی کی کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق قرار پائے گی اور کچھ اس لحاظ سے کہ رفتہ رفتہ راقم حروف کی طبیعت نے اپنے لئے اصناف سخن میں سے غزل کو اپنے حسب حال پاکر منتخب کرلیا ہے، اس کل مجموعہ خرافات کو یک قلم نظرانداز کردیا، البتہ چند غزلیں ضرور رہنے دیں، لیکن ان کو بھی اپنے ابتدائی لباس میں بلا اصلاح چھوڑ دیا تاکہ اہل نظر کو ان کے مطالعہ سے راقم حروف کے مذاق سخن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوسکے"۔

حسرت کی یہ تحریر ۲ اپریل ۱۹۱۶ء کی ہے.
حسرت کے نزدیک ان کی حقیقی شاعری کا آغاز ۱۹۰۳ء سے ہوا اور اس سے پہلے کے کلام کو وہ محض ایک تجربہ یا مشق سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے . حسرت نے ضمیمہ الف کی غزلوں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو "اپنے ابتدائی لباس میں بلا اصلاح چھوڑ دیا" لیکن ہمیں متذکرہ بالا غزل میں بعض تبدیلیاں نظر آتی ہیں . یہ غزل مخزن، لاہور کے شمارۂ دسمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ مخزن میں گیارہ شعر ہیں اور کلیات میں دس . یہ شعر کلیات میں موجود نہیں ہے:

کم نگاہی کب تلک ہاں آج اے پیر مغاں
بے خبر کر دے عطائے ساغر معمور سے

مطلع اور ایک شعر میں بھی حسرت نے بعد میں تبدیلی کی:

آشنا ہیں جلوہ ہائے عارض پرنور سے
کیا غرض ہم کو بیان ماجرائے طور سے
مخزن

آشنا ہیں جلوہ ہائے ساقیٔ مخمور سے
کیا غرض ہم کو بیان ماجرائے طور سے
کلیات

ہم نشیں وے کیا ہوئے آغاز الفت کے مزے
پھر رلا دے اس زمان لطف کے مذکور سے
مخزن

ہم نشیں وہ کیا ہوئے آغاز الفت کے مزے
پھر رلا دے اس زمان عیش کے مذکور سے
کلیات

اس غزل کا مطلع ثانی یہ ہے :

رات بھر ہوتی رہیں باتیں دل رنجور سے
کچھ نہ پوچھو شغل ناکام شب دیجور سے

مخزن میں اس شعر کے نیچے قوسین میں لکھا ہے (ترجمہ: "از شغل ناکام شب دیجورمپرس") ـــ حسرت کے ابتدائی دور میں ہمیں ان کے ذہن پر فارسی کا خاصا تسلط اور غلبہ نظر آتا ہے . ان کی

کئی نظموں میں فارسی کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں. اسی کا ایک پہلو فارسی اشعار کا ترجمہ ہے. علاوہ بریں حسرت اردو کے اساتذہ قدیم کے دیوانوں کے والہانہ مطالعہ میں کھوئے ہوئے تھے ، جس کا اندازہ "وے" سے ہوتا ہے .

دیوان اول میں حسرت کی غزل ہے :

اضطراب عاشقی پھر کارفرما ہوگیا
صبر میرا ناشکیبائی سراپا ہوگیا
(کلیات صفحہ ۷)

یہ غزل مخزن، دسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی اور مقطع کے بغیر — یہ مشہور مقطع حسرت نے بعد میں کہا :

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

دیوان اول میں حسرت کی مشہور غزل ہے :

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
(کلیات صفحہ ۳۲)

یہ غزل مخزن، نومبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی : کلیات اور مخزن دونوں میں گیارہ گیارہ شعر ہیں، لیکن کلیات میں مخزن کے ایک مطبوعہ شعر کو نکال کر ، نئے شعر کا اضافہ کیا گیا ہے. کلیات میں یہ نہیں ہے :

مانا کہ نہیں تجھ کو کچھ پاس وفا ، لیکن
دنیا میں کوئی شے ہے اے یار مروت بھی

ذیل کا شعر مخزن میں نہیں ہے ۔ گویا یہ بعد کا اضافہ ہے :

دکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمت بے تابی
یاد نالۂ مضطر کی جب مجھ میں ہو قوت بھی

ایک شعر میں حسرت نے بعد میں ترمیم کی ہے :

دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر
اے صاحب مےخانہ، کچھ لطف و عنایت بھی
مخزن

دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر
اے ساقیٔ جاں‌پرور، کچھ لطف و عنایت بھی

مخزن میں غزل پر نوٹ بھی ہے ۔ "جو الہ آباد سنٹرل جیل میں بزمانۂ قید لکھی گئی ."

اس غزل کا مقطع ہے :

ہیں شاد ، صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں، اقبال بھی، وحشت بھی

حسرت شعر و ادب اور زبان کے بڑے سخت گیر نقاد تھے. اردوئے معلیٰ میں انہوں نے حالی، اقبال اور چودھری خوشی محمد ناظر وغیرہ کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھے اور ان بزرگوں اور ہم‌عصروں کی زبان کی غلطیوں کی نشان دہی کی ، لیکن حسرت داد دینے اور اعتراف کمال کے باب میں کسی سے پیچھے نہ تھے . انہوں نے اپنے مشہور ہم‌عصروں کے علاوہ کم اہم لیکن خوش گو ہم‌عصروں کی تعریف بھی کشادہ قلبی سے کی ہے . آج شاد ، صفی ، شوق ، اقبال اور وحشت کے نام ان کے کلام کی بنا پر زندہ ہیں اور یہ نام زندہ رہیں گے لیکن وفا ، ضامن اور محشر وغیرہ کے نام حسرت کے اشعار میں پڑھ کر کتنے ہی لوگ ان شاعروں کے بارے میں کچھ جاننے کی تمنا کرتے ہوں گے اور شاید بہتوں کو ان کے نام بھی معلوم نہ ہوں. مخزن میں ایک نوٹ اسی مقطع کے ساتھ موجود ہے جس میں ان شعرا کے اسمائے گرامی درج کردئے گئے ہیں. نوٹ یہ ہے:

"سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی ، سید علی نقی صفی لکھنوی، احمد علی صاحب شوق لکھنوی، حکیم عبدالہادی وفا رامپوری، حضرت ضامن گنتوری ، مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی ، پروفیسر اقبال و رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ ۔"

دیوان اول میں حسرت کی غزل ہے :

راحت کو اضطراب سے مقرون کردیا
ان سرخ پوشیوں نے تو دل خون کردیا
(کلیات صفحہ ۱۱)

دیوان اول میں "۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء" تک کی غزلیں شامل کی گئی ہیں . سر ورق پر اس کی وضاحت موجود ہے ، لیکن یہ غزل 'مخزن ، فروری ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی . ممکن ہے کہ دو تین سال تک یہ غزل غیر مطبوعہ رہی ہو . . . کلیات میں چار شعر ہیں اور مخزن میں پانچ . ذیل کا شعر کلیات میں نہیں ہے .

کیا کہئیے ان سواعد رنگیں کی دلکشی
خوبی نے جن کی ، عقل کو مجنون کردیا

مخزن میں ایک شعر اس طرح چھپا ہے:

اب دل ہے اور فراغت حیرت کہ یاس نے
تکلیف انتظار سے مصئون کر دیا

مصئون کے اجنبی ، غیر مانوس اور غریب لفظ کے معنی بھی مخزن میں درج کئے گئے تھے. بعد میں حسرت نے دوسرے مصرع میں ترمیم کے ذریعہ اس لفظ کو بدل ھی دیا. کلیات میں دوسرا مصرع یوں ہے :

تکلیف انتظار سے مامون کر دیا

دیوان اول میں مولانا کی ایک غزل ہے :

عہد مستی کے اب کہاں وہ رنگ
ساغر بادہ ہے ، نہ کاسۂ بنگ
(کلیات صفحہ ۲۲)

یہ غزل زمانہ مارچ ۱۹۱۰ میں شائع ہوئی اوراس پر یہ نرٹ درج تھا:

—" الہ آباد سنٹرل جیل میں قید فرنگ کے آخری زمانہ میں لکھی گئی". مقطع میں مولانا نے یہی بات کہی ہے.

بڑھ چلا جوش آرزو حسرت
ختم ہونے کو آئی قید فرنگ

ایک مصرع میں معمولی سا رد و بدل ہے

خوب تر تھی وہ عقل و عشق کی جنگ	زمانہ
خوب تر تھی وہ عشق و عقل کی جنگ	کلیات

دیوان دوم میں حسرت کی غزل ہے

پیرو عشق رہنما نہ ہوا
زاہد خشک با خدا نہ ہوا

یہ غزل الناظر جنوری ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی لیکن حسرت نے دیوان اور کلیات میں اخبار "اقدام" کلکتہ ۱۹۱۵ء کا حوالہ دیا ہے . گویا " الناظر" نے یہ غزل " اقدام " سے نقل کی یا پھر حسرت نے دو اشعار کا اضافہ کر کے یہ غزل "الناظر" کو بھی بھیجی کیونکہ کلیات میں اس غزل میں ۱۳ اشعار ہیں اور "الناظر" میں ۱۵ء؛ یہ دو شعر کلیات میں نہیں ہیں :

ہجر میں جان مضطرب کو سکون
آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا

رہ گئی تیرے فقر عشق کی شرم
میں جو محتاج اغنیا نہ ہوا

مولانا کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے

سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو، مرجانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

اس غزل پر حسرت نے لکھا ہے۔ "روزانہ اخبار ہمدم لکھنؤ ۱۹۱۶ء"۔ غالباً حسرت سے سہو ہوگیا۔ یہ غزل جون ۱۹۱۶ء کے "الناظر" میں شائع ہوئی تھی اور اس پر تاریخ تصنیف یوں درج ہے۔ "بتاریخ ۱۹ اپریل ۱۹۱۶ء۔ دراثنائے راہ للت پور نوشتہ شد"۔ کلیات میں اس غزل کا ایک مصرع یوں ہے:

فرقت یار میں گھنگھور اٹھی ہے جو گھٹا

الناظر میں یہ مصرع یوں ہے:

فرقت یار میں بے وقت اٹھی ہے جو گھٹا

دیوان دوم کی ایک اور غزل ہے:

یاس کا دل پہ کچھ اثر نہ ہوا
قصۂ شوق مختصر نہ ہوا
(کلیات صفحہ ۵۹)

یہ غزل نومبر ۱۹۱۶ء کے الناظر میں شائع ہوئی تھی۔ کلیات میں ۱۹ شعر ہیں اور الناظر میں ۲۰۔ الناظر میں دو شعر زائد ہیں جو کلیات میں موجود نہیں۔ اور کلیات میں ایک نیا شعر ہے جو الناظر میں نہیں۔ یوں ۱۹ اور ۲۰ کا معمہ حل ہوجاتا ہے۔

الناظر کے جو شعر کلیات میں نہیں ہیں، وہ یہ ہیں:

آہ اس التفات ناز کی یاد
وہ جو پھر بارہ دگر نہ ہوا

آگئے تم جو بر سر بالیں
میں بھی آمادۂ سفر نہ ہوا

اور کلیات کا یہ شعر "الناظر" میں نہیں ہے

اس نے وعدہ کیا، یہی ہے بہت
شکوہ کیوں ہو اگر وفا نہ ہوا

اس غزل کی بعض اور تبدیلیاں ملاحظہ ہوں۔

صرف عصیاں ہوا وہ حصۂ عمر
جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

الناظر

صرف عصیاں ہوا وہ لحظۂ عمر
جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

کلیات

تاب نظارۂ دگر نہ ہوئی
حسن پر غلبۂ نظر نہ ہوا

الناظر

تاب نظارۂ دگر نہ رہی
حسن پر غلبۂ بصر نہ ہوا

کلیات

ہے جہاں مدفن شہید وفا
آپ کا وہاں کبھی گزر نہ ہوا

الناظر

ہے جہاں مدفن شہید وفا
واں کبھی آپ کا گزر نہ ہوا

کلیات

دیوان دوم میں مولانا حسرت کی یہ غزل شامل ہے

شکوۂ عشق جو ہم سے کسی عنواں نہ ہوا
حشر میں بھی وہ جفاکار پشیماں نہ ہوا
(کلیات صفحہ ۶۰)

اس غزل کی تاریخ اشاعت کلیات میں یوں درج ہے۔ "رسالہ خیال بھاگلپور، اگست ۱۹۱۶ء"۔ یہ غزل خیال کے شمارۂ اگست میں بلکہ شمارۂ ستمبر میں شائع ہوئی تھی۔ خیال کے ایڈیٹر "حکیم شاہ ابوالحسن شفیق حیدرآبادی تھے"۔ خیال کی مطبوعہ غزل میں ۷ شعر ہیں اور کلیات میں ۶۔ یہ شعر کلیات میں نہیں ہے۔

حیف اس آنکھ پہ جو تیری شناسا نہ ہوئی
اس پہ افسوس ہے جو دل ترا خواہاں نہ ہوا

حسرت نے اس غزل میں بعض اور تبدیلیاں بھی کیں:

کامیابی نہ ہوئی اہل نظر کو پھر بھی
روئے خورشید ہوا، وہ رخ تاباں نہ ہوا
خیال

کامیابی نہ ہوئی اہل نظر کو بھی نصیب
روئے خورشید ہوا، وہ رخ تاباں نہ ہوا
کلیات

دشمن زہد ہوئے حسن بتاں کے بندے
کفر الفت پہ کبھی قبضۂ ایماں نہ ہوا
خیال

دشمن زہد ہوئے حسن بتاں کے بندے
کفر الفت پہ کبھی غلبۂ ایماں نہ ہوا
کلیات

دیوان سوم کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

دام گیسو میں ترے اک دل ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے
کلیات صفحہ ۱۱۶-۱۱۵

یہ غزل رسالہ خیال اپریل، مئی ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ کلیات میں ایک شعر یوں ہے:

کچھ مرے دل ہی سے مخصوص نہیں لذت غم
خوش اسی حال میں جوہر بھی ہے آزاد بھی ہے

خیال میں یہ شعر یوں شائع ہوا تھا:

کچھ مرے دل ہی سے مخصوص نہیں لذت غم
خوش اسی چیز سے مجنوں بھی ہے فرہاد بھی ہے

حسرت ان دنوں قید فرنگ میں تھے۔ خیال میں ان کی غزل پر یہ نوٹ درج ہے۔ "مرسلہ بیگم صاحبہ حسرت" اسی لئے حسرت نے جوہر و آزاد کو وقتی طور پر مجنوں و فرہاد کے اشاروں میں چھپا دیا تھا۔

دیوان چہارم میں ایک غزل ہے:

نزاد آرزو ہے، مایۂ ناز تمنا ہے
مرے دل سے کوئی پوچھے کہ تو اے فتنہ گر کیا ہے
کلیات

یہ غزل "خیال" اگست ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی تاریخ تصنیف ۱۸، ۱۹ جنوری ۱۹۱۷ء ہے اور یہ فیض آباد جیل میں کہی گئی تھی: دو شعروں میں حسرت نے بعد میں ترمیم کی:—

مٹانے سے بھی یاد اس نوک مژگاں کی نہیں مٹتی
عجب کانٹا لگا تھا، آج تک دل میں کھٹکتا ہے
خیال

مٹانے سے بھی یاد اس نوک مژگاں کی نہیں مٹتی
عجب کانٹا تھا یہ جو آج تک دل میں کھٹکتا ہے
کلیات

گرفتار وفا رکھنے کی چالوں پر نہ جا حسرت
وہ دلداری جو پھر کرتے ہیں یہ بھی ایک دھوکا ہے
خیال

گرفتار وفا رکھنے کی چالیں ہیں، سمجھ حسرت
وہ دلداری جو پھر کرتے ہیں یہ بھی ایک دھوکا ہے
کلیات

حضرت سحر

عنبر چغتائی

نحیف الجثہ ، کشیدہ قامت ، لانبا چہرہ، گندمی رنگ، داڑھی نہ زیادہ چھوٹی نہ بڑی، عمامہ صندلی ، ملاگیری یا اگرئی رنگ کا ململ کا کرتہ ، اونچی شروانی، تنگ مہری کا پاجامہ، سلیم شاہی جوتہ یا گرگابی، کم سخن، مرنجاں و مرنج ، خلیق و با مروت، مہمان نواز، عجز وانکسار کے خوگر، لیکن انتہائی خوددار — یہ تھے حضرت سحر بھوپالی . غدر کے زمانے (۱۸۵۷ء) میں پیدا ہوئے اور امن زمانے (۱۹۱۸ء) میں انتقال فرما گئے — لیکن بقول حکیم الامت یہ لوگ صرف نظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں، فنا نہیں ہوتے. میرے والد بزرگوار نے میرے وجود سے پہلے انہیں دیکھا ہے ، ان سے کلام بھی سنا ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آج بھی ہماری بزم میں موجود ہیں یا ابھی ابھی اٹھ کر گئے ہیں، اور پھر آنے والے ہیں — وہ دیکھیے دوزانو بیٹھے آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر غزل پڑھ رہے ہیں، نرت اور ایکٹنگ تو ایک طرف، نظر بھی نہیں اٹھاتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کلام کی کیفیت میں کھوئے ہوئے ہیں، اور کیا مجال کوئی متنفس ایسا ہو جو ہمہ تن گوش نہ ہو ! غزل ختم ہوتے ہی حضرت امیر مینائی نے آواز دی "میں پہچان گیا ، آپ سحر بھوپالی ہیں ، یہاں میرے پاس تشریف لے آئیے !"

سحر مرحوم کو ذاتی شرافت کے ساتھ ساتھ موروثی نجابت بھی عطا ہوئی تھی. ان کے اجداد سردار دوست محمد خان بانیٔ ریاست بھوپال کے دوش بدوش افغانستان سے تشریف لائے تھے اور سپہ گری پیشہ کرتے تھے. انھوں نے بھی اس زمانے کے علوم درسی کے علاوہ خوشنویسی، شہسواری اور نشانہ اندازی میں کمال پیدا کیا. سحر مرحوم کو عہدۂ نظامت (کلکٹری) کے لئے انتخاب کیا گیا، لیکن ملازمت میں کچھ تو غلامی کا احساس اور علمی ذوق کی تکمیل کی خاطر انکار کردیا. حیدرآباد سے میر محبوب علی خاں بہادر (نظام حیدرآباد) نے طلب فرمایا، لیکن لطائف الحیل سے ٹال گئے، اور آخر عمر تک سرکار بھوپال سے جو منصب ملتا تھا، اسی پر قانع رہے.

کچھ عرصے تک مختلف جگہوں پر اپنی پوری شان اور وضعداری سے شریک مشاعرہ ہوتے

رہے، لیکن پھر سوچا، چھپنے میں جو لطف ہے، نمایاں رہنے میں نہیں، چنانچہ کافی عرصے تک فقیرانہ لباس میں سیاحت کرتے رہے. صندلی یا گرئی احرام باندھے ہیں اور سفر جاری ہے. پرنس سلیمان قدر کے ہاں جا پہنچے. ارتجالاً ایک قصیدہ پڑھا، انہوں نے خوش ہوکر انعام دینے کا ارادہ کیا. آپ نے ایک قہقہہ لگایا، اور راجہ تصدق حسین کے ہاں جا پہنچے۔ لکھنؤ سے پہنچ گئے دھلی، نواب احمدخاں نیر کے رو برو قصیدہ پڑھ کر سب کو محو حیرت بنا دیا، اور وہاں سے بھی چل دئے. کافی سیاحت کے بعد بالکل خانہ نشین ہو گئے، اور پھر لحد گزیں.

ابتداً میں کچھ دن منیر شکوہ آبادی سے تلمذ رہا اور پھر نامی خیر آبادی سے. انہی کے مشورے سے سراج کے بجائے سحر تخلص کیا. یہ استادی و شاگردی بھی برائے نام ہی سی رہی. وہ خود اتنے ذہین و طباع واقع ہوئے تھے کہ مشاعرے کی غزلیں اکثر راستے میں کہتے، اور مشاعرے میں نظرثانی کرکے سنادیتے تھے. ان کے معاصرین کے قول کے مطابق وہ شعر اتنی تیزی سے کہتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو جلدی میں خط لکھ رہے ہیں. شاگردوں کی اصلاح کا بھی عجیب طریقہ تھا: بہت سے شاگرد بیٹھے ہیں، ہر ایک نے ایک ایک شعر سنا دیا، آپ بیٹھے اپنے کسی دوست سے باتیں کررہے ہیں، حقے کا دور چل رہا ہے، باتیں کرتے کرتے ایک کی طرف متوجہ ہوئے "ہاں میاں تم اس شعر کو یوں بنالو، اور تم یوں! — اور میرے خیال میں آپ کا شعر یوں ٹھیک رہے گا!"

خود اپنے کلام کی طرف سے بےانتہا بےپروا رہے. پرچے پر غزل لکھی اور ایک طرف ڈال دی: ایک مرتبہ کافی غزلیں جمع ہو گئی تھیں، لیکن ایک دن ان کی بیگم کو ان غزلوں پر رحم آگیا، سوچا: اتنی بہت سی ردی پھنکوائی ہوئی تو فضول ضائع ہوگی، اور اللہ رسول کے نام کی بھی بےادبی ہوگی، نوکرنی کو حکم دیا کہ "انہیں گلاکر ٹوکریاں بنا دے!" لیجیے وہ جواہر پارے جو برسوں میں جگر لخت لخت کی طرح جمع کئے گئے تھے، ٹوکری کی ردی بن گئے. پھر ان کے بھانجے نے احتیاط کے ساتھ ان کا کلام فراہم کرنا شروع کیا، جو غزل جناب سحر کہتے وہ صندوق میں مقفل کرتے جاتے. وہ کسی وجہ سے باہر چلے گئے: کچھ دن کے بعد واپس آکر صندوق جو کھولا تو اس کا ہر پرچہ دیمک کی نذر ہوچکا تھا. اس کے بعد کا کلام ایک نوجوان سید حامد علی نے بڑی کوشش و کاوش سے فراہم کیا، لیکن ان کی دفعتہً موت کے ساتھ کلام بھی نہ جانے کہاں تلف ہو گیا! پھر تو وہ اپنے کلام کی طرف سے اور بھی بےنیاز سے ہو گئے.

جب نواب سرراس مسعود (مسعودجنگ بہادر) مرحوم وزیر ریاست ہوکر بھوپال تشریف لائے تو ان کی موروثی اور فطری شرافت و علم دوستی نے حسب عادت اہل کمال کی جستجو شروع کردی. اتفاق سے بھوپال کے اہل کمال حضرات میں پہلا قرعہ حضرت سحر کے نام پڑا، اور اس کی تقریب یہ ہے کہ سر راس مرحوم ایک سماع کے جلسے میں

تشریف رکھتے تھے، مطرب اداشناس تھا، اس نے سحر مرحوم کی یہ غزل چھیڑ دی۔

سینے میں دل ہے، دل میں داغ، داغ میں سوز و ساز عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں، پردہ نشیں کا راز عشق

بس تڑپ ہی تو گئے، قوال کو ایک طرف بلا کر پوچھا "بھئی یہ کس کی غزل ہے؟" اس نے ہاتھ باندھ کر کہا "حضور یہ بھوپال ہی کے ایک استاد سراج میر خاں سحر کی ہے۔" اس وارفتہ علم و ادب نے تہیہ کرلیا کہ کچھ ہو سحر کا دیوان ضرور مرتب ہوگا! چنانچہ جہاں تک مجھے علم ہے نواب مرحوم نے غزلیں تو غزلیں، حضرت سحر کے ایک ایک شعر کا کافی معاوضہ ان لوگوں کو دیا، جن سے دیوان کی ترتیب میں کچھ بھی مدد مل سکی۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"!

فارسی ادب سے عام تغافل اور مضمون کی طوالت کے اندیشے سے حضرت سحر کے منفرد فارسی کلام کو قلم انداز کرتا ہوں، آئیے ایک اچٹتی سی نظر ان کی ایک مسدس "کیف برشگال" پر ڈالتے چلیں:

روشنیٔ شمع بالیں بے نمود،
چادر نور قمر بے تار و پود
بے ضیا تاروں کی جملہ هست و بود
رنگ لایا ہے مگر چرخ کبود
ہے اندھیرا چار سو چھایا ہوا،
دم لبوں پر ڈر سے ہے آیا ہوا
مے کدے میں کر کے پورا بندوبست
بیچ میں ساقی کو گھیرے مے پرست
در جہاں سے بے خبر مست الست
دور باندھے بیٹھے ہیں ساغر بدست
کم رہے ہیں آج نشہ اور ہو
خیر ہو ساقی کی مے کا دور ہو

فرماتے ہیں:

صدا دیتا ہوا چٹکی سے نکلا تیر قاتل کا
"ملے ٹکڑا خدا کی راہ میں ٹوٹے ہوئے دل کا!"

تیر کا چٹکی سے نکلنا اور صدا دیتے ہوئے، صدا بھی کون سی ٹوٹے ہوئے دل کی ــــ بات میں بات پیدا کردی نا!؟

ادب سے قیس عرض مدعا کچھ کر نہیں سکتا
اٹھا سکتی نہیں لیلیٰ حیا سے پردہ محمل کا

آداب حسن و عشق کو کس طرح ملحوظ رکھا گیا ہے: ایک سمت اضطراب ہے شوق ہے، احترام حسن ہے، دوسری جانب فطری حیا ہے، احساس برتری ہے، اجتناب ہے، آتش شوق کو بھڑکا دینے کا جذبہ ہے۔ مطالعۂ نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس شعر کے داخلی تاثر سے پوری طرح محظوظ ہوسکتے ہیں۔

وہاں بھی سکۂ داغ جنوں چلا کرتا
دیار عشق میں ڈنکا مرا بجا کرتا

دیکھا آپ نے! ڈنکے کی چوٹ، سکۂ داغ جنوں چلا رہے ہیں، دیکھیں کوئی کیا کرتا ہے!؟

آگے مرے کیا مال ہے منعم کا دوشالہ!
اس فقر کے کمبل سے گراں ہو نہیں سکتا!

قلندرانہ انداز بیان لائق توجہ ہے!

پڑے تو یوں پڑے جھٹکا، شب غم دست وحشت کا
گریباں، تا بدامن چاک ہو صبح قیامت کا

مضمون کچھ اچھوتا نہیں، ناسخ، ذوق اور بہت سے پرانے مشاق شعرا کے ہاں یہی مضمون مختلف طریقے سے ملے گا، لیکن یہ سلیقۂ اظہار، یہ منفرد انداز بیاں کہیں نہیں ملے گا:

اچھا ہوا مریض محبت ہوا جو میں!
یہ بھی کسی گناہ کا کفارہ ہو گیا

جس گناہ کا کفارہ مبتلائے محبت ہوجانا ہو، وہ گناہ کتنا معصوم کتنا لطیف ہو گا!

فتنہ پردازی اگر دیکھے نگاہ نازکی،
پیر گردوں ٹیک دے سر آستان یار پر

یہاں وہ چیز ہے جسے میں 'مقامی اثر' کہتا ہوں۔ سر ٹیک دینا، ہار مان لینے کے مرادف ہے جو فصاحت کی نزاکتوں کو سمجھنے والے اصحاب کے لئے بار سماعت ضرور ہو گا، لیکن اگر دوسرے مصرعے کو اس طرح پڑھیں:

"پیر گردوں سر جھکا دے آستان یار پر"

دیکھیے معنیٰ کے اعتبار سے کوئی کمی یا بیشی واقع نہیں ہوئی، لیکن آپ محسوس کریں گے کہ شعر اپنے مرتبے سے گر گیا، وہ جذبہ وہ جوش فنا ہو کر رہ گیا۔ علاوہ اس کے "سر جھکا دینے" سے کسی مغرور کے سر جھکا دینے پر مجبور ہوجانے کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔

کس قدر دل کش ہے فصل گل! عجب کیا گر پڑے
طائر ابر سیہ پر تول کر گلزار پر

کتنی ندرت ہے اس تخیل میں!

سحر گر تعمیر کی کوشش کروں تو رشک سے
اڑ اڑا کر گر پڑے گردوں مری دیوار پر

آسمان کا اڑ اڑا کر گر پڑنا نہ صرف عمارت کے گر پڑنے کا صوتی اظہار ہے، بلکہ اس سے گرنے والی عمارت کا عظیم الشان ہونا بھی پایا جاتا ہے، ورنہ پھوس کا چھپر کیا اڑ اڑا کر گرے گا!

میں وہ نہیں جو غش کروں برق و شرار دیکھ کر
طور سے اٹھ کے جاؤں گا جلوۂ یار دیکھ کر!

بہت ہی لطیف مفہوم ہے اس شعر کا! اور پھر آتش کا سا بانکپن۔ ملاحظہ ہو کتنی معصوم بیباکی ہے! — تجلیٔ دوست کو اب تک برق و شرار ہی سمجھے ہوئے ہیں اور بضد ہیں کہ واہ وا! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں بھی غش کھا کر گر پڑوں گا! برق و شرار سے غش کھا کر گرنے لگا تو بس ہو ہی چکا! برق و شرار کہہ کر جذبۂ خود نمائی کو اکسانے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ آزردہ مرحوم ایک جگہ فرماتے ہیں:

یہ کہہ کے رخنہ ڈالیے ان کے نقاب میں
اچھے برے کا حال کھلے کیا حجاب میں

لیکن سحر کے ہاں لطف مزید ہے: اڑے بیٹھے ہیں، جب تک جلوہ نہ دکھاؤگے، میں یہاں سے اٹھ کے جانے کا نہیں! جو اصحاب عربی ادبیات کا سنجیدہ ذوق رکھتے ہیں وہ "رب ارنی!" اور "طور سے اٹھ کے جاؤں گا جلوۂ یار دیکھ کر!" کی روح سے صحیح طور پر لطف اندوز ہوسکیں گے۔

سحر پیو شراب عشق، شوق سے! غم نہیں مگر
اس کا چڑھاؤ دیکھ کر! اس کا اتار دیکھ کر!

دیکھئے کس لطیف انداز سے فرماتے ہیں کہ ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ تم نے شراب محبت کے لئے دست طلب کیوں بڑھایا، لیکن قبل اس کے کہ تمہیں شراب ملے، اپنے ظرف کو دیکھ لو! کہیں ایسا نہ ہو کہ "آبروئے شیوۂ اہل نظر" بھی کھو بیٹھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ بہک جاؤ اور دار پر چڑھا دئے جاؤ! اسی کی جانب غالب بھی توجہ دلاتے ہیں:

ایں ہرزہ رواں گشتن دریا نتواں گشتن
جوئی بسخیاباں رو! سیلی بہ بیاباں شو!

سحر کا انداز تادیبی کتنا دلچسپ ہے!

سینے میں دل ہے، دل میں داغ، داغ میں سوز و ساز عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں، پردہ نشیں کا راز عشق

اردو ادب میں ایسے جواہر پارے بہت کم نظر پڑتے ہیں۔ وہ جسے کسی نے آج تک نہ دیکھا ہو، اسے دیکھنے کی تمنا حقیقتاً ایسا ہی راز ہے، جسے آتنے ہی لطیف پردوں کی ضرورت ہے: سوز و ساز کو راز عشق سمجھنے والا اور اسے کلیجے سے لگا کر رکھنے والا کیا کچھ نہ ہوگا، بقول اقبال:

این است مقام او دریاب، مقام من

فرش زمیں پہ مصطفیٰ، عرش بریں پہ کبریا
پہنچا کہاں سے ہے کہاں! سلسلۂ دراز عشق

ایک منکر خدا یا ناآشنائے محبت تو نہایت آسانی سے کہہ دیگا کہ "واہ کیا زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں"، لیکن اس کا لطف اس سے پوچھئے جو حبیب و محبوب کے ربط غائبانہ کا صحیح احساس رکھتا ہو۔

ذیل میں حضرت سحر کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں، جنھیں دلیل مان کر میں نے ان کے منفرد ہونے کا دعویٰ کیا ہے:

بے جرم کی گردن تہ خنجر ہے نظر میں
اب تک وہی ہنگامۂ محشر ہے نظر میں

الطاف جو غیروں پہ ہیں، سب دیکھ رہا ہوں
ساقی یہ ترا شیشہ و ساغر ہے نظر میں

سن سن کے مرے درد کے نالے نہ پسیجا!
اے بت الٰہی باتوں سے تو پتھر ہے نظر میں

مجھ خاک نشیں کا ہے دماغ آج فلک پر،
کسریٰ کا محل پھوس کا چھپر ہے نظر میں!

الٹا ہی جواب آتا ہے خط کا مرے ہر بار
جب دیکھیے، تحریر مقدر ہے نظر میں!

کیا فصل بہاری نے سماں باندھ لیا ہے!
کانٹا بھی اگر ہے تو گل تر ہے نظر میں

دل توڑ کے پہلو سے نکل جاتی ہے کیا شئے!
ناوک ہے، نہ نشتر ہے، نہ خنجر ہے نظر میں

جی میں ہے کہ میخانہ کا میخانہ لنڈھا دوں!
دریا دلیٔ ساقیٔ کوثر ہے نظر میں

بر عکس نہیں ہے اگر انصاف سے دیکھو!
ہر آئینہ گر سحر سکندر ہے نظر میں!

پھر فرماتے ہیں

الجھا ہوا دامن ہے، ذرا سا نہ رکے ہاتھ!
ہاں دست جنوں اور بھی اک زور، لگے ہاتھ!!

زاہد نے برا مئے کو کہا، ان کے چلے ہاتھ،
کیا اس کے زباں منہ میں تھی، رندوں کے نہ تھے ہاتھ

مقتل میں بڑی دیر سے سر میرا جھکا ہے،
شمشیر بکف تو بھی ہے جلاد، لگے ہاتھ!

اے پائے طلب، دشت نوردی سے نہ تھکنا!
اے دست جنوں، جامہ دری سے نہ رکے ہاتھ!!

بر سے جو گھٹا کوئی تو ساغر کا چلے دور،
مئے خوار ہیں بیٹھے ہوئے ہاتھوں پہ دھرے ہاتھ

کس طرح یہ مانوں کہ کیا غیر کو چورنگ!
مجھ پر تو حضور آپ کے اوچھے ہی پڑے ہاتھ!

ہم عجز سے گردن پئے تسلیم جھکائیں!
نخوت سے جبیں تک بھی تمہارا نہ اٹھے ہاتھ؟!

اجزا بکھیر دوں گا آہ شرر فشاں سے!
گن گن کے بدلے لوں گا اک روز آسماں سے

اک جام کے عوض ہم جنت کو بیچ ڈالیں
زاہد غریب ایسا دل لائے گا کہاں سے!

دیکھا بھی اس نے مجھ کو تو اس نظر سے دیکھا:
جس طرح تیر نکلا کوئی کڑی کماں سے

گلچیں تجھے خبر ہے، یہ کس کے پر پڑے ہیں!؟
صیاد کے مکاں تک بلبل کے آشیاں سے

دو چادریں کفن کی، دو گز زمیں لحد کی،
مر مر کے ہم نے پایا اے سحر اس جہاں سے!

سحر مرحوم کی انفرادیت ان کا تیکھاپن ، بیباک لہجہ اور آزادانہ روش ہے ، مخصوص مقامی رنگ (local colour)، چبھتا ہوا طنز ہے ، انتظاری استفہام ہے . یہ خصوصیات جزئی طور پر بہت سے شاعروں میں ہوتی ہیں ، لیکن مجموعی طور پر:

''اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں''

وہ اردو کے بہت بڑے شاعر نہ سہی ، لیکن اچھے شاعروں میں منفرد ضرور ہیں ، اور بھوپال کی بزم سخن کے تو وہ سراج منیر ہیں : قدیم شعرائے بھوپال کا تذکرہ میری نظر سے گزرا ہے ، لیکن میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سرزمین پر ، اس دور میں کوئی ان سے بہتر اور منفرد شاعر نہ تھا ، ان کے تلامذہ میں میرے استاد حضرت ذکی وارثی بہت نمایاں تھے ، جن کے دم سے ایک مخصوص رنگ سخن کی داغ بیل پڑی ، جسے اہل نقد بھوپال اسکول ، کے نام سے موسوم کرینگے ، جس کی باسط ، شعری ، افسوں اور بہت سے اچھے شاعروں نے نمائندگی کی ہے : تقسیم ہند پر یہ بزم بھی برہم ہوگئی ، کچھ غربت کی نذر ہوگئے ، باقی جو بچے انہیں افلاس اور فرقہ پرستی نے آدبوچا ، اور بقول غالب۔

''عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے!''

اُردو مختصر نویسی کی تاریخ

اختر حسن

بنگال کی سیاسی بیداری کے بعد ہی صوبہ متحدہ پر اثر پڑا. وہاں کی گورنمنٹ نے ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۹ء میں غیر معتدل سیاسی تقریروں کو قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس کر کے اردو شارٹ ہینڈ کی تدوین ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ کے سپرد کی. کالج نے یہ کام جناب پروفیسر مرزا محمد ہادی وسوا مرحوم، جناب حکیم محمد ممتاز حسین مرحوم مالک و اڈیٹر اودھ پنچ کے سپرد کیا. ان کی امداد کے لئے مسٹر گھوش (جو اردو زبان میں کوئی خاص قابلیت نہ رکھتے تھے مگر انگلش شارٹ ہینڈ انسٹرکٹر تھے) مقرر کئے گئے: گورنمنٹ نے افسران پولیس کا ایک بیچ بھی اس فن کو حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا:

ان حضرات کا اس وقت یہ عالم تھا کہ پٹمین سسٹم کے کسی قاعدہ کا روزانہ مطالعہ کرتے اوراس کو آردو زبان پر منطبق کر کے ان طلبا کو سکھاتے تھے. اٹھارہ مہینوں میں اس اولیں جماعت کی تعلیم ختم ہوئی. اس وقت یہی نوٹ کتاب کی شکل میں شائع کئے گئے. پٹمین کے زمانے میں کون کہہ سکتا تھا اور آج سے پہلے کس نے کہا ہوگا کہ عربی رسم الخط میں وہ تمام شکلیں موجود ہیں جن کو فن مختصر نویسی یا شارٹ ہینڈ کی تدوین میں پٹمین اور آجکل کے متعدد طریقوں کے بنانے والوں نے ناگزیر خیال کرکے اختیار کیا ہے.

دنیا کے تمام خطوں کی طرح عربی خط بھی سیدھی اور قوسی لکیروں سے مرکب ہے مگر عربی خط کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے ہر لفظ میں یہ لکیریں بہت کم تعداد میں اور بہت سادی شکلوں میں پائی جاتی ہیں اورجب کئی حرف ملاکر لکھے جاتے ہیں تو حرفوں کی شکل اور بھی سادی اور مختصر ہوجاتی ہے جس سے تحریر میں بہت کم وقت صرف ہوتا ہے.

پٹمین نے اپنے شارٹ ہینڈ میں نہ صرف عربی خط کی امتیازی خصوصیتوں سے کام لیا ہے بلکہ آوازوں کے اظہار کے لئے جو علامتیں مقرر کی ہیں ان کی شکلیں بھی بالکل وہی رکھی ہیں جو عربی خط کے حرفوں میں ملتی ہیں. یعنی ان علامتوں میں عربی حرفوں کے اجزائے ترکیبی انفرادی طور پر یا ترکیب میں استعمال کئے ہیں جیسا کہ آئندہ نقشوں سے ظاہر ہو گا.

نقشہ (۱)

عربی خط کے حروف تہجی	شارٹ ہینڈ کے حروف تہجی
ا ب ت ث ج ح خ	
د ذ ر ز س ش ص	
ض ط ظ ع غ ف ق	
ک ل م ن و ہ ء	
ی ے	

نقشہ (۲)

عربی حروف کے اجزائے ترکیبی مع مختصر علامات	شارٹ ہینڈ کے حروف کے اجزائے ترکیبی مع مختصر علامات
خطوط مستقیم	خطوط مستقیم
ا ب ت ث	
ف م	
ل	
ک	
د ذ	
ے	
ط ظ	
خطوط مستدیر یا قوسی	خطوط مستدیر یا قوسی
ج ح خ	
ر ز	
س ش	
ص ض	
ع غ ی	
ف	
و	
ن	

نقشہ (۳).

عربی حروف کے مختصر علامات	شارٹ ہینڈ کے مختصر علامات
(۱) نقطہ " . " حروف میں امتیاز کے لئے	(۱) نقطہ " . " بطور حرکت اور الفاظ کے استعمال کے لئے ہوا ہے
(۲) چھوٹا دائرہ " ہ " ق ف م و میں استعمال ہوا ہے۔	(۲) دائرہ ہر ایک حرف کے شروع اور آخر میں ش س وغیرہ کی علامت ہے۔

ان نقشوں سے صاف ظاہر ہے کہ پٹمین کے شارٹ ہینڈ میں جتنی علامتیں استعمال کی گئی ہیں وہ سب عربی خط سے لی گئی ہیں، البتہ ان کے رخ بدل دئے گئے ہیں اور اس تبدیلی کی ضرورت خاص کر اس سبب سے لاحق ہوئی کہ عربی خط داھنی طرف سے بائیں طرف کو چلتا ہے اور پٹمین نے شارٹ ہینڈ ان لوگوں کے لئے بنایا تھا جو بائیں طرف سے لکھتے ہیں. بہرحال جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ شارٹ ہینڈ میں تمام علامتیں وہی ہیں جو عربی خط میں موجود ہیں تو اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ پٹمین کا شارٹ ہینڈ عربی خط پر مبنی ہے.

مولانا ابوالکلام آزاد قول فیصل میں صفحہ ۱۳۵ پر لکھتے ہیں:

اردو مختصر نویسی کا قاعدہ ۱۹۰۵ء میں کرسچین کالج کے دو پروفیسروں نے ایجاد کیا : جن میں سے ایک کا نام مرزا محمد ھادی بی. اے ہے. میں اس وقت لکھنؤ ہی میں تھا اس لئے مجھے ذاتی طور پر اس کے دیکھنے اور موجدوں سے گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا : مجھے معلوم ہے کہ اس کے موجدوں نے انگریزی کی علامات کو بہت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ منتقل کر لیا ہے لیکن وہ اردو حروف و املا کو پوری طرح محفوظ کر دینے میں کامیاب نہ ہوسکے. خود انہیں بھی اس نقص کا ایک حد تک اعتراف تھا لیکن وہ خیال کرتے تھے کہ مختصر نویس کی ذاتی قابلیت اور حافظہ و مناسبت سے اس کی تلافی ہوجائے گی. میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ تجربے سے ان کا خیال درست نہ نکلا :

صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے ابتدائی تجربے کے لئے دو پولیس سب انسپکٹروں کو تعلیم دلائی تھی. انہوں نے سب سے پہلے آزمائشی طور پر جن پبلک تقریروں کو قلم بند کیا، میں بتلانا چاھتا ہوں کہ وہ میری اور شمس العلما مولانا شبلی مرحوم کی تقریریں تھیں.

ہم دونوں نے انجمن اسلامیہ ہردوئی کے سالانہ جلسے میں لکچر دئے تھے. مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا شبلی نے فی منٹ ساٹھ لفظوں کی رفتار سے تقریر کی تھی اور میری تقریر ۸۰ سے ۹۰ تک تھی. جیسا کہ خود مختصر نویسوں نے ظاہر کیا ہے یہ کوئی تیز رفتار نہ تھی، تاہم جب انہوں نے اپنا کام مرتب کر کے دکھلایا تو بالکل ناقص اور غلط تھا. اس کے بعد بھی مجھے اپنی تقریروں کے قلم بند کرانے کا اتفاق ہوا لیکن ہمیشہ ایسا ہی نتیجہ نکلا. ابھی حال کی بات ہے کہ خلافت کانفرنس آگرہ میں میرا زبانی پریزیڈنشیل ایڈریس ایک مشاق مختصر نویس سید غلام حسین نے قلم بند کیا جو عرصہ تک یو پی کے محکمہ سی آئی ڈی میں کام کرنے کے بعد مستعفی ہوا ہے، لیکن جب لانگ ہینڈ میں مرتب کر کے مجھے دکھلایا گیا تو اس کا کوئی حصہ صحیح اور مکمل نہ تھا. یہ تو اصل قاعدہ کا نقص ہے لیکن جب اس پر مختصر نویس کی ناقابلیت کا بھی اضافہ ہوجائے تو پھر کوئی خرابی ایسی نہیں ہے جس سے السانی تقریر مسخ نہ کی جا سکے. کلکتہ اور بنگال کی مخصوص عدالت نے اس نقص کو اور زیادہ پرمعصیبت بنا دیا ہے. (باقی باقی)

اُردو الفاظ کی رومن املا

ہارون خاں شروانی

میں ڈاکٹر گیان چند کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے مضمون میں ، جو اس موضوع پر اردونامہ کراچی ، بابت اپریل تا جون ۱۹۶۲ میں شائع ہوا ہے ، میرے کتابچے "اردو رسم خط اور طباعت" کو مفید اور بصیرت افروز فرمایا ہے . ڈاکٹر گیان چند ہندوستان کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن پر اردو دوستوں کو فخر ہے اور ان کے قلم سے میرے کتابچے کی بابت یہ الفاظ نکلنا میرے لئے تشکر اور امتنان کا باعث ہے . یہ ایک توارد ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۱ کے رسالہ نوائے ادب ' بمبئی ' میں اردو زبان کے مشہور مفکر جناب شہاب الدین دسنوی کا مضمون " اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ ایک نئی تجویز " کے عنوان سے چھپا ہے . چند ہفتے ہوئے جناب دسنوی صاحب حیدرآباد آئے تھے تو انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ اس موضوع پر خیالات کا اظہار کیجئے ، مگر بدقسمتی سے میں اب تک اس بارے میں کچھ نہ لکھ سکا. میری دانست میں دونوں مضمون ایک اعتبار سے اردو رسم خط کی کم مائگی پر دلالت کرتے ہیں ، اور خصوصیت کے ساتھ حروف علت اور علامات علت* کے لئے رومن علامتوں کا آسرا ڈھونڈتے ہیں . اس کے علاج کے لئے دونوں فاضل مصنفوں نے رومن علتی حروف سے مدد لی ہے ، مگر جہاں ڈاکٹر گیان چند نے اردو الفاظ کے صحیح اور علتی دونوں قسم کے حروف کے لئے رومن حرفوں کا سہارا لیا ہے وہاں دسنوی صاحب نے صحیح حروف تو اردو ہی کے رکھے ہیں مگر علتی حروف اور علتی علامتوں کے لئے رومن حروف، کا استعمال جائز قرار دیا ہے .

میں ڈاکٹر گیان چند صاحب کی اس رائے سے پورے طور پر متفق ہوں کہ بہترین رسم خط وہ ہے جو صحیح بھی ہو اور سہل بھی ہو. صحت سے مراد صرف ایک ہی ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، کسی زبان کی آوازیں اس زبان کے رسم خط کے ذریعے سے ادا کی جاسکیں . ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ کسی رسم خط میں لہجے کے آتار چڑھاؤ کا اظہار نہیں کیا جا سکتا ، گو معمولی بول چال میں بھی کسی لفظ پر زور دینے یا کسی لفظ کو ذرا جھٹکے کے ساتھ

---

* میں ایسے الفاظ جیسے " مصوتے " اور " مصمتے " کو اردو زبان کے لئے بوجھل اور نا مناسب سمجھتا ہوں .

ادا کرنے سے معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہوجاتا ہے. بہرحال کم سے کم یہ تو لازم ہے کہ رسم خط کے ذریعے سے صرف الفاظ کو صحیح طور پر ادا کیا جاسکے. اعراب محض مصنوعی علامتیں ہیں جو مختلف زبانوں کے مخارج اور ان کے باہمی ربط کو ظاہر کرنے کی غرض سے وضع کی گئی ہیں: دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے حروف اور اعراب کسی ایک زبان سے ٹکر کھاتے ہیں تو اس زبان کے مخرجوں کے اظہار کے لئے یا تو یہ حروف بجنسہ قائم رکھے جاتے ہیں ورنہ ان کی آوازوں میں تبدیلی ہوجاتی ہے اور بعض مرتبہ کسی کی آواز دو دو تین تین حرفوں کو ملا کر اس مجموعے سے لگا لی جاتی ہے. ہمارے حرف 'ض' کو لیجئے اس کا تلفظ اردو میں کچھ ہے عربی میں کچھ، فارسی میں کچھ، سندھی میں کچھ. اسی طرح 'ق' کا مخرج حجاز اور مصر میں جداگانہ ہے، اور مصر میں مسجد کو مسگد کہتے ہیں اور اس کے عکس کی طور پر قاہرہ والے کہیں گے کہ ہم اس لفظ کا تلفظ مسجد کیوں کرتے ہیں. خود ہمارے ملک میں پنجاب میں ق کا تلفظ ک کیا جاتا ہے اور دکھنی عام طور پر اسے خاف اور خ کو قے کہتے ہیں. دیوناگری ष اور تلگو کا تلفظ شمالی ہند میں ش کا اور جنوبی ہند میں س کا کیا جاتا ہے. مغربی زبانوں کو لیجئے: حرف T انگریزی میں ٹ، اطالوی اور دوسری جنوبی، زبانوں میں ت فرانسیسی خاص کر پیرس اور اس کے نواح کی زبان میں ت اور ٹ کے درمیان کی آواز کے لئے لکھی جاتی ہے.

یہ حال تو صحیح حرفوں کا ہے. علتی حرفوں کے تلفظ میں تو اس سے بھی زیادہ فرق نمایاں ہے. انگریزی زبان کا تو کچھ کہنا ہی نہیں وہاں تو ہر علتی حرف کا تلفظ گویا ہر لفظ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے. فرانسیسی U کا تلفظ "او" اور "ای" کے درمیان ہوتا ہے. اطالوی اور جرمنی میں U پیش کا کام دیتا ہے، شمالی زبانوں میں پیش کے لئے اور دوہرا U مجزوم و کے لئے استعمال ہوتا ہے.

ڈاکٹر گیان چند کا خیال ہے کہ "مفرد آوازوں کے لئے دو حروف کا استعمال بےاصولی ہے." میں ان کی اس رائے سے متفق نہیں. جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ حروف کی حیثیت ایک حد تک من مانی علامتوں سے زیادہ نہیں تو پھر دو یا دو سے زیادہ حروف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. نام نہاد دو یا دو سے زیادہ حرف ایک دوسرے سے ادغام کے بعد اپنی اپنی حیثیت کو کھوکر گویا ایک ہی آواز کی علامت بن جاتے ہیں. مثال کے طور پر انگریزی میں بجائے اس کے کہ چ کی آواز کے لئے کوئی جداگانہ حرف بنا کر انگریزی حروف تہجی میں اضافہ کیا جائے اس کے لئے عام طور پر CH لکھا جاتا ہے یہ CH ایک جداگانہ آواز کی قائم مقام ہے اور اس میں گویا نہ C باقی رہتا ہے نہ H بلکہ دونوں کے ذریعے ایک نیا حرف بن جاتا ہے جو نہ C کے آواز کا قائم مقام ہے نہ H کی آواز کا. اس علامت یعنی CH کی آواز فرانسیسی میں ش کی، اطالوی میں ک کی اور جرمن میں خ کی ہوتی ہے. بعض مرتبہ کسی خاص آواز کے اظہار کے لئے تین تین چار چار

مفرد حرف ملادئے جاتے ہیں اور یہ حرف اپنی اپنی آواز کھو کر ایک نئی آواز کے لئے ایک مدغم حرف بن جاتے ہیں جیسے ش کے لئے اطالوی میں SCI اور چ کے لئے جرمن میں TSCH پہلی حالت میں S اور C اپنی اپنی حیثیت کو کھو دیتے ہیں اور SCI گویا ایک نیا حرف بن جاتا ہے، اور دوسری شکل میں TSCH مرکب ہوکر ایک نئے حرف کی جگہ لے لیتا ہے . اسی طرح دیو ناگری اور دوسری ہندی نما لپیوں میں سیکڑوں سندھیاں ہیں جن کے ذریعے سے دو یا دو سے زیادہ حروف کو ایک دوسرے سے ملا کر گویا ایک نئی آواز پیدا کردی جاتی ہے .

اس اعتبار سے میری دانست میں بھ ، پھ ، تھ ، ٹھ ، دھ وغیرہ میں ب ، پ ، ت ، ٹ ، د اور ھ اپنی اپنی اصل کو ایک حد تک کھو کر ایک ایک نئی آواز اور نیا مخرج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح ان آوازوں کے لئے جداگانہ مفرد حروف کے بوجھ کو کم کردیتے ہیں . بہت سے ناگری پریمیوں کا یہ کہنا ہے کہ بہت سے نفسی حروف کے لئے اگر حرف کے ساتھ ھ کا ایک حصہ ملادیا جائے تو ناگری حرفوں کی گنتی میں بہت کچھ کمی ہوجائے گی . ڈاکٹر گیان چند کا یہ فرمانا درست نہیں کہ چونکہ اردو رسم خط میں کھ ، گھ ، ٹھ ، ڈھ وغیرہ کے لئے دوسری مفرد علامتیں نہیں اس لئے ہم مخلوط شکلیں لکھنے پر مجبور ہیں . حقیقت یہ ہے کہ اردو لپی بنانے والوں کا یہ احسان ہے کہ نئی علامتیں بنانے کے بجائے انہوں نے ان آوازوں کو مخلوط حروف ہی سے لکھنے پر اکتفا کیا :

ڈاکٹر گیان چند اور دسنوی صاحب دونوں کے مضمونوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اعراب اور ہمارے علتی حروف خود ہماری زبان کی آوازوں کو ادا نہیں کرسکتے. ایک دقت یہ بھی پیش آتی ہے کہ ہماری زبان ایک جاذب زبان ہے اور اسے دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کا خاص ملکہ حاصل ہے: جیسے کسی زمانے میں عربی فارسی اور ترکی کے لفظ اس میں آکر گھل مل گئے اسی طرح اب انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں کے لفظ اس میں شامل ہو رہے ہیں اور یہ رفتار روز بروز زیادہ تیز ہوتی جارہی ہے . اردو زبان کی ابتدائی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ہندی کے الفاظ کو اردو میں لکھنے کے لئے بعض جدید حروف اختراع کئے جیسے ٹ ، ڈ ، ڑ ، لیکن بہت جلد ہجائی اختراع کا دروازہ بند ہو گیا اور اردو والے اپنی لپی کو اتنا مکمل سمجھنے لگے کہ وہ اردو حروف میں کسی قسم کی اختراع کا نام بھی سننے کے روادار نہیں رہے. سب سے بڑی دقت اعراب کے مسئلے حل کرنے میں پڑی ہمارے اعراب اور علتی حرف نہ صرف غیر زبانوں کے اعراب کی تاب نہیں لاسکتے بلکہ وہ خود اردو کے بعض اعراب کو ہو بہو تحریر میں لانے سے عاری ہیں. یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گیان چند اور دسنوی صاحب دونوں نے اعراب اور علتی حروف دونوں کے صحیح تلفظ کے لئے " رومن ، ، اور ' ' بین قومی ، ، علامتوں پر حصر کیا ہے:

جناب شان الحق حقی نے اردو زبان کی آوازوں خصوصاً اعراب اور علتی آوازوں کا پورا مطالعہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اردو میں تیرہ '' مصوتے ،، یعنی علتی آوازیں ہیں. گیان چندصاحب انکی تعداد چودہ بتاتے ہیں. ہماری لپی کی کم مایگی کی یہ کیفیت ہے کہ معمولی طور پر معروف اور مجہول کے تحریری اظہار میں فرق نہیں کیا جاتا، اور زبر، زیر پیش کی لمبی، وسطی، اورچھوٹی آوازوں کے لئے کوئی اعراب نہیں. اردو زبان کو پنجاب کا ممنون ہونا چاھئیے کہ اس نے نون غنہ کے لئے غیر منقوط '' ن ،، اور مدغم '' ھ ،، کے لئے '' ھ ،، کو عام کردیا ہے، ورنہ پچاس برس پہلے تک تو مدغم اور غیر مدغم '' ہ " کے درمیان فرق کرنا ناممکن تھا، اور اب بھی اس صحت مند قاعدے کی کبھی پابندی کی جاتی ہے اور کبھی نہیں کی جاتی. جو انگریزی لفظ اردو میں آ گئے ہیں ان میں متعدد ایسی آوازیں پنہاں ہوتی ہیں جن کے لئے ہمارے یہاں اعراب نہیں اور ان کی املا من مانی طرح سے کی جاتی ہے. cap کے ''a،، کو شمالی ہند اور پاکستان میں "کیپ،، لکھا جاتا ہے اور جنوبی ہند میں "کیاپ ،،. اسی طرح pen میں e کی جو آواز ہے اس کے لئے اردو میں کوئی علامت نہیں.

یہ دوسری مشکل تو اس وقت پیدا ہوگی جب ہم غیر زبانوں کے نامانوس الفاظ اردو میں لکھنے کی کوشش کریں گے: یہ کوشش میرے نزدیک ناممکن عمل ہوگی. جیسا اوپر دکھایا جا چکا ہے، کوئی حرف مشکل سے ایسا ہوگا جس کا تلفظ دوزبانوں میں یکساں ہو. رومن حروف کےلئے انگریزی کا سانچا ڈھونڈنا ایسا ہی ہےجیسے اردو میں جو عربی حروف رائج ہیں ان کی آواز کے لئے عربوں کاسا تلفظ ڈھونڈنا. اگر ہم ایسی علامتوں کے پیچھے پڑجائیں گے جو دو یا تین اہم یوروپی زبانوں کے مخرج کو ادا کرسکیں تو ہمیں علامتوں کے ایسے گھنے جنگل میں سے گزرنا ہوگا جس سے ہم کبھی بھی نہ نکل سکیں گے. پچیس برس کے قریب ہوئے اس وقت جامعہ عثمانیہ میں اس کی کوشش کی گئی تھی کہ مختلف زبانوں کے اعلام کو اردو کے سانچے میں ڈھالا جائے. اس پر بہت کچھہ محنت کی گئی اور علتی حروف ہی کے لئے نہیں بلکہ بعض صحیح حروف کے لئے بھی دو تین یوروپی زبانوں کے تلفظ کو اردو کا جامہ پہنانے پر وقت صرف کیا گیا مگر انتہائی پیچدگی اورتنوع کی وجہ سے یہ کوشش بالکل ناکام ثابت ہوئی.

ہمیں اردو تحریر میں دو طرح کے بیرونی لفظوں سے سابقہ پڑے گا. ایک وہ جو ہماری زبان کا گویا جزو بن گئے ہوں، اور دوسرے وہ اعلام اور دوسرے لفظ جو اتفاقاً ہماری تحریر میں آجائیں. پہلے قسم کے لفظوں کو ایک طرح کی ٹکسالی شکل دے دی گئی ہے. Station کا صحیح انگریزی تلفظ تو Steyshn ہے مگر ہم اسے اسٹیشن کہتے ہیں اس طرح Council کا انگریزی تلفظ Khownsl ہے مگر ہم اسے محض کونسل کہتے ہیں. انگریز جب اپنے کسی لفظ میں علتی حرف

کا تلفظ کرے گا تو وہ لازماً دو علتی آواز diphthong سے ادا کرے گا ، مگر ہم اسے روا نہیں رکھتے ۔ غرض غیر زبانوں کے جو لفظ ہماری زبان کا جزو بن گئے ہیں ان کی بابت تو وہی مسئلے پیش آئیں گے جو خود اردو کے ٹکسالی لفظوں کی تحریر میں پیش آتے ہیں ۔ باقی جو غیر زبانوں کے لفظ خصوصاً اعلام ایسے ہیں جو اردو سے بے گانہ ہیں ان کی بابت میری رائے ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کے اصل تلفظ کو کھوجا جائے اور اسے مسخ کیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ انہیں ہو بہو رومن حروف میں لکھ دیا جائے ۔

مروجہ اردو رسم خط کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ جب تک ہم کسی لفظ سے پہلے سے آشنا نہ ہوں اس وقت تک اسے صحیح نہیں پڑھ سکتے ۔ سب سے پہلے صحیح حرفوں کے چار مجموعوں کو لیجئے : (۱) ح، ہ، (۲) ث، س، ص، (۳) ذ، ز، ض، ظ، (۴) الف، ع، ہمزہ ۔ اردو زبان میں ان میں سے ہر مجموعے کے حروف کا مخرج بالکل ایک سا ہوتا ہے اور تاوقتیکہ کوئی شخص ان کی ماهیت اور ان کے ماخذوں سے واقف نہ ہو اس وقت تک محض اس کے سننے سے اس کی املا کے متعلق کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا ۔ علتی حروف کی املا کی دقت صحیح حروف کی املا سے کئی گنا زیادہ دقت طلب ہے ۔ ہم نے عربی زبان سے صرف تین اعراب ، یعنی زبر ، زیر ، پیش (فتحہ ، کسرہ ، ضمہ) لے لئے مگر اس کا خیال نہیں کیا کہ یہ تین اعراب اردو زبان کے آتار چڑھاؤ کے لئے کافی نہیں ہوں گے اور اردو میں ایسی بہت سی دوسری آوازیں بھی ہیں جن کا اظہار صرف یہ تین اعراب نہیں کرسکتے ۔ اس کے علاوہ ان اعراب کا تلفظ عربی میں معروف کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو اردو میں یہ مجہول سمجھے جاتے ہیں ۔ ہم نے صحیح حرف کی حد تک ٹ ، ڈ ، ڑ ، کا اضافہ کرلیا مگر اعراب میں جو اضافہ ہوا ہے وہ حال حال میں ہوا اور وہ صرف اتنا ہی کہ کھچی ہوئی آوازوں کے لئے الٹا پیش اور سیدھا زیر استعمال کیا جائے ۔ ان کے علاوہ ، اعراب میں کبھی کسی اضافے یا ترمیم کی کوشش نہیں کی گئی ۔ اس کے برعکس ہم نے تنوین کو بھی اپنالیا اور اس کی وجہ سے اپنے رسم خط میں ایک اور دقت پیدا کردی ۔ اگر اردو لپی کے موسس اردو کی ضرورتوں کے پیش نظر صحیح حرفوں کی طرح علتی علامتوں کا بھی اضافہ کرلیتے تو جو دقتیں اردو تلفظ کے اعراب میں پیش آرہی ہیں ان میں بہت کچھ کمی ہوجاتی ۔

ڈاکٹر گیان چند " بہترین رسم خط " کی تعریف میں صحت کے علاوہ اس کے سہل ہونے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں ۔ ذرا ان لپیوں پر غور کیجئے جن کے رسم خط حال ہی میں بدلے گئے ہیں ۔ ان میں ترکی ، انڈونیشیا اور ملایا پیش پیش ہیں ۔ مگر پہل کرنے کا سہرا وسطی ایشیا کے سوویت جمہوریوں ہی کو حاصل ہے جنھوں نے ۱۹۲۰ میں ترکی اور فارسی رسم خط کی جگہ رومن حروف کو اختیار کرلیا اور چند علامات لگا کر ان زبانوں کو ان کے سانچوں میں ڈھال لیا ۔ ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۶ تک ترکستان ، ازبکستان ، آذربائیجان ، قزاقستان وغیرہ میں ترکی اور فارسی کے لئے رومن حروف ہی رائج

رھے ، لیکن ۱۹۳٦ میں انھیں ان زبانوں کے لئے روسی حروف اختیار کرنے پڑے اور اب ارمنستان کے علاوہ سوریت روس کے تمام جمہوریوں میں روسی رسم خط ھی کا راج ھے ۔

ترکی ، اور اب حال میں انڈونیشیا اور ملایا نے بھی اپنے اپنے قدیم رسم خط کی جگہ رومن رسم خط اختیار کرایا ھے ۔ ان تینوں ملکوں میں رسم خط کو آسان بنانے کے لئے تلفظی phonetic طریقے کو اختیار کیا ھے بعض بلا لحاظ حرف کی اصل کے جیسے بھی ملک والے کسی لفظ کو بولتے ھیں اسی طرح اس حرف کے لئے رومن حرف مقرر کیا گیا ھے ۔ مثال کے طور پر چونکہ ترکی میں خ کا تلفظ ح ھی کیا جاتا ھے اس لئے " ینی ترکچہ " یعنی نئے ترکی رسم خط (رومن) میں صرف H کو کافی سمجھا گیا ھے اور خ کے لئے کوئی علامت نہیں ۔ اس [illegible] غ کا ترکی میں بہت کچھ استعمال ھے [illegible] کے لئے G کا حرف رکھا گیا ھے اسی طرح چ کے لئے C (جو اس آواز کی بین قومی علامت ھے)، ج کے لئے C (مع علامت زیریں) ۔ ڈ ترکی میں مفقود ھے اس لئے د کے لئے D ھے اور علتی حروف اور علامتوں کے لئے رومن علتی حروف پر ۸ یا ¨ لگا کر ترکی زبان کی ضرورتیں پوری کی گئی ھیں ۔ اس طرح طباعت کی اغراض کے لئے بجائے ٦٧١ علامتوں کے فرمے کے (جن کی عربی نسخ میں ضرورت تھی) اب رومن ترکی رسم خط کے فرمے کے لئے صرف ۱۰۰ علامتوں کی ضرورت باقی رہ گئی ھے ۔ ترکوں نے اپنی زبان کی کسی آواز کے لئے مخلوط حروف کی ضرورت نہیں سمجھی ، مگر انڈونیشی اور ملائی زبانوں میں مخلوط اور مدغم حروف کو بھی استعمال کیا گیا ھے ۔

اس تفصیل کی اس لئے ضرورت ھوئی کہ ھم خود اردو زبان کو بعض خاص حالات میں رومن املا میں لکھنے کی کوشش کر رھے ھیں ۔ چونکہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ھے کہ غیر زبان والوں کے لئے اردو تلفظ کو پیش کیا جائے اس لئے جہاں تک ھوسکے نئی علامتوں میں پچیدگی پیدا نہیں کرنی چاھئے ورنہ جو مقصد ھے وہ حاصل نہیں ھوگا ۔ ھمارا موجودہ رسم خط نقطوں اور شوشوں سے بھرا پڑا ھے اور یہ نقطے محض بے کار نمائشی چیز نہیں ، چنانچہ اردو کی رومن املا میں بھی نقطوں اور شوشوں کے ذریعے سے بعض حروف کو دوسرے حروف سے ممتاز کیا جاسکتا ھے ۔

پہلے صحیح حرفوں کو لیجئے ۔ دسنوی صاحب نے جو اسکیم پیش کی ھے اس میں صحیح حرفوں کی موجودہ شکلیں برقرار رکھی ھیں اور علتی حروف کے لئے رومن شکلیں اختیار کی ھیں ۔ جو مثالیں دسنوی صاحب نے دی ھیں ان سے ظاھر ھوتا ھے کہ اس قسم کی عبارت کو لکھنے پڑھنے میں بہت تکلف ھوگا ۔ رومن حروف کی کشش بائیں سے دائیں طرف اور اردو حروف کی کشش دائیں سے بائیں کو ھوتی ھے ۔ ساتھ ھی ڈیشوں اور الٹے واو سے بھی جو ٹھراؤ کی علامتیں قرار دی گئی ھیں اور جو ھر لفظ کی املا کا گویا جزو بنا دی گئی ھیں ، لفظ دوگنی بلکہ چوگنی جگہ گھیر لیں گے ۔ ایک معمولی لفظ " کتاب " کو "ک i ت a ب" لکھا گیا ھے ! اس کے کمپوز کرنے لکھنے اور پڑھنے ھر کام

میں دقت ہوگی اور طباعت کے لئے حروف کا فرق دوگنا چوگنا رکھنا پڑے گا ۔ ڈاکٹر گیان چند کی اسکیم منطقی اعتبار سے بہتر ہے اس لئے کہ اس میں صحیح اور علتی دونوں قسم کے حروف کے لئے رومن حروف کو ترجیح دی گئی ہے اور نفسی حروف کے لئے صحیح حرف کے ساتھ h کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ نیز ٹ ، ڈ ، ڑ کے لئے بنیادی حرفوں پر نقطے لگائے گئے ہیں ۔ لیکن انہوں نے گ کے لئے ایک خاص بین قومی علامت کا اضافہ کیا ہے حالانکہ اس کے واسطے ng عام فہم بھی ہوگا اور ن گ کی مخصوص آواز پر حاوی بھی ۔ اسی طرح ش کے لئے s مع علامت زیر بن s' ژ کے لئے zh' اور غ کے لئے ''u'' کی جگہ جس سے بے کار التباس ہوگا gh کافی ہوگا ۔ یہ سمجھنے میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے بعض آوازوں کے لئے بڑے رومن حرف اور بعض کے لئے چھوٹے رومن حرف کیوں تجویز کئے ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ طباعت کا کرشمہ ہو ۔ سہولت تو اس میں ہے کہ رومن اردو میں بڑے حروف Cpiatal letters بالکل استعمال نہ کئے جائیں ۔

اس طرح صحیح اور نیم صحیح حروف کی رومن شکلیں یہ ہونگی :—

الف a؛ ب b؛ پ p؛ ت t؛ ٹ ṭ؛ ث ، س ، ص ، s؛ ج j؛ چ c؛ ح ، ہ ، h؛ خ x (یہ بین قومی علامت ہے اور ڈاکٹر گیان چند نے خ کے لئے یہی علامت رکھی ہے) ' د d؛ ڈ ḍ؛ ذ ، ز ،ض ، ظ z؛ ر r؛ ڑ ṛ؛ ژ zh؛ ش (مع علامت زیر بن) یا sh؛ ع ، ؛ غ gh؛ ف f؛ ق q؛ ک k؛ ل l؛ م m؛ ن n؛ و w ۔

علتی حروف کے آثار چڑھاو کی رعایت سے کچھ نئی علامتیں نکالنی پڑیں گی ۔ زبر کے لئے سادہ a زیر کے لئے سادہ i' پیش کے لئے سادہ u کے بارے میں بحث کی کوئی گنجایش نہیں ؛ کشیدہ آوازوں کے لئے انہی حروف پر ایک چھوٹی سی لکیر کردی جائے تو جگہ بھی نہیں گھرے گی اور کام بھی نکل جائے گا جیسے ā ī ū ۔ یہ تو چھ اعراب ہوگئے ۔ ان کے علاوہ آے آو کے واسطے آسانی اس میں ہے کہ ان کا اظہار ai اور au سے کیا جائے ۔ اب ے مجہول اور و مجہول کو لیجئے ؛ ان کے لئے e اور o مناسب ہونگے اور انھیں کھینچ کر پڑھا جائے (جیسے " دیر اور روز") تو ان آوازوں کے لئے ē اور ō کو خط کشیدہ لکھا جاسکتا ہے ۔ جس حرکت کو دسنوی صاحب و اوسط کہتے ہیں اور جن کی مثالیں انہوں نے دوپٹہ اور عہدے سے دی ہیں وہ اصل میں او کشیدہ ہی کی مثالیں ہیں اب صرف ایک حرکت اور رہی جسے دسنوی صاحب ے اوسط کہتے ہیں اور جو "پہلا" کی "پ" اور محفل کی "م" کے اعرابوں سے ملتی ہے ، اس کے لئے ایک نئی علامت نکالی جاسکتی ہے جس سے زیادہ جگہ بھی نہ گھرے اور تلفظ بھی ادا ہوجائے اور وہ e پر دو نقطے ہیں ۔

اس طرح بغیر کسی بڑے اختراع کے اردو علتی حروف اور اعراب کی رومن شکلیں یہ ہوئیں :۔ a, ā, i, ī, u, ū, ai, au, e, o, ē اس اسکیم کے بموجب ڈاکٹر گیان چند کی اختراع کردہ علامات سے واسطہ نہیں پڑے گا اور بین السطور جگہ بڑھنے کا بھی اندیشہ نہیں رہے گا ۔

آج کل بہت سے اردو رسالوں میں اردو رسم خط کی اصلاح اور اسے رومن حروف کے سانچے میں ڈھالنے کی طرح طرح کی اسکیمیں نکل رہی ہیں. اس بارے میں دو باتیں نہایت ضروری ہیں: ایک تو یہ کہ ہم فی الفور اس دقیانوسی طرز طباعت کو خیر باد کہیں جسے لیتھو کہتے ہیں . دنیا بھر میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جسے لیتھو میں چھاپا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے بہترین اخبار، کتابیں اور رسالے بدترین طور پر طبع ہوتے ہیں . دوسرے اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے چیدہ چیدہ اہل فکر سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ طے کریں کہ اردو زبان کے لئے رومن املا میں کیا تصرفات کئے جائیں کہ دوسری بیسیوں بلکہ سیکڑوں زبانوں کی طرح اردو بھی بشرط ضرورت اس ہی میں ڈھل سکے . اگر اس قسم کا اجتماع نہ ہوا اور کوئی متفقہ اسکیم نہ نکلی تو بڑے سے بڑے مفکروں اور دانشوروں کے بہترین خیالات صدا بصحرا ثابت ہونگے . وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور کسی کا انتظار نہیں کرتا . کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم اردو رسم خط کو سہل اور کارآمد بنانے کے لئے بیٹھیں تو اس وقت یہ انکشاف ہو کہ اردو پڑھنے والے ہی نہیں رہے اب اس کے رسم خط پر غور کرنے سے کیا فائدہ !

بستانِ حکمت

تاریخی اور تنقیدی جائزہ

راج اپل پرشاد جلیل

اردو میں مولانا حسین واعظ کاشفی کی شہرۂ آفاق تصنیف انوار سہیلی کو بڑی فراخ دلی سے نظم و نثر کا قالب پہنایا گیا۔ چنانچہ پنچ تنتر یا کلیلہ و دمنہ کی دیگر فارسی کتابوں سے کہیں زیادہ انوار سہیلی کے اردو تراجم ملتے ہیں۔ اس کتاب کے اردو میں جو ترجمے ہوئے ہیں ان کے من جملہ فقیر محمد خاں گویا کا ترجمہ موسومہ "بستان حکمت" کئی اعتبار سے منفرد اہمیت کا حامل رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اول نصف میں اردو میں تصنیف و ترجمے کے جو کارنامے انجام پائے یہ نہ صرف ان کی ایک اہم کڑی ہے بلکہ اپنی مقبولیت کی بنا پر بھی اس ترجمے نے کلیلہ دمنہ کے سلسلے کے اردو لٹریچر میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔

کم و بیش تمام اقصائے عالم میں ازمنۂ قدیم سے فن داستان طرازی و قصہ گوئی مقبول عام فنون لطیفہ میں شامل رہا ہے۔ چنانچہ مشرق میں اس صنف ادب کی دو نمایندہ کتابیں، سنسکرت کا قدیم مجموعۂ حکایت بہایم موسومہ 'پنچ تنتر' او شاہ نامہ فردوسی اس فن کے ہمہ گیر قبول عام اور ادبی قدر و قیمت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ بستان حکمت اول الذکر سنسکرت مجموعۂ قصص کے عالم گیر سلسلے کی ایک کڑی ہے، یعنی یہ پنچ تنتر کے سلسلے کے مسلم ادب موسومہ کلیلہ دمنہ کی مشہور ترین فارسی تصنیف انوار سہیلی کا ترجمہ ہے۔ انوار سہیلی کو ہندوستان کے طول و عرض میں جو بے نظیر مقبولیت حاصل ہوئی اس پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اردو داں طبقے میں انوار سہیلی کے اس ترجمے نے بھی قبول عام پایا۔ چنانچہ آج بھی غیر فارسی داں اہل اردو بستان حکمت کے توسط سے انوار سہیلی اور اس کی حکایات سے واقف ہیں۔

صاحب بستان، فقیر محمد خاں گویا

یہ انیسویں صدی کے نصف اول میں گزرے ہیں، سنہ ولادت کا پتہ نہ چل سکا۔

افسوس ہے کہ گویا کی زندگی کے حالات تفصیل سے معلوم نہ ہوسکے۔ بلوم ہارٹ [1] نے لکھا ہے کہ اُن کا تعلق علی خیل کے آفریدی قبیلے سے تھا اور وہ ہندوستان میں بمقام کولہار کے متوطن

1. J.F. Blumhardt: Cat. of the Hindustani Mss. in the Library of the India Office 1926 p. 45.

تھے اودھ کی شاہی حکومت کے زمانے میں یہ فوج شاہی کے رسالہ دار تھے [1] اور شاہی سرکار سے ہی انہیں نواب حسام الدولہ [2] تہور جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ گویا لکھنؤ کے ایک نامور رئیس تھے [3]۔

بستان حکمت کافی مشہور کتاب ہے جس سے یہ خیال ہوا کہ ان کی دیگر تصانیف بھی ہوں گی، مگر معلوم یہ ہوا کہ گویا کی صرف یہی ایک تصنیف ہے [4] جو یہی ہے۔

البتہ انہیں شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور گویا تخلص کرتے تھے۔ عام طور پر یہ معروف ہے کہ گویا ناسخ کے تلامذہ میں شامل تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح سخن کے لئے خواجہ وزیر سے بھی رجوع کرتے تھے۔ چناں چہ رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ "یہ ناسخ کے شاگرد تھے، مگر خواجہ وزیر سے بھی اصلاح لیتے تھے" [5]۔ نیز حامد حسن قادری نے بھی لکھا ہے کہ "گویا نے ناسخ اور وزیر دونوں سے مشورہ سخن کیا ہے" [6]۔ خواجہ وزیر خود ناسخ سے اصلاح لیتے تھے اور گویا کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ بھی گویا کے احباب میں شامل تھے؛ پتہ نہیں حقیقت کیا ہے؟ یہ اپنے مقدمے میں بستان حکمت کے سبب ترجمہ کا حال شروع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے [7]......"

یہ صاحب دیوان شاعر تھے "گو کہ دیوان ان کے مرنے کے ایک عرصے بعد مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا" [8]۔

فقیر محمد خاں گویا کا انتقال ۱۸۵۰ء مطابق ۱۲۶۶ھ [9] میں ہوا۔ بقول سید اعجاز حسین "زمانہ کا انقلاب کہیے یا اردو کی خوش قسمتی سمجھیے کہ اس بہادر سپاہی نے تیغ قلم سے بھی وہ کام لیا کہ میدان ادب میں آج تک ان کا نام نمایاں ہے۔" [10] تاہم یہ حقیقت ہمارے پیش نظر ہے کہ گویا کے اس نثری کارنامے کی بیش تر اہمیت تاریخی اعتبار سے ہے نہ کہ ادبی لحاظ سے۔ اس نظریہ کو ہم حصہ تنقید میں تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ انوار سہیلی کے (۵۷) سے زاید بین العالمی تراجم میں بلحاظ مقبولیت بستان حکمت کا ایک اہم اور منفرد مقام ہے۔

بستان حکمت کے سر پرست

یہ عجیب دلچسپ واقعہ ہے کہ فقیر محمد خاں گویا کے اس ترجمے کا مربی میر بہادر علی حسینی، شیخ حفیظ الدین اور میاں ابراہیم دکھنی کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی زعیم نہیں تھا بلکہ ان کے خواجہ تاش احباب کی ہمت افزائی نے حق سر پرستی ادا کیا۔ چناں چہ وہ اپنے مقدمے میں سبب ترجمہ یوں بیان کرتے ہیں کہ " ایک روز

۱، ۲، ۳ رام بابو سکسینہ : تاریخ ادب اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری ۱۹۵۲ ۔ حصہ نثر صفحہ ۲۰
۴: حامد حسن قادری : داستان تاریخ اردو ۱۹۵۷ صفحہ ۱۷۸　　۵: تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۰
۶: داستان تاریخ اردو صفحہ ۱۷۸　　۷: بستان حکمت : مطبع جوہر ہند دہلی ۱۸۹۱ صفحہ ۷
۸، ۹: تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۰　　۱۰ : مختصر تاریخ ادب اردو ۱۹۴۰ صفحہ ۳۳۲

بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے تھے اور اس وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعہ کا تھا اور اس کے مصنف کی فکر رسا پر سب نے زبان ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اس کا عجب حکیم بے مثل تھا اور عجیب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا . . . . اس گفتگو میں اہل محفل نے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں ترجمہ اس کا ہوچکا ہے اگر تم اردو میں اسے ترجمہ کرو تو خوب چیز ہو. راقم نے ہرچند عذر کیا ، پیش رفت نہ ہوا "۔ ۱

غرض بقول حامد حسن قادری "ان خواجہ تاشوں کی فرمایش سے گویا نے یہ کتاب مرتب کی "۔ ۲ ؛ مگر خواجہ تاش احباب کی اس تحریک کی تائید حضرت دل نے بھی کی اور وہ اس طرح کہ " راقم نے ہرچند عذر پیش کیا پیش رفت نہ ہوا. کچھ من اللہ بندے کو بھی توفیق رفیق ہوئی اور ہمت اس پر ہوئی کہ ما توفیقی الا باللہ (نہیں ہے توفیق مجھ کو مگر خدا کی طرف سے) کمر کر ارادہ کرو اگر فضل الٰہی شامل حال ہے تو سب بن آوے گا . لہذا خدا کی عنایت پر تکیہ کر کے شروع کیا جاتا ہے ." ۳

سنہ ترجمہ :

. بستان حکمت کا سنہ ترجمہ ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۶ء ہے جس کا ذکر گویا نے بانداز شکرگزاری ان الفاظ میں کیا ہے. "شکر ہے خدائے عز وجل کا کہ ترجمہ انوار سہیلی کا چودھویں ذیقعدہ ۱۲۵۱ ہجری وقت صبح کے کہ ہنوز نیراعظم نے علم نورانی افق مشرق سے بلند نہ کیا تھا کہ مقام دارالسلطنت لکھنؤ میں ختم ہوا . " ۴ صاحب تذکرۂ گلشن ہند ۵ کے مطابق یہ ۳۔ مارچ ۱۸۳۶ء پنج شنبہ کا دن تھا. گویا کے استاد سخن نے تاریخ کہی تھی، اس کے آخری مصرع :

خرد گفت بستان سیراب حکمت

میں " بستان سیراب حکمت " کے اعداد ۱۲۵۴ ہوتے ہیں . جن میں تین حذف کر دینے چاہئیں. ناسخ کا قطعۂ تاریخ یہ ہے ٦ :۔

زہے نسخۂ حکمت آمیز نافع
کہ ہر باب وا کرد صد باب حکمت
مسمی بہ بستان حکمت نمودند
برائے تماشائے ارباب حکمت
گل و برگ و شاخ و ثمر جملہ حکمت
شد ایں باغ سرسبز با آب حکمت
بلطف مسبب کہ زیباست شکرش
فراہم شدہ بود اسباب حکمت
پی سال تاریخ اتمام ناسخ
خرد گفت بستان سیراب حکمت

بستان حکمت کی ترتیب وغیرہ

کتاب کا آغاز ایک مقدمے سے ہوتا ہے۔ گویا نے ملا کاشفی کا اصل مقدمہ حذف کرکے

---

۱ : بستان حکمت صفحہ ۷ ۔ ۲ : داستان تاریخ اردو صفحہ ۱۷۸ ۔ ۳ : بستان حکمت صفحہ ۷
۴ : بستان حکمت صفحہ ۳۱۹ ٦: بستان حکمت صفحہ ۳۱۹
۵ : مرزا علی لطف : تذکرہ گلشن ہند صفحہ ۵ ، بحوالہ شیخ محمد اسمعیل پانی پتی : مضمون بعنوان سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم مطبوعہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۲ صفحہ ۲۰۵

اپنا مقدمہ شامل کیا ھے. اس کی ابتدا حمدو ثنا کے ایک مختصر فارسی مضمون سے کی گئی ھے جس کے بعد اردو عبارت شروع ھوتی ھے. برزویہ کے پہلوی ترجمے سے لے کر انوار سہیلی اور عیار دانش تک کی عربی فارسی کتابوں کا حال اجمالاً مذکور ھے اور پھر اس کے بعد سبب ترجمہ کی طرف رجوع کرتے ھیں. ترجمہ انھوں نے کتاب کے پہلے باب کے مقدمے سے شروع کیا ھے. ناسخ کی تاریخ پر کتاب ختم ھوتی ھے.

مترجم نے جگہ جگہ اشعار شامل مضمون کئے ھیں جن میں زیادہ تر خود ان کے اور ناسخ کے اشعار ھیں. ملا حسین واعظ کے اشعار بھی اکثر جگہ نقل کئے ھیں. شعر نقل کرنے سے پہلے وہ ضرور شاعر کی طرف اشارہ کرتے ھیں، مثلاً "شعر ناسخ کا میرے ھی حسب حال ھے، برھمن نے یہ شعر گویا کا پڑھا وغیرہ."

ترجمے میں گویا کے تصرفات

گویا نے تصرفات کے تعلق سے اپنے مقدمے میں ایک دعویٰ کیا ھے کہ ان کے کارنامہ تصرفات سے کتاب کچھ سے کچھ ھوگئی ھے. حیرت ھوتی ھے کہ گویا کو محض معمولی سی رد و بدل پر اتنے بڑے دعوے کی جسارت کیوں کر ھوئی ؟

انھوں نے اپنے تصرفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ھے. "اب سننا چاھیے کہ جب ارادہ ھوا کہ ترجمہ اس کا اردو میں کروں تو اول ضرور ھوا کہ بنظر تامل اس کتاب کی عبارت اور مطالب کو دیکھا چاھیے. اس لئے بغور تمام دیکھا تو بیش تر مطالب پر اعتراض وارد ھوتے ھیں اور بعض جگہ اجمال میں مثلاً دو چیزوں کا حال مذکور تھا. جب تفصیل کی تو ایک کا مذکور ھوا اور دوسرا مطلب رہ گیا اور بعض جگہ اگر کچھ بیان اور ھو تو مطلب برآمد ھوتا ھے ورنہ نقصان رھتا ھے. اور اکثر فقرات کہ واسطے رنگینیٔ کلام کے طول دئے گئے تھے سو حذف کرنا اس کا ضرور تھا. اور بہت اشعار کہ مطالب سے چسپاں اور دست و بغل نھے موقوف کرنا ان کا مناسب تھا. بعض جگہ بڑھانا عبارت اور مطلب کا مناسب تھا اور اسی طرح عمل میں لایا" (صفحہ ۷، ۸). اب وہ ایک قدم آگے بڑھا کر یہ ظاھر کرنے کی کوشش کرتے ھیں کہ ان کے کارنامہ تصرفات سے کتاب کچھ کی کچھ ھوگئی ھے: "زیادہ تفصیل کرنے میں طوالت ھوتی ھے للہذا اس پر موقوف رکھا کہ جس نے انوار سہیلی کو دیکھا ھوگا یا اب نظر تامل کے مقابلہ کرے گا اس پر خود منکشف ھوجائے گا کہ گویا صورت کتاب کی اور ھی ھوگئی ھے." (صفحہ ۸). پھر لکھتے ھیں کہ "برائے نام ترجمہ کیا جاتا ھے. ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا ھے" (صفحہ ۸). ایک جگہ اعتراف کرتے ھیں کہ "لیکن حق یوں ھے کہ یہ احسان نقش اول کا ھے ورنہ مجھ بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی."

اس تعلق سے سید اعجاز حسین کی یہ رائے ھے کہ "حقیقت میں گویا نے ترجمہ تک ھی اپنے ذھن رسا کو محدود نہیں رکھا بلکہ غور کیجئے تو معلوم ھوتا ھے کہ برائے نام ترجمہ ھے ورنہ گویا نے عبارت کے لحاظ سے تصرف سے کام لیا ھے. جہاں یہ دیکھا کہ اصل کتاب کسی موقع پر

طویل ہے جس سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے تو وہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ جہاں اصل کتاب میں کوئی مزے دار بات مختصر لکھ دی گئی ہے وہاں دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کو کسی قدر طول دیا ہے۔'' ۱

گویا کے بیان کی روشنی میں فاضل ناقد کی اس رائے کو ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ محض گویا کے بیان کی چھاپ ہے اور خود گویا کے اس ادعا کی روشنی میں ترجمے کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ان کے دعووں کی ہی دھجیاں اڑاتا جارہا ہے۔ جہاں تک انوار سہیلی کی طویل عبارتوں کے ملخص ترجمے کا سوال ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گویا نے اصل کتاب کی زیادہ سے زیادہ تراکیب و لغات کو بجنسہ کھپانے کی کوشش کی ہے اور زیادہ تر ان ہی الفاظ میں تلخیص لکھ دی ہے۔ ادھر انوار سہیلی کے مختصر مطالب کو پھیلانے کا جہاں تک سوال ہے (جس کی مثالیں محض خال خال ہیں) وہاں گویا اپنی لفاظی کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں اور جہاں تک غیر ضروری اشعار کے حذف کا تعلق ہے ترجمے کا ہر صفحہ اپنے چار تا آٹھ اشعار کے ساتھ اس دعوے کی تردید کرتا جارہا ہے۔

ان تمام نکات پر حصہ' تنقید میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف مترجم کے دعاوی کے رد میں اجمالاً عرض کردیا گیا۔

بستان حکمت کی اہمیت کے چار پہلو

ابتداً عرض کیا جاچکا ہے کہ بستان حکمت ہمارے ادب کی ایک مقبول و معروف کتاب رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بستان حکمت کی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس نے کلیلہ دمنہ کے سلسلے کے فارسی ادب اور بالخصوص خود انوار سہیلی کے اردو تراجم کے من جملہ سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی، بلکہ ''اردو میں یہ انوار سہیلی کا مکمل ترجمہ'' ہونے کی حیثیت میں بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ انوار سہیلی کا یہ اس قدر مکمل بلکہ لفظی ترجمہ ہے کہ اسی سے اس کی اہمیت کا ایک اور پہلو بھی نکل آیا ہے، یعنی اپنے قارئین اور تحقیق کی سہولت کے لئے اردو کی نثری داستانوں کے ایک فاضل داستان گو نے کلیلہ دمنہ کی حکایات کی تفصیلی تحقیق اور تنقید کے لئے اسی کو چنا ہے۔ علاوہ ازیں اردو میں انوار سہیلی کے جتنے تراجم ہوئے ہیں، ناقدین کی نظر میں ''ان سب سے فقیر محمد خاں گویا کا ترجمہ بہتر ہے:'' گو ہماری ناچیز رائے اس سے مختلف ہے۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو:

بستان حکمت کی مقبولیت

اس موقع پر اس کتاب کے شہرہ و قبول کے محرکات کے تعلق سے اجمالاً صرف یہ عرض کرنا کافی ہے کہ جس دقت پسند ذوق ادب نے ہندوستان کے فارسی داں طبقے میں انوار سہیلی کو آفاقی شہرت و مقبولیت عطا کی اسی مشکل پسند ذوق

---

۱ مختصر تاریخ ادب اردو، صفحہ ۳۳۴

مطالعہ نے (جو انحطاط پذیر تھا اور جس کا معیار خاصہ گھٹ گیا ہوچکا تھا) اہل اردو میں بستان حکمت کو مقبول بنایا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ بستان حکمت کا اولین ایڈیشن کون سا تھا کیوں کہ باوجود تلاش وجستجو معلوم ہی نہ ہوسکا کہ اس کا پہلا ایڈیشن کس سنہ میں کہاں سے اور کس کے اہتمام میں شایع ہوا تھا۔

خاں صاحب عالی شان فقیر محمد خاں بہادر کی اس کتاب کا قدیم ترین زیر نظر ایڈیشن مطبع حسنی میرحسن، رضوی لکھنؤ کا ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء کا مطبوعہ ہے۔ یہ مترجم (متوفی ۱۸۵۰ء مطابق ۱۲۶۲ھ) کی زندگی میں ہی شایع ہوا تاہم یہ اس ترجمے کا اولین طبع نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اغلب ہے کہ تکمیل (۱۸۳۶ء) کے بعد جلد یا بقدرے تاخیر ترجمہ شایع ہو گیا تھا۔

مطبع جوہرہند، دہلی سے بھی بستان حکمت کے دو ایڈیشن ۱ شایع کیے گئے جن میں سے ۱۸۹۱ کا ہمارے پیش نظر ہے۔

منشی نول کشور کے مطبع سے اس کے اب تک تیرہ ایڈیشن شایع ہوئے۔ چناں چہ اس کا آخری ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں شایع ہوا جو تیرھواں ایڈیشن ہے۔ ۲ شیخ محمد اسماعیل نے ۱۹۱۴ء تک کے مطبع نول کشور سے بستان حکمت کے گیارہ ایڈیشنوں کی اشاعت کی بنا پر بالکل درست لکھا تھا کہ "یہ اس کتاب کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا ثبوت ہے۔ ۳"

بلوم ہارٹ کے پیش نظر بستان حکمت کا جو ایڈیشن تھا وہ ۱۹۰۳ء میں کان پور کا مطبوعہ آٹھواں ایڈیشن تھا :— "Bustan-i-Hikmat

A Hindustani translation of the Persian Anwar-i-Suhaili by Fakir Muhammad Khan, Goya. Eighth: Edn. Lith. Cawnpore, 1903." ۴

افسوس ہے کہ بلوم ہارٹ کے ہاں مطبع کا حوالہ نہیں ملتا، تاہم اتنا یقینی ہے کہ کان پور کے یہ آٹھ ایڈیشن قبل ازیں مذکورہ ایڈیشنوں کے علاوہ ہیں۔

بستان حکمت کے سنہ ترجمہ ۱۸۳۶ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک ایک صدی کے عرصہ میں اس کا کم از کم ۲۴ دفعہ شایع ہونا اس ترجمے کی مقبولیت کا ایسا ثبوت ہے جو آپ انوار سہیلی کے دیگر اردو تراجم سے بلاشبہ ممیز کرتا ہے۔ اس کی شہرت کا اندازہ کیجئے کہ ایران کے فاضل آقائی محمد علی تربیت اپنے ایک مقالہ "مثنوی و مثنوی گویان ایرانی" میں قانعی کی منظومہ کلیلہ دمنہ کے حال میں محمد خاں بہادر ملقب بہ حسام الدولہ و متخلص بہ گویا ۵ کے اس ترجمہ کا ذکر کرتے ہیں۔

انوار سہیلی کا مکمل اردو ترجمہ

ڈاکٹر گیان چند کے الفاظ میں بستان

---

۱ : بحوالہ مضمون شیخ محمد اسمعیل مطبوعہ اردو جولائی ۱۹۲۲ صفحہ ۲۰۵۔

۲ : راجہ رام کمار بک ڈپو لکھنو : مراسلہ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۱۔ ۳ : اردو جولائی ۱۹۲۲۔

۴: Blumhardi: A Supplimentary Cat. of Hindustani Books in the Library of the British Museum, 1909. p'p 175-176.

۵ : محمد علی تربیت: "مثنوی و مثنوی گویان ایرانی" مطبوعہ مجلہ مہر تہران، بہمن ماہ ۱۳۱۶ فصلی صفحہ ۸۵۲

حکمت کی اہمیت و امتیاز کا ایک قابل لحاظ پہلو یہ بھی ہے کہ "اردو میں یہ انوار سہیلی کا مکمل ترجمہ ہے۔" ۱

اس وقت ہمارے پیش نظر انوار سہیلی کے کم و بیش ساٹھ بین العالمی تراجم کے من جملہ اردو کے دس منظوم و منثور ترجمے ہیں ۔ ان دس اردو تراجم میں تین مثنویاں ہیں : (۱) دانش افروز (دکن میں شمالی ہند کے دو شعرا کی مصنفہ، غیر مطبوعہ) (۲) مثنوی ارژنگ راضی یا نگار راضی (مطبوعہ) اور (۳) محیط دانش (طباعت نامعلوم). کپتان نا کس نے (۴) مرزا مہربی اور (۵) داستان گوہینگا خاں سے دو ترجمے کرائے تھے جو معلوم ہوتا ہے کہ نامکمل تھے اوران کا صرف ذکر ہی ملتا ہے . ایک ترجمہ دکھنی نثر میں ہے یعنی (٦) میاں ابراہیم کی دکھنی انوار السہیلی مطبوعہ ۱۸۲۴ء اور (۷) اٹھارویں صدی کے اواخر کا ایک ناتمام غیر مطبوعہ ترجمہ محولہ بلوم ہارٹ . دو مطبوعہ تراجم جزوی اور نامکمل ہیں یعنی (۸) منتخبات انوار سہیلی اور (۹) ستارۂ ہند (۱۰) خود بستان حکمت ہے۔

اس طرح ان دس ترجموں کے منجملہ تین منظومات: دو جزوی غیر مطبوعہ ، دو نامکمل مطبوعہ اور دو دکھنی تراجم خارج از بحث قرار پاتے ہیں اور ایک بستان حکمت ہی اردو میں انوار سہیلی کا مکمل ترجمہ رہ جاتا ہے. اگر منشی ابراہیم کی دکھنی انوارالسہیلی کو شامل کر بھی لیں تو اس سے گویا کے ترجمے کی یگانہ حیثیت متاثر نہیں ہوتی کیوں کہ لسانی اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے سے بےحد مختلف ہیں اور بستان حکمت اپنے متعدد اسقام و نقایص کے باوجود کہانیوں پر تحقیق کے کام میں مدد دیتی ہے۔

بستان حکمت کی اہمیت کا ایک اور پہلو

یہ ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی تحقیقی تصنیف "اردو کی نثری داستانیں" میں انوار سہیلی کے مآخذ کی چھان بین کے سلسلے میں بستان حکمت کو پیش نظر رکھا ہے، اور یہ اسی لیے کہ بقول موصوف "اردو میں یہ انوار سہیلی کا مکمل ترجمہ ہے ."

اس کتاب کی اشاعت سے قبل ڈاکٹر گیان چند نے اپنے ایک مختصر مقالے میں بستان حکمت کو پیش نظر رکھ کر کلیلہ دمنہ کی کہانیوں کے اصل اور مماثل کہانیاں تلاش کرنے کے سلسلے میں اپنی ٹھوس تحقیق کا نتیجہ اجمالاً پیش کیا تھا. ۲ اردو میں اس موضوع پر تحقیق کی غرض سے اور ساتھ ہی ناظرین کی سہولت کی خاطر ضروری تھا کہ اس تعلق سے کسی اردو ترجمے سے استفادہ کیا جاتا ، اور چوں کہ بستان حکمت انوار سہیلی کا معروف و مکمل ترجمہ ہے اس لیے موصوف کی نظر انتخاب اسی پر پڑی ۔

یہاں ایک ضمنی سوال اٹھتا ہے کہ کلیلہ دمنہ کے سلسلے کی حکایات کے مآخذ کی تحقیق کے

---

۱ : اردو کی نثری داستانیں: مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۹۳.

۲ : ڈاکٹر گیان چند : تاریخ کلیلہ دمنہ مطبوعہ نگار مئی ۱۹۴۹.

لئے بطور خاص انوار سہیلی کو پیش نظر رکھنا کون ضروری تھا۔ واقعہ اصل میں یہ ہے کہ پنچ تنتر کے سلسلے کے مسلم لٹریچر یعنی عربی ، فارسی ، ترکی ادب کی کتابوں میں انوار سہیلی اس اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل اور ممتاز ہے کہ ملا حسین واعظ کاشفی نے اس کی تصنیف کے وقت متعدد کتب سے استفادہ کیا۔ ان کے اپنے بیان کے بموجب انوار سہیلی ابوالمعالی نصراللہ بن الحمید کی فارسی کلیلہ دمنہ ، بہرام شاہی کا فارسی عصر میں پیراہن جدید تھی اور اس طرح مذکورہ فارسی ترجمہ ھی ان کا اولین اور راست مآخذ تھا۔ یہ بالکل درست ہے مگر علاوہ اس کے حسین واعظ نے کلیلہ دمنۂ مقفع، ترکی حکایاتی ادب، بالخصوص جاودان خرد کے قصوں، مختلف عربی و فارسی شعرا کےکلام اور عقلاً و حکماء کے اقوال نیز احادیث وغیرہ سے کافی استفادہ کیا تھا۔ اور پھر مسلمہ طور پر ان کے اصل مآخذ ابوالمعالی و ابن المقفع کی کلیلہ دمنہ بالترتیب واحد بالواسطہ و راست ذریعہ یعنی برزویہ کا گم شدہ پہلوی ترجمۂ پنچ تنتر خود بھی علاوہ پنچ تنتر کے جزواً دیگر کئی کتب سے ماخوذ قرار دیا گیا ہے۔

نگار میں ڈاکٹر گیان چند نے بستان حکمت کی مدد سے انوار سہیلی کے مآخذ کی جو مجمل تحقیق پیش کی تھی اس کی دلچسپ تفصیلات ہمیں "اردو کی نثری داستانیں" کے صفحات پر مجتمع نظر آتی ہیں۔ صفحہ ۴۸ سے لےکر صفحہ ۵۹ تک پھیلے ہوئے ایک جامع اور بسیط نقشے کے ذریعہ بستان حکمت کی روشنی میں انوار سہیلی کے مضامین و قصص کا تمام ممکنہ ہندوستانی ذرایع پنچ تنتر، ہت اپدیش ، جاتک ، رامائن ، مہابھارت وغیرہم کی مماثل حکایات سے نتیجہ خیز تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

بستان حکمت کی اہمیت کا چوتھا پہلو یعنی اس کا ادبی مقام و مرتبہ ادبی تنقید کا ایک اہم اور مستقل بالذات پہلو ہے۔ انوار سہیلی کی انشا و نگارش سے بستان حکمت کی عبارتوں اور اسلوب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس ادبی موضوع پر زیر نظر تاریخی مطالعہ سے ہٹ کر تفصیل کے ساتھ کسی آیندہ مضمون میں بحث کریں گے۔

اشتقاقیات

الفاظ کی اصل و اشتقاق پر تشریحی حاشیے

ڈاکٹر شوکت سبزواری

(۱) ادھر کے معنی ہیں یہاں یا اس طرف۔ یہ "ا" (= یہ) اور "دھر" سے مرکب ہے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ "دھر" کی اصل "دھار" ہے جو قدیم دکنی ادب میں طرف اور جانب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں بڑی حد تک شبہ کی گنجائش ہے، اس لئے کہ یہ لفظ قدیم ہے اور اردو کے علاوہ دوسری قدیم و جدید زبانوں میں بھی ملا ہے۔ مثلاً لاطینی میں یہ Ci-tra ہے، قدیم انگریزی میں Hider جدید انگریزی میں Hither اور اوستائی میں ایتھرہ ---- یا اتھرہ ---- پہلوی میں ایتر، جدید فارسی میں ایدر۔ یہ تمام صیغے صوتی اور معنوی طور پر ایک ہیں۔ ان کے ہوتے اس لفظ کو اردو زبان کا ساختہ پرداختہ نہیں کہا جاسکتا۔ شاید اس لئے شبد ساگر نے اس کی اصل سنسکرت اتر इतर بتائی اور پلیٹس نے سنسکرت اتس इतस۔ "اتر" اگرچہ "ادھر" سے صوتی طور پر زیادہ قریب ہے لیکن اس کے معنی ہیں دوسرا یا مختلف۔ "ادھر" کے معنے سے اسے کوئی نسبت نہیں۔ "اتس" کو "ادھر" سے معنوی مناسبت ہے، صوتیاتی مناسبت نہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ادھر "اترتس" इतरतस سے لیا گیا ہے۔ سنکرت میں بصورت تکرار اترتس چ اترتہ (اترتس = یہاں + چ = اور + اترتہ = وہاں) بمعنی ادھر ادھر استعمال ہوا ہے۔ اس کلمے کا دوسرا جز "تر" بہت قدیم ہے۔ غالباً اس کی قدیم شکل "تھر" تھی (جیسا کہ اوستائی میں ہے) جس نے اردو میں "دھر" کی شکل اختیار کی۔

(۲) "اڑد" یا "اَرد" اردو میں ماش کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ گجراتی میں "اڑد" اور مرہٹی میں "اڈید" ہے۔ پلیٹس نے اس کی اصل نہیں بتائی۔ شبد ساگر نے سنکرت ردھ ऋद्ध اور پالی اُدھ उद्ध سے ماخوذ بتایا ہے۔ نوراللغات میں لکھا ہے کہ یہ ٹامل لفظ ہے۔ دراوڑ خاندان کی زبانوں میں اس کی حسب ذیل شکلیں ہیں :—

ٹامل = اُڑنتو (= کالا چنا) ملیا لم : اُڑنو، کنڑی : اُڑدو، اُددو۔ تلیگو : اُددو و لو۔ تولو :

اردو، کولامی: آرندے، نائیکی: آرن دل۔
ہیم چندر نے اپنی مشہور کتاب "دیشی نام مالا" میں اس کی پراکرت شکل آڈد उड्ड (۱:۹۸) دی ھے. سوال یہ ھے کہ اردو میں آرد کہاں سے آیا؟ سنسکرت "ردھ" اور پالی "آدھ" کا سراغ نہیں ملا۔ براہ راست دراوڑ زبانوں سے لئے جانے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آئی. ھاں، یہ ممکن ھے کہ پراکرت نے یہ لفظ دراوڑ خاندان کی کسی زبان سے لیا اور وھاں سے اردو میں چلا آیا. لیکن ڈاکٹر ٹرنر (ہند آریائی زبانوں کی تقابلی ڈکشنری حصہ اول۔ ص ۷۷) آڈد उड्ड (=غلہ) ایک قدیم ہند آریائی لفظ فرض کر کے اسے "آڑد" اور اس سے ملتے جلتے تمام الفاظ کا ماخذ قرار دیتے ھیں۔

"آپ" کے اردو میں دو استعمال ھیں،
ضمیر تاکیدی کے طور پر بمعنی خود، جیسے:

جو بت پرست ھیں ھو جائیں حق پرست وہ آپ

دوسرے ضمیر تعظیمی کے طور پر، جیسے:

چھوڑا اگر مجھے تو نہ پھر پائیے گا آپ

عام طور سے اردو "آپ" کی اصل پراکرت "اَپّا" (= خود) بتائی جاتی ھے جو قدیم ہند آریائی آتما आत्मा کی ایک شکل ھے۔ میرا خیال ھے کہ "اپ" بمعنی خود کی اصل پراکرت "اَپّا" ھے اور "آپ" ضمیر تعظیمی کی اصل پراکرت و قدیم آریائی اَپّ अप्प (= باپ)۔ چنانچہ آسامی میں "آپ" سے باپ کو خطاب کرتے ھیں یا بزرگ کو، جو گجراتی میں "آپو" (گڈریوں کی زبان) ہوگیا ھے اور مرہٹی میں "آپا"۔

تعداد و حالت

(یہ مضمون نمونۂ ''لغات اردو'' پر تبصرہ کے صفحہ دس سطر آٹھ اور نو سے متعلق ہے)

ڈاکٹر آمنہ خاتون

Satiric	ہجو یہ نظم ، ہجو یہ قصیدہ ، ہجو یہ شعر ہجو یہ اشعار
Schoolboy slang	وہ متبذل الفاظ جو اسکولوں اور مدرسوں میں رائج ہوتے ہیں
Scores of people	بہت سے اشخاص
Seaside	وہ مقامات جو سمندر کے کنارے یا قریب واقع ہوں

(ماخوذ از انگلش اردو ڈکشنری ، انجمن ترقیٔ اردو، حیدر آباد دکن)

لفظ خواہ کسی زبان کا ہو جب اس کی جمع قواعد اردو کے مطابق بنتی ہے تو حرف ربط کی موجودگی میں لفظ کے آخر ، وں ، بڑھاتے ہیں اور اگر لفظ عربی ہو تو اس کی عربی جمع لاتے ہیں۔ غیر زبان کی جمع پر ، وں ، نہیں بڑھاتے ، جیسے "نمازیوں سے مسجدوں کی رونق ہے"۔ مسجدوں کی جگہ مساجد کم دیں گے اور کوئی حرف ربط موجود نہ ہو تو عربی جمع لانا بےسود ہے، اس لئے "ہجویہ شعر" کم دینے کے بعد " ہجویہ اشعار " کہنا اور "متبدل لفظ" کی جگہ " مبتذل الفاظ " کہنا اور "بہت سے شخص"(۱) کی جگہ "بہت سے اشخاص" اور "مقام" کی جگہ " مقامات " کہنا بےسود ہے۔

اس جملے میں کہ "اوپر کے شعروں میں شاعروں نے خود بتایا ہے کہ مختلف آلات قتل سے انھوں نے کون کون سی چیزیں مراد لی ہیں"۔ (ہماری شاعری مصنفہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ، تیسرا اڈیشن صفحہ ۱۵۳) اگر " شعروں " کی جگہ " اشعار " اور " شاعروں " جگہ " شعرا " لائیں تو قواعد اردو کی کوئی غلطی یا ادائی مطلب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہاں سوال صرف یہ رہ جائے گا کہ ان دو عبارتوں میں فصیح تر کون سی ہے، کیونکہ

(۱) ۔ اس مضمون کی اساس ایک غلط فہمی پر ہے اور وہ یہ کہ قواعد زبان کا وہ حصہ جو جملوں اور عبارتوں میں الفاظ کی ترکیب سے متعلق ہے اس کا مقصد محض اتناسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے تعلق اور تذکیر و تانیث و وحدت و جمع کے نقطۂ نگاہ سے اسما و صفات کا افعال سے تطابق پرکھا جاسکے ۔ لیکن یہ بات کہ کس جگہ لفظ کی اردو جمع بولنا اور کس موقع پر عربی یا فارسی جمع استعمال کرنا فصیح یا فصیح تر ہے، اس کا تمام تر تعلق زباں دانوں اور ادیبوں کے روز مرہ اور بول چال سے ہے جس کو صرفی یا نحوی قواعد کی زنجیروں میں جکڑا نہیں جاسکتا۔ اسے کلیہ قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا کہ ''بہت سے'' کے بعد عربی جمع کے بدلے واحد ہی استعمال کیا جائے کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ غیر فصیح ہوگا۔ مثلاً '' بہت سے اصحاب موجود تھے '' کی جگہ اگر یہ کہا جائے کہ '' بہت سے صاحب موجود تھے '' تو یہ جملہ روز مرہ کے خلاف ہے ۔ یہی صورت '' بہت سے شخص '' کی ہے کیونکہ ''بہت سے شخص کہتے تھے '' کوئی نہیں بولتا ۔

بعض وقت وں کی تکرار (۱) مخل فصاحت ہوتی ہے، لیکن اسی کتاب کے اس جملے میں کہ " اس بند کے چار مصرعوں میں ابتدائی اور آخری الفاظ ایسے لائے گئے ہیں جن میں سے دو دو لفظوں میں صنعت مقلوب ہے" (صفحہ ۱۰۷) "الفاظ" بے سود ہے، اس کی جگہ "لفظ" کافی تھا، لیکن قابل داد (۲) بات یہ ہے کہ ساری کتاب میں یہی ایک مقام ہے جہاں ادیب صاحب کو سہو ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو زبان کا یہ گر معلوم ہے اور انہوں نے قدم قدم پر اس کا خیال رکھا ہے۔ اردو کے جن مستند ادیبوں کی اردو اپنی سلاست اور شستگی کی وجہ سے مقبول عام ہے وہ اپنی تحریروں میں عربی الفاظ کی جمعیں بے محل استعمال نہیں کرتے اور میری دانست میں انشاپردازی میں اگر صرف اسی ایک بات کا لحاظ رکھا جائے تو اردو عربی کی گراں باری سے سبکدوش ہوجائے گی (۳)۔ خواجہ حالی کے اس جملے میں " یہ بھی اپنی تصنیفات میں نظم ہو یا نثر خوب دل کے بخارات نکالتے تھے" تصنیفات، تصانیف، مصنفات اور تصنیفوں میں کوئی ایک لفظ حرف ربط " میں " کی موجودگی میں ناگزیر ہے، لیکن "بخارات" (۴) کی "ات" حذف بھی کر دی جائے تو جمع کا وہی مفہوم نکلتا اور بخارات کا لفظ چان لینے کے بعد بھی طالب علم کو عربی قواعد ہی آئی نہ اردو۔

خواجہ حالی کا ایک اور جملہ ہے " اپنی مےخواری و توبہ شکنی وخرابات نشینی پر فخرکرنا اور اہل تقویٰ اور اہل شرع کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے .... یہ مضامین بھی غزل کے اجزا سے غیر منتفک قرار پاگئے ہیں" (صفحہ ۱۳۲، مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۸۹۳ء)۔ جب اردو میں " عیب نکالنے " صحیح ہے تو مضامین کی جگہ "مضمون. . . . قرار پاگئے ہیں" بھی صحیح ہے۔

بعض جگہ عربی جمع کا استعمال اردو کو مضحکہ خیز بنا دے گا، مثلاً حالی کے اس جملے میں دماغ کی جگہ ادمغہ لانے سے جملہ مضحک بن جاتا ہے۔ " اخلاق کی خوشبو سے موجودہ اور آئندہ دونوں نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا سامان مہیا کر جائے، صفحہ ۱۷۷" اور بعض مقاموں (۵) میں جملہ ہی مہمل ہوجائے گا. جیسے اس جملے میں جوہر (۶) کی جگہ جواہر لانے سے "اگرکسی نے

(۱) تذکیر غریب اور تانیث عام طور سے فصحا میں متداول ہے۔

نام شبیر کی ہوتی ہے جو تکرار جلیل لذت قند مکرر مرے اشعار میں ہے

(۲) اس جگہ " داد " ترکیب فارسی میں درست نہیں کیونکہ یہ اس معنی میں فارسی نہیں بلکہ اردو ہے

(۳) بعض جگہ بالکل بھدی اور بھونڈی بھی، مثلاً " اس کے حواس بجا نہ تھے " اگر اس جملے میں " حاسے بجا نہ تھے " کہا جائے تو سلاست اور شستگی میں فرق آجائے گا۔

(۴) بحث عربی جمع کے استعمال سے متعلق ہے مگر یہ عربی جمع نہیں، اردو دانوں نے بنالی ہے، عربی جمع ابخرہ ہے۔

(۵) مقامات "پر" زیادہ فصیح ہے۔

(۶) "جوہر" اصلاً عربی ضرور ہے مگر اس معنی میں اردو (منقول) اور اردو محاورے کا جز ہے ایسا لفظ مقام اشتہاد میں مستند نہیں۔ (ادارہ)

زیادہ جوہر دکھانے چاہے تو وہ مدح سے پہلے ایک تمہید لکھتا ہے "۔ محمد حسین آزاد جہاں کہیں عربی کی جمعیں استعمال کرتے ہیں، وہاں ایسی صفائی (۱) سے انہیں لاتے ہیں کہ عربی کی جمعیں بھی آجائیں اور قواعد اردو بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے، مثلاً " جاپانیر کا قلعہ بڑا مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی اکثر وہاں رہتا تھا اور تمام خزائن و دفائن وہیں رکھتا تھا"۔ "سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انہی کی زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں"۔ (آب حیات)

ان جملوں کے خط کشیدہ الفاظ میں اگر فارسی کی ترکیبیں نہ ہوتیں تو خزائن و دفائن کی جگہ خزانے اور دفینے اور علوم و فنون کی جگہ علم اور فن صحیح تر اور فصیح تر ہوتے۔ علوم و فنون میں آزاد معطوف اور معطوف علیہ کو دو مستقل چیزیں سمجھتے ہیں، اس لئے میں نے اس کا اردو مترادف علم اور فن لکھا ہے ورنہ علم و فن بہ عطف فارسی کو اگر ایک چیز خیال کریں تو معطوف کی رعایت سے یہ لفظ اردو میں واحد اور جمع میں مشترک ہے مثلاً مسلمانوں کے بیسیوں علم و فن آج معدوم ہو رہے ہیں ۔ ناسخ کے اس شعر میں

حال دل کہنے کی ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

میں یہ نہیں کہتی کہ اشعار کا لفظ غلط ہے بلکہ بے سود اور قواعد اردو کے خلاف (۲) ہے ۔ اگر ناسخ اشعار کی جگہ شعر کا لفظ استعمال کرتے جیسا کہ اس شعر میں خود انہوں نے استعمال کیا ہے:

اس زمیں میں ناسخ اب مستانہ پڑھئے چند شعر (۳)
ہے بغل میں شیشۂ مے ہاتھ میں پیمانہ ہے

تو قواعد اردو کے مطابق ہوتا ۔ اگر کہا جائے کہ شعر کی جگہ اشعار کا لفظ لانے سے عوام کو سمجھنے میں سہولت ہوگی کہ یہ جمع کا صیغہ ہے تو اس خیال کی غلطی دوطرح ثابت ہے ۔ پہلی یہ کہ ہم ہندوستانیوں کو اردو سکھا رہے ہیں نہ کہ عربوں کو اور دوسری یہ کہ سیاق (۴) و سباق جو قواعد اردو میں سب سے اہم چیز ہے نظر انداز ہوگیا ۔

عربی الفاظ کے بارے میں جو اردو میں منصرف ہیں، میرا خیال ہے کہ چون کہ (۵) ان کے آخر میں الف یا اس کا کوئی ہم آواز حرف ہوتا ہے اور جمع میں یہ یا ے مجہول سے بدل جاتا ہے، یعنی اصل لفظ حذف و ازدیاد کے بغیر بذاتہ جمع کے معنی دینے کی قدرت (۶) نہیں رکھتا تو اس کی جگہ

---

(۱) بیشتر عطف یا اقتباسات کے ساتھ

(۲) خلاف نہیں بلکہ ضروری ہے "اشعار" کی جگہ شعر کہہ کر دیکھئے اور مصرع یوں پڑھئے
پھینک جاتا ہے وہ شعر ترے کوچے میں　　تو اس سے جمع کے معنی مفہوم نہیں ہوسکیں گے ۔

(۳) یہاں "چند" کی وجہ سے شعر (واحد) کہہ دینے میں قباحت نہیں کیونکہ جمع کے معنی "چند" کی وجہ سے پیدا ہوگئے۔

(۴) لفظ کے واحد و جمع استعمال کرنے میں صرف "سباق" کو دخل ہے "سیاق" کو نہیں۔ اس شعر میں کلمات سابق سے جمع ہونے کی جانب اشارہ نہیں ہوتا ۔

(۵) چونکہ　　(۶) صلاحیت　　(ادارہ)

عربی کی جمع لانا ابتذال میں داخل نہیں ، البتہ اردو کی جمع لانا فصیح تر ہوگا، مثلاً

باندھ اور قوافی بھی کچھ اک ایسے کہ انشا
جس سے کہ بپا غلغلہ' وا عجبا ہو
انشا بدل کے قافیے اشعار تازہ لکھ (۱)
اور اس میں تو معانی عاشق پسند باندھ

ناسخ

دوائر حرفوں کے بنتے ہیں طوق گردن قمری
رقم کرتا ہوں گر مضمون اپنے سرو دل جو کا

رشک

قصہ کو تاہ ہوا مر کے چھٹا جھگڑوں سے
اب کسی سے نہیں اے رشک قضایا ہم کو

ان اشعار میں قوافی اور قافیے ، دوائر اور دائرے ، قضایا اور قضیے ساخت کے اعتبار سے مبتذل ہونے میں برابر برابر ہیں (۲) ۔ البتہ قواعد اردو کے لحاظ سے قافیے، دائرے اور قضیے فصیح تر ضرور ہیں ، اسی طرح مونث الفاظ کی اردو جمع لانے کی عوض عربی جمع لانا ابتذال میں داخل نہیں ، مثلاً رشک :

نہ وہ بندش نہ وہ لفظیں ہیں پرانی اے رشک
شعر گوئی میں تمہیں سب سے نیا پاتے ہیں
مجھ کو بھاتے ہیں وہ الفاظ جو ہوں پہلودار
تازہ مضمون ہے وہ نکلے اگر بات میں بات

رشک کے نزدیک ' لفظ ، مونث ہے اور دوسرے شعر میں لفظیں کی جگہ الفاظ لایا ہے ، اس لئے یہ مبتذل نہیں ۔ اگر کوئی دلی کا شاعر دوسرے شعر میں الفاظ لاتا تو ضرور مبتذل ہوتا ۔ یہی بات شیخ ناسخ کے اس شعر میں ہے :

سر پٹکتی پھرتی ہیں ارواح سنگ وخشت سے
چل بسے ہیں جسم کیا کیا قصر دیوان چھوڑ کر

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں میری تالیف " لطائف السعادت ۱۹۵۵ " میں " دو ٹکر پر انشا کا اعتراض " صفحہ ۱۰۸-۹ ۔ ندائی حالت میں اگر واحد مذکر اسم کے آخر میں الف یا ہ ہو تو وہ یائے مجہول سے بدل جاتے ہیں جیسے "لڑکے ! شور نہ کر" اور جمع میں آخر کا نون گرجاتا ہے، جیسے "لڑکو! شور نہ کرو ، لڑکو ! چپ بیٹھو ، صاحبو ! غور سے سنو" (قواعد اردو ۱۹۴۰ صفحہ ۵۰)

		لفظ	حالت مفعولی	لفظاً	تقدیراً
منصرف	واحد	لڑکا	پکارتا ہوں میں لڑکے کو	اے لڑکے	لڑکے
	جمع	لڑکے	پکارتا ہوں میں لڑکوں کو	اے لڑکوں (۳)	لڑکوں
غیر منصرف	واحد	خدا	پکارتا ہوں میں خدا کو	اے خدا	خدا
	جمع	خدا	پکارتا ہوں میں خداؤں کو	اے خداؤں	خداؤں

حرف ندا اے جو پکارتا ہوں میں (ادعو) کا قائم مقام ہے کبھی مذکور ہوتا ہے اور کبھی مقدر اور علامت مفعول ہمیشہ حذف ہوجاتی ہے اور یہ جو سرسید کے زمانے تک خطابت میں مسلمانو کی جگہ مسلمانوں کہہ دیتے تھے قواعد کے عین مطابق ہے . آج واو کا غنہ حذف کردیتے ہیں . منادیٰ

(۱) انشا نے " قافیہ" (واحد) کہا ہے اور اسی کی یہاں ضرورت ہے "قافیے" (جمع) یہاں درست نہیں۔
(۲) "برابر" تکرار کے ساتھ اس معنی میں جو یہاں مراد ہیں مستعمل نہیں ۔
(۳) "اے" کے بعد "ں" لکھنا درست نہیں ۔ (ادارہ)

مفعولیہ کی ان اقسام میں داخل ہے جن میں فعل وجوباً حذف کیا جاتا ہے اس لئے حالت ندائی کا ذکر حالت مفعولی کے تحت آنا چاہئے۔ حالت ندائی حالت مفعولی سے علٰحدہ مستقل طور پر کوئی چیز نہیں۔

حاصل یہ کہ منادیٰ اگر جمع ہو تو علامت مفعول کی وجہ سے آخر میں 'وں'، بڑھانا یا منادیٰ کی عربی جمع لانا دونوں برابر ہیں جیسے ناسخ اس شعر میں طفلوں کی جگہ اطفال لائے ہیں:

ہو گیا مرتے ہی میرے سرد بازار جنوں
آج اے اطفال کوئی سنگ داماں میں نہیں

عربی کی بعض جمعیں اردو میں جن معنوں میں مستعمل ہیں، ان کے واحد ان معنوں میں نہیں آتے، اس لئے اس قسم کے غیر منصرف لفظ واحد اور جمع میں مشترک نہیں ہوتے، مثلاً اقربا بمعنی رشتہدار جمع میں آتا ہے واحد میں نہیں جیسے ''خالد اور زید میرے قریب (بمعنی اقربا) ہیں'' نہیں کہتے۔ خلاصہ یہ کہ جب (۱) لفظ منصرف ہے جیسے قافیہ (۲) مونث ہے جیسے روح (۳) منادیٰ ہے جیسے اے طفل (۴) کسی لفظ کے واحد اور جمع کے صیغوں میں معنے کا اختلاف ہے جیسے اقربا و قریب، تو جمع لانا جائز ہے۔ (۱)

نگار ستمبر ۳۹ع میں منقش صاحب نے آتش کے اس شعر پر:

اس کی رسوائی بھلا مدنظر کیوں کرکریں
میرے ماتم میں عزیزاں چشم تر کیوں کرکریں

اعتراض کیا ہے کہ اس میں عزیزاں کی جگہ اعزا چاہیے، یہ اعتراض درست نہیں، یہاں دونوں لفظ مبتذل ہیں، صرف عزیز کافی ہے۔ اگر اعزا صحیح ہے تو عزیزاں فارسی کی جمع کیوں غلط ہے! ضرورت کے تحت وزن شعر کی رعایت داخل نہیں کیوں کہ قادر الکلام شاعر کے لئے ابتذال سے بچنا ضروری ہے اور نثر میں تو ان چار (۲) موقعوں کے سوا کسی اور موقع میں عربی الفاظ کی جمع لانا قواعد اردو کے خلاف ہے۔ '' رند باغ میں انار توڑ رہے تھے، کی جگہ رنداں (۳) باغ میں انارہا توڑ رہے تھے، کیوں نہیں کہتے! اس جملے میں رنداں اور انارہا جس قدر مبتذل ہیں اسی قدر انشاؔ ناسخ اور رشک کے اشعار میں خط کشیدہ لفظ متبذل یعنے 'بے سود'' ہیں۔

اس معیار پر انشا کے کلیات میں اشعار کا لفظ چھ جگہ اور اشخاص کا لفظ ایک جگہ متبذل ہو گیا ہے۔ انشاؔ جیسے عربی داں کے ایک ضخیم کلیات میں صرف دو الفاظ کی جمع خلاف

---

(۱) حصر نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً اس جملے میں ''ایسی باتیں ان کے اخلاق سے بعید ہیں'' ''اخلاق'' (جمع) کو ''خلق'' (واحد) پر بہر حال ترجیح ہے حالانکہ ''اخلاق'' نہ منصرف ہے نہ مونث، نہ منادیٰ اور نہ واحد (خلق) اور جمع (اخلاق) کے معنی مختلف ہیں۔

(۲) اس جگہ پانچویں شرط یہ بھی دوہرانا چاہئے کہ جمع عطف یا اضافت کے ساتھ ہو جیسا کہ اوپر آزاد کی مثال کے ذیل میں کہا گیا ہے۔

(۳) زبان اور روز مرہ میں قیاس کو دخل نہیں ہوتا بلکہ زبان دانوں کا استعمال دیکھا جاتا ہے۔ (ادارہ)

اصول استعمال ہوئی ہے (۱) حال آں کہ سیکڑوں جگہ جمع کے صیغے استعمال ہوسکتے تھے۔

دیوان ناسخ جلد اول میں اشعار چھ جگہ حروف اور اوراق ایک ایک جگہ اور مضامین دو جگہ مبتذل ہو گئے ہیں۔ میرے پاس جو دیوان رشک ہے، اس کا اول و آخر چٹ ہے ص ۵۰ سے ص ۲۶۰ تک "اشعار" نو جگہ اور نیچے لکھے ہوے چھ لفظ ایک ایک جگہ مبتذل ہوگئے ہیں:
اوصاف، امراض، اعضا، حروف، شعرا، مضامین

انشا نے قواعددانی کا حق ادا کیا ہے۔ ناسخ بھی کافی محتاط ہیں لیکن رشک کچھ قابل رشک نہیں۔ اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے قواعد اردو کے لئے نہایت مفید ہوگا۔

انشا کے وہ شعر جن میں عربی الفاظ کی جمعیں مبتذل ہو گئی ہیں:—

جس نے سنے یہ میرے اشعار خوش ہو بولا
نام خدا ہے تو کچھ اے نو جوان تماشا
آزادوں کے لہجے میں غزل تونے سنائی
از بہر تفنن
اب اپنی تو بولی کے کچھ اشعار کہہ انشا
ہو جس میں ظرافت

میر و قتیل و مصحفی و جرأت و مکیں
ہیں شاعروں میں یہ جو نمودار چار پانچ
سو خوب جانتے ہیں کہ ہر ایک رنگ کے
انشا کی ہر غزل میں ہیں اشعار چار پانچ
قافیے اور نئے سوجھے ہیں مجھ کو انشا
جن میں اشعار کئی رنگ کے ڈھل سکتے ہیں
سن کے یہ اشعار مرے کہتے ہیں یہ اہل رشک
کوئی اس کو کیا کرے یہ تو خدا کی داد ہے
کچھ اور ڈھب کے اب اشعار ایسے لکھ انشا
کہ جس سے طبع سخن سنج مستقل لپٹے
دوستداران علی سے جو ہوں اشخاص ان کو
دخل ہے یہ کہ کرے مس لہب نار کی آنچ

ناسخ کے شعر جن میں عربی الفاظ کی جمعیں مبتذل ہوگئی ہیں:—

ساغر مے ہے دوات اپنی نئے مطرب قلم
لکھتے ہیں اشعار دیوار و در خمار پر
حال دل کہنے کی ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں
عوض افسوں کے جادوگر مرے اشعار پڑھتے ہیں
کہ وقت فکر، دل رہتا ہے اس کی چشم جادو میں
اس زمیں میں یوں ہی اشعار پڑھے جا ناسخ
دل کے بہلانے کی اور اب کوئی تدبیر نہیں
فراق میں مرے اشعار ایسے ہیں پردرد
کہ سامعین عرض واہ آہ کرتے ہیں

---

(۱) اگر یہ اصول درست ہے تو اس اصول کے خلاف انشا نے صرف اشعار اور اشخاص ہی نہیں بلکہ اور بھی بیسیوں عربی جمعیں استعمال کی ہیں مثلاً:

گرچہ افلاک کے سب پھونک دے اطباق آتش
دوستوں کی ہوئی عینین کے احداق آتش

یا سب اورات میں ہر آن رفیق و ارفق
یا یہ حریم کوئے جاناں ہے مقام آداب کا
(لغت ناسخ کے نزدیک مذکر ہے)
یا رحم کر عشاق پر گر چاہئے عمر دراز

اسی طرح ناسخ (دیوان اول) کے ان اشعار میں:
یا مطلب ہے ایک فرق فقط ہے لغات کا
یا ہجر میں روئیں نہ کیوں رونے کے یہ ایام ہیں

ان اقتباسات کے خط کشیدہ الفاظ عربی کی جمعیں ہیں اور ان میں وہ شرطیں نہیں پائی جاتیں جو اس مضمون میں ایسی جمع کا استعمال جائز ہونے کے لئے درج کی گئی ہیں (ادارہ)

یہ ہیں اشعار شور انگیز اک طرب کی الفت میں
کہ اوراق اپنے دیواں کے مشابہ ہیں جلاجل سے

معنے ثمر حروف ورق صنعتیں ہیں گل
ناسخ ہے کلک فکر نہال سخن کی شاخ

ایسے لکھ رنگیں مضامیں ناسخ نازک خیال
یک قلم اوراق گل ہوں دفتر اشعار میں

رشک کے وہ شعر جن میں عربی الفاظ کی جمعیں مبتذل ہو گئی ہیں :

صفت سرو کے اشعار سنا کرتا ہے
قمری قامت موزوں مجھے شاید سمجھا

اے رشک وہ فرماتے ہیں سن کر مرے اشعار
ہے نسبت اقران و اماثل بہت اچھا

جس ورق میں تھے تری سیم تنی کے اشعار
یک قلم اس میں ہوی سونے کی تحریر سفید

ہوں وہ افسردہ مرا چرچا عزاخوانوں میں ہے
پڑھتے ہیں اشعار میرے مرثیہ خواں اس برس

زباں اپنی ہے کیا کم جو کیجئے تقلید
کہیں جو فارسی اشعار ہم نہیں واقف

اے رشک غزل ہو کہ قصیدہ ہو کہ قطعہ
اچھے ہوں تو دو چار بھی اشعار بہت ہیں

صاف اشعار کئی اور سناؤں اے برق
اور کیا ہے دل صاف شعرا کے گھر میں

تری چکنی باتوں کی مدحت کے اشعار اے صبیح
چھان کر لکھتا ہوں اوراق بیاض شہر میں

جس دم آجاتے ہو اے رشک غزل گوئی پر
نئے انداز کے اشعار سنا دیتے ہو

چانپیں چڑھوائیں سنے جب کہ لوڑوں کے اوصاف
پائے پر مدحت پاسن کے تپنچہ کھینچا

سارے امراض ہوں اے شافع مطلق اچھے
مرض عشق دلوں میں یونہی ساری رکھنا

دھن کمر کی طرح سارے تیرے اعضا ہیں
قیاس و وہم سے باہر گماں سے باہر

افسانہ میرے عشق کا ہے جا بجا غلط
لفظیں غلط حروف غلط مدعا غلط

پھبتی شعرا کہتے ہیں اس گوشہ نشیں پر
مضمون غم و درد کا ہے بیت حزن میں

نہ دھن ہی نہ کمر ہی کے مضامین بندھیں
کھل گئی اے بت معدوم کمر، تیری بات

التماس

جن اصحاب کے پاس اردو نامہ شمارہ اول کی زائد کاپیاں ہوں، وہ براہ کرم قیمتاً عنایت فرمائیں۔ دفتر اردو نامہ کو اس شمارے کی ضرورت ہے ۔

منیجر

تبصرے

اردو نثر کا آغاز اور ارتقا
۱۹ ویں صدی کے اوایل تک
مولفہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
طبع اول
ناشر مجلس تحقیقات اردو
حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن میں اردوادب پر خواتین بھی خوب کام کررہی ہیں. چنانچہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اردو نثر پر یہ بڑی اچھی کتاب لکھی ہے ، جس میں بعض کتابوں اور مصنفین کے متعلق نئی معلومات کا اضافہ کیا گیاہے ، اور یقیناً بڑی محنت سے تمام ضروری مواد یکجا کردیا گیا ہے ، جو ادب کے مطالعے اور تحقیق دونوں صورتوں میں مفید ثابت ہوگا. ہم موصوفہ کو آن کی اس گراں قدر تالیف پر مبارکباد پیش کرتے ہیں . افسوس ہے کہ اردو نثر کی یہ تازہ ترین تالیف ، جو یقیناً دوسری تالیفات سے زیادہ مکمل ہے ، صرف ۵۰۰ کی تعداد میں شایع ہوئی ہے جو اردو دنیا میں علم و ادب کی قدر دانی کا کوئی اچھا ثبوت مہیا نہیں کرتی ہے ، البتہ ممکن ہے کہ اس کتاب کو قصداً محدود تعداد میں چھپوایا گیا ہو ، تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اور مواد داخل کیا جاسکے جو ابھی تک مولفہ کی دسترس میں نہیں آسکا ، اوران مقامات پر نظر ثانی بھی ہوجائے جہاں کچھ ترمیم و اصلاح کی گنجائش باقی رہ گئی ہے . اسی ضرورت نیز موضوع کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے ، مولفہ کی محنت کے پیش نظر ہم ذیل میں چند مقامات کی نشان دہی کررہے ہیں .

صفحہ (۲) پر شہر یار بزرگ کی تصنیف کا سنہ ۱۰۱۳ء (۳۰۰ھ) درج ہے. مگر بہ لحاظ مطابقت سنہ عیسوی ۴۰۲ھ ہونا چاہئے . محترمہ تحریر فرماتی ہیں کہ مولف 'عجائب الہند ، کا بیان ہے کہ الور کے راجہ کے زمانے میں ایک عرب نے ہندی میں قصیدہ لکھا تھا اور قرآن کا ترجمہ بھی ہندی زبان میں کیا تھا. یہ '' الور ،، ہندوستان کے کس مقام پر ہے ، اسکی صراحت نہیں کی گئی . کیا یہ شہر الور ، سندھ کا مشہور شہر تو نہیں جس کو راجہ دیو رائے برہمن آباد نے اپنا پایہ تخت بنایا تھا ، اور جس کے بھائی نے اسلام قبول کیا تھا ؟ یا یہ وہ 'ارور ، تو نہیں جس کے راجہ کے زمانے میں ایک عراقی عالم نے ، قرآن مجید کا ترجمہ سندھی زبان میں ، نہ کہ ہندی میں تقریباً ۲۷۰ھ میں کیا تھا .
('' تاریخ سندھ ،، ابو ظفر ندوی - صفحہ ۳۶۲ و 'عجایب الہند ، صفحہ ۳ - (لائیڈن) .

احسن التقاسیم مولفہ شباری کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ عرب ہندوستانی عورتوں سے شادی بیاہ کرتے تھے، اس لئے ان کو ہندوستانی نام اور خطاب سے دلچسپی تھی ، مگر احسن التقاسیم کا سنہ تصنیف درج نہیں ہے ۔ محترمہ نے محمود غزنوی کے ایک نقروی سکہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ اس پر مخلوط سنسکرت عربی فارسی الفاظ درج تھے ، مگر یہ صراحت نہیں کہ یہ سکہ کسی عجائب خانہ میں ہے یا کسی کے پاس ہے (صفحہ ۳).

. اسی طرح ''ہمیرراسو''، کے سنہ تصنیف یا زمانے کا تعین نہیں کیا گیا ہے (صفحہ ۹)، نیز محترمہ نے محمود غزنوی کے حریف پرتھی راج کے ایک پروانہ کا ذکر نہیں فرمایا جس میں اردو الفاظ ملتے ہیں. (ہندی بھاشا از ایودھیا سنگھ هری) صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے کہ حضرت بابا فرید کے ہندی اذکار ''جواهر فریدی''، میں درج ہیں ۔ جواهر فریدی کا سنہ تصنیف تو درج نہیں ، البتہ جواهر خمسہ کا ۱۰۹۷ھ کا حوالہ ہے. مگر حضرت سید اکبر حسینی کی تصنیف 'تبصرة الاصطلاحات' میں بھی تو بابا فرید کے ہندی اذکار کا حوالہ ملتا ہے جو غالباً سب سے قدیم ہے ، بلکہ مولانا زین الدین دولت آبادی کی مشہور کتاب ''هدایت القلوب'' میں بھی بعض دوهے موجود ہیں . محترمہ نے بعض ہندی تصانیف کا شاید بذات خود مطالعہ نہیں فرمایا، البتہ زمانۂ موجودہ کی بعض تالیفات ، مولفہ رامچندر شکل سے اخذ کرکے بعض ہندی نثر کی عبارتوں کے ذریعے سے اردو کے ارتقا کو ثابت کیا ہے (صفحہ نمبر ٦).

لایق مولفہ نے بموجب بیان مولفین مثلاً مولانا حامد حسن قادری وغیرہ ''دہ مجلس''، فضلی کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے. مگر اس کا اظہار نہیں فرمایا کہ یہ کتاب اب دستیاب ہے اور دهلی یونیورسٹی سے شائع ہو چکی ہے. اس کا زمانۂ تصنیف ۱۱۴۵ھ ہے مگر دکن میں اسی طرز کی اور ایک کتاب "وسیلۂ النجات" بھی ہے جو ۱۱۱۲ھ میں تالیف ہو چکی تھی . مصنف کا نام حسن بیگ شاهجہاں پوری ہے مگر زبان دکنی ہے . اس کا مخطوطہ کتب خانۂ سالار جنگ میں محفوظ ہے . (ملاحظہ ہو فہرست توضیحی سالار جنگ ، مرتبہ هاشمی صاحب ، و "تاریخ ادب اردو" جلد اول مطبوعہ پاکستان پبلیکیشنز کراچی، (صفحہ ۵۶۳)۔ تعجب ہے کہ کتاب مذکور فاضل مولفہ کی نظر سے نہیں گزری . صفحہ (۲۹) پر محترمہ نے لکھا ہے کہ بقول مولانا حامد حسن قادری اردو نثر کا پہلا کارنامہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کا ہے جو ۷۰۸ھ کا تصنیف کردہ ہے ، مگر سوال یہ ہے کہ حضرت اشرف سمنانی رحہ ہندوستان کب تشریف لائے ؟ حضرت موصوف نے ۸۰۸ھ میں وفات پائی ہے تو اس رسالہ کی تصنیف کے وقت آپ کی عمر شریف کیا تھی ؟ غور طلب یہ ہے کہ کیا آپ نے یہ رسالہ وفات سے سو سال قبل لکھا تھا ؟

فاضل مولفہ نے ایک اور قدیم کتاب (فارسی شرح) ''جنونیہ''، کا حوالہ دیا ہے جو عجائب

خانہ بیجا پور میں ہے ، اور میوزیم کے کیٹلاگ میں سنہ کتابت ۹۵۷ھ درج ہے ۔ مگر مولفہ کو یہ سنہ دریافت نہیں ہوسکا ۔ مولفہ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ ایک مجموعہ رسایل ہے جس میں پندنامہ اورچکی نامہ بھی ہے، اورایک مقام پر کاتب نے ۵۰۰ھ درج کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مولفہ کو سنہ کے پڑھنے میں سہو ہوا، بعض قدیم کتابوں میں سنہ کے لئے عربی‌ہند سے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

فاضل مولفہ کو مصنف کے نام کی قراٴت میں بھی تسامح ہوا ہے ۔ مصنف کا نام کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ میں بجائے محمدو خاں کے ''محمد وفا'' درج ہے اوریہی نام کتب‌خانہ سالارجنگ کے نسخہ میں بھی ہے ۔ فاضل مولفہ نے مصنف کے حالات دریافت کرنے کی سعی کی مگر کوئی صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ اس رسالہ کا نام مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کے خیال میں ''چنونیہ'' ہے ۔ دکن میں ایسے نام مثلاً میاں چنو، یا جنو ہوتے ہیں ۔ غالباً نام ہی کی مناسبت سے شارح نے اس کا نام 'چنونیہ ' یا چنونیہ رکھا تھا۔

دوسری اہم چیز یہ ہے کہ مولفہ نے اس فارسی شرح کے اردو جملوں کی مطابقت حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ کے منسوبہ رسالہ " شکارنامہ " سے نہیں فرمائی ، جس میں اسی قسم کے استعارے اورعبارتیں ملتی ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ شکارنامہ یا اس کے کسی جزو کے بعض استعاروں کی شرح ہو ، مثلاً " یو رسالہ بات کی بات کرامات کی کرامات ، کانٹے پر تین تلاؤ اس میں دو سوکے ایک میں پانی نہیں" الخ ۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ کے ایک مجموعہ رسایل نمبر ۶۲ مصنفہ حضرت امین الدین اعلیٰ وغیرہ کی تصانیف کے ساتھ شیرازہ بند ہے ۔ "شکارنامہ" (۱) بھی وہاں موجود ہے ۔ محترمہ نے کتابت کے جو سنین دیئے ہیں وہ خود ان کی رائے میں مشتبہ ہیں ، یہ گیارھویں صدی کے اواخر کی تالیف معلوم ہوتی ہے ۔ ایک بزرگ خواجہ محمد وفا خلیفہ حضرت ابوالعلاٴ اورنگ آباد میں بھی گذرے ہیں ۔ " شکارنامہ " فارسی حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کی کئی شرحیں مختلف بزرگوں نے لکھی ہیں نیز حیدرآباد کے ایک فاضل اجل مرزا قاسم علی بیگ اخگر مرحوم نے بھی لکھی تھی ، جو مجموعہ یازدہ رسایل حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ (مطبوعہ) میں شامل ہے ۔

(یازدہ رسایل خواجہ بندہ نواز قدس سرہ کتب خانہ ترقیٴ اردو بورڈ ، کراچی)

صفحہ (۹۵) پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ عین‌الدین گنج‌العلوم قدس‌سرہ کے اردو رسالے ناپید ہیں ، صرف حکیم شمس‌اللہ صاحب نے حوالہ دیا ہے جو فورٹ سینٹ جارج مدراس میں موجود تھے ، تو پھر فورٹ سینٹ جارج کی فہرست کا پتہ چلانا چاہئے۔ مولوی ہاشمی صاحب کا اس کو نظر انداز کر دینا کچھ درست نہیں معلوم ہوتا ۔ ممکن ہے کہ آیندہ کبھی پتہ چل جائے ۔

صفحہ (۶۰) پر مولفہ نے شاہ راجو‌ؒ کے ایک رسالے کا حوالہ دیا ہے اور نمونہ بھی درج فرمایا ہے۔

(۱) جناب مبارزالدین رفعت لکچرار گلبرگہ کالج (میسور اسٹیٹ) نے حال ہی میں اسے مرتب کر کے شایع کیا ہے (ادارہ)

دکن میں شاہ راجو نام کے کئی بزرگ خصوصاً حضرت خواجہ بندہ نوازرح کی اولاد میں ہیں۔ ایک تو شاہ راجو قتال حضرت کے والد ماجد تھے، دوسرے شاہ راجو بیجاپوری حضرت شاہ راجو گولکنڈوی کے جد امجد بھی تھے، مگر فاضل مولفہ نے ان کو شاہ راجو قتال برادر حضرت مخدوم جہانیاں اوچی سے مخلوط کردیا ہے اور محترمہ نے جو نمونۂ نثر دیا ہے وہ تو حضرت سید محمد شاہ میر رائیچوری متوفی ۱۱۸۶ھ کی تصنیف اسرارالتوحید سے ملتا جلتا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت شاہ میررح کے کسی مرید نے اس کو بطور سوال و جواب مرتب کیا ہو۔ تعجب تو یہ ہے کہ محترمہ نے حضرت راجو قتال والد ماجد حضرت خواجہ بندہ نوازرح کا سنہ وفات ۷۹۵ھ درج کیا ہے اور یہ بھی کہ جب حضرت خواجہ صاحب رح ۸۰۱ھ میں دکن تشریف لائے تو والد ماجد یعنی حضرت راجو قتال بھی، ہمراہ تھے اور برکات الاولیا سے اس کی سند لی گئی جو صدیوں بعد کی تالیف ہے۔ "سیر محمدی" مصنفہ میر محمد علی سامانی خلیفہ حضرت گیسو دراز (تالیف ۸۳۱ھ) نیز "تاریخ حبیبی" مولفہ عبدالعزیز ابن شیر ملک (تالیف ۸۲۸ھ میں) یہ لکھا ہے کہ حضرت سید گیسو درازرح بعد وفات پدر بزرگوار اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی سے استفادہ کے لئے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ "تحفۃالنصایح" کے اصلی مصنف کے متعلق رائے مختلف فیہ ہے۔ اس میں سنہ تصنیف ۷۹۵ھ درج ہے۔ مگر اس کا ایک نسخہ جو کتب خانہ روس میں ہے، اس میں سنہ تصنیف ۷۵۲ھ درج ہے۔ (ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ جامعہ بمبئی، مولفہ پروفیسر عبدالقادر سرفراز. مطبوعہ)۔ "تحقیقات چشتی" میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ راجو قتال پنجاب میں بھی گزرے ہیں جو حضرت روشن چراغ دہلوی کے مرید تھے۔ اسی طرح حضرت راجو قتال کا ایک دیوان بھی ہے جس کے نسخے دکن میں اور پٹنہ لائبریری میں بھی موجود ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری نے رسالہ معاصر میں اپنے مضمون دیوان راجو قتال میں لکھا ہے کہ راجو قتال حضرت قطب الدین محمود مانکپوری کی اولاد میں تھے۔ بہرحال یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے۔ موصوفہ نے مزید لکھا ہے کہ جناب ہاشمی صاحب نے تحفۃالنصایح کو شاہ راجو ثانی گولکنڈوی کی تصنیف ہونا بیان کیا ہے، مگر بلحاظ سنہ تصنیف ۷۹۵ھ شاہ راجو ثانی کا اس زمانہ میں وجود ہی نہیں تھا۔

صفحہ ۸۳ پر محترمہ نے تحریر فرمایا ہے کہ معراج العاشقین کے متعلق سب سے قدیم شہادت عشق نامہ مولانا عبداللہ ابن عبدالرحمان چشتی کی ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم اور حکیم شمس اللہ قادری مرحوم کی تحقیق بھی یہی ہے۔ مگر "عشق نامہ" کا وجود کسی کتب خانہ میں ہے یا نہیں، فاضل مولفہ سے توقع ہے کہ ضرور اس کا پتہ چلائیں گی۔ جناب عبدالحفیظ قتیل حیدرآبادی نے اپنی تالیف "میراں جی خدا نما" میں شبہ ظاہر کیا ہے۔ مگر مولوی عبدالحق اور شمس اللہ قادری کا قول مستند معلوم ہوتا ہے۔

صفحہ نمبر ۹۱ پر حضرت شاہ صدرالدین قدس سرہ کے رسایل "مرآۃ الاسرار" اور "مصباح النور"

کی نثر سے بحث کی ہے اور تائیدمیں جناب پروفیسر سروری صاحب کی رائے نقل کی گئی ہے کہ یہ حضرت سید صدرالدین ذاکر کی تصنیف ہے. مگر پروفیسر آمنہ خاتون (بنگلور) نے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۳۳ھ بیان کیا ہے اور " مصباح النور " کا ۱۱۶۳ھ . یہ شاہ صدرالدین رح علاقہ نلونگل ریاست بنگلور کے رھنے والے تھے، اور متذکرہ صدر مخطوطات انجمن ترقی اردوکراچی کے کتب خانہ خاص میں بھی موجود ھیں جن سے ڈاکٹر آمنہ خاتون اور مولانا ابوالحسن ادیب بنگلوری کی تائید ھوتی ہے کتب خانہ خاص انجمن مذکور کے نسخوں پر تو خود شاہ صدرالدین کی مہر ۱۱۸۲ھ ثبت ہے . ایسی صورت میں جناب پروفیسر سروری صاحب کا آخر استدلال کیا ہے اور کیا سند ہے، اس کا اظہار محترمہ نے نہیں فرمایا۔

صفحہ (۹۴) ۔ خلاصۃ التوحید ۔ صفحہ (۱۰۰)، تلاوت المعراج کو حضرت خواجہ گیسودراز کی تصنیف ظاھر کیاگیا ہے مگر کوئی قوی سند موجود نہیں ۔ ان کی مندرجہ اصطلاحات امین نور، امین شاھد وغیرہ تو حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ کے مریدین کی تصانیف میں ملتی ھیں ۔ حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ کی تصانیف اردو و فارسی میں اس کا پتہ نہیں .

صفحہ (۱۰۶) . درالاسرار مرید سلطان کے دو قلمی نسخے ترقی اردو بورڈ کراچی میں بھی موجود ھیں اور ان میں مصنف کا نام سلطان ثانی درج ہے، اس لئے ان کا حضرت گیسودراز کی تصنیف ھونا مشتبہ ہے .

صفحہ (۱۱۵)۔ فاضل مولفہ نے تحریر فرمایا ہے کہ ترجمہ "نشاط العشق" مولفہ عبداللہ حسینی نہیں دستیاب ھوئی . یہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں تھی . تاریخ ادب اردو جلد اول مطبوعہ پاکستان میں لکھا ہے کہ اس کا ایک تحت اللفظی ترجمہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ یہ وھی ھو .

صفحہ (۱۱۴) ۔ کاتب نے کتاب العقاید مصنفہ سید اکبر حسینی رح کا نام کتاب القصاید لکھ دیا ہے ۔ ایسی بہت سی اور بھی غلطیاں موجود ھیں . کاش کہ مطبوعہ اوراق کی نظرثانی کے بعد ایک غلط نامہ منسلک کردیا جاتا .

صفحہ (۱۱۵) ۔ فاضل محترمہ نے کشف الوجود مصنفہ شاہ داول بیجاپوری رح کو "شاہ داول" گجراتی تحریر فرمایا ہے، مگر کتب خانہ روضتین گلبرگہ کے نسخہ میں جس کا حوالہ دیا گیا ہے نیز کتب خانہ خاص بابائے اردو کے نسخہ میں شاہ برھان الدین بیجاپوری کے بعض اشعار تمثیلاً درج ھیں مثلاً آدم، نور، نبی، پاک۔

تو پھر یہ شاہ داورالملک گجراتی رح (۸۸۹ھ) کی تصنیف کیسے ھوسکتی ہے، نیز اپنی دوسری تصنیف کشف الانوار میں، شاہ برھان کو اپنا مرشد بیان کیا ہے (مخطوطہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو کراچی) .

صفحہ (۱۱۹) ۔ حاشیہ پر فاضل مولفہ نے لکھا ہے کہ خواجہ کمال الدین مغربی مرشد شاہ کمال الدین بیابانی کا مزار مبارک بیجاپور میں مرقد شاہ میران جی کے پائیں موجود ہے، مگر ہم نے ثقہ بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ کا مزار، مقبرہ خواجہ شاہ یداللہ حسینی عرف شاہ قبولا (روضہ خرد گلبرگہ) کے جنوبی حصہ قبرستان میں احاطہ کی دیوار سے متصل حضرت جمال الدین مغربی کا اور ان کے بائیں جانب شاہ کمال الدین کا مزار موجود ہے ۔ مولانا قاضی احمد عبدالصمد ٹیکمالی، حال مقیم کراچی کا بھی یہی بیان ہے ۔ معلوم نہیں بیجا پور کے مجاوروں نے یہ کیسے باور کرادیا ۔ جناب سجادہ صاحب روضہ بزرگ گلبرگہ شریف سے مزید تصدیق کرائی جاسکتی ہے ۔

صفحہ (۱۴۰). سب رس میران جی کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کا یہ بیان تھا کہ یہ وہی رسالہ تاج الحقائق مصنفہ وجیہ الدین وجہی گولکنڈوی ہے جس کی تائید فہرست توضیحی مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سرفراز جامعہ بمبئی سے بھی ہوتی ہے ۔ اور سب رس وجہی گولکنڈوی تصنیف ۱۰۴۵ھ کے اسلوب بیان سے بھی تصدیق ہوتی ہے ۔ مگر فاضل مولفہ نے بہت زور دیا ہے یہ کہ حضرت علامہ وجیہ الدین گجراتی کی ہے، اور ایک کمزور استدلال یہ ہے کہ ملفوظات حضرت وجیہ الدین گجراتی میں اردو فقرے ملتے ہیں ، مگر غور طلب یہ ہے کہ دراصل آپ کے وہ فقرے ایسے فصیح و بلیغ کہاں ہیں ۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ وجیہ الدین گولکنڈوی بھی گجرات کا ہی رہنے والا تھا ۔ اس لئے کہ اس کی مثنوی "قطب مشتری" میں گجراتی الفاظ ملتے ہیں (ملاحظہ ہو مضمون مسٹر گرنا تھ راج، رسالہ نوائے ادب بمبئی اپریل ۵۲ع).

چنانچہ وجہی گولکنڈوی کی سب رس میں شاہ علی جیوگام دھنی کی ایک تلمیح بھی ہے ۔ گجرات کی تباہی کے بعد اکثر اہل علم ، بیجا پور اور گولکنڈہ آگئے تھے ۔ سب رس میران جی پر ایک مضمون پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا کا رسالہ " النور ،، حیدرآباد دکن میں کئی سال قبل شائع ہوا تھا. بیان کیا جاتا ہے کہ آغا صاحب موصوف کے پاس مختلف مصنفوں کی سب رس کے کئی نسخے ہیں ۔ میران جی شمس العشاق کی تصانیف کی زبان اور اس سب رس کی زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے ۔

صفحہ (۱٦۱)۔ محترمہ نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم نے تحریر فرمایا ہے کہ شاہ برہان بیجاپوری کا سنہ وفات ۱۰٦۸ھ ہے اور رسالہ اردو جولائی ۲۷ء کا حوالہ دیا ہے ۔ مگر باوجود تلاش ہم کو کوئی ایسا بیان نہیں ملا ، بلکہ مولوی صاحب مرحوم نے شاہ صاحب کی تصنیف ارشاد نامہ پر بحث فرمانے ہوئے صفحہ ۵۳۳ پر اس کتاب کا سنہ کتابت ۱۳ صفر ۱۰٦۸ھ لکھا ہے نہ کہ سنہ وفات . اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا سنہ وفات بہ لحاظ سنہ تصنیف غالباً ۹۹۰ھ ہے. (صفحہ ۵۱۹ ، ۵۳۳، رسالہ اردو ۱۹۲۷ء) ۔ صفحہ (۱٦۷) پر کلمۃ الاسرار کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ یہ شاہ برہان الدین جانم کی

تصنیف ہے۔ اس کے دو مخطوطات علی الترتیب جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ مگر ہمارے پاس جو اس کا نسخہ ہے اس میں مصنف کا نام شاہ امین الدین اعلیٰ لکھا ہے۔ اس کے نسخے کتب خانہ خاص بابائے اردو میں بھی ہیں جن میں مصنف کا نام امین الدین ہے۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ اس کی نثر کلمۂ الحقائق مصنفہ شاہ برہان الدین کے اسلوب سے مطابقت نہیں رکھتی، نیز اس میں صفحہ ۱۵ پر حضرت شاہ برہان راز الٰہی (برہانپوری) کا ایک قول نقل ہے۔ نیز شاہ سرمست اور شاہ علی جیوگام دھنی کے بھی حوالے موجود ہیں۔ حضرت شاہ برہان راز الٰہی ان کے بہت بعد کے بزرگ ہیں۔ ایسی صورت میں یا تو حضرت امین الدین اعلیٰ کی نہیں تو حضرت راز الٰہی رح کے کسی مرید کی تصنیف ہونی چاہئے۔

صفحہ (۱۸۲). پر محترمہ نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق نے شاہ برہان بیجاپوری کا سال وفات تحقیق کے ساتھ ۱۰۶۸ھ تسلیم کیا ہے، شاہ امین کی ولادت ۱۰۶۸ھ ہے اس سنہ کو حکیم شمس اللہ قادری بھی مستند مانتے ہیں اور طویل بحث کی گئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ بالفرض ۱۰۶۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا صحیح سنہ وفات ۱۰۸۲ھ ہے تو کیا آپ نے صرف ۱۸ سال کی عمر پائی تھی۔

صفحہ (۱۹۲)۔ تعجب ہے کہ محترمہ کو شاہ امین کی تصنیف "گفتار شاہ امین،" کا نسخہ نہیں ملا۔ اس کے نسخے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ خاص بابائے اردو میں موجود ہیں۔

صفحہ (۲۰۲)۔ احکام الصلوٰۃ مولانا عبداللہ تصنیف ۱۰۳۲ھ کو فاضل مولفہ نے شاہ عبداللہ ابن علامہ وجیہہ الدین گجراتی قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ آپ کا مزار حیدرآباد میں ہے۔ مگر مولف " ثمرۃ القدس "نے تو یہ لکھا ہے کہ آپ احمدآباد گجرات ہی میں دفن ہیں۔

صفحہ (۲۰۷-۲۰۸)۔ شرح "تمہیدات ہمدانی" میراں جی خدا نما۔ خواجہ گیسودراز رح نے شرح فارسی میں لکھی، تھی دوسری شرح میراں جی نے اردو میں لکھی۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطے میں ترجمہ تمہیدات ہمدانی (بیاض پروفیسر سروری صاحب)۔ مگر پروفیسر حفیظ قتیل نے تو یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ نہ تو ترجمہ شرح تمہیدات خواجہ گیسو دراز رح ہے اور نہ شرح شرح تمہیدات بلکہ خود میراں جی نے شرح لکھی ہے۔ اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اس کو اصل تمہیدات کا ترجمہ بیان فرمایا ہے۔ (مجموعہ مضامین عبدالحق۔ ' اردوئے قدیم' مطبوعہ صفحہ ۲۱۰)۔

صفحہ (۲۲۹) پر تفسیر وہابی کے مصنف عبدالصمد المخاطب نواب شکوہ الملک نصیرالدین عبدالوہاب والا جاہی آرکاٹ کو حیدرآبادی تحریر کیا ہے، جو غلط ہے۔ (مضمون مولوی عبدالحق، رسالہ اردو۔ جنوری ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۵۶)۔

صفحہ (۲۳۲) ۔ فاضل مولفہ نے ترجمہ معرفة السلوک مصنفہ شاہ محمود خوش دہان کے ضمن میں حضرت شاہ جمال الدین مغربی کو سہواً خواجہ کمال الدین کا خلیفہ بیان کیا ہے ، حالانکہ شاہ کمال الدین حضرت جمال مغربی کے خلیفہ تھے ۔

صفحہ ۔ (۲۳۸) شاہ جمال الدین پدر شاہ میر کا سنہ وفات ۱۱۸۲ھ غلط درج ہے ۔ نیز صفحہ ۲۲۵ پر شاہ کمال کے دیوان کا نام بجائے " مخزن العرفان " کے 'گنج عرفان' لکھا ہے ۔

صفحہ (۲۵۵) ۔ وجہی کے حالات پردہ خفا میں ہیں ۔ حالانکہ اس کے کچھ حالات اسی کے دیوان فارسی سالار جنگ میں ملتے ہیں اور اصل نام بھی ۔ البتہ محترمہ کی یہ جدید تحقیق قابل تعریف ہے کہ وجہی کی ایک اور مثنوی " ماہ سیما و پری رخ " محولہ دتاسی کا نسخہ الہ آباد میں ہے ، مگر جب تک اس کا مطالعہ نہ کیا جائے صحیح رائے قائم نہیں ہوسکتی ۔

صفحہ (۳۹۶) ۔ پر لکھا ہے کہ احمد بن محمد مغربی مصنف سراج الایمان کے حالات نہیں ملے ۔ مگر گلزار اعظم تذکرہ شعرائے مدراس میں موجود ہیں ۔ نیز ازک محبوبیہ جلد نمبر (۲) میں بھی ان کا خطاب اعظم الملک تھا ۔ ان کی اولاد حیدرآباد میں بھی ممتاز تھی ۔ جناب ہاشمی صاحب معتمد انجمن خواتین دکن و ڈاکٹر محمد غوث لائبریرین جامعہ عثمانیہ سے پتہ چل سکتا ہے ۔

صفحہ (۴۰۱) ۔ مجموعة المسایل ۔ عبدالمجید ویلوری کے متعلق لکھا ہے کہ یہ محمود خوش دہان بیجاپوری کے مرید تھے اور یہ تصنیف قبل ۱۲۱۳ھ کی ہے ۔ مگر حضرت خوش دہان رح تو شاہ برہان بیجاپوری کے خلیفہ تھے جو تین صدی قبل کے بزرگ ہیں ۔ اس لئے یہ بزرگ سید محمود ویلوری کے بزرگ معلوم ہوتے ہیں ۔

فاضل مولفہ نے ہر دور کی نثر اردو پر کافی بحث فرمائی ہے ۔ مثلاً فضلی ، قتیل انشا ، سودا ، مگر محترمہ نے شاہ حاتم کی نثر کا نمونہ نہیں دیا ، شاہ صاحب کا ایک مزاحیہ نسخہ الموسوم بہ نسخہ " مفرح الضحک معتدل من طب الظرافت " رسالہ " آج کل " دہلی (غالباً ۵۹ء میں) شایع ہوچکا ہے اور تذکرہ " مجموعة الانتخاب " شاہ کمال میں موجود ہے جو سودا سے قبل کا ہے ۔ دو ایک فقرے یہ ہیں ۔ " چاندنی کا روپ ، دوپہر کی دھوپ " ، " چڑیل کی چوٹی ، بھتنے کی لنگوٹی ، پریوں کی نظر گزر " ، "دیو کی نظر ، جوگی کی بھرکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آٹھ آٹھرنی " الغ (صفحہ ۲۹۵ ، تذکرہ شاہ کمال ۔ سالار جنگ) ۔

مولفہ کی ایک خاص عبارت غور طلب معلوم ہوتی ہے کہ " دکھنی زبان جو ایک لچر سی زبان تھی ، مرزا مظہر ، حاتم وغیرہ نے اس کو ایک ترقی یافتہ صورت دے کر اردوئے معلیٰ بنایا ۔ ولی اورنگ آبادی کے دو ادوار کے کلام میں تفاوت ہے یعنی سفر دہلی کے قبل اور بعد کے " ۔ مگر اس کی ترقی اور اجتہاد کا زمانہ تو شاہ حاتم اور مظہر کا ہے جو ولی سے سالہا سال بعد کا ہے ۔ دکن سے فصیح اردو تو

دھلی میں پہلے ہی سے رائج تھی اور ولی نے بھی اسی اردو یعنی ریختہ میں طبع آزمائی کی۔
باب (۱۱) میں نثر کی توسیع سے بحث فرمائی ھے۔ اس سلسلے میں ترجمہ قران، فقہ، حدیث، تصوف، قواعد زبان اردو مولفہ مستشرقین، تاریخ، قصص، سیر، وغیرہ پر کافی روشنی ڈالی ھے، مگر ابھی اس میں بہت گنجائش تھی۔ مولوی سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور اصلاح شرک و بدعت کے سلسلے میں رسالے لکھے گئے ھیں، اردو تفاسیر پر مولوی عبدالحق مرحوم کا مقالہ رسالہ اردو جنوری ۱۹۳۷ء میں شایع ہوا تھا۔ اس میں گجراتی اردو میں تفسیر، تفسیر حسینی کا ترجمہ اور پارہ عم کی تفسیر "مرادیہ" شاہ مراد اللہ سنبھلی ۱۱۸۴ھ کا ذکر اور نمونہ بھی ھے۔ مولفہ نے ان کا ذکر نہیں فرمایا ھے۔ امید ھے کہ آیندہ اشاعت ثانی میں مزید اضافہ کیا جائے گا بحیثیت مجموعی تالیف قابل قدر ھے۔
(س ـ م)

فہرست مطبوعات موصولہ

نام کتاب	مصنفہ، مولفہ، مترجمہ	ناشر	طابع	صفحات	قیمت
۱ ـ ابن الوقت	ڈاکٹر نذیر احمد، دھلوی مرتبہ سبط حسن	مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاھور	رہبر پریس لاھور	۳۵۰	۳/۵۰
۲ ـ رسوم ھند	ماسٹر پیارے لال آشوب دھلوی دیباچہ از خلیل الرحمن داؤدی	ایضاً	اوپل پریس لاھور	۳۲۰	۳/۵۰
۳ ـ مسافران لندن	مرتبہ ڈاکٹر سرسید احمد خان دھلوی	ایضاً		۲۹۵	
۴ ـ وکرم اروسی	(طبع ثانی) کالی داس، ترجمہ عزیز مرزا مرتبہ عشرت رحمانی	ایضاً	اوپل پریس لاھور	۱۶۲	۱/۷۵
۵ ـ حیات سعدی	مولانا الطاف حسین حالی مرتبہ شیخ محمد اسماعیل	ایضاً	ایضاً	۲۲۳	۲/۵۰
۶ ـ نامور مسلم سائنس داں	پروفیسر حمید عسکری	ایضاً	شفیق پریس لاھور	۶۲۷	۶/۵۰
۷ ـ اسلام بیسویں صدی میں	ایم محی الدین لکھنوی	ادارہ اوراق زریں، ۷۸، ریلوے روڈ لاھور	ثنائی پریس سرگودھا	۲۷۴	۴/۵۰
۸ ـ شکست شب	محسن بھوپالی	فنکدہ، مامن ـ ٹھنڈی سڑک حیدرآباد، سندھ	ٹائمز پریس کراچی	۱۱۲	۲/-
۹ ـ اردو ڈراما	عشرت رحمانی	اردو مرکز، گنپت روڈ لاھور	تعلیمی پریس لاھور	۴۹۹	۶/۵۰
۱۰ ـ امرجوت	بنکٹ پرشاد		نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن	۱۵۹	۳/-

۱۱- شکار نامہ	مصنفہ حضرت گیسو دراز بندہ نواز ـ مرتبہ پروفیسر سید مبارزالدین رفعت	حیدرآباد اکیڈمی حیدرآباد دکن	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن	۳۶	۱/-
۱۲- کلمۃالحقائق	تصنیف سید شاہ برہان‌الدین مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی لکچرر جامعہ عثمانیہ	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن	ایضاً	۱۱۸	۲/-
۱۳- انیس زندگی	محمد انیس‌الرحمان ایڈوکیٹ	رانا اکیڈمی شنکر بلڈنگ اے ایم نمر ۲ کراچی	مشہور آفسٹ پریس کراچی	۲۲۴	۲/۷۵
۱۴- نصیرالمریدین	مرتبہ سید سرفراز علی سالیسری	۸۸- حیدرآباد کالونی کلیٹن روڈ ـ کراچی		۶۴	۱/-
۱۵ فکر مومن	محمد وحیدالدین خان یوزئی	بہادر یارجنگ اکیڈمی کلیٹن روڈ کراچی	فاظر پرنٹنگ پریس کراچی	۴۸	
۱۶- نئے ڈرامے	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	انجمن ترقیٔ اردو (ہند) علی گڑھ	سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۴۱۲	۵/-
۱۷- گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	ایضاً	ایضاً	۳۱۲	۷/-
۱۸- سخن مختصر	معین‌احسن جذبی	ایضاً	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۶	۲/-
۱۹- شاد کی کہانی شاد کی زبانی	پروفیسر محمد مسلم عظیم‌آبادی	ایضاً	معارف پریس اعظم گڑھ	۲۸۱	۵/-
۲۰- تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین		اردو ٹائپ پریس لاہور	۲۵۴	۴/-
۲۱- ملفوظات وحالات شاہ فخر دہلوی	مترجمہ و مرتبہ میر نذر علی درد کاکوروی	سلمان اکیڈمی حق‌نشان ۳۰- نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی	مشہور آفسٹ پریس	۳۲۲	۴/۵۰
۲۲- سوانح خواجہ معین‌الدین چشتی	وحید احمد مسعود	ایضاً	ایضاً	۳۲۰	۴/۵۰
۲۳- الحکمۃ فی مخلوقات‌اللہ	حضرت امام‌غزالی ترجمہ مولوی محمد علی لطفی	ایضاً	ایضاً	۱۴۴	۳/۲۵
۲۴- تذکرۂ علمائے ہند	تالیف مولوی رحمان علی مرتبہ و مترجمہ مولوی محمد ایوب قادری	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی	مشہور آفسٹ پریس کراچی	۷۰۸	۱۵/۰
۲۵- حرف شیریں	پروفیسر قاضی غلام محمد کشمیری	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن	۷۵	۲/۵۰

ماہر القادری
ظہیر فتحپوری
عین الحق فرید کوٹی

مراسلات

(۱) اردو لغت کی تیسری قسط جولائی تا ستمبر کے "اردو نامہ" میں پڑھی، اور " ترقی اردو بورڈ" کی محنت، تحقیق اور دیدہ ریزی پر اس کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔

دوچار مقامات پر مجھے کھٹک محسوس ہوئی، طالب علمانہ حیثیت سے اس کا اظہار کر رہا ہوں، مقصود خدانخواستہ مکابرت اور طنز و تعریض نہیں بلکہ افہام و تفہیم اور اصلاح و ترقی ہے!

صفحہ ۴۲ — " ابر رحمت — خدا کا بھیجا ہوا بادل " کیا وہ بادل جو زحمت و عذاب ثابت ہوتا ہے، خدا کا بھیجا ہوا نہیں، کسی اور کا بھیجا ہوا ہوتا ہے؟ ابر رحمت ہو یا ابر عذاب دونوں قسم کے بادل خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں! "ابر رحمت" کی تشریح میں اس انداز کی عبارت ہونی چاہئے:

'ابر رحمت — خدا کا بھیجا ہوا بادل، جو زحمت و عذاب کی بجائے نشاط و آسودگی کا سبب بن سکے ....'

صفحہ ۴۶ — "ابراہیم، سامی پیغمبر آذر کے بیٹے آر (بابل) کے باشندے ... "

ایسے " نام " جن کا املا دو طریقے سے لکھا جاتا ہے، ان کے دونوں " املا " لغت اردو میں درج ہونے چاہئیں! ہاں! جو " املا " زیادہ معروف ہو، وہ اصل عبارت میں لکھا جائے اور قوسین میں وہ املا جو کم مشہور اور کم مستعمل ہے! مثلاً دلی اور دہلی دونوں لفظ لکھے جائیں گے۔

عربی کا مشہور لغت ' المنجد '، میرے سامنے ہے، اس میں 'آر' کی جگہ ' آور ' لکھا ہے۔ میں نے بعض دوسری کتابوں میں اس بستی کا نام ' آور ' بھی پڑھا ہے، اس لئے لغت اردو میں یوں کتابت ہونی چاہئے:

— آر (آور) —

راقم الحروف نے ۱۹۴۳ء میں عراق کا سفر کیا تھا، بصرہ سے بغداد ہم ٹرین کے ذریعہ روانہ ہوئے رات میں بصرے سے جب ٹرین چلی ہے تو دس بج چکے تھے۔ صبح آٹھ بجے کے قریب ' آر ریلوے جنکشن ' سے ٹرین گزری، یہی بستی ' مولد ابراہیم ' ہے۔ راستہ میں بابل بھی آیا، اس وقت دن کے دو ڈھائی بجے ہوں گے، اس سے اندازہ ہوا کہ " آر " بابل سے تقریباً سو میل کی مسافت پر واقع ہے۔

اس صورت میں 'آر' کے ساتھ 'بابل' قوسین میں لکھنے سے لغت دیکھنے اور پڑھنے والوں کو یہ دھوکا ہوگا کہ "آر" شہر بابل کے قریب اس کی کوئی مضافاتی بستی ہوگی، جیسے دلی کے قریب شاہدرہ! حالانکہ مسافت و بعد کے اعتبار سے آر کا تعلق بابل سے ایسا نہیں ہے جیسا شاہدرہ کا دلی سے تعلق ہے.

شاہدرہ کو ہم بےشک "شاہدرہ (دلی)" لکھ سکتے ہیں، اسی طرح سکندرہ اور فتحپور سیکری کے ساتھ بھی قوسین میں — اکبرآباد — لکھا جاسکتا ہے اور لوگ لکھتے ہی ہیں مگر غازی آباد، ریواڑی، پلول، نجف گڑھ اور فریدآباد کے ساتھ قوسین میں دلی نہیں لکھتے، ہاں قطب صاحب اور بستی نظام الدین کے ساتھ دلی لکھتے ہیں.

اگر آپ کے لغت میں 'آر' کا ایک مستقل نام اور لفظ کی حیثیت سے ذکر آئے تو وہاں اس شہر کی قدرے تفصیل کے ساتھ تاریخی حیثیت بیان کر دی جائے، ورنہ 'ابراہیم' کے ذکر کے ساتھ یوں لکھ دیا جائے

'سامی پیغمبر آذر کے بیٹے، (آور) کے باشندے جو کلدانیوں کی حکومت میں شامل تھا اور بابل سے (اتنے میل کی) مسافت پر واقع ہے....'

ابرھہ یمن کے حبشی گورنر کا نام جس نے اسلام سے پہلے (چھٹی صدی کے نصف اوایل میں) مکہ پر ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی...'

یہ غلط فہمی مغربی مورخین کی پھیلائی ہوئی ہے کہ وہ نبئی آخر سیدنا محمد عربی علیہ الصلواۃ والسلام کی بعثت کو آغاز اسلام سے تعبیر کرتے ہیں اور حضور کو "بانئی اسلام" کہتے ہیں! قرآن کے نقطۂ نگاہ سے ہر نبی اور رسول "مسلم" تھا یہاں تک کہ ابوالبشر آدم علیہ السلام بھی 'مسلم' تھے.

اس لئے

ضروری ہے کہ عبارت سے "اسلام سے پہلے" خارج کر کے 'چھٹی صدی' کے بعد 'عیسوی' ضرور لکھ دیا جائے.

— "مکہ پر ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی" — اور "ہاتھیوں کا لشکر لے کر مکہ پر چڑھائی کی" — ان دونوں میں فصیح تر کون سا ہے! اس پر غور فرمالیا جائے.

— 'ابعاد' کے معنی ہیں — فاصلے، دوریاں، جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے اردو میں 'نزدیکی' کی جمع (نزدیکیاں) اور دوری کی جمع (دوریاں) نہیں آتی!

[ماہرالقادری کراچی]

مکرمی ، السلام علیکم

(۲) " اردو نامہ " کے شمارہٴ نہم میں مرزا محمد ھادی مرزا لکھنوی کی مثنوی " امید و بیم " جناب عشرت رحمانی صاحب کے تعارفی نوٹ کے ساتھ نظر سے گذری ، اس ضمن میں مندرجہٴ ذیل گذارشات ہیں :۔

(الف) ۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مرزا صاحب "ابتدا میں مرزا تخلص کرتے تھے ، بعد میں رسوا ہوئے اور دنیائے شعر میں دونوں تخلص مشہور ہوگئے"۔ مرزا صاحب نے شروع سے آخر عمر تک ایک ھی تخلص " مرزا " اختیار کیا . شاعری میں ان کا نقش اولیں منظوم ڈرامہ " مرقع لیلیٰ مجنوں " ہے جو ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا . اس پر شاعر کا نام " مرزا محمد ھادی ۔ مرزا " درج ہے . موت سے تقریباً ایک سال قبل ان کی ایک غزل رسالہ " ادب " لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی جس کا مقطع یہ تھا :

ہزاروں ھی کو دعویٰ جاں نثاری کا ہے اے مرزا
مگر پورے جو آترے امتحاں میں ایسے کم نکلے

" رسوا " مرزا صاحب کا تخلص نہ تھا بلکہ ایسا قلمی نام تھا جسے انہوں نے صرف ناولوں کے لئے (کسی مصلحت سے) اختیار کر لیا تھا . ناولوں کے علاوہ مرزا صاحب کی کسی بھی علمی تصنیف پر "رسوا " کی چھاپ نہیں ہے . اس بارے میں جناب عبدالماجد دریا بادی کا وہ خیال بالکل درست ہے جو '' اردو نامہ" شمارہٴ ششم کے صفحہ ۱۰۵ پر درج ہے .

(ب) ۔ مرزا صاحب نے (دو نہیں) پانچ مثنویاں لکھیں . " امید و بیم " اور "نو بہار" کے علاوہ مندرجہٴ ذیل مثنویاں بھی مرزا صاحب کی تصنیف ہیں . یہ سب مطبوعہ ہیں :۔

۱ ۔ " لذت فنا " " زمانہ " کانپور میں مرزا صاحب کی وفات کے بعد ان کے بارے میں جو مضامین جناب عزیز لکھنوی کے شائع ہوئے تھے ان میں بھی اس کے اقتباسات موجود ہیں .

۲ ۔ "لذت عشق" ــ راقم الحروف کو جناب علی عباس حسینی صاحب کی وساطت سے دستیاب ہوئی. "اودھ پنچ "میں ۱۹۳۹ء میں شائع ہوچکی ہے. جناب خوشونت سنگھ اور جناب ایم. اے. حسینی نے " امراؤ جان ادا "کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے اس میں مرزا کی منظوم تصنیفات کے سلسلے میں اس کا ذکر ہے .

۳ ۔ "نالہٴ رسوا" سب سے پہلے "جنون انتظار" مصنفہٴ امراؤ جان ادا میں ۱۸۹۹ءمیں شائع ہوئی. (۱) بعد میں " نگار" بابت دسمبر ۱۹۳۶ء میں جناب مشیر احمد علوی نے اسے اپنے تفصیلی تعارف کے ساتھ شائع کیا .

---

(۱) یہ امر توضیح طلب ہے (ادارہ)

مرزا صاحب نے ان مثنویوں کے علاوہ کئی معرکتہ الآرا قصیدے بھی لکھے جن میں سے یہ بہت مشہور ہوا۔ ع

کنار شوق میں آیا وہ دلربا سر شام

مثنویوں اور قصیدوں کے علاوہ تقریباً (۸۰) نایاب غزلیں بھی مرزا کے اس غیر مطبوعہ دیوان میں شامل ہیں جسے راقم الحروف نے ترتیب دیا ہے۔

(ج) - مرزا صاحب کا ڈرامہ ' طلسم اسرار ، منظوم نہیں بلکہ نثر میں ہے۔ اس ڈرامے اور مرقع لیلیٰ مجنون ، کے علاوہ مرزا نے ایک اور ڈرامہ ، بگاڑستان ، بھی لکھا تھا۔ یہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

"اردونامہ" کے اس شمارے میں مرزا کی مثنوی " امید و بیم " شائع ہوئی ہے۔ اس میں طباعت کی کچھ غلطیاں ہیں۔ صحیح شعر درج ذیل ہیں:-

صفحہ ۶۰	ذلہ خواروں میں نظامی ان کے	دُرد نوشوں میں ہے جامی ان کے
صفحہ ۶۱	سوزش زخم جگر یاد ہے ہاں	شورش دیدۂ تر یاد ہے ہاں
صفحہ ۷۰	خوئے مطلوب ہے خلق کامل	روئے محبوب ہے نور بے ظل
" "	وہم ہستی سے گذر جانا تھا	موت کے قبل ہی مر جانا تھا
صفحہ ۷۳	نہ کہ باطن تو ہو بالکل ابتر	اور ظاہر پہ عمل ہو یکسر
صفحہ ۷۶	غور سے دیکھ شہود اشیا	اک تماشا ہے نمود اشیا
صفحہ ۷۷	دیکھ اجرام ذوات الاذناب	ان کے میقات اور ان کے اسباب

صفحہ ۵۸ پر ' عنوان ' سے قبل مندرجہ ذیل الفاظ اشاعت سے رہ گئے ہیں:-

[لکھنؤ. اکتوبر ۱۸۹۶ء		محمد ہادی مرزا]

صفحہ ۵۹ پر جو غزل درج ہے اس میں مقطع سے پہلے حسب ذیل شعر درج کر لیجئے:

اپنی تقدیر پہ شاکر ہوں میں		تم سے بیجا ہے شکایت میری

صفحہ ۷۶ پر حاشیہ میں پہلا جملہ یوں ہے: ' متکافی کو انگریزی میں پیرابولہ (Parabola) ، بیضوی کو الپس (Ellipse) اور متزاید کو ہائپربولہ (Hyperbola) کہتے ہیں۔ '

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

ظہیر فتحپوری

(۳) مجھے اس امر سے کلی اتفاق ہے کہ اردو زبان کے مختلف الاصل الفاظ کے درمیان تفریق و تمیز کی دیواریں حائل کردینا کسی طرح مناسب نہیں. خالص پرست اصحاب اس حقیقت کو نظرانداز

کر جاتے ہیں کہ پہلے حضرت انسان نے بات چیت کرنا سیکھا. بعد میں انہی باتوں کی بنیادوں پر صرف و نحو کے اصول وضع کئے گئے. عوام کی زبان ایک اٹل حقیقت ہے اور اس کے مقابلہ میں صرف و نحو کو محض ایک ثانوی حیثیت حاصل ہے. انسانی فطرت کی طرح انسانی زبان بھی ہمیشہ انقلاب کی طرف مائل ہے. صرف و نحو کو اس کے پاؤں میں زنجیر بن کر حائل نہیں ہونا چاہیے بلکہ پازیب کی طرح اس کے کبھی نہ رکنے والے قدموں کے لئے زیور کا کام دینا چاہئے. اس میں کیا قباحت ہے کہ رود گنگا، زبان دکن اور سنسکرت الاصل قسم کی ترکیبیں استعمال کرلی جائیں. اردو زبان کی بلند و بالا عمارت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے خالص پرستی سے بہتر کوئی اور نسخہ نہ ملے گا.

اردو کی پہلی کتاب

کافی عرصہ ہوا مجھے ایک دوکاندار نے ایک نہایت ہی خستہ اور پرانے کاغذ کے لفافے میں کوئی سودا ڈال کر دیا. میں نے احتجاجاً کہا کہ بھلے مانس میرے لئے بس یہی لفافہ باقی رہ گیا تھا. بہر حال راستہ میں ردی کاغذوں کو اٹھا کر پڑھنے کی عادت عود کر آئی. ابھی دو چار سطریں ہی پڑھی تھیں کہ سودا رومال میں الٹ لیا. پچھلے قدموں دوکان کی طرف بھاگا اور اس سے پوچھا کہ کوئی اور بھی ویسا پرانا لفافہ ہے. دوکاندار نے بڑی حیرت سے میرے منہ کی طرف دیکھا اور کہا اگر لفافہ پھٹ کر سودا راستے میں گر گیا ہے تو اور سودا دے دیتا ہوں. پھر معلوم ہوا کہ ایسے جو لفافے تھے وہ سب کے سب جلا دیئے گئے. گھر آکر اس لفافے کو پانی سے تر کرکے آہستہ آہستہ کھولا. اندر سے دیکھا تو ایک طرف کونے کو مضبوط کرنے کے لئے غالباً اسی کتاب کا آدھا سرورق درمیان سے لمبے رخ پھٹا ہوا لگایا ہوا تھا. یہ کتاب اردو زبان کی صرف و نحو کے اصولوں کے بارے میں تھی. پھٹے ہوئے سرورق پر اوپر رومن حروف میں گرامر، درمیان میں "آزاد" (مصنف کا نام)، اس سے نیچے ۱۸۶۷ء (سنہ اشاعت اور سب سے نیچے ناشر کی جگہ "ـــــ ب سنگھ")، (غالباً رائے صاحب منشی گلاب سنگھ) درج تھا. یہ صفحات غالباً اردو قواعد کے ہیں. لیکن اس سے اس امر کی تردید ہو جاتی ہے کہ "۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک شائع شدہ کتابوں پر بجائے مولانا محمد حسین آزاد کے نام کے کرنل ہالرائڈ کا نام درج ہے". (۱)

ان چار صفحات کو سامنے رکھتے ہوئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی مولانا آزاد کی "قواعد اردو" اتنی ہی مفید ثابت ہوسکتی ہے جتنی کہ آج سے قریباً سو سال قبل تھی. بلکہ آج اسے نئے سرے سے شائع کرنے کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے.

[عین الحق فرید کوٹی]

(۱) آزاد کی ایک اور کتاب "جامع القواعد" پر بھی جو ۱۸۸۹ء میں پانچویں بار چھپی ہے، محمد حسین آزاد ہی کا نام چھپا ہے. (ادارہ)

مردوں کے چہرے پر
مسرت کے آثار!

TIBET
Lather
SHAVING
CREAM
with
B 22

سگریٹ سلگائیے اور لطف اٹھائیے
WILLS's
Navy Cut
MEDIUM CIGARETTES
۴۶ پیسہ میں دش سگریٹ۔
(جہاں کہیں مقامی ٹیکس عائد ہو وہاں قیمتوں میں کچھ فرق ہو سکتا ہے)
PAKISTAN TOBACCO COMPANY LIMITED
JWT
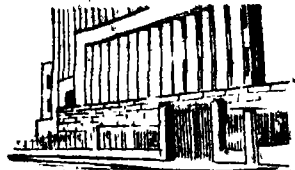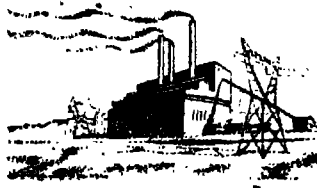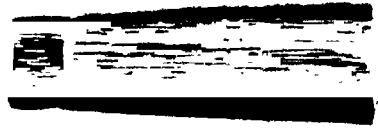
پاکستان کی
قابلِ فخر
مصنوعات
بیکو پمپ
پائیداری اور کارکردگی میں بے مثال
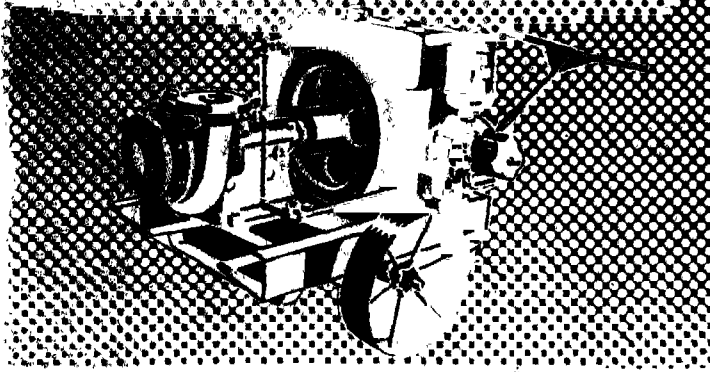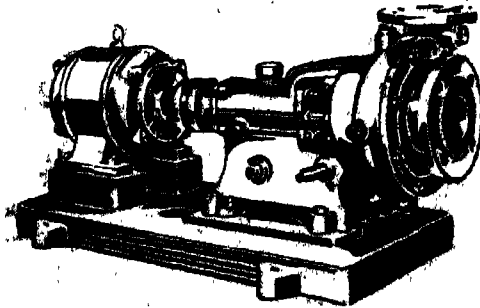
BECO

دُنیا کے سب سے زیادہ تجربہ کار ہوائی مسافروں کا
پی۔ آئی۔ اے کو خراجِ تحسین

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز — باکمال لوگ لاجواب پرواز

ترقیِ اُردو بورڈ کی جامع، تاریخی و تحقیقی

اُردو لُغت

(مختصر، جلی نسخہ)

جلد اوّل : الفِ مقصورہ

ترقیٔ اردو بورڈ ، کراچی

یہ ہماری جامع تاریخی لغت کی مجمل اشاعت کی پانچویں قسط ہے - ابتدا میں خیال تھا کہ اس مجمل اشاعت میں دکھنی دور کی مثالیں شامل نہ ہوں گی ، لیکن بعض ناظرین کی فرمائش پر اب دکھنی مثالیں بھی درج کی جارہی ہیں تاکہ اصل لغت کا صحیح خاکہ سامنے آسکے - ادوار کی مثالیں بھی زیادہ فراخی سے درج کی جارہی ہیں -

شان الحق حقی
معتمد مجلس ادارت
ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی ۵

لغت کی مجمل اشاعت کے سابقہ اجزاء

لغت کے اجزاء جو سابقہ شماروں کے ساتھ شامل تھے ، علیحدہ طور پر پچاس پیسے فی جزو کے حساب سے منگائے جا سکتے ہیں - جو اصحاب منگانا چاہیں، وہ پاکستانی ڈاک کے ٹکٹ یا پوسٹل آرڈر بھیج کر پچھلی تین اقساط طلب کرسکتے ہیں -

خوارزم کے علاقے میں ایک قدیم بستی کا نام جہاں کی آب و ہوا ناخوشگوار اور وبائی بتائی جاتی ہے (آریانہ جلد ۲ ' ۸۵ ۔ بحوالہ یاقوت)

اے نادر جہاں ترے یمن قدوم سے
وضع چمن بسان ابیورد ہوگئی

۱۸۱۸ انشا، ک، ۱۷۹

[ف : " با ارت " یا " باورت " . حاشیہ نمبر ۱ ' برہان قاطع ، ۱ : ۸۵]

اُبھار (ضم ا) امذ

اٹھان یا اونچا پن، جو کسی چیز کے پھولنے یا ابھرنے سے ظاہر ہو ۔ سطح کا ابھرا ہوا حصہ یا ابھری ہوئی کیفیت

مصور کے کمال صناعی نے ان تصویروں میں ایسا ابھار پیدا کیا تھا کہ سطحی کیفیت کے عوض ان میں صنمی اجسام کا انداز پیدا تھا .

۱۸۹۷ کاشف الحقائق، ا : ۳۶

ضعف سے بے کار سب اعضا سراسر ہوگئے
ہے عیاں پوشاک پر بھی ہڈی ہڈی کا ابھار

۱۹۲۷ روح رواں ، ۲

پشت کی طرف پتلون کا ابھار ظاہر کر رہا تھا کہ زبردستی کسی چیز کو موڑ کر اندر کردیا گیا ہے .

۱۹۲۴ نواب صاحب کی ڈائری، ۱۳۷

۲ ۔ ظہور، نمو، برآمدگی

مزا جو آپ کے سینے کے کچھ ابھار میں ہے
نہ سیب میں نہ بہی میں نہ وہ انار میں ہے

۱۸۱۸ انشا، ک، ۱۷۹

ابھار ایسا ہے جوبن کا کہ ہر دم
گرہ ہوتی ہے وا بند قبا کی

۱۸۹۸ د، مجروح ، ۱۷۷

مصفا جلد پر سے نگاہ پھسلی تو پہنچی کہاں؟ تھان پر ۔ شیر خوارگی نے وہاں ابھار دیکھا ۔

۱۹۲۸ اودھ پنچ، ۱۳: ۱۱، ۶

اس کے شانوں کا ڈھلاؤ ، اس کے سینے کا ابھار ، اس کی لمبائی کے تناسب سے تھا .

۱۹۳۴ ریاض خیرآبادی، نثر، ۱۳۹

۳ ۔ وفور، جوش، بالیدگی

نام خدا اب ان کا جوبن ابھار پر ہے
جلوہ دکھا رہا ہے حسن شباب کیا کیا

۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۳ ،

آئی بہار لالہ و گل ہیں ابھار پر
نازاں عروس باغ ہیں کیا کیا نکھار پر

۱۹۱۱ تسلیم، دفتر خیال، ۲۹

۴ ۔ امنگ ، موج، ولولہ

غم و یاس و حسرت و بےکسی کی ہوا کچھ ایسی ہے چل رہی
نہ دلوں میں اب وہ امنگ ہے نہ طبیعتوں میں ابھار ہے

۱۹۲۱ اکبر، ک، ا: ۸۶

۵ ۔ افزائش ، ترقی، فروغ، بڑھنے کا عمل

اور اس کے ابھار کے اسباب
ہیں یہ دموی عروق اور اعصاب

۱۹۱۶ سائنس و فلسفہ، ۱۲۳

تہذیب یافتہ ہونے کے معنی ہیں ان قوتوں کی تربیت اور ابھار ۔

۱۹۳۲ روح تہذیب، ۳۶

۶ ۔ محدّب ، سطح کی بیرونی سمت کا نمایاں حصہ ۔م: لوے کا ابھار، عینک کی تالوں کا ابھار

۷ ۔ (کنایہ) پستان

چھپتا نہیں چھپانے سے عالم ابھار کا
آنچل کی تہ سے دیکھو نمودار کیا ہوا

۱۹۳۴ ریاض، نثر، ۱۳۹

[پ : اُبھَر उभार س : آدبھر
[उद् + भृ

ـــ دینا ف م ۱ ۔ برانگیختہ کرنا ، بھڑکانا ،

بڑھاوا دینا

وہ بات ہی نہیں وہ ملاقات ہی نہیں
نادان جب ابھار دیا تجھ کو چار نے

۱۸۷۸ گلزار داغ، ۲۱۳

ان آزادیوں نے اس کی غلامی کی سرشت کو ابھار دیا .

۱۹۲۶ شرر ، عزیزہ مصر، ۵

۲ ۔ نمایاں کرنا، واضح کرنا

اے سوز عشق کام کئے جا کمی نہ کر
اچھی طرح سے داغ کو دل کے ابھار دے

۱۸۸۵ د، سخن، ۲۲۸

اُبھارا (ضم ا) امذ

۱ ۔ اچھالا، غوطہ کھا کر سطح پر آنا، م:
ایسا ڈوبا کہ ابھارا نہ لیا

۲ ۔ بڑھاوا ، شہ ، بھرّا

آزادیوں کے شوق میں ابھرا تھا دل مگر
اس کی خطا نہ تھی یہ ابھارا انہی کا تھا

۱۹۲۱ اکبر، ا: ۲۱۲

[ار : اُبھار + ا (اسمی)]

ـــ دینا ف م

۱ ۔ ہمت بڑھانا، دل بڑھانا

تو نے دیا آکے ابھارا یہاں
سمجھے کہ ہے مٹھی میں سارا جہاں

۱۹۱۴ حالی، نشاط امید، ۱۵

اُبھارنا (ضم ا ، سکن ر) ف م

۱ ۔ پھُلانا ، تاننا

تن تن کے ، بن بن کے ، سینے ابھار ابھار کے ، جمال اپنے افراسیاب کو دکھا رہی ہیں .

۱۸۸۳ طلسم ہوشربا، ۶۲۳

شاخوں پہ پرندے تھے جھٹکتے ہوئے شہ پر
لہروں میں بطیں اپنے ابھارے ہوئے سینے

۱۹۲۰ سیف و سبو ، ۸۶

۲ ۔ اٹھانا، اونچا کرنا

اٹھا لائیں کیا دل کو اس بزم سے
یہ پتھر ابھارے ابھرتا بھی ہو

۱۹۳۲ کلام بے نظیر شاہ، ۱۲۱

بے سود ہے کبر ہیچ سب مستی ہے
سر مہر ابھارتے ہی یاں پستی ہے

۱۹۳۶ کلام مہر، ۲: ۱۱۶

۳ ۔ اکسانا، شہ دینا، بڑھاوا دینا، جوش دلانا

اب اس طرح کا سمجھانا، مانع ہونا، ابھارنا، بھڑکانا بلکہ نرا جلانا ہے .

۱۸۲۴ فسانۂ عجائب، ۲۹

بام پر پھر بیٹھتے ہیں آ کے آپ
پھر رقیبوں نے ابھارا دیکھئے

۱۸۸۷ واجد علی شاہ، د، ۱۵۱

لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے، ابھارتا ہے .

۱۸۹۸ سر سید، مضامین، ۲: ۱۰۱

مسیحی اسقف لوگوں کو میرے خلاف ابھارتے ہیں .

۱۹۲۷ جوہائے حق، ۲: ۲۹۲

غدر ۵۷ء پر ابھارنے کے لئے انگریزوں کے خلاف کیا کیا روایتیں نہیں تراشی گئیں .

۱۹۳۹ افسانۂ پدمنی، ۱۰۶

۴ - سہارا دینا ، سنبھالنا

شوق نے راہ محبت میں ابھارا لیکن
ضعف نے ایک بھی گرتے کو سنبھلنے نہ دیا

۱۸۷۸ گلزار داغ، ۶۴

ہمت جواب دیتی ہے جب راہ عشق میں
کیا کیا ابھارتی ہے تری آرزو مجھے

۱۹۱۶ جان سخن، ۱۹۸

۵ - اچھالنا ، ترانا

اے قلزم امامت اے بادبان امت
یہ ڈوبتا سفینہ تو ہی نے تو ابھارا

۱۹۳۵ صحیفۂ ولا ، ۳۱۶

۶ - ترقی دینا ، پست یا دبی ہوئی حالت سے نکالنا

ہمارے سب کام ایسی پستی کی حالت میں ہیں کہ ان کے ابھارنے کے لئے نہایت زبردست طاقتیں درکار ہیں۔

۱۹۱۴ حالی، مقالات، ۲: ۹

اپنی قوت اور کندھے کے زور سے اپنی قوم کو پستی اور ذلت سے نکال کر دنیا میں ابھارا۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۲۴

نیچے طبقے کو ابھارنا، انہیں تعلیم دینا اور اپنا بھائی بنانا

۱۹۳۶ پریم چند، مضامین، ۲۲۸

۷ - ترغیب دینا، تحریص دلانا، آمادہ کرنا، راہ پر لانا

ہم رندوں نے ابھار لیا میکشی پر آج
دے دے کے چھیٹے مولویوں کو شراب کے

۱۸۹۶ تجلیات عشق، ۳۲۱

کسی نے کچھ ان کو ابھارا تو ہوتا
نہ آتے نہ آتے یہاں آتے آتے

۱۹۰۵ داغ، مہتاب، ۱۹۳

میں پاؤں تو پوچھوں کہ ظالم تجھے
ابھارا تھا کس نے کہ دیکھے مجھے

۱۹۱۰ قاسم و زہرہ، ۸

بس اس کو ابھار کے پانچ چار پرچے منگواؤں گا اور مزے سے دیکھوں گا۔

۱۹۲۴ اودھ پنچ، ۹: ۴۴، ۶

مجھ کو بھری بہار میں افسردہ دیکھ کر
کیا کیا ابھارتے ہیں مرے بال و پر مجھے

۱۹۲۰ بیخود موہانی، ک، ۱۱۰

۸ - اغوا کرنا، بھگا لے جانا، لے اڑنا

پاؤں میں مجنوں کے تو طاقت نہیں اے کودکو!
موسم گل کی ہوا تم کو ابھارے شہر سے

۱۸۴۶ آتش، ک، ۱۷۴

عیار تھا عجیب زلیخا کا جذب عشق
کنعاں سے ماہ مصر کو لایا ابھار کے

۱۸۷۰ د، اسیر، ۴۰۹

۹ - جلا ، نمو ، فروغ دینا

بنا لیں سوز نہاں کو ابھار کر شعلہ
بیان حال کو ہے اک زبان کی حاجت

۱۹۲۶ فغان آرزو ، ۸۲

جبہ سائی نے ابھارا نور دل کو اس قدر
سنگ در پر ان کے لو دے اٹھی پیشانی مری

۱۹۳۱ گلکدۂ عزیز ، ۱۴۳

۱۰ - حرکت میں لانا،تحریک دینا

قسم اس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا

۱۹۳۷ شعلہ و شبنم، ۲

۱۱ - نمایاں کرنا ، واضح کرنا

امر زیر بحث ابھار کر دکھایا گیا تھا۔

۱۹۲۱ مہدی ، مکاتیب، ۱۲

وہ نقش جسے خود ید قدرت نے ابھارا
۱۹۳۳ سیف و سبو ۱۷۳

۱۲ ۔ اٹکی یا دبی ہوئی چیز کو نکالنا ، باہر کرنا ، اوپر لانا

چٹکیوں سے بھی تری جی کی کھٹک مٹ جاتی
یونہی بیٹھے ہوئے کانٹے کو ابھارا ہوتا
۱۹۵۱ آرزو ، سریلی بانسری، ۶

اُبھارُو (فت ا و مع) صف

۱ ۔ ابھارا دینے ولا

۲ ۔ اڑا لے جانے، غائب کر دینے والا ، اٹھائی گیرا ، چور

۳ ۔ ابھرا ہوا ، سطح پر نمایاں ، م : زردوزی کا کام ابھارو تھا.

۴ ۔ الارو ، ایک طرف سے زیادہ اٹھا ہوا

[ار : ابھار+ؤ (صفتی)]

اُبھاروں میں آنا ف ل **بھروں مں آنا، بڑھاوے میں آنا**

اُبھارے لینا ف ل **۱ ۔ عود کرنا، پنپنا**

۲ ۔ لہرا لہرا کر اوپر چڑھنا ، ہوا یا پانی میں بلند ہونا

اَبھاگ (فت ا) صف (قدیم)

رک: '' ابھاگی ''

راجہ ... بچار کرنے لگا کہ دیکھیں میرا بھاگ پھرے یا ابھاگ رہوں۔
۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی، ۶۴

اَبھاگن (فت ا ، گ) صف ، مث

رک: '' ابھاگی ''

اس ابھاگن کے باغ تمنا میں یہی ایک پودا تھا .
۱۹۳۶ پریم چند، واردات، ۶۱

یہ تو مجھ ابھاگن کا بیٹا ہے .
۱۹۴۷ دہاتی بانکیں، ۶۱

اَبھاگنی (فت ا ، سکن گ ، ی مع) صف مث

ہٹ جا، مجھے مت چھو، میں ابھاگنی ہوں، روسیاہ ہوں .
۱۹۱۸ بازار حسن ۲۶۲

اَبھاگی (فت ا ، ی ، مع) صف

۱ ۔ بدنصیب ، قسمت کا ہیٹا

من سکھی بڑی ابھاگی ہے جو تجھ سے نردھن کے پلے پڑی .
۱۸۶۸ رسوم ہند، ۳۲

دیس سماج سبھی ہیں شترو
کوئی ابھاگی کا نہیں لاگو
۱۹۳۶ جگ بیتی، ۴۳

۲ ۔ منحوس ، سبز قدم

[س : अभागिन ا (حرف نفی) + بھاگن (بھاگ = حصہ + ن = علامت صفت) قسمت یا حصہ والا]

اُبھَرنا (ضم ا، فت بھ سکن ر) ف ل

۱ ۔ سطح سے نمایاں ہونا ، آس پاس کی سطح سے متجاوز ، ناہموار ، اٹھا یا پھولا ہونا

یہ سانپ بہت بڑا ہوتا ہے اور گردن تو بہت ہی موٹی ہوتی ہے اور ناک کی جگہ ابھری ہوئی ۔
۱۸۹۰ تریاق مسموم ، ۱۲

زمین کے اوپر کے حصے کی تہ پھول کر بوجھ پالے کے ابھر جاتی ہے ۔
۱۹۰۶ تربیت الصرا ، ۱۷

ان کے گال کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور پلکیں کوتاہ ہیں۔
۱۹۱۳ تمدن ہند ، ۶۹

آنحضرت صلعم کی پشت پر جو مہر نبوت تھی ، ابھری ہوئی تھی -

۱۹۲۰ سیرۃالنبی ، ۲ : ۳۷۹

۲ - بلند ہونا ، اوپر اٹھنا ، اونچائی اختیار کرنا

قلۂ کوہ جو ابھرا ہے تو اک شان کے ساتھ
کھڈ جو گہرائی میں اترا ہے تو اک آن کے ساتھ

۱۹۰۶ کلام نیرنگ ، ۴۰

۳ - بڑھنا ، پنپنا ، افزائش پانا

اس میں شعوری تنقید کا مادہ ابھرتا ہے۔

۱۹۲۳ تعلیمی خطبات ، ۸

مٹتا ہے یقیں اور ابھرتا ہے گماں اور

۱۹۴۷ سنبل و سلاسل ، ۳۲

۴ - سطح پر آنا ، سرنکالنا

ابھریں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم

۱۸۷۴ انیس ، مراثی ۱ : ۴۲

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا ، گیا دور گراں خوابی

۱۹۲۴ بانگ‌درا ، ۳۰۳

۵ - ابھارا لینا ، ڈوب کر ترنا

محیط عشق سے ساحل تلک اللہ پہنچا دے
بٹھائے دیتی ہے تہ کو قضا جوں جوں ابھرتے ہیں

۱۸۵۰ د ، رند ۱ : ۹۶

قلزم عشق سے اے خضر ہمیں خوف نہیں
بیٹھ کر تہ میں ابھر تے ہیں ابھرنے والے

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۲۵۴

ایسے دریائے تحیر میں ڈوبیں کہ پھر نہ ابھریں

۱۸۹۱ طلسم ہوش ربا ، ۵ : ۶۲۵

جو کچھ بار تھا اتار کر دریا میں غرق کردیا گیا مگر رات کو وہ پھر سطح آب پر ابھر آیا .

۱۹۳۴ ریاض خیرآبادی ، انتخاب فتنہ ، ۲۲۴

۶ - اچکنا ، قد کشیدہ ہونا ، سر یا گردن کو اونچا کرنا

بس ایک دم کے ہیں سب آشنا ابھر کے تہ چل
کسی سے آنکھ یہاں تو نہ اے حباب ملا

۱۸۷۰ الماس درخشاں ، ۲۸

یہ عذر میں نہیں سنتا کہ قد ہے چھوٹا سا
اڑاؤ تیغ سے گردن ذرا ابھر کے سہی

۱۹۲۵ شوق قدوائی ، ۶۵

۷ - عود کرنا ، ہرا ہونا (مرض ، چوٹ وغیرہ کا)

راستے میں ہوا جو چلی تو چوٹ نے اثر دکھایا، ابھری اور ان کو بہت ہی پریشان کیا .

۱۹۰۳ خدائی فوجدار ، ۱ : ۲۷

۸ - دبی ہوئی یا پست حالت سے نکلنا ، سنبھلنا ، پنپنا ، ترقی کرنا ، سربلند ہونا

پست رہنا چاہئے یا کچھ ابھرنا چاہئے
کیا ہمیں کچھ فیصلہ اس کا نہ کرنا چاہئے

۱۸۸۹ لیل و نہار ، ۳۱

یہ خیال ان کو ابھرنے اور پنپنے نہیں دیتا

۱۸۹۹ رویائے صادقہ ، ۶۹

نہ آپ ابھر سکے نہ کسی کی مدد سے ابھرنے کا ارادہ کرے -

۱۹۱۴ حالی ، مقالات ، ۲ : ۱۳۳

اگر عیسائی تعاقب کرتے تو ان کا پھر ابھرنا دشوار ہو جاتا .

۱۹۲۶ شرر ، ملک‌العزیز و رجنا ، ۱۲۹

۹ - غائب ہونا ، اڑ جانا ، چلتا بننا

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
اور ہوں گے تری محفل سے ابھرنے والے

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۲۵۴

۱۰ - نمایاں ہونا ، ظاہر ہونا

آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد
ابھریں گے عشق دل سے ترے راز میرے بعد

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۱۷۴

آگ پر سینکنے کے ساتھ اس میں
آئیں گے نکلے کالے حرف ابھر

۱۸۱۸ انشا ، ک ، ۲۱۲

داغ دل ، داغ جگر ، نقش جفا ، نقش وفا
نہ مٹانے سے مٹیں گے یہ ابھرنے والے

۱۹۰۵ داغ ، انتخاب ، ۱۸۸

۱۱ - اٹھان پر ہونا ، جوش میں آنا

نکلا آتا ہے جوبن جوانی ابھری آتی ہے
مری حسرت نکلتی ہے مرے ارمان ابھرتے ہیں

۱۸۹۶ د ، راسخ دہلوی ، ۱۲۶

تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا
سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کو ابھرنا

۱۹۳۴ چمنستان ، ۱۷۷

بچے فراغ طبع سے اب کھیلتے نہیں
ابھرے ہوئے جوان بھی ڈنڑ پیلتے نہیں

۱۹۲۱ اکبر ، ک ، ا : ۲۹۶

۱۲ - اکڑنا ، تننا ، غرور کرنا

تصور سے ترے موجیں رہا کرتی ہیں لہروں میں
ہوا بھر کر تری سر میں حباب بحر ابھرتے ہیں

۱۸۴۶ آتش ، ک ، ۱۲۲

فرصت یکدم پہ اس بحر جہاں میں اے حباب
کیا ابھرتا ہے تو اتنا تیری ہستی ہے یہی

۱۸۴۹ ک ، ظفر ، ۲ : ۱۷۵

جو کہ اعلیٰ تر بنا آخر ہوا ادنیٰ تریں
جو ذرا ابھرا یہاں اک دن ہوا وہ تہ‌نشیں

۱۹۱۰ جذبات نادر ، ا : ۵۷

[ار : اُبھر (رک : ابھار) + نا (علامت مص)]

اُبھرواں (ضم ا ، فت بھ ، سکن ر) صف

۱ - ابھرا ہوا ، ابھرتا ہوا

رک : ع ابھرنا ا ، ۲ ، ۶

اس نے اپنے کو ابھرواں جنبش دی ... میں اس کی اس ابھرواں جنبش کے معنی نہیں سمجھی کہ آیا یہ کچھ کہنا چاہتی تھی .

۱۸۹۸ روزا لیمبرٹ ، ۳۳۲

جلی قلم سے کندہ کیا ہوا ہے ، حروف ابھرواں ہیں .

۱۹۱۱ ظہیر دہلوی ، داستان غدر ، ۵۵

وہ گوری گوری ابھرواں سینے والیاں

۱۹۱۴ حالی ، مضامین ، ۳۲۸

[ار : ''ابھرنا'' سے اسم حالیہ (ابھر+واں)]

اَبھک (فت ا ، بھ) صف

۱ - ات گت ، اٹا ٹوٹ ، بہت زیادہ

اگر مشعل ایسا ابھک پینے والا نہ ہوتا ، اوندھا ہوجاتا .

۱۸۹۲ طلسم ہوش‌ربا ، ۶ : ۱۱۹

[س : اَت بَھکشَک अतिभक्षक = بہت کھانے والا]

اُبھک (ضم ا ، فت بھ) امذ (قدیم)

۱ - اخراج ، بہاؤ ، سیلان

قطب کے صبر سو انجھواں دئے دریا کوں ابھک
کیا کروں عشق نہیں دیتا ہے یو بات چھپن

۱۶۱۱ محمد قلی ، ک (غزلیات) ۱۸۷

[ار : حاصل مصدر ابھکنا (اپکنا = نکالنا) سے ۔ دیکھو ''اپکا'']

اَبھلا کھا (فت ا ، کس بھ) امث

خواہش، آرزو ، تمنا

اگر اب بھی تجھے مجھ پر دیا نہیں آتی تو آج مجھے مار ڈال .. بس اب یہی ابھلاکھا ہے ۔

۱۹۳۶ پریم چند ، زادراہ ، ۸

[س : آبھلاشا अभिलाषा]

اَبھمان (فت ا ، کس بھ) امذ

۱ ۔ گھمنڈ ، غرور ، تکبر

یہ روپ ! مدن کے بھی خطا ہوں اوسان
یہ سج جو توڑ دے رتی کا ابھمان

۱۹۲۷ روپ ، ۱۷۳

۲ ۔ خودداری ، پاس وضع

یہ بات تو ہم لوگوں کو اس وقت کرنی کبھی ہے جب...کسی کا ابھمان مٹانا ہو ۔

۱۸۶۸ رسوم ہند ، ٦٦

[س : آبھمان अभिमान]

اَبھمانی (فت ا ، کس بھ) صف

۱ ۔ گھمنڈی ، متکبر ، مغرور

اس کا حاجتمند نربل بھی ہے ، ابھمانی بھی ہے
جتنا وہ دھن وان ہے اتنا ہی وہ دانی بھی ہے

۱۹۳۵ آغا حشر ، پہلا پیار ، ۷۳

[س : ابھمان + ـِن (علامت صفت) अभिमानिन]

اَبھو کَن (فت ا ، و مع فت ک) امذ (قدیم)

۱ ۔ زیور ، گہنا ، پاتا

سب ابھوکن اس کے تن پر خوشنما
تھا دوپٹا بادلے کا پَر جلا

۱۷۱۳ فائز دہلوی ، ۲۰۵

[س : ابھ अभि + بھوشَن भूषण]

اَبھوگ (فت ا ، و مج) امث (قدیم)

۱ ۔ ترک ، پرہیز ؛ نہوت ، ناداری

یو بھوگ بی گیان ابھوگ بی گیان
یو جب بی توگیان جوگ بی گیان

۱۷۰۰ من لگن ، ۵۱

۲ ۔ (موسیقی) دھر پد کا چوتھا حصہ جو تارا استھان کے سروں میں گایا جاتا ہے

رنڈی ، آستائی ، انترا ، سنچائی ، ابھوگ ، نماز میں بھی نہ بھول سکی ۔

۱۹۲۸ اودھ پنچ ، ۱۳ : ۱۲ ، ۹

[س : ا अ (نافیہ) + بھوگ भोग (=کھانا ، لطف ، لذت)]

ـــپرن (فت پ ر) امث

(موسیقی) تان کی تیسری قسم ، اس کا آچار (آغاز) گندھار اور مدھم سر سے ہوتا ہے

۱۸٦۲ غنچہ راگ ، ۵۱

اَبھولا (فت ا ، و مج) (قدیم)

غافل ، بےپروا ، بیخود

کیتک دن ہو ہرن او شاہ بھولا
رہیا تھا سب کسی سوں ہو ابھولا

۱۶۵۵   پھولبن ، ۴۹

[س ابھاول (ا अ = نافیہ + بھاو भाव = فطرت + ل क = الحاقی) = بے خود]

ابھو ، ابھوں (فت ا ، ومع ا ومج ، ن غنہ) ظرف
(پورب) رک : ''ابھی'' جو فصیح ہے .

ابھی (فت ا ، ی مع) ظرف

۱ ۔ فی الحال ، سردست

موسم خط میں نہ کر فکر اے گل رنگیں ادا
سبزۂ گلزار خوبی کا ابھی آغاز ہے

۱۷۰۷   ولی ، ۲۲۵

ابھی ایک گوشے میں چھپ کر حقیقت ان درویشوں کی جاننا چاہئیے۔

۱۸۰۲   باغ و بہار ، ۱۷

کوئی دم ہے بحر ہستی میں ابھی تو اے حباب
حبس دم کی بڑھ سکے کثرت تو جوں شاغل بڑھا

۱۸۲۵   ک ظفر ، ۱ : ۸

ہاں اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کیا ہے. ابھی دیکھتا ہوں آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی .

۱۸۶۹   غالب ، نادر خطوط ، ۵۷

رائے صاحب نے سخت تاکید کردی ہے کہ وہ اپنی بہن کو ابھی کچھ دن تک خط نہ لکھا کرے .

۱۹۲۲   افسانچے ، ۱۸

۲ ۔ اسی آن ، ترت ، فوراً

اوس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوو ، کر دکھاتا ہوں میں

۱۸۰۳   رانی کیتکی ، ۵

لوح یاقوت ہے آئینہ ترے پر تو سے
عکس پڑ جائے تو چاندی ابھی زر ہوجائے

۱۸۳۸   ناسخ ، د ، ۲ : ۱۵۰

رات ابھی دوڑتی آئے جو کرو وعدۂ وصل
کہئیے تو چار گھڑی دن سے اندھیرا ہوجائے

۱۹۰۵   محسن کاکوروی ، ک ، ۲۰۰

۳ ۔ ذرا دیر پہلے ، ماضی قریب میں

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

۱۸۱۰   میر ، ک ، ۳۲۹

اتنا رویا لہو تو کب جرأت
ابھی دامن ترا تو لال نہ تھا

۱۸۱۰   جرأت ، د ، ۱۰۲

ابھی تو بزم میں آئے ہیں تیری اے ساقی
کوئی دنوں تو مزا لینے دے ایا غوں کا

۱۸۲۹   میر سوز ، د (ق) ، ۱۵

غل نہ کر مرغ قفس سویا ہے صیاد ابھی
کوئی سننے کا نہیں نالہ و فریاد ابھی

۱۸۵۷   رند ، د ، ۱۹۸

پوشیدہ ہے قصہ نہ احد کا نہ جمل کا
بت توڑے ہیں کعبے میں ابھی ذکر ہے کل کا

۱۸۷۴   انیس ، مراثی ، ۲ : ۲۱۴

ابھی کل کا ذکر ہے ان کے ایک کابلی دوست کو دوچار روپئے کی ضرورت تھی .

۱۹۳۵   اودھ پنچ ، ۱۰ : ۶ ، ۱۰

۴ ۔ ذرا دیر بعد ، ذرا دیر میں

شیخ بادشاہ عصر کی ملازمت کو گئے ہیں ، ابھی آتے ہیں ۔

۱۸۰۳ خرد افروز ، ۱۲۳

سبب نہوری نظروں کا کہیئے تو کہہ دوں
ابھی سیدھی سیدھی سناؤ گے کیا کیا

۱۸۹۹ ظہیر ، د ، ۱ : ۳۴

ابھی آتا ہوں میں بھی پھر پھرا کر
ذرا بازار میں چکر لگا کر

۱۹۲۱ گورکھ دھندا ، ۲۰

۵ ۔ ابھی سے ، اتنی جلدی

کچھ دیر ہے رہائی مرغ اسیر میں
جائے ابھی چمن سے نہ موسم بہار کا

۱۸۲۴ مصحفی ، (انتخاب رامپور) ، ۲۵

ابھی گھبرا گئے کیوں حضرت دل
ابھی کیا کیا ہوا کیا کیا نہ ہو گا

۱۸۹۸ خانۂ خمار ، میکش ، ۱۹

کیا غرض کیوں وہ سنے وصل کا پیغام ابھی
ٹھوکریں کھائے گا برسوں دل ناکام ابھی

۱۹۱۹ درشہوار، بیخود ، ۱۰۱

۶ ۔ ہنوز ، اب تک ، تب تک

خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

۱۲۶۵ (شیخ فریدالدین شکر گنج)

ابھی یہ ذکر تھا ، ہوا عالمگیر ہوئی ، جہاز تباہی میں آیا ۔

۱۸۲۴ فسانۂ عجائب ، ۱۶۹

سمجھا ہے شب ہجر عدو کو وہ قیامت
ظالم نے ابھی روز جزا کو نہیں دیکھا

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۲

مگر میری تو شادی بھی نہیں ہوئی ابھی ۔

۱۹۲۱ گورکھ دھندا ، ۴۵

مری نوا سے گریبان لالہ چاک ہوا
نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی

۱۹۳۶ ضرب کلیم ، ۱۳۲

۷ ۔ اس کے بعد ، آئندہ

بولی کہ سنو گے کچھ ابھی اور
کیا دل میں ہے کچھ کہو تو فی الفور

۱۸۹۵ دفتر سحر ، ہوش ، ۱۱۵

تیرا کرم فزوں رہے عزم کرم فزوں
جب تک جئیں گے ہم سے تو ہوگی خطا ابھی

۱۸۹۷ ک ، راقم ، ۲۲۶

ابھی اور وہ روشنی تیز کرتے
یہ نقش اور ابھی ہو کے روشن ابھرتے

۱۹۱۰ جذبات نادر ، ۴۳

شب لحد میں زیارت اگر نصیب میں ہے
سحر سے پہلے وہ آئیں گے ایک بار ابھی

۱۹۳۲ بینظیر ، کلام ، ۲۰۱

غم عزیزوں کا حسینوں کی جدائی دیکھی
دیکھیں دکھلائے ابھی گردش دوراں کیا کیا

۱۹۲۶ طیور آوارہ ، ۲۷

۸ ۔ کسی وقت ، ایک وقت میں ، کبھی
(متقابل تکرار کی صورت میں)

اللہ ری عجلت ابھی آنا ابھی جانا
مشتاق محبت کو ہنسانے ہی رولانا

۱۸۷۴ انیس مراثی ، ۲ : ۴۹

خواب میں تھے ہم بغل ، اس سے جو جاگے کچھ نہ تھا
واہ اے گردوں ابھی کیا تھا ابھی کیا ہو گیا

۱۸۷۸ د ، واسطی ، ۶

ابھی ایک مشرق کا واقعہ بیان ہو رہا تھا ، ابھی مغرب کا دوسرا واقعہ بیان ہونے لگا ۔

۱۹۱۳ حالی ، مکاتیب ، ۲۰

ابھی الفت ابھی یک لخت نفرت
ابھی کیا تھا ابھی کیا دیکھتا ہوں

۱۹۳۷ معارف جمیل، ۹۲

اس کے کہنے پہ نہ جا دیکھ کہ جس نے تجھ سے
ابھی تیری سی کہی تھی ابھی میری سی کہی

۱۸۵۴ ک، ظفر، ۳ : ۱۲۲

ولی سے پہلے دکنی ادب میں '' ابھی '' نہیں ملا ۔ اس دور کے ادیب، اجھوں، اجھنوں، اجنوں، اجوں اور اجنو استعمال کرتے ہیں ۔

[ار : اب + ی (س: [illegible] = کلمۂ تاکید) یا
اب + بھی (س : अपि = بھی)]

—ابھی مف ۔ ۱ ۔ **ذرا پہلے، دم بھر پہلے**

توڑا ہے دم ابھی ابھی بیمار ہجر نے
آئے، مگر حضور کو تاخیر ہوگئی

۱۹۲۷ روح رواں، ۸۴

وہ جلسے ابھی ابھی درہم برہم ہوئے ہیں ۔

۱۹۴۷ ادبی تبصرے، ۳۶

۲ ۔ فوراً، اسی وقت

مطلب دل ابھی ابھی کہیے
فرق تعمیل ہو جبھی کہیے

۱۸۸۴ مثنوی عالم، ۹۷

میں ابھی اپنے فرشتۂ قدرت کو جو حکم دوں تو وہ ابھی ابھی ہم سب کو کھا جائے ۔

۱۹۰۳ آفتاب شجاعت، ۲ : ۲۳۳

—تک مف ۔ **اب تک، اس وقت تک، ہنوز**

ابھی تک بوئے عشق آتی ہے تیرے خون کے تھالوں میں

۱۹۰۱ آفتاب شجاعت ۱ : ۶۵۳

ابھی تک تمہاری روٹیاں نہیں پک چکیں ۔

۱۹۳۶ پریم چند، واردات، ۱۰۲

—چھٹی کا دودھ نہیں سوکھا (محاورہ) ہنوز نادان بچے ہیں، کچھ تجربہ نہیں رکھتے، کم عقل لونڈے ہیں (دریائے لطافت، ۱۳۵، ۱۸۰۷ء)

—دلی دور ہے (محاورہ) ۱ ۔ منزل مقصود نہیں آئی

بدر پر تک مصحفی تو آن پہنچا ہے تو کیا
بیٹھ مت رہیو ابھی اے یار دلی دور ہے

۱۸۲۴ مصحفی، (ق)، ۴

۲ ۔ کامیابی میں ابھی اور وقت لگے گا

تم سخاوت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، اس منزل کو کب پہونچو گے، ابھی دلی دور ہے ۔

۱۸۰۲ باغ و بہار، ۷۶

یوں مٹاؤ نہ اپنے آپ کو تم
وصل کی ہے ابھی تو دلی دور

شاد، ؟

(نیز رک : دلی، ہنوز)

—دودھ کے دانت (بھی) نہیں ٹوٹے (محاورہ) ہنوز بچہ ہیں، ہوش نہیں سنبھالا ہے، کچھ تجربہ نہیں رکھتے (مہذب، امیر اللغات)

بچپنا ہے مرے اشکوں سے جو رخ چھوٹے ہیں
دودھ کے دانت ابھی شبنم کے نہیں ٹوٹے ہیں

۱۹۲۵ شوق قدوائی، د، ۹۹

(نیز رک : دودھ کے دانت)

—دیکھا کیا ہے (محاورہ) (کیا دیکھا)

۱ ۔ دنیا کا تجربہ نہیں، الھڑ، ناتجربہ کار ہیں

ہوگئے غیر کے کہنے سے ہمارے دشمن
حق بجانب ہے کہ تم نے ہے ابھی کیا دیکھا

۱۸۵۴　ریاض مصنف ، اسیر ، ۴

چشم بد دور تمہارا ابھی سن ہی کیا ہے
ابھی کیا لطف اٹھائے ابھی کیا دیکھا ہے

۱۹۲۷　روح رواں ، ۶۰

آپ نے حضرت نادان ابھی دیکھا کیا ہے

۱۹۲۵　نادان (ق)

۲ - ابھی اور کچھ ہوگا

طور پر حضرت موسیٰ جو گرے غش کھاکر
جلوۂ یار پکارا ابھی دیکھا کیا ہے

۱۹۲۹　د ، نادر ، ۹۴

---سویرا ہے (محاورہ)

۱ - ہنوز وقت باقی ہے، ابھی کچھ نہیں گیا ہے ، تدارک ہوسکتا ہے

غیر کا عشق ہے کہ میرا ہے
صاف کہہ دو ابھی سویرا ہے

۱۹۰۴　سفینۂ نوح ، ۲۰۱

---سے　مف - ۱ - **اتنی جلدی**

ابھی سے رشک ! ابھی کے دن کے راتیں

۱۸۹۹　ہیرے کی کنی ، ۲۲

۲ - ابتدا ہی میں، اس عمر میں، کم سنی میں

دل کو کرے گا خوب یہ دیوانہ پن خراب
اس کے ابھی سے ڈھنگ برے ہیں، چلن خراب

۱۸۵۴　ک ، ظفر ، ۳ : ۲۳

ابھی سے چوری کرنا سیکھے ، بڑھ کر تو خوب ہتھے صاف کرو گے -

۱۸۷۸　فسانۂ آزاد ، ۱ : ۲۵۰

۳ - اسی وقت سے، آج سے

مناسب ہے ابھی سے اس کی تدبیر
نہایت زہر ہے اک دم کی تاخیر

۱۸۶۳　طلسم شایاں ، ۱۱

ہم مر کے بھی اٹھنے کے نہیں اس کی گلی سے
سن رکھیے ذرا شور قیامت یہ ابھی سے

۱۹۰۳　نظم نگاریں ، ۱۹۸

اس دن کا ابھی سے مجھے اک خوف ہے پیدا
ہو طول نہ اس روز کہیں باعث ایذا

۱۸۷۵　دبیر ، دفتر ماتم ، ۱۰ : ۱۲

---کچھ نہیں بگڑا ہے / گیا ہے

(محاورہ) ہنوز وقت باقی ہے ، تدارک یا تلافی ہوسکتی ہے -

ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے ایسا نہ ہو کہ آئندہ ادھر سے بھی شان استغنا ظہور کرے -

۱۸۹۱　فغان بے خبر ، ۱۱۳

---کے ابھی (محاورہ)

کچھ دیر نہیں گزری

مصیبت زدوں کی طرح نوحہ و زاری کرتا ہوا دروازے پر آیا ، بولا یہ فرزند طوطی سا گویا ابھی کے ابھی عالم سکوت میں آگیا ہے .

۱۸۲۵　سیر عشرت ، ۲۷

---کیا ہے (محاورہ) ہنوز آغاز ہے ، آئندہ اس سے زیادہ ہوگا . (اکثر طنزاً)

ابھی کیا ہے ، خدا آپ کو بہت سا سلامت رکھے۔

۱۸۰۷　دریائے لطافت ، ۱۳۵

ابھی کیا ہے ، یہ ایک لڑکیوں کا مدرسہ ہی کھلا ہے ، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا .

۱۹۱۴　راج دلاری ، ۱۵

اس انقلاب کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں
زمانہ کہتا ہے ، دیکھا کرو، ابھی کیا ہے

۱۹۲۱　اکبر ، ک ، ۱: ۲۲۵

ابھر آنے دو جوبن کو ذرا رنگت نکھرنے دو
جوانی رفتہ رفتہ رنگ لائے گی ، ابھی کیا ہے

۱۹۳۴ رونق دہلوی ، ۱۴۴

ـــکے دن کے راتیں (محاورہ) تھوڑے دنوں کی بات ہے ، حال کی بات ہے ، زیادہ زمانہ نہیں ہوا .

ابھی سے رشک ، ابھی کے دن کے راتیں .

۱۸۹۹ ہیرے کی کنی ، ۲۲

ـــکے دن ہوئے (محاورہ) تھوڑا عرصہ ہوا ، زیادہ مدت نہیں ہوئی .

سر سید کے زمانے کو ابھی کے دن ہوئے ، کل کی بات ہے .

۱۹۲۱ مہدی ، افادات ، ۱۳۱

ـــمنہ دابئے تو چلو بھر چھٹی کا دودھ نکل پڑے (محاورہ) رک : ابھی چھٹی کا دودھ نہیں سوکھا

(نور ، امیر ، مہذب)

ـــمنہ کی دال نہیں جھڑی (محاورہ) رک : ابھی چھٹی کا دودھ نہیں سوکھا .

(نور ، امر ، مہذب)

ـــہونٹوں کا دودھ نہیں سوکھا (محاورہ) رک : ابھی چھٹی کا دودھ نہیں سوکھا .

اَبھیاس (فت ا ، سکن بھ نیز کس بھ بشد) امذ

۱ - روحانی ریاضت

ابھیاسوں پہ نہ جاؤ کہ یہ سب مایا ہے
یہ وہ دھوکا ہے کہ بہتوں نے یہاں کھایا ہے

۱۹۱۰ کلام مہر ، ۹۹

دل کی یکسوئی میں جس کا شغل یوگ ابھیاس ہو
ہے یہی تعلیم داناؤں کی اس کا پاس ہو

۱۹۵۰ دھم پد ، ۸۰

۲ - مشق ، ریاض ، کام کو بار بار کرنا تاکہ عادت یا مہارت ہوجائے

راجہ نے کہا جیموت... ذات کا چھتری ہے ، اسے جی دینے کا ابھیاس ہو رہا ہے ، اس سے اسے جان دینی کچھ کٹھن نہ معلوم دی .

۱۸۰۲ بیتال پچیسی ، ۴۷

انسان جس صفت ، جس ہنر ، جس فن ، جس کرتب کا ابھیاس کرتا ہے ، اس میں کچھ نہ کچھ مشق و مہارت حاصل کر لیتا ہے .

۱۸۸۰ تذکرۂ غوثیہ ، ۱۳۲

چھوٹ جائے ابھیاس تو ہو میٹھا بھی کھٹا

۱۹۲۵ بیتاب ، پتنی پرتاپ ۲۰

[س : اَبھیاس अभ्यास = ریاض]

اَبھی روگ (فت ا ، ی مع ، و مج بہ ضم) امذ

مویشی کی بیماری جس سے زبان پر چھالے اور ان میں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں (اصطلاحات پیشہ وراں ، ۵ : ۹۲، ۱۹۳۹ ع)

[س : آبھ अभि (سابقہ) ، روگ रोग (بیماری)]

آپ (فت ا) ضمیر (قدیم)

۱ - آپ ، خود

جگ کے سنگار ہور عرش کے آپ گوشوارے میں علی

۱۶۱۱ محمد قلی ، ک ، ۷۱

۲ - اپنا ، اپنی

پیا کو بلا لیائے ہوں آپ مندر

۱۶۱۱ محمد قلی ، ک (غزلیات) ، ۲۳۲

پرونے لگیا بیس اپ ہات سوں

۱۶۲۵ سیف الملوک ، غواصی ، ۱۸

[پ : آپ अप्प س : آتم आत्म]

—سے ازخود ، آپ ہی ، اپنے آپ

بچن کا دیواکاں تب اپ سے جگائے

کہ جب عقل کی چرب روغن نہ پائے

۱۶۵۷ گلشن عشق ، نصرتی ، ۳۳

آپ (فت ا) حرف

سابقہ جو اسما کے شروع میں دوری ، پستی ، نفی اور جدائی وغیرہ معانی پر دلالت کرتا ہے م: آپ سُر ، آپ کبت (رک)

[س: آپ अप]

—سُر (ضم س) گویا جو سُروں کا خیال نہ رکھے اور ایک راگ کے سُر اور سُرتیاں دوسرے راگ میں ملادے ۔

[س : آپ+سُور अप + स्वर = بے سُرا]

اُپ (ضم ا) (الف) امث ۔ آپائی (رک)

اُپ (ضم ا) حرف

سابقہ جو اسما کے شروع میں قرب ، مماثلت ، یا ضمنیت اور پستی کا اظہار کرتا ہے ۔ جیسے

اُپ انگ ، اُپ جنتر (رک)

[س : آپ उप]

—انگ (ضم ا ، ن غنہ) امذ ۔ اپانگ

نسترنگ ، پاکستان کی شمال مغربی سرحد والوں کا ستار یا سارنگی کی قسم کا ساز (اصطلاحات پیشہ وراں ، ۴ : ۱۶۷)

[س : آپ (= ضمنی) + انگ (= حصہ]

—جنتر (فت ج ، سکن ن ، فت ت) امذ

پرندوں کی چونچ کی شکل کا جراحی آلہ جو چھوٹی بڑی پچیس وضع کی چونچوں کے مشابہ ہوتا ہے ۔ (اصطلاحات پیشہ وراں، ۷: ۱۱۶، ۱۹۳۹)

[س : اپ (سابقہ) + جنتر (= س : ینترم यन्त्र = مشین]

—سان امث ۔ سچے نگوں کو جلادینے کے لئے عمدہ لکڑی کی بنی ہوئی سان

[ار : آپ (= اُپ) + سان (=فسان) مرکب و صفی]

—ناس/نیاس امذ (موسیقی) وہ سُر جس پر راگ کا ایک حصہ ختم ہو۔ نیاس کے سُر پر پورا راگ ختم ہوتا ہے اور آپ نیاس پر راگ کا ایک حصہ

[پ: اپناس उपनास س: آپ (سابقہ) + نیاس उपन्यास]

—وَن (فت و) امذ

خانہ باغ

زنجیر حیات بحر و بر ھلتی ہے
آپ ون بن میں کلی کلی کھلتی ہے

۱۹۴۲ روپ ، ۱۲۷

۔وید امذ ۔ فرعی علوم و فنون جو ویدوں سے ماخوذ ھیں (یہ چار ھیں : تیراندازی ، یجر وید سے ماخوذ ۔ موسیقی ، سام وید سے ۔ طب اور فن تعمیر ، رگ وید اور اتھر وید سے)

شام وید کے بھجن گا کے ادا کئے جاتے تھے ، آپ ویدوں میں وہ بحیثیت ایک فن کے مرتب کی گئی ۔

۱۹۱۶ ہندوستان کی موسیقی ، شرر ، ۳

[س : آپ (شاخ) + وید (علم) उपवेद]

اُپا (ضم ا) صف مذ

رک : " آپی " (مث) جو زیادہ عام اور کثیرالاستعمال ہے

آپے ہوئے چمکدار چاقو دیکھ کے بیمار کی جان نکل گئی ۔

۱۹۲۸ اودھ پنچ ، ۱۳ : ۲۰ ، ۶

اَپاپ (فت ا) امذ

بے گناھی ، معصومی

[س : ا (نافیہ) + پاپ (گناہ) अपाप]

اُپادھیا (ضم ا ، سکن دھ) امذ

رک : اپادھیائے

میرے دادا معمولی نہیں مہا مہو اپادھیا پنڈت تھے ۔

۱۹۳۵ اودھ پنچ ، ۲۰ : ۱۷ ، ۲

اُپادھیائے (ضم ا ، شد دھ بکس)

۱ ۔ وید ، ویدانگ کا پڑھنے والا

۲ ۔ معلم ، استاد

۳ ۔ برھمنوں کی ایک قسم

اچاری ، اپادھیائے سے دس مرتبہ زیادہ واجب التعظیم ہے ۔

۱۹۱۳ تمدن ھند ، ۲۳۷

[س : آپادھیائے उपाध्याय = مطالعہ کرنے والا]

اَپار (فت ا) صف اپارا ، اپاری (قدیم)

۱ ۔ ناقابل عبور ، جسے پار نہ کیا جاسکے ، نا پیداکنار

یو اپار غرقاب دریا اسے نہیں پار ، پر ایک نہنگ اس دریا میں شناوری کرتا اپنی مقدار ۔

۱۶۳۲ سب رس ، ۳۰۹

یو دیکھ سو کیا اپار دریا
ھرجنس کے گوھراں سوں بھریا

۱۷۰۰ من لگن ، ۷۷

۲ ۔ بہت زیادہ ، بے حد و شمار

بھلے اور برے کوں دیا رزق اپار
کہ جوں تیر برسے بدل ٹھار ٹھار

۱۶۰۹ قطب مشتری ، ۳

سو ایسے میں روباہ اک کہنہ کار
ملیا سو دیکھیا اس کوں دلگیر اپار

۱۶۳۹ غواصی ، طوطی نامہ ، ۱۵۱

او ، پا چھاؤں شہ کے کرم کی اپار
منگے حق کنے یوں دعا ھت پسار

۱۶۵۷ گلشن عشق ، نصرتی ، ۱

دلیری کے پن کچ نہ ان میں اپار
جنم رہ کہ شہراں میں ایسے گنوار
۱۶۶۵ علی نامہ ، ۲۷۹

[س : ا + پار अपार = نامحدود]

اُپار (ضم ا) ظرف (قدیم)

رک : اوپر

جو رانی اتھی سال کی روزہ دار
جرس کی زباں تی صدا سن آپار
۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۵۸

آپارا ، ری (فت ا) صف (قدیم)

رک : اپار

چلے چندنی میں جب لٹک پیو ہمارا ،
اونن عکس دیپے چندر تھے اپارا
۱۶۱۱ محمد قلی ، ک (غزلیات) ، ۲۹۵

چندر سوجل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے
۱۶۱۱ محمد قلی ، ک (مراثی) ، ۵۸

اُپارنا (ضم ا) ف م

رک : آپاڑنا

وقت آیا ہے کہ غم کا جڑ اوپاریں پیٹرسوں
صد ہزاراں شکر پایا ہوں میں دھن عید کا
۱۶۱۱ محمد قلی ، ک (قصائد)، ۱۰

اُپاڑ (ضم ا) امذ

۱ ۔ اکھاڑنے ، ادھیڑنے کا عمل

۲ ۔ بدھی کا نشان ، آدھیڑن ، کھال کی ترقن

۳ ۔ دانے یا آبلے جو تیز دوا کی مالش سے جلد پر نمودار ہوجائیں

اف : **کرنا، لانا ، لینا ، ہونا**

[پ : آپڈ उपाड س : اُت پٹ उत्पट = اکھیڑنا]

اُپاڑنا (ضم ا) ف م آپارنا

۱ ۔ جڑ سے اکھاڑنا ، جڑ سمیت ڈھادینا ، بیخ کنی کرنا ، نیست و نابود کرنا

اگر سخت پولادتے ہوئے جھاڑ
سٹے پیڑتے اس کوں تھوں سوں اپاڑ
۱۶۰۹ قطب مشتری ، ۲۴

لیا وہیں وچازین میں نے اوپاڑ
پھرا اس کوں کر کر زمیں پر پچھاڑ
۱۶۸۱ جنگ نامہ سیوک (ق)، ۴۸

۲ ۔ بدھیاں ڈالنا ، کھال ادھیڑنا

۳ ۔ جڑی یا چپکی ہوئی چیز کو الگ کرنا ، نوچنا ، چھٹانا ، اکھیڑنا ، نیز مجازاً: بگاڑنا

جو پکڑی وھیں دندراویں اوپر
سو پنجرے میں نے کاڑ اوپاڑ اس کے پر
۱۶۳۹ طوطی نامہ غواصی ، ۲۰

کہا ان کی ڈاڑھی کو گرپشم میں نے
بھلا شیخ جی نے مرا کیا اپاڑا
۱۸۲۴ مصحفی (ق) ،

۴ ۔ تیار کرنا ، پارنا (کاجل کا)

پھر آزاد کل خلق گرویدہ ہو
پھر ایسا کوئی خاص کاجل اپاڑ
۱۹۳۷ معارف جمیل ، ۶۳

اُپاڑُو (ضم ا ، و مع) صف

۱ ۔ اپاڑنے والا ، کھال اتارنے والا ، آبلے پھپھولے ڈال دینے والا

[ار : اپاڑ + و (فاعلی)]

اُپاس (ضم ا) امذ

فاقہ ، روزہ

جوگی بولا مہاراج سنگھ اگر سات دن اپاس کرے تو بھی گھاس نہ چرے ۔
۱۸۰۱ سنگھاسن بتیسی ، ۳۶

مہری جورو ، لڑکے آج اپاس کریں گے ۔
۱۸۹۰ طلسم ہوش ربا ، ۳ : ۳۲

پانڈے جی دو وقت اپاس کئے پڑے رہے ۔
۱۹۲۵ اودھ پنچ ، ۱۰ : ۹/۵

اف: کرنا

[س : اُپ واس उपवास = گزارنا]

اُپاسک (ضم ا ، فت س) صف

۱ ۔ معتقد ، پیرو ، ماننے والا ، قب: اپاسی

سومناتھ کی عقیدت میں یہ قید نہ تھی کہ ان کو کرشن اپاسک یا رام اپاسک یا شیو اپاسک نہ مانیں۔
۱۹۲۳ غزنوی جہاد ، ۹

جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں ، انہیں دولت لات مارتی ہے ۔
۱۹۳۵ دودھ کی قیمت ، ۱۵۵

[س : उपासक اُپاس + ک = علامت فاعل]

اُپاسنا (ضم ا ، سکن س) امث اپاشنا

پوجنا ، عبادت کرنا ، پرستش کرنا

عشوہ طراز کوکلا ایشور کی اپاسنا میں محو ہوگئی ۔
۱۹۳۶ پریم چند، پریم چالیسی ، ۱ : ۲۳

استتی پرارتھنا، اپاسنا کے لئے تو ایک انترہ بہت تھوڑا ہے ۔
۱۹۲۵ بیتاب ، پنتھ پرتاپ ، ۳

[اُپاس (رک) + نا]

اُپاسی (ضم ا ، ی مع) صف (قدیم)

پجاری ، عبادت گزار ، اپاسنا کرنے والا

گھر ترا ہے یہ رشک دیول چین
اس میں مدت سوں دل اپاسی ہے
۱۷۰۷ ولی ، ۲۹۳

[س : اُپ واسِن उपवासिन]

اُپاشنا (ضم ا ، سکن ش) رک: اپاسنا

دوسری قسم کے وے ہیں جو سرگن کی اپاشنا کرتے ہیں اور بہشت و دوزخ کی بیم و رجا میں رہتے ہیں ۔
۱۹۱۲ جوہر معرفت ، ۱۰۵

اُپانا (ضم ا) ف م (قدیم) **پیدا کرنا، جنم دینا**

جن جوت میں گیان کو اُپایا
وہ گیان ہوا جگت کوں مایا
۱۷۰۰ من لگن ،

[س: اُت پَنّ उत्पन्न یا : اُپنّ = پیدا کرنا]

کو سلو وا کیا کے اردو اسکالر
بیان مارک اردو بورڈ کی بابت
تاثرات رقم کر رہے ہیں .
ادہ :
شاہد ، حقی ، مسرور صدیقی
بتہ :
یان مارک ، ممتاز حسن

اب یان مارک اردو نظموں کے
ک زبان میں منظوم ترجمے
ہے ہیں .
از حسن ، یان مارک ، حقی ،
ینی -

ڈاکٹر زور مرحوم کی یاد میں !

ٹر رضی الدین صدیقی نے
ہ تعزیت کی صدارت فرمائی
، شاہد ، ماہر القادری ، جوش ،
، قدوائی ، شوکت سبزواری ،
ف بریلوی ، اکبر وفاقانی ،
محمد نے تقریریں کیں .
ں نقوی اور مجیب خیرآبادی
منظوم خراج عقیدت پیش کیا.

NATIONAL INVESTMENT (UNIT) TRUST
100
NATIONAL INVESTMENT (UNIT) TRUST